وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ
تسہیل البیان
فی
تفسیر القرآن
تالیف
محمد اسلم شیخوپوری
www.toobaaelibrary.com
مکتبہ حلیمیہ
سائٹ کراچی

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ
تسہیلُ البیانُ
فی
تفسیرِ القرآن
جلد نمبر ۴
تالیف
محمد اسلم شیخوپوری
ناشر
المنهل

موضوع .... تفسیر القرآن

نام .... تسہیل البیان فی تفسیر القرآن

تالیف .... مولانا محمد اسلم شیخوپوری

مقام تالیف .... جامع مسجد تو ابین، گلشن معمار کراچی

کمپوزر .... منور علی مبارک

صفحات ۵۵۳

سائز .... ۲۹ x ۲۳

تعداد ۱۰۰۰

ناشر .... المنهل

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور 042-37228196
- ادارہ اسلامیات، 190، انارکلی، لاہور 042-32722401
- البرہان، اردو بازار، لاہور 042-37122543

ملتان
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان 061-4540513, 0322-6180738
- مکتبہ اشاعت الخیر، بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان 061-4514929

کوئٹہ
- مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ 081-2662263, 0333-7825484
- مکتبہ فاروقیہ، عبدالستار روڈ، کوئٹہ 0311-3737656

راولپنڈی
- اسلامی کتب گھر، CDA اسٹاپ، راولپنڈی 051-4830451
- الخلیل پبلشنگ، کمیٹی چوک، راولپنڈی 051-5553248

پشاور
- مکتبہ عمر فاروق، پشاور 091-2580301, 0311-8845717

اسٹاکسٹ
ادارۃ النور
دوکان نمبر 3-2، انور مینشن، بنوری ٹاؤن، گرومندر، کراچی
021-34914596, 0324-2855000
idaratunnoor@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اے رب ہمارے! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے! اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر، اے رب ہمارے! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر، تو ہی ہمارا رب ہے، مدد کر ہماری کافروں پر ۝

چوتھی جلد ایک نظر میں

☆☆☆☆☆

سُورَۃُ یُونُس
مَکِّیَّۃٌ

﴿سورۂ یونس کے اہم مضامین﴾

سورۂ یونس مکی ہے، اس میں ۱۰۹ آیات اور ۱۱ رکوع ہیں، اس سورت میں ایمان کے بنیادی ارکان اور عقائد اور بالخصوص قرآنِ کریم سے بحث کی گئی ہے۔ سورت کی ابتداء کتاب اللہ اور رسول اللہ کے ذکر سے ہوتی ہے، بتایا گیا ہے کہ خاتم المرسلین ﷺ کی نبوت ورسالت سے کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی بعثت کوئی نئی بات نہیں بلکہ ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی رسول آتا رہا ہے۔ اس کے بعد ربوبیت، الوہیت اور عبودیت کی حقیقت اور خالق ومخلوق کے درمیان تعلق کی بنیاد بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے، جو رب اور خالق ہے وہی معبود بننے کے لائق ہے، کائنات کا یہ سارا نظام اس کی ربوبیت اور قدرت پر گواہ ہے۔ (۱۰:۶)

اس نظام اور دلائلِ قدرت میں غور وفکر کے بعد انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، تکذیب کرنے والے اور تصدیق کرنے والے۔ تکذیب کرنے والوں کا انجام آگ اور تصدیق کرنے والوں کا انجام دائمی باغات ہیں۔ (۱۰:۷)

تکذیب کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں عجلت ہے، یہاں تک کہ یہ بعض اوقات اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے عذاب اور ہلاکت کی دعائیں مانگتا ہے۔ (۱۰:۱۱)

ان جھٹلانے والوں کا حال یہ ہے کہ یہ قرآن کو جھٹلانے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے اور اللہ کے نبی سے استہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ آپ کوئی دوسرا قرآن لے آئیں یا اسی میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، آپ نے جواب دیا کہ مجھے ان میں سے کسی بات کا اختیار نہیں، میں تو وحی کی اتباع کا پابند ہوں، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے معاذ اللہ! یہ کلام خود بنا کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ میں تمہارے درمیان زندگی کے چالیس سال گزار چکا ہوں، تم نے مجھے کبھی جھوٹ بولتے ہوئے سنا ہے یا کسی استاد سے علم حاصل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ اگر نہیں سنا اور نہیں دیکھا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں یکا یک جھوٹ بولنا شروع کر دوں یا ایسا معجزانہ کلام تمہارے سامنے پیش کر دوں؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں انسانوں پر تو جھوٹ نہ بولوں اور اللہ پر جھوٹ بولنے کی جرأت کر لوں؟ آپ کی سیرت کی صفائی اور زبان کی صداقت کا یہی وہ پہلو تھا جس کا دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور تھے، ابوسفیان سے زمانہ کفر میں جب روم کے بادشاہ ہرقل نے سوال کیا تھا کہ کیا دعوائے نبوت سے پہلے تم نے کبھی محمد ﷺ کو جھوٹ بولتے ہوئے سنا ہے؟ تو کافر اور مشرک ہونے کے باوجود ابوسفیان بھی اس سوال کا جواب نفی میں دینے پر مجبور ہو گیا تھا اور ہرقل نے اس کا جواب سن کر کہا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ تو جھوٹ نہ بولے اور اللہ پر جھوٹ بولنا شروع کر دے۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مشرکین نے بچپن سے نزولِ قرآن کے زمانہ تک رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا، وہ جانتے تھے کہ آپ نے نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا نہ کسی استاد کی شاگردی اختیار کی، پھر چالیس سال گزر گئے تو آپ یکا یک ایک عظیم کتاب ان کے پاس لے کر آ گئے جو علمِ اصول کے نوادر، علمِ احکام کی باریکیوں، علمِ اخلاق کے لطائف اور پہلوں کے واقعات کے اسرار پر مشتمل تھی اور جس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ کرنے سے بڑے بڑے ادیب اور شاعر عاجز آ گئے، ہر وہ شخص جسے عقلِ سلیم عطا کی گئی ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اگلی آیات میں مشرکین کی بت پرستی اور توحید کے دلائل مذکور ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ سختی اور مصیبت کے وقت بڑے سے بڑے مشرک بھی جھوٹے معبودوں کو بھول کر سچے معبود کو پکارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ (۱۰:۲۲)

پھر تلقین کے انداز میں آپ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ آپ ان سے سوال کریں کہ: ”تمہیں آسمان اور زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے؟ اور بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو کون پیدا کرتا ہے اور کون تمام امور کی تدبیر کرتا ہے؟ ان کا جواب یہی ہوگا کہ یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے، تو آپ پوچھئے کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے ہو۔“ (۱۰:۳۱)

قرآن کی صداقت کے حوالے سے انہیں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر یہ انسانی کلام ہے تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر دکھا دو اور اس مقصد کے لیے عرب و عجم میں سے جسے بلانا چاہتے ہو بلا لو، پھر اللہ نے ان کی تکذیب کا سبب خود ہی بیان فرما دیا، وہ یہ کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ جس چیز سے جاہل ہوتا ہے اور اس کی حقیقت سمجھ نہیں پاتا تو سرے سے اس کا انکار ہی کر دیتا ہے۔ (۱۰:۳۹)

مشرکین نے توحید، بعث بعد الموت اور قرآن کی صداقت کا جو انکار کیا تو اس کی ایک بڑی وجہ ان کی جہالت اور عدمِ علم بھی تھا، اس سورت میں انہیں کہیں زجر اور تنبیہ کے ساتھ اور کہیں نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں ان تینوں بنیادی عقائد کے بارے میں ہٹ دھرمی چھوڑنے اور ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآنِ کریم کی اعلیٰ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”اے لوگو! تمہارے لیے ہدایت اور رحمت آ پہنچی ہے، تو کہہ دیجئے کہ یہ کتاب اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں، یہ اس (مال و دولت) سے کہیں بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے ہیں۔“ (۱۰:۵۷)

توحید کے دلائل، بعث بعد الموت کا یقینی ہونا، قرآنِ کریم کی صداقت بیان کرنے اور مشرکین کے مزعومات کی

تردید کے بعد عبرت اور نصیحت کے لیے تین قصے بیان کیے گئے ہیں، جن میں سے پہلا قصہ شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کا ہے، جن کی عمر اور زمانہ تبلیغ تمام انبیاء علیہم السلام سے زیادہ طویل مگر ان کے متبعین بہت کم تھے، پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے جنہوں نے فرعون جیسے خدائی کے دعویدار کا مقابلہ کیا، تیسرا قصہ حضرت یونس علیہ السلام کا ہے اور انہی کے نام پر اس سورت کا نام رکھا گیا ہے۔قرآنِ کریم میں حضرت یونس علیہ السلام کا صراحۃً نام چار جگہ آیا ہے اور دو مقامات پر انہیں ''مچھلی والے'' کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، وہ اپنی قوم کے ایمان سے مایوس اور اللہ کا عذاب آنے کو یقینی سمجھ کر ''نینویٰ'' کی سرزمین چھوڑ کر چلے گئے، آگے جانے کے لیے جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی والوں نے سمندر میں طغیانی کی وجہ سے انہیں سمندر میں پھینک دیا، اللہ نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رکھا، بالآخر چند روز بعد مچھلی نے انہیں ساحل پر اُگل دیا، اُدھر یہ ہوا کہ ان کی قوم کے مرد اور عورتیں، بچے اور بڑے سب صحراء میں نکل گئے اور انہوں نے آہ وزاری اور توبہ واستغفار شروع کر دیا اور سچے دل سے ایمان قبول کر لیا جس کو وجہ سے اللہ کا عذاب ان سے ٹل گیا۔

یہ تین قصے ذکر کرنے کے بعد مشرکین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر وہ کفر وشرک سے باز نہ آئے تو قیامت سے پہلے ہی ان پر عذاب آسکتا ہے، حضورِ اکرم ﷺ اور مؤمنین کو بشارت سنائی گئی ہے کہ اللہ کی مدد قریب ہے، یہ ہماری سنت ہے کہ ہم بالآخر اہلِ ایمان کو نجات دیتے ہیں۔

جیسے سورۂ یونس کی ابتداء قرآنِ حکیم کے ذکر سے ہوئی تھی اسی طرح اس کی انتہاء بھی اس سچی کتاب کی اتباع اور پیروی کے حکم پر ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''فرما دیجیے اے انسانو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق (قرآن) آچکا ہے تو جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو اس ہدایت کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو اس گمراہی کا وبال اسی پر پڑے گا اور میں تم پر وکیل نہیں ہوں اور (اے پیغمبر!) آپ اسی کی اتباع کیجیے جو کلام آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے اور صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

☆☆☆☆☆

وحی اور اس کا پیغام

﴿۱......۴﴾

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ

یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی ○ کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی ہم نے ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنا دے

اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ

لوگوں کو اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو کہ ان کے لیے پایہ سچا ہے اپنے رب کے یہاں کہنے لگے منکر بے شک یہ تو

هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

جادوگر ہے صریح ○ تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا عرش پر تدبیر کرتا ہے

عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ

کام کی کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو کیا تم

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ

دھیان نہیں کرتے ○ اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو وعدہ ہے اللہ کا سچا وہی پیدا کرتا ہے اول بار پھر دوبارہ کرے گا

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ

اس کو تاکہ بدلہ دے ان کو جو ایمان لائے تھے اور کیے تھے کام نیک انصاف کے ساتھ اور جو کافر ہوئے ان کو پینا ہے کھولتا پانی

وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴

اور عذاب ہے دردناک اس لیے کہ کفر کرتے تھے ○

تسہیل: یہ ایسی کتاب کی آیات ہیں جو حکمت سے لبریز ہے ○ کیا لوگوں کے لیے یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیجی کہ بد عملی میں مبتلا لوگوں کو خبردار کر دیجئے اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لیے ان کے رب کے ہاں اعلیٰ مقام ہوگا! منکرین کہتے ہیں کہ یہ شخص کھلا جادوگر ہے ○ بلا شبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا، ہر کام کی تدبیر وہی کرتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکتا، یہی اللہ تمہارا رب ہے پس تم اس کی عبادت کرو، کیا تم ان آیات میں غور وفکر نہیں کرتے؟ ○ بالآخر تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، پہلی بار بھی اسی نے پیدا کیا تھا دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا، تاکہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ پوری جزا دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک

عمل کیے، اور جنہوں نے کفر اور انکار کا راستہ اختیار کیا انہیں پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ملے گا اور دردناک عذاب ہوگا یہ سزا ہوگی ان کے کفر کی جو وہ کرتے رہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾......﴿الٓرٰ﴾ جیسے حروف مقطعات لاکر قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے سے انکار کرنے والوں کو بار بار چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم اسے انسانی کلام سمجھتے ہو تو تم بھی ان حروف سے اسی جیسا کلام بنالو، اگر ایک سو چودہ سورتیں نہیں بنا سکتے تو صرف ایک سورت ہی بنا دو۔

﴿الْحَكِيْمِ﴾ یہ ایسی کتاب کی آیات ہیں جو حکمت سے لبریز ہے{۱} اس کے معانی اور مطالب، اس کے اوامر اور نواہی، اس کے قصص اور مواعظ کوئی چیز بھی حکمت سے خالی نہیں۔

﴿حَكِيْمٍ﴾ کا معنی محکم بھی ہے{۲} یعنی ایسی کتاب جو الفاظ اور معانی ہر اعتبار سے محکم، محفوظ اور سچی ہے۔

﴿۲﴾......مقامِ بشریت سے بے خبر لوگ بڑے تعجب{۳} سے سوال کرتے تھے کہ کیا انسان بھی اللہ کا رسول ہوسکتا ہے؟ یہ وہ لوگ تھے جو خود اپنی نظروں سے گر چکے تھے، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسان مقامِ رسالت پر فائز ہوسکتا ہے۔

انسان کے حقیقی مقام سے تو بس اللہ ہی آگاہ ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھ دیں، پھر فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا، دنیا میں چونکہ انسانوں کی بود و باش ہے، اس لیے اللہ نے جب بھی وحی نازل فرمائی کسی انسان ہی کی طرف نازل فرمائی، اگر بالفرض دنیا میں فرشتوں کی سکونت ہوتی تو کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجا جاتا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾{۴}

''اگر زمین پر فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔''

مشرکینِ عرب کو ''بشر'' ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے یتیم اور مفلس ہونے پر بھی اعتراض تھا، ان کا خیال تھا کہ نبوت کے لیے کسی سردار کا انتخاب ہونا چاہیے تھا، وہ کہتے تھے:

{۱} ''الحکیم'' صفۃ للکتاب ووصف بذلک لاشتمالہ علی الحکم، فیراد بالحکیم ذوالحکمۃ علی انّہ للنسبۃ کلابن وتامر (روح المعانی ۱۱،۷/۸۷)

{۲} ''الحکیم'' بمعنی المحکم (کبیر ۱۷،۶/۱۸۵)

{۳} أنّ الکفّار قالوا لما بعث محمد: ان اللہ اعظم من ان یکون رسولہ بشرا (قرطبی ۸/۲۷۸)

{۴} (الاسراء ۱۷/۹۵)

﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ {۵} ''یہ قرآن دونوں شہروں (یعنی مکہ اور طائف) کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں نازل کیا جاتا؟''

تعجب اس بات پر ہے کہ شرک پسند لوگ مٹی اور پتھر کی مورتیوں اور اپنے جیسے انسانوں کو معبود اور مسجود اور اللہ تعالیٰ کے مظہر اور اوتار تو ماننے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں مگر کسی بشر کو رسول تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، مشرکوں کو انسان کے نبی ہونے پر تعجب ہوتا تھا، قرآن ان کے تعجب پر اظہارِ تعجب کرتا ہے کہ کیسے کم عقل ہیں وہ جو انسانوں کے لیے کسی انسان کے نبی ہونے پر حیران ہو رہے ہیں؟

﴿مِّنْهُمْ﴾ اللہ نے نہ صرف انسان کو نبی بنایا بلکہ ایسا انسان جو انہی میں سے تھا، اور جس کے خاندان، سیرت و کردار اور شب و روز سے وہ خوب آگاہ تھے۔

دو بڑے مقاصد:

﴿اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ﴾ داعی جو بھی ہو خواہ نبی ہو یا غیر نبی، انسان ہو یا قرآن جیسی کتاب، اس کے بڑے مقاصد دو ہی ہیں، انذار اور بشارت! بدعملیوں میں مبتلا انسانوں کو ڈرانا، جگانا، خبردار کرنا، اور حکمِ الٰہی کے سامنے سر جھکانے والوں کو خوشخبری سنانا!

﴿قَدَمَ صِدْقٍ﴾ اعلیٰ مقام اور مرتبہ! اسے ''قَدَمَ'' سے تعبیر کیا گیا کیونکہ فضائل و کمالات کا حصول قدم {۶} اور جہد و سعی ہی سے ممکن ہے، صدق کا تعلق صرف قول سے نہیں بلکہ عقائد و اعمال اور تمام اوصاف و اخلاق سے ہے۔ {۷}

﴿اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ﴾ جب اللہ کے معجز کلام کے مقابلے میں کافر لاجواب ہو جاتے اور اس کی اثر انگیزی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو کہتے کہ اس کلام کا پیش کرنے والا جادوگر ہے، ہمارے زمانے کے مغربی دانشوروں کا بھی یہی حال ہے، وہ قرآنِ کریم کی فتوحات اور حضورِ اکرم ﷺ کی حیرت انگیز کامیابیوں سے تو انکار کر نہیں سکتے، حسد اور تعصب کی وجہ سے یہ کہہ کر انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ ان کامیابیوں کے پیچھے کسی ''ذہین انسان'' کا ہاتھ تھا۔

بنیادی مقاصد:

﴿۳﴾......نبوت کے بعد توحیدِ باری تعالیٰ اور بعث بعد الموت کا ذکر ہے اور یہ تین مضامین قرآن کی اساس کی

{۵} (الزخرف ۴۳/۳۱)

{۶} والوجه أن الوصول الى المقام إنما يحصل بالقدم (ابی سعود ۳/۲۰۹) لما كان السعى والسبق بالقدم، سميت المسعاة الجميلة والسابقة قدمًا (كشاف ۲/۳۱۳)

{۷} و قيل بل لمن صدق بقوله و اعتقاده و حقق صدقه بفعله (مفردات/۲۷۷)

حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید، ربوبیت اور حاکمیت کو کسی منطق اور فلسفی کے انداز میں پیچیدہ بنا کر بیان نہیں کرتا بلکہ سادہ اور فطری انداز میں بیان کرتا ہے جسے معمولی شدبدر رکھنے والا انسان بھی بآسانی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے تمہارا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، یعنی اوپر اور نیچے جو کچھ ہے {۸} اسے چھ دنوں میں بنایا گیا۔ چھ دنوں سے چھ مراحل بھی مراد لیے گئے ہیں۔ {۹} ظاہر ہے جس وقت ارض وسماء کی تخلیق ہوئی اس وقت نہ سورج تھا نہ اس کا طلوع وغروب، نہ دن اور رات کی تقسیم......دل کہتا ہے اگر اللہ کو منظور ہوا تو ممکن ہے کبھی نہ کبھی انسان پر ان چھ مراحل کا راز بھی کھل ہی جائے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ {۱۰} یہ مت سمجھو کہ اللہ نے اس کائنات کو بنا کر یونہی چھوڑ دیا ہے جس کا نظام خود بخود چل رہا ہے، بلکہ دنیا پر اس کا مکمل کنٹرول ہے، اللہ کا عرش پر جلوہ افروز ہونا ویسے ہرگز نہیں جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہیں بلکہ اس کی شان کے مطابق ہے اور اس کی حقیقت پوری طرح سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے، ویسے یہ دعویٰ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم مجرّد معانی اور مفاہیم کو بھی حسّی انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ وہ عام لوگوں کے فہم وادراک کے قریب ہو جائیں، ہوسکتا ہے ''عرش پر جلوہ افروز ہوتے'' کی تعبیر بھی اسی لیے اختیار کی گئی ہو۔

دوسری الہامی کتابوں میں بھی اللہ کے عرش پر جلوہ فگن ہونے کا ذکر ہے، زبور (۹-۴) میں ہے: ''تو نے تخت پر بیٹھ کر صداقت سے انصاف کیا۔''

﴿مَا مِنْ شَفِيْعٍ﴾ مشرک قومیں اللہ کے وجود کا انکار نہیں کرتی تھیں ان کا بڑا جرم یہ تھا کہ وہ شرک کی مختلف صورتوں میں مبتلا تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اپنے معبودوں کے بارے میں اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ قیامت کے دن سفارش سے اپنے پیروکاروں کو چھڑائیں گے اور ان کی سفارش کو ٹھکرانا اللہ کے لیے ممکن نہ ہوگا، قرآن کریم میں اس تصور کی جابجا نفی کی گئی ہے، یہاں بھی فرمایا گیا کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کرسکتا، آیت الکرسی میں ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ {۱۱} ''کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرسکے۔''

{۸} یراد بھما العالم العلوی والعالم السفلی (تفسیر المراغی، الجزء الثا ن / ۱۲۸)

{۹} ای فی ستّة اوقات (ابی سعود ۳/ ۲۱۰)

{۱۰} ''استواء علی العرش'' کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے تسہیل البیان ۳/ ۷۶)

{۱۱} (البقرة ۲/ ۲۵۵)

﴿فَاعْبُدُوْهُ﴾ جب خالق بھی اللہ ہے، کائنات کا نظام بھی وہی چلا رہا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش بھی نہیں کرسکتا تو عبادت بھی صرف اسی کی ہوگی، اہلِ عرب یہ تو تسلیم کرتے تھے کہ رب، خالق اور رازق صرف اللہ ہے مگر الوہیت میں اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے تھے، یہاں اسی غلط سوچ کی تردید کی گئی ہے۔

﴿۴﴾......آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی یقینی ہے، اس کائنات کو ابتداء میں بھی اللہ نے پیدا کیا تھا اور دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا، عقل پر انحصار کرنے والے ابتدائے خلق کے بارے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں وہ کبھی ایک نظریہ پیش کرتے ہیں اور کبھی دوسرا، لیکن وحی پر اعتماد کرنے والوں کی نظر میں یہ مسئلہ بدیہی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾{۱۲}

"وہی ہے جو مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اس کے لیے بہت آسان ہے۔"

دوبارہ پیدا کرنے کو انسانی سوچ کے اعتبار سے زیادہ آسان کہا گیا ہے ورنہ اللہ کے لیے ابتداء اور اعادہ دونوں برابر ہیں۔

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ﴾ موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا اصل مقصد عدل اور جزا ہے، دنیا میں نہ کامل عدل ہوتا ہے نہ پوری جزا اور سزا ملتی ہے۔ آخرت میں پورا انصاف ہوگا، فرمانبردار کو جزا اور نافرمان کو سزا مل کر رہے گی، سورۃ انبیاء میں ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾{۱۳}

"ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو رکھیں گے، پھر کسی پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو ہم اس کو حاضر کر دیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔"

حکمت و ہدایت:

۱......قرآنِ کریم اپنی عبارت اور مطالب کے اعتبار سے محکم بھی ہے اور حکمت و دانائی سے بھی لبریز ہے۔(۱)

۲......کسی انسان کی طرف وحی کا نازل ہونا باعثِ تعجب نہیں بلکہ عقل و حکمت کے عین موافق ہے۔(۲)

۳.....نبوت، ذکاوت و ذہانت، دولت و ثروت اور حسب و نسب کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس منصب کے لیے

{۱۲} (الروم ۳۰/۲۷)
{۱۳} (الانبیاء ۲۱/۴۷)

جس کا انتخاب فرمالے صرف اسی کو ملتی ہے۔(۳)

۴......رسول کے اہداف میں سے بڑے ہدف دو ہوتے ہیں، انذار اور تبشیر یعنی خبردار کرنا اور خوشخبری سنانا۔(۳)

۵......قرآنِ کریم کی تاثیر سے مشرکین بھی انکار نہیں کرتے تھے لیکن جب ان سے کوئی بھی جواب بن نہ پاتا تو وہ اسے سحر سے تعبیر کر دیتے تھے۔

۶......آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں یا چھ مرحلوں میں پیدا کرنا اس دعوے کو ثابت کرتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ انتہائی اہتمام سے پیدا کیا گیا کارخانہ ہے، علاوہ ازیں اس میں انسانوں کے لیے تحمل اور برداشت کا سبق بھی ہے کہ ہر کام سوچ سمجھ کر اور باریک بینی سے کیا جائے۔

۷......مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آسمانوں سے ورے ایک عظیم الشان تخت ہے جس کی اصل حقیقت روزِ قیامت ہی معلوم ہو سکے گی جو حقائق کے انکشاف کا دن ہے۔

۸......ان نام نہاد دانشوروں، فلسفیوں اور منطقیوں کا دعویٰ غلط ہے جو اللہ کو خالق تو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت "علت العلل" کی ہے اور تخلیق کے بعد اس کا کائنات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سارا نظام طبعی اصولوں کے مطابق خود بخود چل رہا ہے۔(۳)

۹......قرآن ہر قسم کی جبری شفاعت کی نفی کرتا ہے، کوئی نبی اور ولی سفارش کے ذریعے اللہ کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا(۳) حقِ شفاعت ایک قسم کا اعزاز ہوگا جو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرمائیں گے۔

۱۰......اللہ تعالیٰ نے توحید اور وجود کے بارے میں جو دلائل دیے ہیں ان میں غور و فکر کرنا واجب ہے(۳)

۱۱......بعث بعد الموت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، جو ہستی مادہ اور مثال کے بغیر پہلی بار پیدا کر سکتی ہے وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتی ہے(۴)

۱۲......قیامت کے دن اہلِ اطاعت کو جزا اور باغیوں کو سزا دی جائے گی، یہی تقاضائے عقل و عدل ہے۔(۴)

شمسی و قمری منزلیں

﴿۵......۶﴾

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ

وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمک اور چاند کو چاندنا مقرر کیں اس کے لیے منزلیں تاکہ پہچانو گنتی برسوں کی اور حساب

وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ

یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے یہ سب کچھ مگر تدبیر سے ظاہر کرتا ہے نشانیاں ان لوگوں کے لیے جن کو سمجھ ہے O البتہ بدلنے میں

الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

رات اور دن کے اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں O

ربط: ابتدائے سورت کی طرح ان آیات میں بھی اللہ کی قدرت اور توحید کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔

تسہیل: وہی تو ہے جس نے سورج کو چمکتا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کے لیے منزلیں مقرر کر دیں تا کہ تم ان کے ذریعے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، وہ یہ دلائل تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں O یقیناً شب و روز کے آنے جانے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے لیے اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں O

تفسیر

﴿۵﴾......وہی ذات ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اس نے شمس و قمر کو روشنی عطا کی ہے، سورج دن میں اور چاند رات کو نور بکھیرتا ہے، ان کی روشنی سے انسانوں، حیوانوں اور نباتات سب کو یکساں فائدہ پہنچتا ہے، پھلوں اور غلّہ جات کے پکنے اور ان میں مٹھاس پیدا کرنے میں بھی ان کا دخل ہوتا ہے۔

چونکہ ہم دنیا میں آنکھیں کھولنے سے لے کر آج تک سورج اور چاند کو روشن دیکھ رہے ہیں اس لیے ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، لیکن ایک لمحہ کے لیے سوچیں کہ اگر یہ دونوں روشن نہ ہوتے تو یہ دنیا کیسی ہوتی؟

سورج اور چاند ایک لگے بندھے نظام کے تحت چلتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس نظام سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتا، سورۂ رحمٰن میں ہے:

﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ {۱۴} ”سورج اور چاند ایک حساب سے چلتے ہیں۔“

ان دونوں کے لیے منزلوں کا تعین کر دیا گیا ہے، چاند کی منزلیں ۲۹ یا ۳۰ اور سورج کی منزلیں ۳۶۰ یا ۳۶۵ ہوتی ہیں، منزل سے مراد وہ مسافت ہے جو یہ شب و روز میں طے کرتے ہیں، منزلیں تو دونوں کی متعین ہیں مگر یہاں صرف

{۱۴} (الرحمٰن ۵۵/۵)

چاند کی منزلوں کا ذکر ہے کیونکہ چاند کو دیکھ کر ہر کوئی آسانی سے اس کی منزل اور تاریخ معلوم کر سکتا ہے جبکہ سورج کو دیکھ کر تاریخوں کا تعین ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔

﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ﴾ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں کوئی چیز بھی بے فائدہ پیدا نہیں کی بلکہ اس کی ہر مخلوق میں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے، سورۂ ص میں ہے:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا﴾{۱۵} ''ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔''

حکمتیں اور مصلحتیں تو اللہ کے ہر کام اور ہر تخلیق میں بے شمار ہیں، مگر سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ انسان غور وفکر کرے اور اللہ کے وجود اور توحید کا اعتراف کر لے۔

﴿لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ ان حکمتوں کا ادراک اور پھر توحید کا اعتراف وہی لوگ کریں گے جو فہم ودانش رکھتے ہیں۔

﴿۶﴾......شب وروز کے ادل بدل اور انواع واقسام کی بے شمار اشیاء میں بھی اللہ کی قدرت، اس کی صناعی اور حکمت پر واضح نشانیاں پائی جاتی ہیں، یہ نشانیاں ہر کسی کو نظر آتی ہیں مگر ان سے استفادہ وہی کرتے ہیں جو اہلِ تقویٰ ہیں، اگر تقویٰ کی شرط نہ ہوتی تو قبولِ ہدایت میں سائنسدان سارے انسانوں سے پیش پیش ہوتے، لیکن چونکہ وہ ابتداء ہی میں یہ طے کر لیتے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ طبعی اصولوں کے تحت ہو رہا ہے اور شمس وقمر کی حرکت، دن اور رات کی گردش، اور فلکیات وارضیات میں پائی جانے والی مناسبت اور ترتیب میں کسی خالق وقادر کا عمل دخل نہیں اس لیے وہ حسنِ ترتیب اور حکمت وافادیت کا اعتراف کرنے کے باوجود ایمان سے محروم رہتے ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱......شمس وقمر کے مختلف احوال اور ان میں پوشیدہ فوائد سمیت کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہے۔(۵)

۲......اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل اور تخلیق حکمت اور فائدہ سے خالی نہیں۔(۵)

۳......مسلمانوں کو ریاضی، حساب اور فلکیات وغیرہ ایسے علوم سیکھنے چاہئیں جن سے انہیں مادی اور شرعی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔(۵)

۴......اللہ کے وجود اور قدرت کی نشانیاں تو چہار سو ہیں مگر ان سے استفادہ اللہ سے ڈرنے والے اہلِ علم ہی کرتے ہیں۔(۶)

{۱۵} (ص ۳۸/۲۷)

منکر اور مومن کا انجام

﴿۷......۱۰﴾

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ

البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اُسی پر مطمئن ہو گئے اور جو لوگ

هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۝۷ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۸ إِنَّ الَّذِينَ

ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں ۝ ایسوں کا ٹھکانا ہے آگ بدلہ اس کا جو کماتے تھے ۝ البتہ جو لوگ

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي

ایمان لائے اور کام کیے اچھے ہدایت کرے گا ان کو رب ان کے ایمان سے بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں

جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝۹ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ

باغوں میں آرام کے ۝ اُن کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ اور ملاقات ان کی سلام اور خاتمہ ان کی دعا کا

أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۱۰

اس پر کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار سارے جہان کا ۝

تسہیل: جن لوگوں کو ہمارے سامنے پیش ہونے کا خوف ہے نہ توقع اور وہ دنیا کی زندگی پر راضی ہیں اور اسی سے دل لگائے بیٹھے ہیں اور جو ہماری آیات سے بالکل غافل ہیں ۝ یہی ہیں وہ لوگ جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے، ان اعمال کے سبب جو یہ کرتے رہے ۝ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کیے ان کا رب ان کے ایمان کی برکت سے ان کو منزل تک پہنچا دے گا، ان کے محلات کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جبکہ وہ عیش و آرام کے باغات میں ہوں گے ۝ جب اللہ کے انعامات پر ان کی نظر پڑے گی تو وہ کہہ اٹھیں گے "سبحان اللہ" اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو "السلام علیکم" کہہ کر دعا دیں گے اور ان کا آخری قول یہ ہوگا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ۝

﴿تفسیر﴾

﴿۷﴾......ان آیات میں دو مختلف سوچ رکھنے والے گروہوں کا ذکر ہے، پہلا گروہ وہ ہے:

الف......جس کے دل میں نہ تو وقوعِ قیامت کا خوف ہے اور نہ ہی حساب کا اندیشہ ہے {۱۶} اس لیے کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

{۱۶} "لایرجون لقاء نا"...... فالمعنی لایتوقعون الرجوع الینا أولقاء حسابنا...... (روح المعانی،۱۱،۷/۱۰۵)

ب...... آخرت کے بدلے وہ دنیا کی زندگی پر راضی ہو چکے ہیں، ان کی ذہانت اور کوششیں دنیا کی زندگی سنوارنے کے لیے وقف ہو چکی ہیں، سورۂ توبہ میں اس جیسی ذہنیت رکھنے والوں سے خطاب فرماتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾{۱۷} ''کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ہے؟''

ج...... دنیا ان کے حواس پر اس قدر چھا چکی ہے کہ انہیں قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اسی ناسوتی زندگی کی شہوتوں، رنگینیوں اور لذتوں سے حاصل ہوتا ہے، ان کی مجلسوں اور گفتگو میں آخرت کا ذکر تو کیا ہوگا، الٹا ہر اس شخص کو وہ طعن اور طنز کا نشانہ بنا لیتے ہیں جو آخرت کا ذکر کرے۔

د...... اور وہ ہماری آیات سے غافل اور بے خبر ہیں، آیات سے تکوینی اور قرآنی دونوں قسم کی آیات مراد ہو سکتی ہیں، اس دنیا میں ہر روز نجانے کتنے حادثات اور واقعات پیش آتے ہیں، کہیں زلزلہ، کہیں طوفان، کہیں ایکسیڈنٹ، کہیں جنازے، لیکن وہ کسی بھی واقعہ سے عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتے، یونہی قرآنِ کریم کی وہ پُر تاثیر آیات جو پہاڑوں تک کو ہلا دینے والی تاثیر رکھتی ہیں مادی علوم و فنون اور ترقیات میں کھویا ہوا انسان ان سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے پاس ان میں غور و فکر کرنے کے لیے وقت ہے۔

﴿۸﴾...... یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی بھر نخوت پرستی، ظلم و زیادتی، اور نجاست اور گندگی میں ملوث رہے اور انہیں کبھی توبہ کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

﴿۹﴾...... منکروں اور سرکشوں کے مقابلے میں دوسرا گروہ ان خوش نصیبوں کا ہے جنہوں نے نہ صرف اپنے سینوں کو نورِ ایمانی سے منور کیا بلکہ وہ حسبِ استطاعت نیک عمل بھی کرتے رہے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کے نور کی برکت{۱۸} سے قدم قدم پر ہدایت دیتا ہے حتیٰ کہ یہ اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے، وہ منزل جنت ہے جہاں ہر طرح کی نعمتیں مہیا کی گئی ہیں۔

﴿۱۰﴾...... جنتیوں کی زبان پر تین کلمات عام ہوں گے۔

☆...... جب وہ جنت کے عجائبات{۱۹} اور وہم و گمان سے بالاتر نعمتوں کو دیکھیں گے تو بے اختیار پکار اٹھیں گے:

''سبحانک اللّٰھمّ''

{۱۷} (التوبۃ ۹/۳۸)
{۱۸} یکون لھم نورا یمشون بہ (ابن کثیر ۲/۵۳۳)
{۱۹} (بیان القرآن ۵/۵۰۱)

☆...... جب ایک دوسرے سے ملیں گے تو سلام کریں گے، دنیا میں بھی ان کا یہی شعار تھا، آخرت میں بھی یہی شعار ہوگا، نہ صرف جنتی ایک دوسرے کو سلام کریں گے بلکہ فرشتے بھی اہلِ جنت کو سلام کریں گے، سورۂ زمر میں ہے:

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ﴾ {۲۰}

''اور جنت کے داروغے ان سے کہیں گے کہ ''السلام علیکم'' تم بہت اچھے رہے تو اب اس جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔''

سورۂ رعد میں ہے:

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝﴾ {۲۱}

''اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے، سلام ہو تم پر اس ثابت قدمی کی وجہ سے جو تم نے دنیا میں دکھائی، اس جہاں میں تمہارا انجام خوب ہے۔''

حد یہ کہ خود رب العالمین بھی انہیں سلام کہے گا:

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝﴾ {۲۲}

''انہیں سلام کیا جائے گا رحم کرنے والے پروردگار کی طرف سے۔''

☆...... جب جنتی اطمینان سے جنت میں بیٹھ جائیں گے اور دنیا کی فانی لذتوں کا مقابلہ وہاں کی دائمی راحتوں سے کریں گے تو کہیں گے۔ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

حقیقت میں مومن اپنے ہر کام کی ابتداء بھی اللہ کی حمد سے کرتا ہے اور اس کا اختتام بھی اللہ کی حمد پر کرتا ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......کافر قیامت کے دن اپنے کفر و معاصی کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (۷)

۲......چار چیزیں عموماً کفر کا سبب بنتی ہیں:

☆ اللہ کے عذاب کا خوف اور اس کے اخروی انعامات کی اہمیت کا دل سے نکل جانا۔

☆ دنیا ہی کو مقصدِ حیات بنا لینا اور آخرت کو پسِ پشت ڈال دینا۔

☆ دنیوی نفع کو حقیقی نفع اور دنیوی نقصان کو حقیقی نقصان سمجھ لینا۔

☆ دلائلِ قدرت دیکھ کر بھی عبرت نہ پکڑنا۔ (۷)

{۲۰} (الزمر ۳۹/۷۳)
{۲۱} (الرعد ۱۳/۲۳-۲۴)
{۲۲} (یٰسٓ ۳۶/۵۸)

۳......سچے مومن، جو ایمان اور اعمالِ صالحہ لے کر اللہ کے حضور پیش ہوں گے، انہیں آخرت کی دائمی خوشیاں اور ابدی نعمتیں حاصل ہوں گی۔(۹)

۴...مومن جنت میں اللہ کی حمد وثناء مکلّف ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض زبان کی لذت کے لیے کریں گے۔

۵......جنّتی جنّت کی نعمتوں کے حصول کے بعد اللہ کی تعریف کریں گے، علماء فرماتے ہیں کہ دنیا میں بھی اللہ کی نعمتیں استعمال کرتے ہوئے اور استعمال کرنے کے بعد اللہ کی حمد بیان کرنی چاہئے تاکہ جنتیوں کے ساتھ مشابہت ہو جائے، صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿إن الله ليرضى عن العبد أن يأكل الأكلة فيحمده عليها أو يشرب الشربة فيحمدهُ عليها﴾ {۲۳} "اللہ تعالیٰ کو بندے کا یہ عمل بہت پسند ہے کہ وہ کھانے کا کوئی لقمہ کھائے یا پانی کا گھونٹ پیے اور پھر "الحمدللہ" کہہ دے۔"

۶......دعا کرنے والے کے لیے یہ مستحب ہے کہ دعا کے آخر میں وہ کلمات کہے جو جنّتی کہیں گے، یعنی واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین.(۱۰)

انسان کی جلد بازی

﴿۱۱......۱۴﴾

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ

اور اگر جلدی پہنچا دے اللہ لوگوں کو برائی جیسے کہ جلدی مانگتے ہیں وہ بھلائی تو ختم کر دی جائے ان کی عمر سو ہم چھوڑے رکھتے

لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۱﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا

ہیں ان کو جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں سرگرداں O اور جب پہنچے انسان کو تکلیف پکارے

لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ

ہم کو پڑا ہوا یا بیٹھا یا کھڑا پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلا جائے گویا کبھی نہ پکارا تھا

ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ

ہم کو کسی تکلیف پہنچنے پر اسی طرح پسند آیا ہے بیباک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں O اور البتہ ہم ہلاک کر چکے ہیں جماعتوں کو

مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ

تم سے پہلے جب ظالم ہو گئے حالانکہ لائے تھے ان کے پاس رسول ان کی کھلی نشانیاں اور ہرگز نہ تھے

{۲۳} (مسلم ۲، کتاب الذکر/۳۵۲)

كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۝۱۳ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ

ایمان لانے والے یوں ہی سزا دیتے ہیں ہم قوم گناہ گاروں کو○ پھر تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں ان کے بعد

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝۱۴

تا کہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو○

ربط: منکرینِ قرآن بعض اوقات جوشِ غضب میں آ کر دعا کرتے تھے:

﴿اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ {۲۴}

''اے اللہ! اگر یہ قرآن واقعی تیرا کلام ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا، یا ہمیں المناک عذاب سے دوچار کردے۔''

ان کے بارے میں کہا جارہا ہے:

تسہیل: اور اگر اللہ تعالیٰ انسانوں پر عذاب بھیجنے میں بھی ویسے ہی جلدی کرتا جیسے وہ دنیا کے فوائد کے لیے جلدی مچاتے ہیں تو ان کی مہلتِ عمل کب کی ختم کردی گئی ہوتی، لیکن چونکہ یہ ہماری حکمت کے خلاف ہے اس لیے ہم ان لوگوں کو اپنی مستی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جو ہمارے سامنے پیش ہونے کی امید نہیں رکھتے○ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لیٹے، بیٹھے اور کھڑے ہمیں پکارتا ہے، جب ہم اس کی وہ تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے ہمیں کسی برے وقت میں پکارا ہی نہ تھا، حد سے گزر جانے والوں کی نظر میں ان کے اعمالِ بد یونہی خوشنما کردیے جاتے ہیں○ ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کردیا جب انہوں نے ظلم کو اپنا شیوہ بنالیا حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے مگر وہ کہاں ایمان لانے والے تھے، ہم مجرموں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں○ پھر ہم نے دنیا میں ان کی جگہ تمہیں آباد کیا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱﴾......منکرین اور مشرکین انبیاءِ کرام علیہم السلام کا مذاق اڑانے اور انہیں زچ کرنے کے لیے چیلنج کرتے تھے کہ وہ سچے ہیں تو ان پر وہ عذاب نازل کردیں جس سے وہ ڈراتے ہیں، مشرکین کے اس چیلنج کا ذکر متعدد آیات میں آیا ہے، سورۂ عنکبوت میں ہے:

{۲۴} (الانفال ۸/۳۲)

﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَأْتِيَنَّهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾{۲۵}

''یہ آپ سے جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں، اگر اللہ کے ہاں عذاب کی متعیّن مدت نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ جاتا اور وہ اچانک ان پر آ پڑے گا اور انہیں معلوم ہو جائے گا۔''

یہ جلد بازی انسان کی فطرت میں ہے:

﴿خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾{۲۶}

''انسان کو جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔''

انسان بھلائی اور برائی دونوں کے لیے جلد بازی کرتا ہے، بھلائی کے لیے شدّتِ حرص کی وجہ سے اور برائی کے لیے غصّے اور جہالت کی وجہ سے!

﴿وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا﴾{۲۷}

''اور انسان جس طرح بھلائی مانگتا ہے بعض اوقات اسی طرح برائی بھی مانگنے لگتا ہے اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔''

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، اس لیے وہ مہلتِ عمل کے ختم ہونے سے پہلے چیلنج اور مطالبے کے باوجود کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا اور اگر یہ اس کی سنت نہ ہوتی تو چیلنج کرنے والوں کا قصّہ کب کا تمام ہو چکا ہوتا۔

﴿فَنَذَرُ الَّذِينَ﴾ عمومی طور پر اللہ نے انسانوں کو قیامت تک مہلت دی ہے اس لیے وہ وقوعِ قیامت سے قبل ایسا عذاب نازل نہیں کرے گا جس سے نوعِ انسانی کا کلّی خاتمہ ہو جائے، چنانچہ اللہ کی ملاقات کو جھٹلانے والوں کو ایک معین وقت تک کفر و تکذیب میں حیران و سرگرداں چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان پر فوراً عذاب نازل نہیں ہوتا، اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر انسان جوشِ غضب میں آ کر بددعا کرے تو اس کی بددعا قبول نہیں کی جاتی، مگر بعض اوقات قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے جس میں انسان کی زبان سے نکلی ہوئی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

''اپنی جانوں، اپنی اولاد اور اپنے اموال کے لیے کبھی بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ قبولیتِ دعا کا وقت ہو اور تمہاری دعا قبول ہو جائے۔''{۲۸}

﴿۱۲﴾...... انسان کی عجلت پسند طبیعت کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ جب وہ فقر و فاقہ اور بیماری میں مبتلا ہو جائے یا

{۲۵} (العنکبوت ۲۹/۵۳)
{۲۶} (الانبیاء ۲۱/۳۷)
{۲۷} (الاسراء ۱۷/۱۱)
{۲۸} (ابوداؤد ۱، کتاب الصلوٰۃ/۲۲۱)

کوئی حادثہ پیش آ جائے تو وہ اللہ سے خوب دعائیں کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ اسے تکلیف سے نجات دے دیں تو وہ دوبارہ پرانی ڈگر پر چلنے لگتا ہے، وہی کفر و شرک وہی غفلت اور سرکشی، اس کے رویے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ نہ تو اسے کوئی تکلیف پہنچی تھی اور نہ ہی اس نے اپنے رب کو پکارا تھا۔

﴿کَذٰلِکَ زُیِّنَ﴾ جیسے ان لوگوں کا حال ہے جو بڑے اخلاص اور آہ و زاری سے اللہ کو پکارتے ہیں مگر پریشانی ختم ہونے کے بعد اللہ کو بھول جاتے ہیں، یہی حال مکّہ کے ان مشرکوں کا ہے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عناد میں بہت دور جا چکے ہیں، ان کی نظر میں یہ ضد اور عناد بڑا خوبصورت عمل ہے۔

﴿۱۳﴾...... اے منکرین اور مشرکین! یہ مت سمجھو کہ تم پہلی امت ہو جس کی طرف اللہ کا پیغام آیا ہے، تم سے پہلی امتوں کی طرف بھی اللہ نے پیغمبروں کے ذریعے اپنے احکام نازل فرمائے تھے مگر جب انہوں نے ان احکام کے مقابلہ میں ظلم کی روش اختیار کی تو انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

علماء نے ظلم کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱...... بندے اور اس کے رب کے درمیان ظلم...... کفر و شرک اور نفاق اسی قسم میں شامل ہیں۔

۲...... انسانوں کا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم...... کسی کے مال میں ناجائز تصرّف، جسمانی اذیّت، قتل و غارت گری، غیبت اور بہتان تراشی، دل آزاری اور دھوکہ دہی وغیرہ اسی قسم میں شمار ہوں گے۔

۳...... انسان کا خود اپنے اوپر ظلم...... سورۂ فاطر میں ہے:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ {۲۹} ''ان میں سے بعض اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔''

حقیقت میں دیکھا جائے تو پہلی دو قسمیں بھی اپنے اوپر ظلم میں داخل ہیں {۳۰} کفر و شرک ہو یا دوسروں پر زیادتی اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی، درحقیقت اپنے اوپر ہی ظلم ہے۔

ظلم کی جو بھی صورت مراد لی جائے بہرحال قوموں کے زوال اور ان کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے، بالخصوص ایسی قومیں جو واضح دلائل اور نشانیاں سن لینے اور دیکھ لینے کے باوجود ضد اور عناد پر اڑی رہیں اور انہیں قبولِ ایمان کی توفیق نہ ہو وہ قہرِ الٰہی سے نہیں بچ سکتیں۔

﴿۱۴﴾...... گزشتہ قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنا دیا، زمین کی خلافت تمہارے حوالے کرنے کا مقصد عیش و عشرت نہیں تھا بلکہ اس میں حق و عدل کا قیام اور اسے فتنہ و فساد سے پاک رکھنا اصل مقصود تھا......

{۲۹} (فاطر ۳۵/۳۲)

{۳۰} (الذریعۃ /۳۵۸...... بحوالہ نضرۃ النعیم ۱۰/۴۷۴۸)

جیسا کہ سورۃ الحج میں ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾{۳۱}

’’یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔‘‘

﴿ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ تم دنیا میں ہمیشہ کے لیے نہیں ہو محدود وقت کے لیے ہو، جتنا وقت بھی یہاں گزارو گے تمہاری سخت نگرانی کی جائے گی اور آخرت میں باز پرس بھی کی جائے گی۔

حکمت وہدایت:

۱......اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑا رحیم اور شفیق ہے اسی لیے وہ ان بددعاؤں کو قبول کرنے میں جلدی نہیں کرتا جو غصے کی حالت میں بندے اپنے یا اپنی اولاد وغیرہ کے لیے کر دیتے ہیں، یونہی وہ داعی جو اپنی قوم کے رویے سے جلد تنگ آ کر ہلاکت کی دعا کر دیتے ہیں ان کی دعا بھی فوراً قبول نہیں کی جاتی۔

۲......مشرکین کے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان پر عذاب نازل نہ کرنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ مشرکین میں سے بعض آگے چل کر ایمان لائیں گے یا ان کی نسلیں ایمان کے نور سے منور ہوں گی۔(۱۱)

۳......انسان اپنے مولا کا کتنا ناشکرا ہے، مصیبت میں اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور مصیبت ٹل جائے تو دوبارہ سرکشی پر کمر باندھ لیتا ہے۔(۱۲)

۴......جس طرح مومن نیک اعمال کے ذریعے طمانیت محسوس کرتا ہے اسی طرح کافر کے لیے کفر و معاصی کو مزین کر دیا گیا ہے۔(۱۲)

سورۂ انعام میں ارشاد باری ہے:

﴿ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ﴾{۳۲}

’’ہم نے یونہی ہر جماعت کی نظر میں ان کے اعمال کو مزیّن کر رکھا ہے۔‘‘

۵......شیطان کے پاس سب سے مؤثر ہتھیار انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ ہے کہ وہ اشیاء کی حقیقت بدل کر انسانوں کے سامنے ان کو لاتا ہے، تاریکی کو نور اور نور کو تاریکی بنا کر پیش کرتا ہے۔(۱۲)

۶......ہلاک شدہ قوموں کی ہلاکت کا اصل سبب ظلم تھا کفر و شرک بھی ظلم ہے اور انسانوں کے حقوق کی پامالی بھی ظلم ہے۔(۱۳)

{۳۱} (الحج ۲۲/۴۱)
{۳۲} (الانعام ۶/۱۰۸)

۷......اللہ بندوں کو عذاب دے کر ہلاک کرنے کی بجائے انہیں ایمان کے نور سے منور دیکھنا چاہتا ہے اس لیے وہ باوجود قدرت کے عذاب نہیں دیتا بلکہ ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔(۱۳)

۸......مجرم جلد یا بدیر اللہ کی پکڑ میں ضرور آئے گا، اگر اس نے توبہ نہ کی۔(۱۳)

۹......زمینی خلافت اعمالِ صالحہ کے ساتھ مشروط ہے، اللہ تعالیٰ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو ارضی خلافت عطا فرماتا ہے تاکہ دیکھے کہ وہ کیسے اعمال کرتے ہیں۔ معاذ اللہ! اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کریں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ اس شخص جیسا معاملہ کرتا ہے جو جزا دینے کے لیے کسی کے اچھے یا برے عمل کا انتظار کرتا ہے۔

مشرکین کا ناروا مطالبہ

﴿۱۵......۱۷﴾

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ

اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے آیتیں ہماری واضح کہتے ہیں وہ لوگ جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی لے آ کوئی

غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا

قرآن اس کے سوا یا اس کو بدل ڈال تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے میں تابعداری کرتا ہوں

مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۵ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ

اسی کی جو حکم آئے میری طرف میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے دن کے عذاب سے O کہہ دے اگر

مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا

اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس کو تمہارے سامنے اور نہ وہ تم کو خبر کرتا اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس سے پہلے

تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ

کیا پھر تم نہیں سوچتے O پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو بے شک بھلا

لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۱۷

نہیں ہوتا گناہ گاروں کا O

ربط: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت میں شک کرنے والوں کے متعدد ناروا مطالبات میں سے ایک مطالبہ ذکر کیا جارہا ہے۔

تسہیل: اور جب ان مشرکین کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہمارے روبرو پیش ہونے کی امید نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آیئے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے، آپ فرما دیجئے کہ مجھے اپنی طرف سے اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں، میں تو بس اس حکم کی اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے O فرما دیجئے اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں تمہیں یہ قرآن پڑھ کر نہ سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی اطلاع دیتا، آخر اس کلام کے سنانے سے پہلے بھی میں تمہارے درمیان زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟O اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اپنی طرف سے جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی آیات کو جھوٹا قرار دے، یقیناً اس قسم کے مجرم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۵﴾...... جب ان لوگوں کے سامنے قرآن پڑھا جاتا جو نہ آخرت پر ایمان رکھتے تھے، نہ وحی و رسالت کے سلسلہ سے پوری طرح واقف تھے، نہ انہیں اللہ کی معرفت حاصل تھی، نہ مقامِ نبوت سے آگاہ تھے، تو وہ قرآن کو معاذ اللہ! رسول اللہ ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھ کر اس کے تغیر و تبدل کا مطالبہ کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کا انداز بڑا سخت ہے، یہ ان کے بتوں کو گونگے، بہرے، اندھے اور عاجز قرار دیتا ہے، بہت سی چیزیں اور معاملات جو باپ دادا سے استعمال ہوتے آ رہے ہیں قرآن انہیں حرام قرار دیتا ہے، پھر مرنے کے بعد کی زندگی اور جزا و سزا کا نظام ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لیے انہوں نے دوسرا قرآن لانے یا اس میں ان کی خواہشات کے مطابق تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ میں ایک اور راز بھی پوشیدہ تھا، وہ یہ کہ اگر بالفرض محمد ﷺ نے ہمارا مطالبہ تسلیم کر لیا تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے۔ {۳۳}

﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ﴾ مشرکین کے غلط خیال کی تردید کرتے ہوئے آپ کو اللہ کی جانب سے حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نہ تو قرآن میری تصنیف ہے اور نہ ہی مجھے اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار ہے، ویسے بھی قرآن مکمل دستورِ حیات ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن ہی نہیں۔

﴿۱۶﴾...... یہ بھی فرما دیجئے کہ تمہیں قرآن سنانا اللہ کی مشیت کے موافق ہے، اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے، اس نے

{۳۳} ولم یکن مقصد هم من هذا الا ان یختبروا حاله بمطالبته بالاتیان بقرآن غیره ...... حتی اذا فعل هذا أوذاك كانت دعواه أنه كلام الله اوحاه إليه دعوى لا يعوّل عليها (تفسير المراغی ۱۱/۷۸-۷۹)

قرآن کی صورت میں بندوں کو زندگی کا دستور دینے کا ارادہ کیا اور مجھے بندوں تک پہنچانے کا حکم دیا، اگر اس کی مشیت اور حکم نہ ہوتا تو میں ایک آیت بھی تمہارے سامنے نہ پڑھتا۔

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ﴾ نبوت کے دعوٰی اور قرآن کی تلاوت سے قبل چالیس سال تمہارے درمیان گزار چکا ہوں میں نے کبھی ایک سورت بھی تمہارے سامنے نہیں پڑھی، اگر میرے لیے ایسا کلام بنانا ممکن ہوتا تو چالیس سال کے عرصہ میں کچھ نہ کچھ تو ضرور کہا ہوتا۔

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ کیا تم عقل سے ذرہ بھر بھی کام نہیں لیتے کہ وہ شخص جس نے چالیس سال تک نہ کوئی کتاب پڑھی نہ کسی استاد کی شاگردی اختیار کی، نہ اس نے شعر و نثر اور خطابت وغیرہ میں طبع آزمائی کی اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ یکا یک ایسا کلام انسانوں کے سامنے پیش کر دے جس کی مثال لانے سے جن وانس عاجز آ جائیں؟

انسانی اخلاق ونفسیات کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں اور طبعی رجحانات کا اندازہ بچپن ہی سے ہو جاتا ہے، پھر جب وہ بھرپور جوانی کی عمر کو پہنچ جائے اس کے باوجود علم وعمل کے کسی شعبہ میں اس کا کمال ظاہر نہ ہو تو اس کے بعد مہارت اور کمال کا ظاہر ہونا محالات میں سے ہے، پھر مہارت بھی ایسی جو پوری زندگی فن کی نذر کر دینے والے اساتذہ کو دم سادھ لینے پر مجبور کر دے، قطعاً ناممکن ہے۔ اپنی بیتی ہوئی عمر کو صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ:

﴿۱۷﴾...... اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنی طرف سے کلام بنا کر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دے یا اللہ کی آیات کو جھٹلا دے؟ ظاہر ہے کوئی نہیں! جب میں تمہیں جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں خود ہی اللہ پر جھوٹ بولنے لگوں۔

حکمت وہدایت:

۱...... دعوت الی اللہ کے لیے قرآن سے مؤثر کوئی اور ہتھیار نہیں۔ (۱۵)

۲...... مشرکین کا یہ مطالبہ کہ "اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لے آ ؤ یا اسی کو بدل دو" یا تو استہزاء کے طور پر تھا یا آپ کا امتحان لینے کے لیے تھا، ان کا خیال تھا کہ اگر محمد (ﷺ) دوسرا قرآن لے آئے تو ہمارے لیے عوام کے سامنے یہ امر ثابت کرنا آسان ہو جائے گا کہ قرآن ان کا خود ساختہ کلام ہے، اسی لیے تو دوسرا قرآن بنا کر لے آئے ہیں۔ (۱۵)

۳...... "ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ" سے مشرکین کی مراد یا تو یہ تھی کہ اس میں ہمارے معبودانِ باطلہ کی جو

کمزوریاں بیان کی گئی ہیں انہیں نکال دیں، یا یہ مراد تھی کہ احکام کو تبدیل کر دیں، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، اور اگر دونوں باتیں مراد لے لی جائیں تو بھی ان میں کوئی تضاد نہیں۔

۴......نبی وحی کا تابع ہوتا ہے، حلّت وحرمت اور وعدو وعید میں وہ اللہ کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے، وہ حاملِ شریعت تو ہوتا ہے بانیِ شریعت نہیں ہوتا۔ (۱۵)

۵......آسمانی وحی میں تبدیلی کا مطالبہ کل کے کافروں نے بھی کیا تھا اور آج کے کافر بھی اس مذموم کوشش میں اپنے پیشرووں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں بلکہ ان سے دو قدم آگے ہیں۔

۶......اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑنے کا حکم دے کر کافر، مسلمانوں کی ایمان پر ثابت قدمی کا امتحان لینا چاہتے ہیں، ایسے موقع پر شریعت کو اور زیادہ مضبوطی سے تھام لینا چاہئے۔ (۱۵)

۷......عذابِ الٰہی سے بچنے کے لیے اللہ کی نافرمانی سے باز رہنا شرط ہے، چاہے وہ نافرمانی قرآن میں تحریف کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔ (۱۵)

۸......"مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ" سے فقہاء نے بدعت کے حرام ہونے کا مسئلہ اخذ کیا ہے۔ (۱۵) {۳۴}

۹......ایک اُمّی کی زبان سے علوم ومعارف کا سمندر بہہ پڑنا، ہمارے آقا کی نبوت اور قرآن کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔

۱۰......نزولِ قرآن کا مقصد اسے تمام انسانوں تک پہنچانا ہے اور اگر اللہ کی مشیت نہ ہوتی تو اسے نازل نہ کیا جاتا اور نہ ہی اس کی تلاوت کا حکم دیا جاتا اور نہ ہی کسی کو اس کے مضمون کی خبر ہوتی۔ (۱۶)

۱۱......نبی کی سیرت بھی معجزہ ہوتی ہے اسی لیے وہ بے دھڑک قوم کے سامنے اپنی زندگی رکھ کر چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہیں اس میں کوئی جھول، کوئی عیب اور کوئی برائی نظر آتی ہے تو اس کی نشاندہی کرو۔

۱۲......سب سے بڑا جرم اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ (۱۷)

۱۳......اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو وحیِ الٰہی کہہ دینا اور اللہ کی جانب سے آئی ہوئی وحی کی تکذیب کرنا دونوں اِفۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ کے دائرے میں آتے ہیں۔ (۱۷)

☆☆☆☆☆

{۳۴} (ماجدی ۲/۴۴۱)

بتوں کی عبادت اور معجزہ کا مطالبہ

۱۸......۲۰

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ

اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کی جو نہ نقصان پہنچا سکے ان کو نہ نفع اور کہتے ہیں یہ تو ہمارے

شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ

سفارشی ہیں اللہ کے پاس تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ

وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو شریک کرتے ہیں O اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا جدا ہو گئے

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾ وَيَقُولُونَ

اور اگر نہ ایک بات پہلے ہو چکتی تیرے رب کی تو فیصلہ ہو جاتا ان میں جس بات میں کہ اختلاف کر رہے ہیں O اور کہتے ہیں

لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا

کیوں نہ اتری اس پر ایک نشانی اس کے رب سے سو تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو

إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں O

تسہیل: اور یہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی کوئی فائدہ، ان کا خیال ہے کہ یہ معبود اللہ کے ہاں ان کے سفارشی ہیں، آپ ان سے پوچھیے کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جسے نہ تو وہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ ہی زمین میں؟ اللہ تعالیٰ پاک اور بلند و بالا ہے ان کے شرک اور شریکوں سے O سارے انسان ایک ہی دین پر تھے، پھر ان میں سے بعض نے عقیدۂ توحید میں اختلاف کیا، اور اگر آپ کا رب پورا عذاب آخرت میں دینے کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا تو ان کے اختلافات کا فیصلہ دنیا میں کر دیا جاتا O اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کے ہاتھوں کوئی معجزہ کیوں نہیں ظاہر ہوتا؟ آپ فرما دیجئے کہ غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے لہٰذا تم بھی اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو میں بھی اس کا منتظر ہوں O

تفسیر

﴿۱۸﴾......مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان جن چیزوں کو اپنا معبود مانتا ہے ان

سے نفع اور نقصان کا تصوّر بھی رکھتا ہے، خواہ وہ معبود سورج، چاند اور ستاروں کی صورت میں ہو یا پتھر اور لوہے سے بنائی ہوئی مورتیوں یا جنّوں اور انسانوں کی صورت میں ہو، قرآن بتاتا ہے کہ ان میں سے کوئی معبود بھی اپنے عابدوں کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا، صرف بتوں کے عجز اور بے چارگی کو ثابت کرنا قرآن کا مقصد نہیں ہے بلکہ قرآن کا دعوٰی ہے کہ کوئی بھی مخلوق مافوق الاسباب (یعنی اسباب سے بے نیاز ہو کر) نہ نفع کا اختیار رکھتی ہے نہ نقصان کا۔

﴿وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ﴾ بے شمار مشرک ایسے تھے جو تسلیم کرتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی نفع دے سکتا ہے نہ نقصان، نہ پیدا کر سکتا ہے نہ مار سکتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے خود ساختہ معبودوں کی تعظیم محض اس لیے کرتے تھے کہ وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں گے اور انہیں اللہ کے قریب کر دیں گے، شیطان نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ چونکہ تمہارا دامن گناہوں کی نجاست سے آلودہ ہے اس لیے تمہیں براہِ راست اللہ سے رابطہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ رابطہ ان ہستیوں کے واسطے سے ہونا چاہئے جو اللہ کے مقرب اور محبوب ہیں۔

﴿قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ﴾ اے میرے پیغمبر! آپ ان سے دریافت کیجئے کہ کیا تم اللہ کو ایسی ہستیوں کے وجود کے بارے میں بتاتے ہو جنہیں وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ ہی زمین میں؟

اللہ تعالیٰ پر ارض وسماء کی کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اگر ایسی ہستیاں کہیں بھی موجود ہوتیں جو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو وہ ضرور ان کے بارے میں جانتا ہوتا۔{۳۵}

﴿۱۹﴾......ابتداء میں سارے کے سارے انسان دینِ فطرت پر تھے، ان میں سے کوئی بھی مشرک نہ تھا، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے بقول حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سے قبل تک یہی صورتحال رہی، حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان کم وبیش دس صدیوں کا فاصلہ ہے۔{۳۶}

رنگ ونسل، وطن اور قبیلے کے اختلاف کے باوجود قرآن وحدتِ دین کی وجہ سے ان سب کو ایک امت قرار دیتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد نسب اور وطن پر نہیں بلکہ عقیدہ اور مذہب پر ہے۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ﴾ آپ کا رب یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ کسی بھی جرم کی پوری سزا صرف آخرت میں دے گا{۳۷} کیونکہ دنیا دار العمل ہے دار الجزاء نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ انسانوں کے مابین

{۳۵} واللہ لا یعلم لنفسه شریکاً فی السّمٰوٰت ولا فی الارض لأنّه لا شریك له فلذلك لا یعلمه (قرطبی ۸/۲۹۱) واذا لم یکن معلوما له وهو العالم الذات المحیط بجمیع المعلومات لم یکن شیئاً ...... (کشاف ۲/۳۲۰)

{۳۶} قال ابن عباس: کان بین آدم و نوح عشرة قرون کلهم کانوا علیٰ دین واحد (ابن کثیر ۲/۵۳۸)

{۳۷} بتاخیر القضاء بینهم أوالعذاب الفاصل بینهم إلیٰ یوم القیامة فانّه یوم الفصل والجزاء (روح المعانی ۷/۱۱/۱۳۰) و هو تاخیر الحکم بینهم إلیٰ یوم القیامة (کشاف ۲/۳۲۱)

پائے جانے والے اختلافات کا فیصلہ دنیا میں نہیں آخرت میں سنایا جائے گا، اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ طے نہ کیا ہوتا تو اب تک آسمانی فیصلہ ظاہر ہو چکا ہوتا۔

﴿۲۰﴾......کفار کہتے تھے کہ محمد ﷺ کے ہاتھوں کوئی معجزہ کیوں نہیں ظاہر ہوتا؟ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ واقعی انہیں کوئی معجزہ نہیں دکھایا گیا تھا، کیونکہ پوری کائنات قدرتِ الٰہیہ کے معجزات سے بھری پڑی ہے، علاوہ ازیں قرآن کی ہر سورت ایک مستقل معجزہ ہے، کفار کا مقصد یہ تھا کہ ایسے معجزات کیوں نہیں دکھائے جاتے جن کا ہم مطالبہ کرتے ہیں۔{۳۸}

حکمت و ہدایت:

۱......اللہ کو خالق و رازق سمجھنے کے باوجود مشرکین بتوں کی عبادت دو وجہ سے کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ انہیں نفع اور نقصان پر قادر سمجھتے تھے، دوسرے اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا اور آخرت کے معاملات میں اللہ کے ہاں ہماری سفارش کر سکتے ہیں حالانکہ یہ ان کی صریح جہالت تھی کہ ایسوں سے آخرت میں نفع رسانی اور شفاعت کی امید رکھتے تھے جو دنیا میں انہیں ذرا بھی فائدہ نہیں دے سکتے تھے۔(۱۸)

۲......اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو شفاعتِ قہری کا مالک سمجھنا شرک ہے۔(۱۸)

۳......اصل میں سارے انسان دینِ فطرت اور توحید پر تھے بعد میں شرک کی صورت میں ان میں بگاڑ اور اختلاف پیدا ہوا۔(۱۹)

۴......انبیاء اور آسمانی تعلیمات سے اختلاف کا بنیادی سبب نفس اور باطل کی اتباع ہے، یہی سبب انہیں مومنوں اور کافروں میں تقسیم کرتا ہے۔(۱۹)

۵......جزا و سزا اور اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا ظلم اور کفر و شرک میں مبتلا افراد اور جماعتیں اپنی آخرت برباد کر رہے ہیں۔(۱۹)

۵......نزولِ قرآن کے باوجود مشرکین کا کسی اور نشانی کا مطالبہ، ایک گھٹیا حرکت تھی، وہ اگر غور کرتے تو سیرتِ مصطفوی کے ہر پہلو میں معجزہ پاتے اور ہر خارجی معجزہ سے مستغنی ہو جاتے۔

۶......ہدایت کے طلب گاروں کے لیے ایک آیت ہی کافی ہے اور تعصب زدہ قلب و نظر کو پورا قرآن بھی مفید نہیں۔

☆☆☆☆☆

{۳۸} ای معجزۃ غیر هذه المعجزة فیجعل لنا الجبال ذهبا و یکون له بیت من زخرف و یحیی لنا من مات من آبائنا (قرطبی ۸/۲۹۲)

بگڑے ہوئے انسانوں کا مزاج

﴿۲۱.....۲۳﴾

وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ

اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو مزا اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے جو ان کو پہنچی تھی اس وقت بنانے لگیں حیلے ہماری قدرتوں میں، کہہ دے کہ اللہ سب سے جلد

مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِى يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا كُنتُمْ

بنا سکتا ہے حیلے تحقیق ہمارے فرشتے لکھتے ہیں حیلہ بازی تمہاری O وہی تم کو پھراتا ہے جنگل اور دریا میں یہاں تک کہ

فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا۟ بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَآءَهُمُ

جب تم بیٹھے کشتیوں میں اور لے کر چلیں وہ لوگوں کو اچھی ہوا سے اور خوش ہوئے اس سے، آئی کشتیوں پر ہوا تند اور آئی ان پر

الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا۟ اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ

موج ہر جگہ سے اور جان لیا انہوں نے کہ وہ گھر گئے پکارنے لگے اللہ کو خالص ہو کر اس کی بندگی میں اگر تو نے بچا لیا

أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِۦ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّٰكِرِينَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ أَنجَىٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِى الْأَرْضِ

ہم کو اس سے تو بے شک ہم رہیں گے شکر گزار O پھر جب بچا دیا ان کو اللہ نے لگے شرارت کرنے اُسی وقت زمین میں

بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُم ۖ مَّتَٰعَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ

ناحق کی سنو لوگو! تمہاری شرارت ہے تمہی پر نفع اٹھا لو دنیا کی زندگانی کا پھر ہمارے پاس ہے تم کو لوٹ کر آنا پھر

فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

ہم بتلا دیں گے جو کچھ کہ تم کرتے تھے O

ربط: اوپر بھی بگڑے ہوئے انسانوں کا ذکر تھا جو انبیاء کرام علیہم السلام کو تنگ کرنے کے لیے ان سے طرح طرح کے مطالبات کرتے تھے، یہاں بھی ایسے ہی لوگوں کا اور ان کے خصوصی مزاج کا ذکر ہے۔

تسہیل: انسانوں کا حال یہ ہے کہ جب ہم انہیں مصیبت کے بعد کوئی نعمت عطا کر دیتے ہیں تو وہ فوراً ہماری آیات کے بارے میں چالبازی شروع کر دیتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ اللہ اپنی چال میں کہیں زیادہ تیز ہے، اس کے فرشتے تمہاری ساری شرارتوں کو لکھ رہے ہیں O وہی ہے جس نے تمہارے لیے خشکی اور تری میں سفر کرنا آسان کر دیا ہے، لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور کشتی بادِ موافق کے ذریعے خراماں خراماں چل رہی ہوتی ہے، سارے مسافر خوش ہوتے ہیں، پھر اچانک مخالف ہوا چلنے لگتی ہے اور ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور مسافر سمجھ

لیتے ہیں کہ ہم مصیبت میں گھر گئے تو وہ اللہ ہی کے لیے دعا کو خالص کرتے ہوئے پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بن جائیں گے O مگر جب اللہ انہیں بچالیتا ہے تو وہ فوراً زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں، اے لوگو! سن لو کہ تمہاری سرکشی کا وبال تمہارے اوپر ہی پڑے گا، چند دن دنیا کی زندگی کے مزے لوٹ لو، پھر ہماری طرف تمہیں واپس آنا ہے، پھر ہم تمہیں تمہارے کرتوتوں سے آگاہ کر دیں گے O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۱﴾......بگڑے ہوئے انسانوں کے مزاج اور فطرت کا ذکر کیا جا رہا ہے، یہ لوگ نت نئے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں مگر جب کوئی نشانی دیکھ لیتے ہیں تو اس سے عبرت اور نصیحت حاصل نہیں کرتے، مصیبت کے بعد راحت، تنگی کے بعد فراخی اور فقر و فاقہ کے بعد خوشحالی بھی اللہ کی نشانیوں اور نعمتوں میں سے ایک نشانی اور نعمت ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ ایسی صورت میں اللہ کی حمد و ثناء کرتے اور اس کا شکر ادا کرتے، مگر یہ شکر کی بجائے سرکشی پر اتر آتے ہیں اور استہزاء اور تکذیب کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں، شیطان ان کے دل میں یہ سوچ بٹھا دیتا ہے کہ مصیبتیں اور پریشانیاں پہلے لوگوں پر بھی آتی رہی ہیں، حالات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔

﴿قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا﴾ اے پیغمبر! آپ فرما دیجئے کہ اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے، اس کی تدبیروں کے مقابلے میں تمہاری کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی، تمہاری ساری چالبازیاں لکھی جا رہی ہیں جن کی سزا جلد یا بدیر تمہیں مل کر رہے گی۔

﴿۲۲﴾......ان کی چالبازیوں میں سے ایک کی زندہ مثال پیش کی جا رہی ہے جس کا آغاز اس اعلان سے کیا جا رہا ہے کہ اس کائنات کی حرکت اور سکون پر اللہ تعالیٰ کا کنٹرول ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ بحری سفر کر رہے ہوتے ہیں، بادِ موافق کی وجہ سے کشتی سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہوتی ہے سارے مسافر خوشی سے سرشار ہوتے ہیں کہ اچانک بادِ مخالف چلنے لگتی ہے، سرکش موجیں اپنے تھپیڑوں سے کشتی کو ڈانواں ڈول کر دیتی ہیں، وہ کبھی دائیں لڑھکتی ہے اور کبھی بائیں، مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ ہمیں موت نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، دور دور تک نہ آبادی دکھائی دیتی ہے نہ کوئی نجات دہندہ نظر آتا ہے، ان کے دل و دماغ پر غلط نظریات کا چڑھا ہوا زنگ یکلخت صاف ہو جاتا ہے، وہ جان لیتے ہیں کہ اس لق و دق سمندر میں نہ کوئی بت ہماری فریاد سن سکتا ہے نہ کوئی دوسرا خود ساختہ معبود کام آ سکتا ہے، چنانچہ وہ سب کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پکارتے ہیں اور موت کے منہ میں جانے سے بچ جانے کی صورت میں شکر گزار بندے بننے کے وعدے کرتے ہیں۔

﴿۲۳﴾......اچانک ہوا تھم جاتی ہے، موجیں پرسکون ہوجاتی ہیں، کشتی چلتے چلتے ساحل پر پہنچ جاتی ہے، ساحل پر قدم رکھتے ہی ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے، وہی لوگ جو چیخ چیخ کر اللہ سے دعائیں کررہے تھے اور بقیہ زندگی عبادت واطاعت میں بسر کرنے کے وعدے کررہے تھے وہ اپنے عہدو پیمان بھول کر پچھلی سرمستیوں اور شرارتوں میں مگن ہوجاتے ہیں۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ﴾ یوں تو یہ پرتاثیر منظر سمندر کے چند مسافروں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے مگر چونکہ یہ منظر انسانی معاشرے میں اکثر پیش آتا رہتا ہے اس لیے سارے انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ:

''اے لوگو! سن لو! تمہاری سرکشی اور سرمستی کا وبال تمہارے اوپر ہی پڑے گا۔''

دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، دنیا میں یوں کہ تمہارا ضمیر تمہیں مسلسل ملامت کرتا رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے گناہوں کی سزا تمہیں دنیا ہی میں دے دی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے:

''ظلم اور قطع رحمی سارے گناہوں سے زیادہ اس لائق ہیں کہ ان کے مرتکب کو دنیا میں بھی سزا دی جائے اور آخرت میں بھی۔''{۳۹}

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

''نیک اعمال میں سے سب سے جلدی حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کا ثواب عطا کیا جاتا ہے اور گناہوں میں سے سب سے جلدی ظلم اور قطع رحمی کی سزا دی جاتی ہے۔''{۴۰}

جب اللہ تعالیٰ کے حکموں سے بغاوت عام ہوجائے تو پورا معاشرہ عذاب کی لپیٹ میں آجاتا ہے، یہ ایسی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جو آج کے بے سکون، پریشان حال، بھوکے، ننگے اور قتل وقتال میں مبتلا معاشرے کو ایمانی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

﴿ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ﴾ ''پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے'' اس عبارت میں اخروی سزا کی طرف اشارہ ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......اللہ کی نعمتوں کا انکار اور آیات جھٹلانے والوں کا ہر عمل لکھا جارہا ہے جس کی سزا قیامت کے دن مل کر رہے گی۔(۲۱)

۲......انسان بڑا بھول بھلکڑ ہے، مصیبت کے بعد راحت مل جائے تو شکر گزار بندہ بننے کے بجائے احکامِ الٰہیہ کے خلاف تدبیریں کرنے لگتا ہے۔(۲۱)

{۳۹} (ابوداؤد ۲، کتاب الادب/۳،۲۴)
{۴۰} (ابن ماجہ، کتاب الزھد/ ۳۱۰)

۳......انسان بہت کمزور ہے، وہ دنیا میں قدم قدم پر اللہ کا محتاج ہے، خشکی ہو یا تری، کسی مقام پر بھی وہ اللہ کے فضل سے مستغنی نہیں۔(۲۲)

۴......سمندر کی سرکش لہریں اللہ نے انسان کے لیے مسخر کر دیں، نجانے انسان کب مالکِ حقیقی کا تابع ہوگا؟(۲۲)

۵......سمندری سفر جائز ہے، بلکہ قرآنی آیات کے مطالعہ سے یوں لگتا ہے کہ مسلمانوں کو سمندروں کو مسخر کرنے اور نقل وحمل کے لیے انہیں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔(۲۲) حدیث سے بھی اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، ہمارے آقا علیہ السلام نے اگرچہ خود سمندری سفر نہیں کیا مگر صحابہ نے جہاد کے سلسلہ میں سمندری سفر خوب کیے۔

۶......مصیبت میں بے ساختہ زبان پر ''اللہ'' آجانا مشرکوں کو توحید کی دعوت دیتا ہے۔(۲۲)

۷......توحید انسان کی فطرت میں داخل ہے جبکہ شرک ایک غیر اصلی اور غیر فطری چیز ہے۔(۲۲)

۸......مصیبت اور بیماری میں اللہ سے کیا گیا عہد و پیمان توڑ دینا مشرکین کی عادت ہے۔ مسلمان کا اس بری عادت میں مبتلا ہونا ایسے سے کم نہیں۔(۲۲)

۹......ظلم اور بغاوت کا وبال خود انسان پر ہی پڑتا ہے مگر وہ سمجھتا نہیں۔(۲۳)

نبی کریم علیہ السلام کا فرمان ہے:

﴿ثلاث علی اصحابها رواجع: البغی والمکر والنکث﴾ ''تین چیزوں کا وبال ان کے کرنے والے پر لوٹ کر آتا ہے، ظلم، دھوکہ دہی اور عہد شکنی۔''

۱۰......مشرکینِ مکہ دورِ حاضر کے مشرکوں سے اس اعتبار سے بہتر تھے کہ کم از کم مشکل وقت میں ''اللہ'' کی طرف رجوع کر ہی لیا کرتے تھے، آج جاہلیت کا یہ عالم ہے کہ مصائب بھی معبودِ حقیقی کی طرف رجوع کا سبب نہیں بنتے۔

دنیا کی زندگی کی مثال

﴿۲۴﴾

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا

دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے پھر رلا ملا نکلا اس سے سبزہ زمین کا جو کہ

يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ

کھائیں آدمی اور جانور یہاں تک کہ جب پکڑی زمین نے رونق اور مزین ہوگئی اور خیال کیا زمین والوں نے کہ یہ ہمارے

اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ

ہاتھ لگے گی ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اس کو کاٹ کر ڈھیر گویا کل یہاں نہ تھی آبادی اسی طرح ہم

بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں O

ربط: ماقبل آیات میں انسان کی غفلت، وعدہ فراموشی، بغاوت اور اس کے سبب کا ذکر تھا یعنی عارضی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اس پر از حد فریفتگی، چنانچہ آخر میں تنبیہ کے انداز میں کہا گیا تھا ''چند دن دنیا کی زندگی کے مزے لوٹ لو'' اب آیت ۲۴ میں دنیوی زندگی کی مثال بیان کی جا رہی ہے۔

تسہیل: دنیا کی زندگی جس نے تمہیں غفلت میں ڈال رکھا ہے، اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہم آسمان سے بارش برساتے ہیں، اس سے زمین کی پیداوار خوب گنجان ہو کر نکلتی ہے جسے انسان اور حیوان سب کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین اپنے جوبن پر ہوتی ہے اور دیکھنے میں خوشنما معلوم ہوتی ہے اور اس کے مالک یقین کر لیتے ہیں کہ ہم اس کے کاٹنے اور اس سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہو چکے ہیں تو رات کو یا دن میں یکا یک ہمارے حکم سے کوئی آفت اس پر آ پڑتی ہے جو اس میں ایسی تباہی مچاتی ہے گویا وہاں کل کچھ تھا ہی نہیں، ہم اپنی آیات یونہی کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں O

قرآنی مثالیں:

﴿۲۴﴾.....قرآن اس ذات کا کلام ہے جس کے علم کی کوئی انتہا نہیں، دوسری جانب وہ ذات اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے، اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ اس کے بیان کردہ علمی حقائق اور کائنات کی فطری صداقتیں بندوں کی سمجھ میں آ جائیں چنانچہ اس نے ابدی حقیقتوں اور ایمانی اصولوں کو آسان فہم مثالوں کے ذریعے ذہنوں میں بٹھایا ہے، کیونکہ ضابطے کا سمجھنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا جبکہ مثال ہر عام و خاص کی سمجھ میں آسانی سے آ جاتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ {۴۱} ''اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

{۴۱} (ابراھیم ۲۵/۱۴)

قرآن کے مطالعہ سے ہمارے سامنے منافقین، حق و باطل، خودساختہ معبودوں کی کمزوری، علمائے سوء اور کفار کے اعمال کی مثالیں آتی ہیں، زیرِ نظر آیت میں باری تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی مثال بیان فرمائی ہے، اس مثال میں عبرت کا سامان ہے ان لوگوں کیلئے جو دنیا کی زیب و زینت ۔ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، فانی زندگی کو دائمی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ حالات ہمارے کنٹرول میں ہیں اور ہم جس طرح چاہیں تصرف کر سکتے ہیں، پھر اچانک اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا ہے، زندگی کا چراغ گل ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی رہا ہی نہیں تھا۔ اور بعض اوقات وہ اسباب و وسائل غارت ہو جاتے ہیں جن پر انسان کو گھمنڈ ہوتا ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱......کھیت اور کھلیان کتنے ہی شاداب کیوں نہ ہوں انکا انجام فقط فنا ہے، دنیا کی حقیقت بھی اس زوال پذیر کھیتی سے چنداں مختلف نہیں۔

۲......مقصودِ حقیقی (آخرت) کو پسِ پشت ڈال کر، عارضی ضرورت (دنیاداری) کو مقصدِ حیات بنالینے والے سراسر خسارے میں ہیں۔

۳......گناہ دل کی سختی اور نعمتوں کے سلب کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۴......نظامِ قدرت میں غور و فکر کر کے عبرت حاصل کرنے والے اللہ کے ہاں بڑا مقام رکھتے ہیں۔

اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ

﴿۲۵......۳۰﴾

وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور دکھلاتا ہے جس کو چاہے راستہ سیدھا ○ جنہوں نے کی بھلائی

الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا

ان کے لیے ہے بھلائی اور زیادتی اور نہ چڑھے گی ان کے منہ پر سیاہی اور نہ رسوائی وہ ہیں جنت والے وہ اُسی میں رہا

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ ۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ

کریں گے ○ اور جنہوں نے کمائیں برائیاں بدلہ ملے برائی کا اس کے برابر اور ڈھانک لے گی ان کو رسوائی کوئی نہیں ان کو اللہ سے

مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

بچانے والا گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے وہ ہیں دوزخ والے وہ اُسی میں

فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ

رہا کریں گے ○ اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے شرک کرنے والوں کو کھڑے ہو کر اپنی اپنی جگہ تم اور تمہارے

وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ

شریک پھر تڑوا دیں گے ہم آپس میں ان کو اور کہیں گے ان کے شریک تم ہماری تو بندگی نہ کرتے تھے ○ سو اللہ کافی ہے

شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ

شاہد ہمارے اور تمہارے بیچ میں ہم کو تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی ○ وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور رجوع

اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٣٠﴾ ع

کریں گے اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے ان کا اور جاتا رہے گا ان کے پاس سے جو جھوٹ باندھا کرتے تھے ○

ربط: دارِ فانی کی مثال بیان کرنے کے بعد آخرت کے دائمی گھر کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

تسہیل: اور اللہ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے ○ جو لوگ دنیا میں نیک عمل کرتے ہیں انہیں آخرت میں اچھا ٹھکانہ ملے گا اور اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی! ان کے چہرے نہ تو غم سے سیاہ ہوں گے اور نہ ہی انہیں ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ جنت کے حقدار ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ اور جو لوگ برے کام کرتے رہے انہیں برائی کی سزا اس کے برابر ملے گی اور ان پر ذلت چھائی ہوگی، ان کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا، ان کے چہرے ایسے سیاہ ہوں گے گویا ان پر اندھیری رات کی تہیں چڑھا دی گئی ہیں، انہیں دوزخ میں رہنا ہوگا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ○ وہ دن بھی قابلِ ذکر ہے جس دن ہم سارے انسانوں کو محشر میں جمع کریں گے پھر ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر ہم ان کے درمیان عابد و معبود کا جو رشتہ تھا اسے ختم کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے ○ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہ بننے کے لیے اللہ کافی ہے، ہم تمہاری عبادت سے قطعاً بے خبر تھے ○ دنیا کی زندگی میں جس شخص نے جو کچھ کیا ہوگا وہ قیامت کے دن اس کے سامنے آ جائے گا اور سب کو ان کے مالکِ حقیقی کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور جتنے بھی معبود انہوں نے تراش رکھے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے ○

تفسیر

﴿۲۵﴾ ...... دنیا مصائب و آلام کی جگہ ہے، یہاں کی کوئی چیز عیب اور فنا سے محفوظ نہیں، اس دار الفناء کے مقابلے میں

اللہ تعالیٰ بندوں کو دارالسلام کی دعوت دیتا ہے، وہاں سلامتی ہی سلامتی ہوگی، ہر مصیبت، بیماری، نقص، عداوت اور فنا سے سلامتی، {۴۲} اہلِ جنت آپس میں بھی ایک دوسرے کو سلام کہیں گے، فرشتے بھی ان کے لیے سلامتی کی دعا کریں گے اور رب العلمین بھی فرمائیں گے "سلام علیکم" {۴۳} (تم پر سلامتی ہو)۔

﴿وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ "دارالسلام" کی دعوت تو سارے انسانوں کے لیے عام ہے مگر "دارالسلام" تک پہنچانے والے اعمال کی توفیق اللہ کے مخصوص بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔

﴿۲۶﴾...... اللہ تعالیٰ ایمان اور اسلام کی دعوت اس لیے دیتے ہیں تاکہ لوگ نیک عمل کریں، وہ اپنے عقائد بھی درست رکھیں اور اعمال بھی، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جنت میں ہوگا۔

﴿وَزِيَادَةٌ﴾ انہیں صرف جنت ہی نہیں ملے گی بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ملے گا، اس کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ حسن اور احسان کے ساتھ زندگی گزارنے والوں کو برابر سرابر بدلہ نہیں دیا جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے انہیں ان اعمال سے کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے اس لیے کہ اللہ کا وعدہ ہے "جو کوئی نیک عمل کرے گا اسے دس گنا اجر دیا جائے گا۔"

دوسرا یہ کہ "زِيَادَةٌ" سے مراد باری تعالیٰ کی زیارت ہے، یہ معنی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں وارد ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے یہ آیتِ کریمہ پڑھنے کے بعد فرمایا کہ:

"جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہوجائیں گے تو ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا اے جنت والو! اللہ نے تمہیں ایک نعمت عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا اب اس کے ایفاء کا وقت آپہنچا ہے، جنتی سوال کریں گے وہ کون سی نعمت ہے جواب تک انہیں عطا نہیں کی گئی؟ کیا ہمارے نامۂ اعمال کو وزنی نہیں کردیا گیا؟ کیا ہمارے چہرے روشن نہیں کردیے گئے؟ کیا ہمیں دوزخ سے بچا کر جنت میں جگہ عطا نہیں کی گئی؟ جب جنتی یہ سب کہہ چکیں گے تو درمیان سے پردہ اٹھادیا جائے گا چنانچہ وہ بلا حجاب باری تعالیٰ کی زیارت کرسکیں گے، اللہ کی قسم! جنتی محسوس کریں گے کہ اب تک انہیں جتنی نعمتیں عطا کی گئی تھیں یہ نعمت ان سب سے بڑھ کر دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک

{۴۲} سمّیت الجنّة دارالسّلام لأنّ من دخلها سلم من الآفات (قرطبی ۲۹۶/۸) و قیل السلام السلامة، لانّ اهلها سالمون من کل مکروه (کشاف ۳۲۵/۲)

{۴۳} سمیت الجنة بدار السلام لانّه تعالیٰ یسلّم علی اهلها ...... والملئکة یسلّمون علیهم ایضا ...... وهم ایضًا یحیی بعضهم بعضا بالسلام (کبیر ۲۳۸/۱۷،۲)

عطا کرنے والی ہے۔'' {۴۴}

﴿وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ﴾ ان کے چہرے نہ غم سے سیاہ ہوں گے اور نہ ان پر ذلّت کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ ہوگی، اس کے بجائے وہ مسرت وکامرانی کے احساس سے چمک رہے ہوں گے، سورۂ عبس میں ہے:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝﴾ {۴۵} ''اس دن کچھ چہرے چمکتے ہنستے اور خوش خوش ہوں گے۔''

﴿۲۷﴾...... ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ زندگی گزارنے والوں کے بعد ان کا ذکر ہے جنہوں نے زندگی کے سرمائے سے نیکیاں کمانے کے بجائے گناہ کمائے، ان کی سرکشی اور نافرمانی کے باوجود ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی بلکہ عادلانہ برتاؤ کیا جائے گا، انہیں اتنی ہی سزا دی جائے گی جتنے انہوں نے گناہ کیے ہوں گے۔

﴿كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ﴾ خوف، احساسِ ذلّت اور غم کی وجہ سے ان کے چہرے اس قدر سیاہ ہوں گے کہ گویا اندھیری رات کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ان کے چہروں پر لیپ دیئے گئے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ {۴۶} ''جس دن بعض چہرے روشن اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے، جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا، کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے؟ تو اب کفر کی سزا کا مزہ چکھو۔''

﴿۲۸-۲۹﴾...... قیامت کے دن وہ منظر بھی بڑا عجیب ہوگا جب سارے جنوں اور انسانوں، نیکوں اور بدوں کو جمع کر لیا جائے گا، پھر اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں کو حکم دیا جائے گا کہ ''تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ ٹھہرے رہو'' ظاہر ہے ان کے پاس تعمیلِ حکم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا، اس کے بعد ان کے درمیان عابد اور معبود کا جو رشتہ تھا وہ ختم ہو جائے گا، مشرکین کو اپنے خود ساختہ معبودوں سے جو امیدیں تھیں وہ خاک میں مل جائیں گی، ان کے معبود اعلان کر دیں گے کہ ہمیں نہ تو تمہاری عبادت کا علم ہے نہ ہم نے تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا، حقیقت میں تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ ہمارے ناموں کی آڑ میں اپنی خواہشات اور شیاطین کی عبادت کرتے تھے اور اللہ اس بات پر گواہ ہے کہ اس جرم میں ہم تمہارے ساتھ کسی طور پر بھی شریک نہیں تھے۔

{۴۴} (ابن ماجہ، مقدمہ/ ۱۳)
{۴۵} (عبس ۸۰/۳۸-۳۹)
{۴۶} (آلِ عمران ۳/۱۰۶)

﴿۳۰﴾......حقیقت سے قریب تر قیامت کا یہ منظر کس متاثر کن پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا کہ:
کفار و مشرکین جن جھوٹے دیوی، دیوتاؤں کی شفاعت کے سہارے جیتے رہے، قیامت میں وہ سب رفو چکر ہو جائیں گے، کوئی خیر مقدمی کلمات کہنے والا نہیں ہو گا بلکہ ہر ایک کو اپنے اعمال سے سابقہ پڑے گا اور خرافات و توہمات کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی {۴۷}......مجرّد بیانیہ انداز سے ہٹ کر انسانی شعور میں راسخ ہو جانے والا یہ منفرد انداز آج بھی قرآنی صداقت کا گواہ ہے۔

حکمت و ہدایت:

ا......ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے انسان کو دارالسلام اور جنت کی نعمتوں کی دعوت دینا، اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی دلیل ہے۔ (۲۵) اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ دنیا جمع کرنے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ وہ تو عبادت و اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔

۲......"یَدْعُوْٓا" میں عموم لا کر اللہ نے بندے پر حجت تام کر دی، اب کسی کے پاس سوائے ایمان کے کوئی چارہ نہیں۔ (۲۵)

۳......ایمان کی دعوت تو عام ہے مگر ہدایت انہی کو ملتی ہے جنہیں توفیق دی جاتی ہے۔

۴......دنیا میں اچھے اعمال کرنے والوں کو آخرت کی لازوال نعمتوں کی صورت میں اچھا بدلہ ملے گا۔ (۲۶)

۵......ایمان والوں کو قیامت کے دن اللہ کے دیدار کا شرف حاصل ہو گا۔ (۲۶) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں "زیادۃ" کے لفظ سے مراد ہے "النظر الیٰ وجہ اللہ الکریم" {۴۸} (اللہ کریم کے چہرے کو دیکھنا)

۶......حسرت اور ندامت قیامت کے دن گناہوں سے باز نہ آنے والوں کا مقدر ہو گی۔ (۲۷)

۷......قیامت کے دن سارے انسانوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا، یہ ایک قطعی اور یقینی بات ہے جس کی گواہی قرآن نے دی ہے۔ (۲۸)

۸......قیامت کے دن معبودانِ باطلہ اپنے پیروکاروں اور پجاریوں سے برأت کا اظہار کریں گے، یہ منظر اہلِ شرک کے لیے سب تکلیفوں اور عذابوں سے بڑھ کر ہو گا۔ (۲۸)

۹......غیر اللہ کے سامنے جبینِ نیاز جھکانے والے قیامت کے دن محرومی و ذلت سے دوچار ہوں گے، کاش! ان ناواقفوں کو دنیا میں ہی حقیقت کا عرفان نصیب ہو جائے۔ (۲۸)

{۴۷} "ما کانوا یفترون" من ان الھتھم تشفع لھم (ابی السعود ۳/۲۳۵)
{۴۸} (ذکرہ السیوطی فی الدر ۳/۵۴۷...... بحوالہ قرطبی ۱۰/۲۹۷)

۱۰......مشرکین قیامت کے دن اپنے معبودانِ باطلہ کا عجز اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔(۲۸)

۱۱......قیامت کا دن، اعمال کی جزا کا دن ہے، وہاں شدید خواہش کے باوجود بھی انسان کوئی عمل نہیں کر سکے گا اس لیے دنیا کی زندگی کو غنیمت سمجھتے ہوئے اچھے اعمال میں صرف کرنا چاہیے۔(۳۰)

۱۲......"مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ"......اللہ کا کفار کے لیے "مولٰی" ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ ان کا رازق اور انہیں دنیوی نعمتیں دینے والا ہے، نہ یہ کہ وہ کافروں کی نصرت اور مدد کرنے والا ہے۔(۳۰)

اثباتِ توحید

﴿۳۱......۳۶﴾

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ

تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ

مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی سو بول اٹھیں گے کہ اللہ تو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو O

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ

سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے مگر بھٹکنا سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو O اسی طرح

حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ

ٹھیک آئی بات تیرے رب کی ان نافرمانوں پر کہ یہ ایمان نہ لائیں گے O پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں

يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ

جو پیدا کرے خلق کو پھر دوبارہ زندہ کرے تو کہہ اللہ پہلے پیدا کرتا ہے پھر اس کو دہرائے گا سو کہاں سے پلٹے جاتے ہو O پوچھ کوئی ہے

مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۚ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ

تمہارے شریکوں میں جو راہ بتلائے صحیح تو کہہ اللہ راہ بتلاتا ہے صحیح تو اب جو کوئی راہ بتائے صحیح اس کی بات ماننی چاہیے یا اس

اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۗ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ

کی جو آپ نہ پائے راہ مگر جب کوئی اور اس کو راہ بتلائے سو کیا ہو گیا تم کو کیسا انصاف کرتے ہو O اور وہ

اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۚ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر سو اٹکل کام نہیں دیتی حق بات میں کچھ بھی اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں O

ربط: اثباتِ توحید اور نفیِ شرک کا مضمون مسلسل چل رہا ہے۔

تسہیل: اے میرے حبیب! آپ ان مشرکوں سے سوال کیجئے کہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے؟ یا بھلا کون ہے جو سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کا مالک ہے؟ اور وہ کون ہے جو جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے پیدا کرتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو ہر کام کی تدبیر کرتا ہے؟ یہ جواب میں ضرور کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے، تو آپ ان سے کہیں کہ یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ ○ اے لوگو! یہی اللہ ہے جو تمہارا حقیقی رب ہے، حق کے سوا جو کچھ ہے وہ گمراہی ہے، پھر حق کو چھوڑ کر تم باطل کی طرف کہاں الٹے چلے جا رہے ہو؟ ○ یونہی نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کے بارے میں آپ کے رب کی یہ بات سچی ہوگئی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ○ آپ ان سے سوال کیجئے کہ تمہارے خود ساختہ شریکوں میں کوئی ایک بھی ایسا ہے جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرے، پھر حشر کے دن انہیں دوبارہ پیدا کر دے؟ آپ فرما دیجئے کہ پہلی بار بھی اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور موت کے بعد دوبارہ بھی اللہ ہی پیدا فرمائے گا۔ حق واضح ہو جانے کے بعد تم اوندھے منہ کہاں جا رہے ہو؟ ○ آپ ان سے سوال کیجئے کہ جنہیں تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو ان میں کوئی ایسا ہے، جو حق کا راستہ دکھاتا ہو؟ آپ فرما دیجئے کہ صرف اللہ ہی حق کا راستہ دکھاتا ہے، تو پھر یہ بتاؤ کہ جو شخص حق کا راستہ دکھاتا ہو وہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ زیادہ حقدار ہے جو خود قدم قدم پر رہنمائی کا محتاج ہو، ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم انصاف کی بات کیوں نہیں کرتے؟ ○ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر صرف وہم و گمان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ یقینی بات ہے کہ حق کے معاملے میں گمان کچھ بھی کام نہیں دے سکتا، جو کچھ یہ کرتے ہیں یقیناً اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہے ○

﴿تفسیر﴾

اسلوبِ یقین:

﴿۳۱﴾......اس آیت میں مشرکین پر جرح کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے اسے اصطلاح میں ''اسلوبِ یقین'' کہتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ امّی کو ایسے دلائل سکھاتا ہے جن کا منکرین کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا اور وہ شرمندگی اور سرآفندگی پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ اسلوب عام طور پر سوال جواب کی شکل میں ہوتا ہے جیسا کہ زیرِ نظر آیت میں مشرکین سے چند سوالات کیے گئے، ان سوالات میں ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے، پہلا سوال رزق سے متعلق ہے جو سلسلۂ ربوبیت میں پہلے نمبر پر ہے، دوسرا سوال ظاہری حواس سے متعلق ہے جن کے بغیر انسان اور

جمادات برابر ہیں، تیسرا سوال موت وحیات اور چوتھا سوال کائنات کے نظام اور تمام معاملات کی تدبیر کے بارے میں ہے، آیئے ان میں سے ہر ایک پر قدرے تفصیلی نظر ڈالیں۔

﴿مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی کون ہوائیں چلاتا ہے؟ کون سورج کی روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے؟ کون بارش کے وقت کا، مناسب فصل اور مناسب مقدار کا فیصلہ کرتا ہے؟ اور پھر کون زمین کو گرماتا اور زرخیز بناتا ہے؟ اس سے نباتات اگاتا ہے، غرض زمین و آسمان دونوں جگہ اس کی قدرت و حکمت کی مستقل کارفرمائیاں ہیں، اور "السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" دونوں ناموں میں سے کوئی نام بیکار نہیں لایا گیا۔{۴۹}

﴿اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾ کون ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی صلاحیت عطا کی ہے؟ اور وہ اگر چاہے تو تمہیں اس سے محروم بھی کرسکتا ہے، سورۂ ملک میں ہے:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾{۵۰} "فرما دیجئے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہیں کان، آنکھیں اور دل دیئے۔"

سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کیونکہ انسان کے ظاہری حواس میں سے سب سے اعلیٰ "سمع و بصر" ہی ہیں، بالخصوص حصولِ علم میں ان کا کردار سب سے اہم ہے، یہ سمع و بصر ہی ہیں جو اپنی سنی اور دیکھی خبریں اور معلومات دماغ تک پہنچاتے ہیں اور دماغ ان میں چھان پھٹک کے بعد معنی اور مدلول تک پہنچتا ہے، اگر انسان سمع و بصر سے محروم ہو جائے تو اس کا دائرۂ علم چھونے، سونگھنے اور چکھنے تک محدود ہو کر رہ جائے۔

زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ:

﴿وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ زندہ کو مردہ سے اور مردہ سے زندہ نکالنے کو کسی نے حقیقی معنی میں لیا اور کسی نے مجازی معنی میں، کسی نے اس آیت کے ذیل میں سائنسی اور حیاتیاتی عجائب بیان کیے اور کسی نے روزمرہ کی زندگی سے اس کی مثالیں ذکر کیں، اللہ کی قدرت پر ایمان رکھنے والا انسان جب ان عجائب اور مثالوں میں غور و فکر کرتا ہے تو اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

☆......کافر سے مومن اور مومن کی نسل سے کافر، جاہل سے مومن اور مومن سے جاہل پیدا ہوتا ہے۔

☆......مرغی سے انڈا، انڈے سے مرغی، انسان سے نطفہ اور نطفہ سے انسان، خشک اور مردہ بیج سے لہلہاتی کھیتی اور سرسبز

{۴۹} (تفسیر ماجدی ۲/۴۵۴)

{۵۰} (الملک ۶۷/۲۳)

درخت سے مردہ بیج، وہ غذا جسے آگ پر پکا کر مار دیا جاتا ہے اس سے خون اور خون سے منی پیدا ہوتی ہے۔

☆......سانپ نما بام مچھلی دریاؤں کے ڈیلٹا میں پائی جاتی ہے، یعنی ان علاقوں میں جہاں دریا سمندر میں گرتے ہیں، ایک قسم کی بام مچھلی خلیج میکسیکو میں طویل سفر کر کے انڈے دینے کی جگہ پہنچتی ہے اور بچوں کی پیدائش سے پہلے ہی مر جاتی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ بچے مردہ سے نکلتے ہیں، ذہن کو چکرا دینے والی بات ہے کہ یہی بچے بحر اوقیانوس میں اس ڈیلٹا تک پہنچتے ہیں جہاں سے ان کی ماں آئی تھی، یہ اسی جگہ رہنا شروع کر دیتے ہیں اس میں دس ہزار کلومیٹر کا فاصلہ پڑتا ہے، قدرت کے اس عظیم راز کی کہانی ابھی حال ہی میں دریافت ہوئی ہے جو کھلے ذہن کے ماہرینِ حیاتیات کو ایمان لانے پر مجبور کرتی ہے۔

☆......کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بچہ اپنی ماں کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد پیدا ہوا اور ماں کی موت کے چند گھنٹوں بعد بچوں کی پیدائش کے واقعات تو خاصی بڑی تعداد میں ہیں۔

☆......کچرے کے ڈھیر سے کیڑے یا تتلی کا پیدا ہو جانا بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔

☆......جہاں تک زندہ سے مردہ کو نکالنے کے راز کا تعلق ہے تو سب سے پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے زندہ چیزوں کے فنا یا مرنے کا تصور، ہمیں علمِ حیاتیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ (DNA) کے ذرے (مالیکیولز) جو بہت ہی چھوٹی اکائیاں ہوتی ہیں، توانائی کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنی ہی قسم کی نقل تیار کرتے ہوئے ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتے ہیں، ان کا موت سے ہمکنار ہونا یعنی ان کے وجود کی ہمیشگی کا ختم ہو جانا صرف اللہ ہی کے حکم سے واقع ہوتا ہے۔{۵۱}

﴿وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ کون ہے جو ہر کام کی تدبیر کرتا ہے؟{۵۲} وہ صرف خالق اور رازق ہی نہیں حاکم اور مدبّر بھی ہے، کائنات کی تخلیق کے بعد وہ معطل ہو کر بیٹھ نہیں گیا بلکہ چھوٹے بڑے ہر کام کی تدبیر اور انتظام بھی وہی کرتا ہے۔

﴿فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ﴾ یہ پانچوں سوالات اتنے واضح ہیں کہ اللہ کے وجود کا اقرار کرنے والا کوئی بھی انسان خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہو، جواب میں کہے گا "اللہ" اس لیے کہ ان سوالات کا کوئی دوسرا جواب ہے ہی نہیں۔

﴿۳۲﴾......وہ ذات جو تمہیں رزق دیتی ہے، جو سننے اور دیکھنے کی قوتوں کی مالک ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں

{۵۱} (قرآنی آیات اور سائنسی حقائق/۲۰۶......از ڈاکٹر ہلوک نور باقی، ترکی......انڈس پبلشنگ، کراچی)
{۵۲} ای و من یلی تدبیر امر العالم کلہ (تفسیر قاسمی ۹/۲۹)

موت وحیات کا نظام ہے اور جو ہر ہر کام کی تدبیر کرتی ہے، وہی اللہ ہے اور وہی تمہارا رب ہے۔

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ﴾ جب توحید کا حق ہونا ثابت ہو گیا تو شرک یقیناً گمراہی ہوا، اس لیے کہ توحید و شرک جیسی دو متضاد چیزوں کے درمیان کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی جو نہ تو حق ہو اور نہ ہی باطل!

﴿فَأَنَّى تُصْرَفُونَ﴾ یہ مجہول کا صیغہ ہے جس کا اصل معنی یہ ہے کہ تمہیں باطل کی طرف کہاں الٹا چلایا جا رہا ہے، جبکہ معلوم کی صورت میں معنی یہ ہوتا کہ تم کہاں الٹے چلے جا رہے ہو۔

اہلِ علم کہتے ہیں کہ معلوم کے بجائے صیغۂ مجہول اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ کسی عقلمند انسان کا راہِ حق کو چھوڑ کر اپنے ارادے سے گمراہی کی طرف جانا محالات میں سے ہے، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اسے کوئی خارجی قوت مجبور کرے۔{۵۳}

﴿۳۳﴾...... جس طرح اللہ کی وحدت و ربوبیت حق ہے اسی طرح رب کا کلمہ یعنی اس کی سنت بھی ان لوگوں کے بارے میں حق ہے جو کفر و فسق پر اصرار کی وجہ سے اپنی فطری صلاحیت ختم کر لیتے ہیں، ایسے بدنصیبوں کو قبولِ ایمان کی توفیق نہیں ملتی، اسی سورت میں آگے آ رہا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝﴾{۵۴}

"بیشک جن لوگوں کے لیے تیرے رب کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آ جائیں، جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔"

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ رب کے کلمہ سے مراد آخرت کا عذاب ہے، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ کفر پر جمے رہنے والوں کے لیے ایمان قبول نہ کرنے کی وجہ سے آخرت کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔{۵۵}

﴿۳۴﴾...... اس آیتِ کریمہ میں بھی اسلوبِ تلقین اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ ان تمام مشرکین سے سوال کیجیے جو بتوں، فرشتوں، جنوں یا انسانوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں کہ تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے جس نے پہلی بار بھی مخلوق کو پیدا کیا ہو اور موت کے بعد اسے دوبارہ بھی پیدا کر سکے؟

{۵۳} و فی ایثار صیغة المبنی للمفعول ایذان بان الانصراف من الحق الی الضلال مما لا یصدر عن العاقل بارادته (ابوسعود ۳/۲۳۷)

{۵۴} (یونس ۱۰/۹۶-۹۷)

{۵۵} اراد بالکلمة: العدة بالعذاب "وأنهم لا يؤمنون" تعليل بمعنى "لانهم لا يؤمنون" (كشاف ۲/۳۲۹)

ایسے لوگوں کی طرف سے اس سوال کے جواب کی کوئی امید نہ تھی جو دوسری زندگی کو مانتے ہی نہیں، اس لیے اللہ نے فرمایا کہ آپ خود ہی جواب دے دیجئے کہ یہ کام صرف اللہ ہی کر سکتا ہے۔

﴿۳۵﴾......اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے خود ساختہ شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو حق کی طرف ہدایت کر سکے؟

ہدایت کی مختلف قسمیں ہیں، جبلّی، فطری، وجدانی، عقلی اور دینی ہدایت، اللہ کے سوا کوئی نہیں جو کسی بھی قسم کی ہدایت کر سکے، ساری مخلوق کو اس نے پیدا کیا ہے اور وہی ہدایت دیتا ہے، سورۂ طٰہٰ میں ہے:

﴿رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾{۵۶} ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر اسے ہدایت دی۔''

کیڑوں مکوڑوں اور چرند پرند کو کھانے پینے، چلنے پھرنے اور توالد وتناسل کی وہی ہدایت دیتا ہے اور انسان کو دنیا میں رہن سہن، اخلاقی معاملات اور دنیوی واخروی فلاح کی بھی وہی ہدایت دیتا ہے۔ قرآن سمیت اس نے جتنی بھی کتابیں نازل فرمائیں ان سب کا مقصد حق کی ہدایت تھا۔

﴿قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ﴾ مشرکین کے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن نہ تھا کہ ہمارے شریک حق کی ہدایت دیتے ہیں، اس لیے اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ آپ فرما دیجئے کہ اللہ ہی ہے جو ہدایت دیتا ہے لہٰذا ہم اتباع بھی اسی کی کریں گے۔

﴿۳۶﴾......توحید، نبوت، اور آخرت کے جتنے بھی منکر ہیں ان کے پاس کوئی بھی مضبوط عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے، یہ لوگ مفروضوں، تخیلات اور وہم وگمان کی پیروی کرتے ہیں اور کمال یہ کہ دلیل کا مطالبہ ان سے کرتے ہیں جو ظن اور وہم کی بجائے وحی آسمانی کی اتباع کرتے ہیں، اپنے وقت کے عظیم فاضل مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ اثباتِ توحید کے دلائل قائم کرنے کی بجائے ہم کو تو مطالبہ اہلِ شرک سے کرنا چاہئے کہ وہ کوئی الٹی سیدھی دلیل تو تعددِ الٰہ کے ثبوت میں لائیں۔

﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ﴾ یہاں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ انسانی ظن وتخمین، وہم وخیال جن کا شاندار مرعوب کن نام ''حکمت وفلسفہ'' یا ''علومِ عقلیہ'' رکھا گیا ہے قرآن اور شریعت اسلامی میں مطلق ان کا کوئی درجہ نہیں، قرآن صرف حقائق کا قائل ہے جو روز بدلتے نہیں رہتے ''علومِ نظری'' ''اصولِ موضوعہ'' اور ''نظریات'' انہیں کو مبارک رہیں جن کی تحقیقات ہر صبح وشام بدلتی رہتی ہیں۔{۵۷}

قرآن نے بلا استثناء سارے مشرکین کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ گمان کی اتباع کرتے ہیں بلکہ ان میں سے

{۵۶} (طٰہٰ ۲۰/۵۰)

{۵۷} (تفسیر ماجدی ۲/۴۵۷)

اکثر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو جانتے تھے کہ اللہ کے رسول حق پر ہیں۔

حکمت و ہدایت:

۱......متصرف اور مختارِ کل اس کائنات میں صرف اللہ ہے، رزق دینا، پیدا کرنا، مارنا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔(۳۱)

۲......جب پوری کائنات کا نظام اللہ کے دستِ قدرت میں ہے تو اس کی ربوبیت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں اور معبودانِ باطلہ کو ذرہ برابر بھی اختیار نہیں تو ان کے الٰہ ہونے کا انکار کرنا بھی واجب ہے۔(۳۱)

۳......مشرکینِ مکہ شرک فی الربوبیۃ نہیں کرتے تھے البتہ شرک فی الالوھیۃ میں مبتلا تھے۔(رب تو صرف اللہ کو مانتے تھے مگر عبادت میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔)

۴......شرک فی الالوھیۃ میں مبتلا شخص اگر شرک فی الربوبیۃ سے بچ بھی جائے تو یہ بچنا اس کے لیے سودمند ثابت نہیں ہوگا۔(۳۱)

۵......اللہ کی ربوبیت کا اقرار اپنی زبان سے کرنے کے باوجود مشرکین کا شرک کرنا کھلی ضلالت ہے۔

۶......مسئلہ توحید میں ہدایت وضلالت کے درمیان تیسرا کوئی مرتبہ نہیں، جو ہدایت پر نہیں وہ یقیناً گمراہی میں ہے۔(۳۲)
جتنے بھی بنیادی مسائل ہیں ان میں یہی اصول ہے کہ حق ایک ہے متعدد نہیں، البتہ فروعی مسائل کے لیے یہ اصول نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾{۵۸} ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔“

حدیثِ نبوی ہے:

﴿الحلال بيّن والحرام بيّن وبينهما مشتبهات﴾{۵۹} ”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں۔“

ائمہ کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں ان میں بھی یہ سوچ صحیح نہیں کہ ایک امام کا قول حق اور باقی کے اقوال باطل ہیں۔

۷......طبیعتوں میں فساد اور شر کا عنصر غالب آ جائے تو نتیجہ فقط ہلاکت اور ضلالت ہے۔(۳۳)

{۵۸} (المائدۃ ۵/۴۸)
{۵۹} (بخاری ۱، کتاب الایمان/۱۳ ...... وأیضًا المجلد الاوّل، کتاب البیوع/۲۷۵)

۸......حیرت ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اسے اللہ نے عقل عطا فرمائی ہے، لیکن یہ توحید کے عقلی دلائل بھی تسلیم نہیں کرتا۔

۹......مشرکین اپنے معبودانِ باطلہ کے سامنے جھکنے اور عبادت کرنے سے پہلے اتنا سوچ لیں کہ:

ایک طرف ان کے معبودانِ باطلہ ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بھی عطا نہیں کر سکتے، دوسری طرف اللہ نے آسمان وزمین اور اس کے درمیان جتنی مخلوقات ہیں ان کو پیدا کیا، خود انسان کو مٹی سے، پھر نطفے اور پھر خون کے ایک لوتھڑے سے وجود میں لایا اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے ......عبادت کا مستحق کون ہونا چاہیے؟ وہ جو یہ سب کچھ کرتا ہے یا وہ جو ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے۔(۳۴)

۱۰......معبودانِ باطلہ دوسروں کو تو کیا ہدایت دیں گے وہ تو اپنی ہدایت کے لیے بھی اللہ کے محتاج ہیں جبکہ اللہ، قرآن و اسلام کے ذریعے ساری انسانیت کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے لہٰذا عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔(۳۵)

۱۱......کفر وتکذیب میں مبتلا انسان کو اپنے کیے کا بدلہ ضرور ملے گا۔(۳۶)

۱۲......عقائد دلیلِ قطعی سے ثابت ہوتے ہیں، دلیلِ ظنّی سے نہیں۔(۳۶)

۱۳......مشرکین ومنکرین کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ کوئی نقلی دلیل، بلکہ وہ اندھیرے میں پڑے محض اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔(۳۶)

۱۴......یقین، شک سے زائل نہیں ہو سکتا اور قیاس، نص کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔(۳۶)

۱۵......قرآن کے عموم واطلاق کو خبرِ واحد سے خاص اور مقید نہیں کیا جا سکتا۔(۳۶)

۱۶......ایمانیات واعتقادات میں تو اجتہاد مردود ہے لیکن فقہی مسائل میں اس کی گنجائش ہے۔(۳۶)

۱۷......اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیوں سے بچ کر سلف صالحین کی اتباع کرنا چاہیے۔{۲۰}(۳۶)

منکرین کو چیلنج

﴿۳۷......۴۰﴾

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ

اور وہ نہیں یہ قرآن کہ کوئی بنا لے اللہ کے سوا اور لیکن تصدیق کرتا ہے اگلے کلام کی اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو

{۲۰}(بیان القرآن ۱۲/۵۰۱)

وَتَفْصِيلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿٣٧﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرٰىهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا

جوتم پر لکھی گئیں جس میں کوئی شبہ نہیں پروردگار عالم کی طرف سے O کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بنالایا ہے تو کہہ دے تم لے آؤ

بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ﴿٣٨﴾ بَلْ

ایک ہی سورت ایسی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو O بات یہ ہے کہ

كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن

جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت اسی طرح جھٹلاتے رہے

قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الظّٰلِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم مَّن

اُن سے اگلے سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا O اور بعضے ان میں یقین کریں گے قرآن کا اور بعضے

لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾

یقین نہ کریں گے اور تیرا رب خوب جانتا ہے شرارت والوں کو O

ربط: وحی کے منکرین ظن کی اتباع کرتے تھے جبکہ قرآن قطعی اور یقینی علوم پر مشتمل ہے، اسلام کے دشمن قرآن کو مشکوک ثابت کرنے کے لیے اسے انسانی کاوش قرار دیتے تھے، یہاں ان کے دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے انہیں چیلنج دیا جارہا ہے۔

تسہیل: یہ قرآن ایسا ہے ہی نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اسے اپنی طرف سے بنا سکے بلکہ یہ ان آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور ان باتوں کی تفصیل بیان کرتا ہے جو اللہ نے لوحِ محفوظ میں لکھ رکھی ہیں، اس میں شک وشبہ والی کوئی بات نہیں، یہ اس ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے O کیا اس کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ پھر تو تم بھی اس جیسی کوئی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلالو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو O اصل بات یہ ہے کہ اس چیز کو یہ جھوٹا قرار دیتے ہیں جس کا احاطہ ان کا علم نہیں کرسکتا اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں آیا، یونہی ان لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے، پھر دیکھ لو کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا؟ O ان میں سے بعض ایسے ہیں جو قرآن پر ایمان لے آئیں گے اور بعض ایسے ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور آپ کا رب فساد پھیلانے والوں کو خوب جانتا ہے O

تفسیر

﴿۳۷﴾......قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت، حلاوت و جامعیت، تاثیر و جاذبیت، حکمت و موعظت اور اس کے

علوم ومعارف، حقائق ودقائق، اخبار وقصص خود گواہی دیتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں، جس عظیم انسان نے اہلِ عرب کے سامنے یہ کلام پیش کیا اس کے بارے میں خود اس کے دشمن یہ گواہی دیتے تھے کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ جو شخص انسانوں پر جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ کے بارے میں جھوٹ بول دے، ابوجہل جو مخالفت اور عداوت کی آخری انتہا پر تھا اس نے کہا تھا:

﴿ان محمدالم یکذب علی بشر قط أفیکذب علی اللہ؟﴾ {۲۱} ’’محمد نے کبھی انسانوں پر جھوٹ نہیں بولا، وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہے؟‘‘

﴿وَلٰكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِيۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ﴾ یہ قرآن معاذ اللہ! افتراء اور جھوٹ نہیں ہے بلکہ ان انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے آچکیں، اس لیے کہ قرآن بھی انہی اصولوں کی دعوت دیتا ہے جن کی دعوت تمام انبیاء دیتے رہے ہیں۔

﴿وَتَفۡصِيۡلَ الۡكِتٰبِ﴾ قرآن ان باتوں کی تفصیل بیان کرتا ہے جو اللہ نے لوحِ محفوظ میں لکھ رکھی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن سمیت دوسری آسمانی کتابوں میں عقائد وعبادات اور اخلاق ومعاملات کے بارے میں جو ہدایات آئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کی تخلیق سے پہلے لوحِ محفوظ میں درج کردی تھیں۔

﴿۳۸﴾......قرآنِ کریم کو انسانی کاوش، افتراء اور جھوٹ کہنے والوں کو چیلنج دیا جارہا ہے اور یہ چیلنج کئی مقامات پر دیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو زیادہ نہیں کوئی ایک ایسی سورت بنا کر لے آؤ جو حسنِ اسلوب، قوتِ تاثیر، وسعتِ علم، فصاحتِ بیان اور گہرائی وگیرائی میں قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے ہم پلہ ہو۔ سورۂ بنی اسرائیل میں پورا قرآن، سورۂ ہود میں دس سورتیں اور یہاں صرف ایک سورت بنا لانے کا چیلنج دیا گیا ہے مگر منکرین اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔

﴿وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ﴾ یہ چیلنج کسی ایک فرد کو نہیں بلکہ سارے انسانوں اور جنوں کو تھا کہ سارے مل کر قرآن جیسی ایک سورت بنا لاؤ، اس سے اندازہ ہوتا ہے اس یقین کا جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی صداقت پر تھا۔

﴿۳۹﴾......چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اس بے مثال کلام کی خصوصیات پر غور کرتے اور اس کے بارے میں اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے سو بار سوچتے، اس کے بجائے انہوں نے یہ کلام سنتے ہی اسے جھٹلا دیا، ان کا ناقص اور محدود علم جن ایمانی حقائق کا احاطہ نہ کرسکا ان کا انکار کردیا۔

{۲۱} (تفسیر منیر ۱۱/۱۷۶)

﴿وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ﴾ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ انکار کرنے والوں کے ذہن ابھی تک قرآنِ کریم کے معانی اور حقائق تک نہیں پہنچے۔{۶۲} قرآن نے جو حقائق بیان کیے ہیں ان کے مصداق آہستہ آہستہ انسانوں کے سامنے کھلتے جائیں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے جس عذاب کی وعید انہیں سنائی ہے وہ عذاب ابھی تک ان پر نہیں آیا ہے۔{۶۳} اصل میں "تاویل" کا لفظ عاقبت اور مآل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہ مآل علمی بھی ہو سکتا ہے اور فعلی بھی۔{۶۴} علمی مآل سے مراد معانی اور حقائق ہیں اور فعلی مآل سے مراد عذابِ الٰہی ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ابھی تک قرآن کے مضامین اور حقائق ان پر نہیں کھل سکے اس لیے یہ ایمان سے محروم ہیں، جب ان پر حقائق کھلیں گے تو یہ قرآن کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب یہ عذابِ الٰہی دیکھ لیں گے تب مانیں گے مگر اس وقت کا ماننا ہرگز مفید نہ ہوگا۔

﴿۴۰﴾......اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دینے کے لیے فرما رہے ہیں کہ جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ان کا حال تو یہ تھا کہ چند ایک کے سوا پوری قوم جھٹلانے پر تل گئی تھی مگر آپ کی قوم ایسی نہیں ہے، ان میں سے کچھ اگر جھٹلا رہے ہیں تو کچھ ایمان بھی لے آئیں گے، اس لیے یہ اس عذاب سے محفوظ رہیں گے جو کسی قوم کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱......قرآن سارا اللہ کا کلام ہے جو آنحضرت ﷺ کی طرف وحی کیا گیا ہے۔(۳۷)

۲......قرآن کے پانچ اوصاف جو یہاں مذکور ہیں، وہ اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں یعنی اس کا معجز، مصدِّق، مفصَّل، شک و شبہ اور تناقض سے پاک اور رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہونا۔(۳۷)

۳......مشرکین نے قرآن کو خود ساختہ کلام قرار دیا تو انہیں چیلنج ہوا کہ فصاحت و بلاغت میں تم بھی کچھ کم نہیں لہٰذا تم بھی اس جیسی ایک سورت بنا کر دکھاؤ! قرآن کا یہ چیلنج کل کے کافروں کے لیے بھی تھا اور آج کے کافروں کے لیے بھی ہے۔(۳۸)

۴......ہر نبی کو اس وقت کے مخصوص حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا جاتا رہا، آنحضرت ﷺ کے مخاطبوں کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا اس لیے آپ کو قرآن جیسی بے مثال کتاب بطور معجزہ عطا ہوئی۔

۵......ضد اور عناد انسان کو حق سے دور رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، مشرکین اگر اس روش سے ہٹ کر قرآن

{۶۲} ولم تبلغ اذھانھم معانیه (بیضاوی ۱۹۹/۳)
{۶۳} ای ولم یأتھم حقیقة عاقبة التکذیب من نزول العذاب بھم (قرطبی ۳۱۰/۸)
{۶۴} رد الشئی الی الغایة المرادة منه علما کان او فعلا (المفردات/۳۱)

میں غور وفکر کرتے تو ضرور ہدایت پاتے۔

۶......قرآن سے کون ہدایت پائے گا اور کون اس سے محروم رہے گا؟ اللہ کو ان سب کا علم ہے۔(۴۰)

حضرت خاتم الرسل ﷺ کو تسلّی

(۴۱......۴۴)

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لیے میرا کام اور تمہارے لیے تمہارا کام تم پر ذمہ نہیں میرے کام کا اور مجھ پر

بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا

ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو○ اور بعضے ان میں کان رکھتے ہیں تیری طرف کیا تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو

لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿٤٣﴾

سمجھ نہ ہو○ اور بعضے ان میں نگاہ کرتے ہیں تیری طرف کیا تو راہ دکھائے گا اندھوں کو اگرچہ وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں○

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾

اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر کچھ بھی لیکن لوگ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں○

ربط: سابقہ آیات میں کفار کی تکذیب اور اس کا جواب مذکور تھا، اب فرمایا جارہا ہے کہ اگر یہ تکذیب سے کسی صورت باز نہیں آتے تو انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں، انہیں ان کے اعمال کے مطابق بدلہ مل کر رہے گا۔

تسہیل: اے حبیب! اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہی رہیں تو ان سے فرما دیجئے کہ میرا عمل میرے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے ہے، تم میرے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہو اور میں تمہارے اعمال کی جوابدہی سے بری ہوں○ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو (طلب حق کے بغیر) اگرچہ کان لگا کر آپ کی باتیں سنتے تو ہیں، مگر کیا آپ بہروں کو سنائیں گے خواہ وہ کچھ سمجھتے ہی نہ ہوں؟○ یونہی ان میں سے بعض (بغیر طلب کے) ظاہراً آپ کی طرف دیکھتے ہیں، تو کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکیں گے جبکہ وہ بصیرت سے کام ہی نہیں لیتے؟○ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں○

تفسیر

(۴۱)......اے میرے پیغمبر! اگر یہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ فرما دیجئے کہ میں اپنا عمل ترک نہیں کر سکتا تم اپنے عمل میں

لگے رہو میں اپنے عمل میں لگا رہوں گا، میرا عمل ہے دعوت وتبلیغ، عبادت واطاعت اور اصلاح وتربیت اور تمہارا عمل ہے ظلم وفساد، کفر وشرک اور تکذیب وانکار۔ سورۂ اسراء میں ہے:

﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا﴾{۲۵}

''اے پیغمبر! آپ ان سے فرما دیجئے کہ ہر انسان اپنے طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے، پس تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سب سے زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔''

﴿۴۲﴾...... جب آپ قرآن پڑھتے ہیں یا ایمانی عقائد اور احکام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ان میں سے بعض بظاہر متوجہ ہو کر سنتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ نہیں سنتے، اس لیے کہ نہ تو وہ تدبر کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا مقصد ایمان اور اصلاح ہے بلکہ ممکن ہے وہ محض آواز کے حسن اور کلام کی بلاغت کی وجہ سے سن رہے ہوں اور اللہ کے ہاں ایسے سماع کا کوئی اعتبار نہیں، سورۂ انعام میں ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾{۲۶}

''اور ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر آپ کی طرف کان لگاتے ہیں مگر ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، اس لیے وہ سمجھ نہیں پاتے اور ان کے کانوں کو بوجھل کر دیا۔''

﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ﴾ جیسے اس شخص کو سنانا ناممکن ہے جو بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ دیوانہ بھی ہو یونہی ان لوگوں کو بھی سننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا جو نہ ہدایت کی طلب رکھتے ہوں نہ معنی سمجھتے ہوں اور نہ ہی کلام کی عظمت ان کے دل میں ہو۔

﴿۴۳﴾...... ان میں ایسے بھی ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں مگر نہ ان کی نظر آپ کی سیرت وصورت پر ہوتی ہے نہ آپ کے حسنِ خلق اور کمالِ ایمان پر، ایسے لوگوں کو دیکھنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ صرف ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے، اللہ کے نزدیک ایسے لوگوں کا شمار اندھوں میں ہوتا ہے، سورۂ حج میں ہے:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾{۲۷}

''حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ ان کے سینوں میں دل اندھے ہیں۔''

{۲۵} (الاسراء ۱۷/۸۴)
{۲۶} (الانعام ۶/۲۵)
{۲۷} (الحج ۲۲/۴۶)

﴿۴۴﴾......اللہ تعالیٰ انسانوں پر کسی طرح بھی ظلم نہیں کرتا، نہ تو گناہوں کے بغیر سزا دے کر اور نہ ہی ہدایت دینے والے اسباب اور حواس سے محروم کر کے۔{۶۸} بلکہ انسان اپنے اوپر خود ہی ظلم کرتے ہیں جس کی ایک نمایاں صورت یہ ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے حواس اور عقل کو صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے استعمال نہیں کرتے۔{۶۹}

حکمت و ہدایت:

۱......اہلِ طریقت کی عادت یہی ہے کہ وہ مناظرہ میں خصم کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھ کر "اَنْتُمْ بَرِیْٓــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ" کہہ دیتے ہیں۔(۴۱){۷۰}

۲......ہر انسان سے اس کے اپنے ہی اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور اعمال ہی کے مطابق جزا اور سزا کا فیصلہ کیا جائے گا، دوسروں کے گناہوں کی وجہ سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔

۳......سمع و بصر جیسے حواس کا ظاہری ہدف یہ ہے کہ ان سے دیکھا اور سنا جاتا ہے جبکہ ان کا حقیقی ہدف یہ ہے کہ ان کے ذریعے دیکھی اور سنی چیزوں میں غور و فکر کر کے حق اور ہدایت کی تلاش کی جاتی ہے۔

۴......رسول صرف مبلّغ اور داعی ہوتے ہیں کسی کو ہدایت دینے پر قادر نہیں ہوتے۔

۵......دلائل سے فریقِ مخالف کو لاجواب کر دینا سنّتِ نبوی ہے۔

۶......ہدایت کے طلب گاروں کے لیے سماع حصولِ ہدایت کے ذرائع میں سے ایک بڑا ذریعہ ہے، اسی لیے اللہ نے "سمع" کو "بصر" پر مقدم کیا ہے۔

۷......اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے لیکن انسان اس صلاحیت کو ضائع کر کے خود اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔(۴۴)

مکذّبین کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب

﴿۴۵......۵۶﴾

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ

اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی دن ایک دوسرے کو پہچانیں گے بے شک خسارے میں پڑے جنھوں نے

{۶۸} إن الله لا يظلم الناس شيئا بسلب حواسهم و عقولهم (روح المعاني ۱۸۴/۱۱،۷)

{۶۹} "ولكن الناس أنفسهم يظلمون"...... عدم استعمال حاساتهم و مدار كهم فيما خلقت له (تفسير القاسمي ۳۷/۹)

{۷۰} (بيان القرآن ۱۵/۵،۱)

كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

جھٹلایا اللہ سے ملنے کو اور نہ آئے وہ راہ پر ○ اور اگر ہم دکھائیں گے تجھ کو کوئی چیز اُن وعدوں میں سے جو کیے ہم نے ان سے یا وفات دیں تجھ کو،

فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ

سو ہماری ہی طرف ہے ان کو لوٹنا، پھر اللہ شاہد ہے ان کاموں پر جو کرتے ہیں ○ اور ہر فرقے کا ایک رسول ہے پھر جب پہنچا ان کے پاس رسول ان کا

قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝

فیصلہ ہوا اُن میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا ○ اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو ○

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ

تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر جو چاہے اللہ ہر فرقے کا ایک وعدہ ہے جب آپہنچے گا ان کا وعدہ پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے

فَلَا يَسْتَاْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا

ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے ○ تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر آپہنچے تم پر عذاب اس کا راتوں رات یا دن کو

مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ۝ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ

تو کیا کر لیں گے اس سے پہلے گناہ گار ○ کیا پھر جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے اب قائل ہوئے اور تم اسی کا

تَسْتَعْجِلُونَ ۝ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ

تقاضا کرتے تھے ○ پھر کہیں گے گنہگاروں کو چکھتے رہو عذاب ہمیشگی کا وہی بدلہ ملتا ہے جو کچھ

تَكْسِبُونَ ۝ وَيَسْتَنْۢبِـُٔونَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِي وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ

کماتے تھے ○ اور تجھ سے خبر پوچھتے ہیں کیا سچ ہے یہ بات تو کہہ البتہ قسم میرے رب کی یہ سچ ہے اور تم تھکا نہ سکو گے ○ اور اگر ہو ہر شخص

نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ

گناہ گار کے پاس جتنا کچھ ہے زمین میں البتہ دے ڈالے اپنے بدلے میں اور چھپے چھپے پچتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب اور ان میں فیصلہ ہوگا

بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ

انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا ○ سن رکھو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں سن رکھو وعدہ اللہ کا سچ ہے

حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

پر بہت لوگ نہیں جانتے ○ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے ○

تسہیل: جس دن اللہ ان سب کو محشر میں جمع کرے گا تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ ہم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لیں گے اس کے باوجود کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا، حقیقت میں سخت

خسارے کا سودا کیا ان لوگوں نے جنہوں نے آخرت میں اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور جو راہِ راست پر نہیں آئے O جس عذاب سے ہم ان کافروں کو ڈراتے رہتے ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں سے کچھ ہم آپ کو آپ کی زندگی میں ہی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہم آپ کو وفات دے دیں، بہر حال انہیں لوٹ کر ہمارے پاس تو آنا ہی ہے، پھر وہ اللہ جو ان کی ایک ایک حرکت پر گواہ ہے وہ انہیں ضرور سزا دے گا O ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی رسول آتا رہا ہے، پھر یوں ہوا کہ جب اللہ کا رسول واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس آ گیا اس کے باوجود اسے انہوں نے جھٹلایا تو اللہ کے رسول اور ان جھٹلانے والوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا، اور ان پر ذرہ بھی ظلم نہ کیا گیا O اور کافر مسلمانوں سے مذاق کے طور پر سوال کرتے ہیں کہ اگر تم واقعی سچ کہتے ہو تو یہ عذاب کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ O میرے حبیب! آپ ان سے فرما دیجئے میں تو اپنے لیے بھی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر جتنا اللہ چاہے اتنا ہی اختیار مجھے حاصل ہوتا ہے، تو تمہارے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں کہ کب اور کتنا عذاب تم پر نازل ہوگا؟ ہر امت کی ہلاکت کا ایک وقت متعین ہے چنانچہ جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو وہ اس سے نہ ایک گھڑی پیچھے جا سکتے ہیں نہ آگے آ سکتے ہیں O آپ فرما دیجئے کہ تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کے وقت آئے یا دن کے وقت تو آخر اس عذاب میں ایسی کون سی پرکشش چیز ہے جس کی وجہ سے مجرم اسے جلدی مانگ رہے ہیں؟ O کیا جب وہ عذاب آ ہی پڑے گا تب اسے مان لوگے؟ اگر تم نے اس وقت مان لیا تو تم سے کہا جائے گا کیا اب ایمان لاتے ہو حالانکہ پہلے تم استہزاء کے طور پر اس کے لیے جلدی مچایا کرتے تھے؟ O پھر ظالموں سے کہا جائے گا اب اس عذاب کا مزہ چکھو جس میں تم ہمیشہ کے لیے پڑے رہوگے، یہ تمہیں اپنے کرتوتوں کی سزا دی جا رہی ہے جو تم کرتے رہے ہو O اور یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ جزا وسزا کی باتیں واقعی سچ ہیں؟ آپ کہہ دیجئے ہاں، میرے پروردگار کی قسم! یہ سو فیصد سچ ہیں اور تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے O اور ہر وہ شخص جس نے ظلم کا ارتکاب کیا اگر اسے روئے زمین کی ساری دولت بھی مل جائے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے اسے تاوان کے طور پر دینے کے لیے آمادہ ہوگا اور جب وہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اپنی شرمندگی چھپانے کی کوشش کریں گے اور ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہوگا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا O یاد رکھو! کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے یہ بھی سن لو! کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے O وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے O

﴿تفسیر﴾

﴿۴۵﴾......مردے جب قبروں سے اٹھ کر محشر میں جمع ہوں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ ہم قبر میں یا دنیا میں {۷۱}

{۷۱} یستقربون وقت لبثهم فی الدنیا، و قیل: فی القبور (کشاف ۲/۳۴۲)

میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔

یہ مضمون قرآنِ کریم کے متعدد مواقع میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، سورۂ روم میں ہے:

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ﴾ {۷۲} ''جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسمیں اٹھائیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔''

﴿يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ﴾ وہ آپس میں ایک دوسرے کو یوں پہچان لیں گے گویا واقعی وہ بہت تھوڑے وقت کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ {۷۳} لیکن یہ تعارف ان کے کسی کام نہیں آئے گا، تعارف کی یہ گھڑی بھی ایک دوسرے پر لعن طعن میں گزر جائے گی، ہر دوزخی شخص دوسرے سے یہی کہے گا کہ آج میں تمہاری وجہ سے انجامِ بد سے دوچار ہو رہا ہوں۔ {۷۴}

﴿۴۶﴾...... اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آپ کی زندگی میں جھٹلانے والوں کو عذاب دیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی وفات کے بعد ان پر عذاب نازل ہو، اس ابہام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، اور وہ ہے تخویف یعنی کافروں کو ہر حال میں اور ہر قسم کے عذاب سے ڈرانا۔

وہ بدبخت جو اللہ کے پیغمبر کی موت کی تمنا اور انتظار کرتے تھے انہیں بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ تمہارے لیے دونوں حالتیں برابر ہیں، اگر آپ دنیا سے تشریف لے بھی گئے تو تمہیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا، ہر حال میں تمہیں عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بقیہ آیات کا مفہوم بالکل واضح ہے لہٰذا صرف ''حکمت و ہدایت'' لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱...... دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی، احمق ہیں جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دے کر اپنا نقصان خود کرتے ہیں۔

۲...... قیامت کے دن کافروں کو ایسا شدید عذاب دیا جائے گا کہ وہ دنیوی لذّات کو یکسر بھول جائیں گے۔

۳...... کافر دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اسے دائمی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (۴۶)

۴...... قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی موجودگی میں ان کی امتوں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں گے، ایمان

{۷۲} (الروم ۳۰/۵۵)

{۷۳} یعرف بعضھم بعضا کانھم لم یتفارقوا الا قلیلا (کشاف ۲/۳۳۲)

{۷۴} و ھذا التعارف تعارف توبیخ و افتضاح (قرطبی ۸/۳۱۲)

والے نجات پا جائیں گے اور کافر دائمی عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔(۴۷)

۵......"ولکل امّة رسول" میں رسول سے لغوی رسول مراد ہے، اس میں اصطلاحی رسول کے علاوہ اس کے نائبین بھی داخل ہیں۔(۴۷)

۶......قیامت کا دن عدل کا دن ہوگا، اس دن بغیر گناہ کے کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا اور بغیر کسی حجت کے کسی کا مواخذہ نہیں ہوگا۔(۴۷)

۷......جو لوگ دورِ فترۃ (یعنی نبی کے وجود سے پیشتر) گزرے ہیں ان سے سوال ان کی استعداد اور فہم وبصیرت کے مطابق ہوگا۔(۴۷)

۸......کوئی شخص بشمول انبیاء، نہ اپنے نفع ونقصان کا مالک ہے نہ کسی دوسرے کا(۴۸)

۹......حق کے معاملے میں بندوں سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور اس میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوسکتی۔(۴۹)

۱۰......معصیت سے توبہ اور عملِ خیر کے اختیار میں توقف بلاضرورت ایک لحہ کے لیے بھی نہ کیا جائے کہ وقوعِ عذاب کے لیے کوئی علامت شرط نہیں۔(۵۰)

۱۱......عذاب دیکھ لینے کے بعد توبہ کا کوئی فائدہ نہیں۔(۵۱)

۱۲......کافروں کا مطالبہ عذاب باعثِ تعجب ہے کہ مطالبہ کسی عاجز ذات سے کیا جاتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے، جس وقت چاہے کافروں کو عذاب دے سکتا ہے۔

۱۳......خبر میں تاکید کی غرض سے قسم اٹھائی جاسکتی ہے۔(۵۳)

۱۴......قیامت کے دن کسی شخص سے گناہوں کے بدلے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ فدیہ وغیرہ کی ضرورت محتاج کو ہوتی ہے جبکہ اللہ غنی اور زمین وآسمان کا بادشاہ ہے۔(۵۴)

۱۵......کافر اور ظالم لوگ اپنے اعمال پر آخرت میں نادم ہوں گے، وہ اس ندامت کو کبھی چھپانے کی کوشش کریں گے اور کبھی ان کی یہ ندامت ظاہر ہوجائے گی۔(۵۴)

۱۶......گمراہی پھیلانے والے وڈیرے اور سردار دوزخ میں جانے سے پہلے اپنے متبعین سے اپنی ندامت چھپائیں گے لیکن دوزخ میں جاتے ہی دہکتی آگ انہیں یہ کہنے پر مجبور کردے گی "غلبت علینا شقوتنا و کنّا قوما ضآلین" (ہمارے اوپر ہماری بدبختی غالب آگئی اور ہم گمراہ قوم تھے۔)(۵۴)

۱۷......عالمِ علوی اور سفلی میں موجود تمام مخلوقات کا حقیقی رب اللہ تعالیٰ ہے۔(۵۵)

۱۸......اسلامی نقطۂ نظر سے موت وحیات دونوں کا مالک صرف اللہ ہے(۵۶) ایسا نہیں کہ سلامتی و ہلاکت کا الگ الگ خدا ہو جیسا کہ بعض جاہلی مذاہب میں اس کا تصوّر ملتا ہے۔

۱۹......اسلام اپنے ماننے والوں کے دل ودماغ میں یہ حقیقت پیوست کر دینا چاہتا ہے کہ موت کے بعد انسان کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔(۵۶) بہت سے دیگر مذاہب جو اس شفاف اور بدیہی عقیدہ کے منکر ہیں، وہ سراسر گمراہی کا شکار ہیں۔

قرآنِ کریم کے مقاصد

﴿۵۷......۵۸﴾

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ

اے لوگو! تمہارے پاس آئی ہے نصیحت تمہارے رب سے اور شفاء دلوں کے روگ کی اور ہدایت اور رحمت مسلمانوں کے

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

واسطے O کہہ اللہ کے فضل سے اور اس کی مہربانی سے سو اسی پر ان کو خوش ہونا چاہیے یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جو جمع کرتے ہیں O

ربط: پچھلی آیات میں کفار ومشرکین کی بدحالی اور آخرت میں ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا، اب انہیں اس بدحالی اور عذاب سے نجات کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

تسہیل: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جس میں نیکی کی نصیحت، دلوں کی بیماریوں کی شفاء اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے O اے میرے پیغمبر! آپ ان سے فرما دیجئے کہ اللہ کے اسی فضل و رحمت پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے، یہ اس دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

چار خصوصیات:

﴿۵۷﴾......ایک مسلمان کی نظر میں کائنات کی عظیم ترین نعمتیں دو ہیں، قرآنِ کریم اور اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔ یہاں ان دونوں نعمتوں کا ذکر بڑے ولولہ انگیز انداز میں اللہ نے فرمایا ہے۔

پہلی آیتِ کریمہ میں قرآنِ کریم کی چار اہم خصوصیات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں:

۱......**مَّوْعِظَةٌ**: وعظ اور موعظت کے اصل معنی ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو، آخرت کا منظر سامنے آ جائے، قرآنِ کریم اول سے آخر تک اسی موعظۂ حسنہ کا نہایت بلیغ مبلّغ ہے، اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید، ثواب کے ساتھ عذاب، دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی کا ایسا ملا جلا تذکرہ ہے جس کو سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے، پھر اس پر قرآن کریم کا اعجازِ بیان جو دلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔{۷۵}

سورۂ آلِ عمران میں بھی قرآنِ کریم کی اس خصوصیت کا ذکر ہے:

﴿هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًی وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾{۷۶} ”یہ قرآن لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اس میں ہدایت اور نصیحت ہے۔“

۲......**شِفَآءٌ**: کفر و شرک، نفاق و ریا، بغض و حسد اور کبر و بخل سمیت دلوں کی جتنی بھی بیماریاں ہیں ان کے لیے قرآن شفاء ہے، عمل کی نیت سے غور و تدبر کے ساتھ تلاوت کرنے والے انسان کو روحانی بیماریوں سے ضرور شفا حاصل ہوتی ہے، اس آیت کے حوالے سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ان اللہ تعالیٰ جعل القرآن شفاء لما فی الصدور و لم یجعلہ شفاء لامراضکم.﴾{۷۷} ”اللہ نے قرآنِ کریم کو تمہاری روحانی بیماریوں کے لیے شفاء بنایا ہے جسمانی بیماریوں کے لیے نہیں۔“

متعدد دوسرے علماء قرآنِ کریم کو ہر بیماری کیلئے شفاء قرار دیتے ہیں خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی، ان کا استدلال حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہے جس میں آتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے سینے میں کچھ تکلیف ہے آپ نے فرمایا:

”قرآن پڑھو اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے ”قرآن سینے کی بیماریوں کیلئے شفا ہے۔“{۷۸}

یونہی واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے اپنے گلے کی تکلیف

{۷۵} (معارف القرآن ۴/۵۴۲)
{۷۶} (آلِ عمران ۳/۱۳۸)
{۷۷} (روح المعانی ۷، ۱۱/۲۰۴)
{۷۸} (أخرجه ابن مردویه بحواله روح المعانی ۷، ۱۱/۲۰۴)

کے بارے میں عرض کیا، آپ نے فرمایا:

﴿علیک بقراۃ القرآن و العسل فالقرآن شفاء لما فی الصدور والعسل شفاء من کل داء.﴾{۷۹}

”قرآن اور شہد کو لازم پکڑو، اس لیے کہ قرآن سینے کی بیماریوں اور شہد ہر بیماری کے لیے شفاء ہے۔“

اگر چہ یہ روایات قابلِ بحث ہیں اور ان سے جسمانی بیماریوں کے علاج کے جواز پر استدلال کمزور ہے مگر چونکہ صحابہ کرام اور اسلاف کے تعامل سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے اس لیے ہمیں اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے، البتہ اس میں شک نہیں کہ جو حضرات قرآنِ کریم کو محض تعویذ گنڈے اور جسمانی علاج معالجہ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اپنی روحانی اور باطنی بیماریوں کا علاج نہیں کرتے اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کا ھادی اور رہنما بناتے ہیں وہ اس کی صراحۃً حق تلفی کر رہے ہیں۔

۳...... **هُدًى**: قرآنِ کریم کے نزول کا اصل مقصد ہدایت ہے، یہ انسانوں کو راستہ دکھاتا ہے اور جو اسے مضبوطی سے تھام لیں انہیں منزلِ مقصود تک پہنچاتا بھی ہے، اس کے الفاظ کی تلاوت اور اس کے معانی میں غور و تدبر کرنے والا انسان ہدایت سے محروم نہیں رہتا۔

۴...... **رَحْمَةٌ**: قرآنِ کریم ایمان والوں کے لیے ان کے رب کی طرف سے خصوصی رحمت ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ خود اہلِ ایمان کے دلوں میں بھی رحمت پائی جاتی ہے اور ان کے آقا ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ”**رحمة للعٰلمین**“ قرار دیا ہے، آپ صرف انسانوں کے لیے نہیں حیوانوں کے لیے بھی رحمت تھے، آپ نے اپنی امت کو بتایا کہ:

”رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم اہلِ زمین پر رحم کرو تمہارے اوپر وہ ذات رحم کرے گی جو آسمانوں میں ہے۔“{۸۰}

غرضیکہ قرآن خود بھی رحمت ہے اور جن کے دل و دماغ میں قرآن اتر جائے ان کا وجود بھی سراپا رحمت بن جاتا ہے۔

چار منزلیں:

یہ جو قرآنِ کریم کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں ان کے بارے میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بعض محققین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”نفسِ انسانی کے لیے حصولِ کمال میں چار مرتبے یا منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر لفظ ایک ایک مرتبہ یا منزل کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

{۷۹} (البیهقی فی شعب الایمان بحواله "المنار" ۱۱/۳۴۱)

{۸۰} (ابوداؤد ۲ کتاب الأدب/۳۲۷، ترمذی ۲، ابواب البر والصّلة/۱۴)

☆......پہلا مرتبہ تہذیبِ ظاہر یعنی گناہوں اور اعمالِ بد سے بچنے کا ہے "رَحْمَةٌ" اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔
☆......دوسرا مرتبہ تہذیبِ باطن یعنی برے اخلاق اور غلط عقائد سے بچنے کا ہے، اسی کو "شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔
☆......تیسرا مرتبہ، عقائدِ حقہ و اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہونے کا ہے، یہ منزل "هُدًى" کی ہے۔
☆......چوتھا مرتبہ انوارِ الٰہی سے جگمگا اٹھنے کا ہے اور یہ حاصل ہے مقامِ "مَّوْعِظَةٌ" کا......اور یہ سب ایک سرسری ساخاکہ ہے امام رازی رحمہ اللہ کے ایک مبسوط مقالہ کا جو انہوں نے تفسیر کبیر میں تحریر فرمایا ہے اور جس کا آخری لبِ لباب یہ ہے کہ "مَّوْعِظَةٌ" سے اشارہ ہے ظاہری اعمال کی اصلاح و تطہیر کی طرف اور اس کا نام شریعت ہے اور "شِفَآءٌ" سے مراد اصلاحِ باطن و طہارتِ روحانی ہے جو کام ہے طریقت کا، اور "هُدًى" سے مقصود وہ نورانیت ہے جو صدیقین کے قلوب میں پیدا ہوتی ہے، اس کو منزلِ حقیقت کہتے ہیں اور "رَحْمَةٌ" سے مراد انسانیت کی تکمیل کا آخری مرتبہ ہے، جس سے انوارِ نبوت خلق کی اصلاح کرتے ہیں۔{۸۱}

﴿۵۸﴾......اس آیتِ کریمہ میں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کا ذکر ہے، اہلِ علم کہتے ہیں کہ فضل سے مراد قرآن یا ایمان ہے{۸۲} اور رحمت سے مراد اسلام یا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ فضل اور رحمت دونوں سے مراد قرآن ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ فضل سے اللہ کی دی ہوئی توفیق اور رحمت سے مراد اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، یہ بات پہلے بھی عرض کی جاچکی ہے کہ کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں ایسے اقوال دیکھ کر پریشان نہیں ہوجانا چاہیے جن اقوال میں باہم کوئی تضاد نہ ہو اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن، ایمان اور توفیق تینوں اللہ کا فضل اور اسلام اور رحمتِ دو عالم ﷺ کا وجودِ مسعود اس کی رحمت ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔

﴿فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ اللہ پاک مسلمانوں کو ترغیب دے رہے ہیں کہ انہیں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوش ہونا چاہئے، اس ترغیب کی تعبیر اس انداز میں کی گئی ہے کہ کلام میں بڑا زور اور تاکید پیدا ہوگئی ہے، اب اس فقرہ کا مفہوم یہ بن گیا کہ اہلِ ایمان کو اگر کسی چیز پر خوش ہونا ہی ہے تو صرف اللہ کا فضل اور رحمت ہی ایسی چیز ہے کہ ان پر خوشی کا اظہار کیا جائے۔{۸۳} کیونکہ کامل خوشی وہی ہے جو روحانی ہو جسمانی لذت پر جو خوشی ہوتی ہے وہ باطل اور عارضی ہوتی ہے۔

{۸۱} (بحوالہ ماجدی ۲/۴۶۸)
{۸۲} قال أبو سعيد الخدري و ابن عباس رضي الله عنهما: فضل الله القرآن ...... و عن الحسن والضحاك و مجاهد: فضل الله الايمان (قرطبي ۸/۳۱۶)
{۸۳} "فبذلك فليفرحوا" للتاكيد والتقرير ...... والأصل ان فرحوا بشئ فبذلك ليفرحوا لا بشئ أخر (روح المعاني ۱۱/۲۰۴،۷)

حکمت وہدایت:

۱......آیت میں بیان کردہ قرآن کی چار صفات ویسے تو کائنات کے تمام انسانوں کے لیے ہیں لیکن ان سے حقیقتاً مستفید مؤمن ہی ہوتے ہیں۔(۵۷)

۲......جسمانی امراض کی طرح روحانی بیماریاں بھی انسان میں پائی جاتی ہیں اور یہ جسمانی بیماریوں سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہیں۔

۳......ایک مؤمن کے لیے اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بڑھ کر کوئی خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔(۵۸)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿من هداه الله للإسلام و علّمه القرآن ثمّ شكا الفاقة كتب الله الفقر بين عينيه إلى يوم يلقاه﴾{۸۴}

”جسے اللہ اسلام اور قرآن کی نعمت عطا فرمائے اور وہ پھر بھی فاقے کا شکوہ کرے تو اللہ قیامت تک اس کے مقدر میں فقر لکھ دے گا۔“

اللہ کا فضل اور علمِ محیط

﴿۵۹......۶۴﴾

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ

تو کہہ بھلا دیکھو تو اللہ نے جو اتاری تمہارے واسطے روزی پھر تم نے ٹھہرائی اس میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کہہ کیا اللہ نے حکم دیا تم کو

اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۹ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

یا اللہ پر افتراء کرتے ہو ○ اور کیا خیال ہے جھوٹ باندھنے والوں کا اللہ پر قیامت کے دن اللہ تو

لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۰ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ

فضل کرتا ہے لوگوں پر اور لیکن بہت لوگ حق نہیں مانتے ○ اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے

مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ

کچھ قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس جب تم مصروف ہوتے ہو اس میں اور

عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا

غائب نہیں رہتا تیرے رب سے ایک ذرہ بھر زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا جو نہیں ہے

{۸۴} (بحوالہ تفسیر منیر ۱۱/۲۰۱-۲۰۲)

فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

کھلی ہوئی کتاب میں O یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے O اُن کے لیے خوشخبری دنیا کی زندگانی میں اور آخرت میں

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾

بدلتی نہیں اللہ کی باتیں یہی ہے بڑی کامیابی O

ربط: توحید، نبوت اور آخرت، یہی تین مضامین انداز بدل بدل کر بیان ہو رہے ہیں۔

تسہیل: آپ ان سے سوال کیجئے کہ مجھے یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق نازل کیا تھا پھر تم نے اپنی طرف سے اس میں سے کسی کو حرام اور کسی کو حلال قرار دے لیا، تو کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہو؟O اور وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں ان کا قیامت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر اس کا شکر ادا نہیں کرتے O اے میرے پیغمبر! آپ کسی حال میں بھی ہوں اور آپ قرآن کے جونسے حصے کی تلاوت کر رہے ہوں اور اے لوگو! تم جو بھی کام کر رہے ہو تم ہماری نظر میں ہوتے ہو جب تم کسی کام میں مشغول ہوتے ہو، اور تمہارے رب سے ذرّہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، یہ سب کچھ واضح کتاب میں درج ہے O سن لو! اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیے رہے O ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہوسکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے O

تفسیر

﴿۵۹﴾......اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا فرمایا ہے خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات ان میں اصل اباحت اور حلّت ہے، حرمت صرف ان چیزوں میں ثابت ہوگی جن کی حرمت پر کوئی شرعی دلیل ہو، کسی انسان کو اپنی مرضی سے کسی چیز کو حرام ٹھہرانے کا اختیار ہرگز نہیں، جبکہ مشرکین اس حوالے سے بڑی گڑبڑ کرتے تھے جس چیز کو چاہتے حلال کر دیتے اور جس چیز کو چاہتے حرام ٹھہرا لیتے، سورۂ یونس کے علاوہ سورۂ مائدہ، سورۂ انعام اور بعض دوسری سورتوں میں ان کی اس حرکت پر قرآن نے بار بار گرفت کی ہے۔

بعض متعصب حضرات اس آیت سے فقہی قیاس کی نفی ثابت کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فقیہ اور مجتہد بھی اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو حلال اور کسی کو حرام، کسی کو واجب اور کسی کو مباح ثابت کرتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا مجتہد کا استدلال کتاب وسنت سے ہوتا ہے، وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ حکم اور مسئلہ جو شرعی دلائل میں پوشیدہ ہوتا ہے اسے اپنی سمجھ بوجھ اور علم سے باہر نکال لیتا ہے۔ {۸۵}

﴿۶۰﴾...... یہ جہلاء جو جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کا روزِ قیامت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا انہیں ان کے جرائم اور جھوٹ بولنے کی سزا نہیں دی جائے گی؟ کیوں نہیں! انہیں سزا مل کر رہے گی، اور یہ سزا انہیں اس لیے ملے گی کیونکہ انہوں نے اللہ کے فضل اور اس کی نعمتوں کا جواب کفر وشرک اور جھوٹ اور افتراء سے دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ﴾ اللہ تعالیٰ کا مختلف نعمتیں پیدا فرمانا، ان میں حلت اور اباحت کو اصلی قرار دینا اور حلال اور حرام کا اختیار اپنے پاس رکھنا اس دعوی کی دلیل ہے کہ وہ انسانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ وہ لوگ بھی ناشکرے ہیں جو اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام ٹھہرا لیتے ہیں اور وہ بھی ناشکرے ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں یا بخل تو نہیں کرتے مگر حلال سے اجتناب کو زہد وتقوی سمجھتے ہیں۔

حضرت ابوالاحوص اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں اس حالت میں حاضر ہوا کہ میں پراگندہ حال تھا، آپ نے مجھ سے پوچھا کیا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، آپ نے دریافت فرمایا، مال کی کون سی قسم تمہارے پاس ہے؟ میں نے عرض کیا ہر قسم کا مال ہے یعنی اونٹ، غلام، گھوڑے اور بکریاں۔ آپ نے فرمایا "جب اللہ نے تمہیں مال دیا ہے تو اس کی نعمت کا اثر تمہارے جسم پر بھی دکھائی دینا چاہیے۔" {۸۶}

﴿۶۱﴾...... اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کا ذکر ہے یعنی اس کا علم ہر چیز کا، ہر حالت میں احاطہ کیے ہوئے ہے، چیزوں کا وجود بھی اس کے علم میں ہے اور ان کی مختلف حالتیں، حرکتیں اور کیفیات بھی اس کے علم میں ہیں، دنیا میں ایسی قومیں گزری ہیں جو اللہ کے لیے محدود اور ناقص علم تسلیم کرتی ہیں ان سب کی تردید اس آیت سے ہو جاتی ہے۔

﴿وَمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ﴾ رسول اللہ ﷺ مختلف احوال اور کیفیات سے دوچار ہوتے تھے اور آپ کے سارے ہی احوال اعلیٰ وارفع تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان احوال میں سے تلاوتِ قرآن کا حال خاص طور پر ذکر

{۸۵} (قرطبی ۳۱۸/۸)
{۸۶} (ابوداؤد ۲، کتاب اللباس/۲۰۷)

فرمایا ہے، یہ تخصیص اس کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔{۸۷}

اولیاء اللہ:

﴿۶۲-۶۳﴾......پہلی آیت میں یہ بتایا کہ بندوں کا کوئی حال اور کیفیت اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے، اگلی تین آیات میں اللہ کے مخصوص بندوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست قرار دیا ہے، یہ دوستی جانبین سے ہوتی ہے، بندوں کی دوستی کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اس پر توکل کرتے ہیں اور اسی سے محبت کرتے ہیں، اگر مخلوق سے محبت کرتے ہیں تو وہ بھی اس کی خاطر کرتے ہیں، ہر ہر قدم پر اس کی رضا کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اور اللہ ان سے یوں محبت کرتے ہیں کہ انہیں بھٹکنے سے بچاتے ہیں اور عزت وکرامت سے نوازتے ہیں۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ قرآن اللہ کے ولیوں کی صرف دو علامتیں بتاتا ہے، ایمان اور تقوی، تقوی میں سب سے زیادہ اہمیت گناہوں سے بچنے کو حاصل ہے نہ ترکِ دنیا نہ چلّہ کشی، نہ مخصوص لباس اور ہیئت، نہ کرامتوں کا ظہور، کرامت سراسر غیر اختیاری چیز ہے مگر حیرت ہے کہ عوام نے اس کو ولایت کا لازمی جزء سمجھ رکھا ہے، ان کے خیال میں ولی وہ ہوتا ہے جس سے عادت کے خلاف امور ظاہر ہوتے ہیں وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، بے موسم کا پھل حاضر کر سکتا ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ معاذ اللہ! وہ ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے، فقیر کو امیر بنا سکتا ہے، بے اولاد کو اولاد دے سکتا ہے، جبکہ قرآن نے اولیاء اللہ کی صرف دو صفات بتائی ہیں، پہلی صفت ہے ایمانِ کامل، جس میں شک داخل نہ ہو سکے، اور دوسری صفت ہے تقوی یعنی اللہ کو راضی کرنے والا ہر عمل کرنا اور اسے ناراض کرنے والے ہر عمل سے بچنا۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا، یا رسول اللہ! اولیاء اللہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿الذين اذا رؤوا ذكر الله.﴾ {۸۸} ”جن کے دیکھنے سے اللہ یاد آئے۔“

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ لغت میں ولایت قرب اور محبت کے معنی میں آتا ہے، اس معنی کے اعتبار سے ہر مخلوق کو ولایت حاصل ہے، کیونکہ قرب اور محبت کے بغیر کوئی چیز وجود میں آ ہی نہیں سکتی مگر ظاہر ہے کہ ”اولیاء اللہ“ میں ولایت کا یہ درجہ مراد نہیں اسے ہم ولایتِ عامّہ سے تعبیر کر سکتے ہیں جبکہ یہاں ولایتِ خاصہ مراد ہے جس کا لازمی

{۸۷} "وما تتلوا" من عطف الخاص على العام للاهتمام به (التحرير والتنوير ۲۱۲/۱۱،۶)

{۸۸} (رواه البزار بحواله ابن كثير ۵۵۲/۲)

جزء محبت ہے، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے اور انبیاء میں بھی سب سے اونچا مقام سید الانبیاء ﷺ کا ہے، پھر اس کے نیچے بے شمار درجات ہیں۔

اولیاء اللہ کو حق تعالیٰ سے قرب اور ان کی محبت و عبادت میں فنائیت کا جو مقام حاصل ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ اس حدیثِ قدسی سے ہوتا ہے جس میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ:

''میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے، میں اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں، جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔'' {۸۹}

نفلی عبادت سے بھی زیادہ جس چیز کو ولایت کا رنگ چڑھنے میں عمل دخل ہے وہ اللہ والوں کی محبت، صحبت اور اطاعت ہے، صحابہ کرام کی کایا پلٹ بھی اسی سے ہوئی تھی، بعد والوں کی زندگی میں بھی انقلاب اسی سے آیا۔

﴿۶۴﴾......ان اولیاء کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، دنیا کی زندگی میں اللہ کی مدد، خلافت و حکومت اور حسنِ خاتمہ کی صورت میں {۹۰} اور آخرت میں اجر و ثواب اور جنت کی دائمی نعمتوں کی صورت میں {۹۱} انہیں بشارت حاصل ہوگی۔

﴿لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ کبھی بھی اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا۔

حکمت و ہدایت:

۱......کسی حکم کی حلت و حرمت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔(۵۹)

۲......علاج معالجہ کی غرض سے کسی حلال چیز کو ترک کرنے میں کوئی قباحت نہیں البتہ اعتقاداً ایسا کرنا جائز نہیں۔(۵۹)

۳......اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی نسبت کرنا حرام ہے، اس کا مرتکب اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو خود دعوت دیتا ہے۔(۵۹)

۴......انسان سرتاپا اللہ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔(۶۰)

۵......ایک مومن کے دل میں ہر وقت یہ یقین ہونا چاہیے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اس مراقبے سے غفلت انسان کو گناہوں پر آمادہ کرتی ہے۔(۶۱)

{۸۹}(بخاری ۲، کتاب الرقاق/۹۶۳)
{۹۰} "لهم البشرى في الحيوة الدنيا بالنصر و حسن العاقبة في كل أمرو باستخلافهم في الارض (المراغي ۱۲/۱۳۰)
{۹۱} و ان لهم النعيم الخالد في الآخرة (التحرير والتنوير ۱۱،۶/۲۱۹)

۶......تلاوت کی حالت میں باری تعالیٰ کی خصوصی رحمت بندے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔(۶۱)

۷......انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات ہیں، عقل کا عطیہ، انبیاء کی بعثت، وحی کا نزول اور حرام وحلال کا نظام سب اس کے احسانات ہیں۔(۶۱)

۸......قرآن وسنت کے متعدد نصوص سے "لوحِ محفوظ" کا حق ہونا ثابت ہوتا ہے۔(۶۱)

۹......ولایت کے لیے بنیادی شرط تقوٰی ہے۔

آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اللہ کے ولی کون ہوتے ہیں؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿الّذین یذکر اللہ برؤیتھم.﴾ {۹۲} "وہ لوگ جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آ جائے۔"

۱۰......کرامت کا صدور ولایت کا لازمی جزء نہیں۔{۹۳}

۱۱......اللہ کی ولایت مومنوں کو ہی حاصل ہو سکتی ہے کسی فاسق وفاجر کو حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے عقائد واعمال کی اصلاح کر لے۔

۱۲......اولیاء اللہ کو دنیا وآخرت کی تمام نعمتوں سے بہرہ مند کیا جائے گا۔(۶۴)

معیارِ ولایت:

علامہ محمد جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ نے امام تقی الدین بن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے "اولیاء اللہ" پر مفید بحث فرمائی ہے، ہم اس کا خلاصہ نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں؛ علامہ جمال الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ آیتِ کریمہ اولیاء اللہ کے تعارف میں ایک اساس کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب وسنت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس دنیا میں اگر "اولیاء اللہ" کا طبقہ موجود ہے تو یہ کائنات "اولیاء الشیطان" سے بھی خالی نہیں، چونکہ "اولیاء اللہ" کے بارے میں انسانی ذہنوں میں مختلف قسم کے لغو نظریات اور توہّمات پائے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کی حقیقی پہچان کو سامنے لایا جائے، ولایت کے دعویدار تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں لیکن اصل اور نقل میں پہچان مشکل ہو جاتی ہے، آیئے قرآن وسنت کی روشنی میں معلوم کریں کہ "اولیاء اللہ" کون ہیں اور "اولیاء الشیطان" کون!

مذکورہ آیت ہی کو لے لیجیے جس میں ولایت کے لیے ایمان وتقوٰی کو بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے اور ایمان وتقوٰی کی صفت سے متصف اپنے برگزیدہ بندوں کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں:

{۹۲} (بحوالہ تفسیر منیر ۱۱/۲۱۳)

{۹۳} (بیان القرآن ۱/۵۰۲۰)

﴿من عادی لی ولیًا فقد اذنته بالحرب﴾{۹۴} ”جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت رکھتا ہے میں اس کے لیے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔“

اللہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ جو شخص حقیقی اور عملی طور پر ولی ہوگا وہ اپنی مرضی ومنشاء کو فنا کردے گا، اپنے جذبات کا خون کردے گا اور اللہ کے اوامر ونواہی اس کے شب وروز کا لازمی جزو بن جائیں گے اور جو شخص اللہ کی پسند وناپسند کو اپنی پسند وناپسند پر ترجیح دیتا ہے، اللہ اس سے دشمنی اور عداوت رکھنے والوں کو ضرور بالضرور نمونۂ عبرت بناتا ہے، اللہ قدم قدم پر اپنی نصرت کی نشانیاں اپنے اولیاء کو دکھاتا ہے اور کبھی انہیں ظالم وفاسق لوگوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتا۔

دعوئ ولایت کافی نہیں:

یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت واطاعت کے بغیر ولایت کا ہر دعوی باطل ہے، ایسے کھوکھلے اور بودے دعوے مشرکین اور اہلِ کتاب ہر دو طبقوں نے کیے، یہود، جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر معاذ اللہ! بدکاری کا الزام لگایا، حضرت مریم علیہا السلام کے خلاف زبان درازی کی، وہ کہنے لگے:

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ”ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔“

عمل سے کوسوں دور، ان ظالموں نے جب اتنا بڑا دعوی کیا تو اللہ نے فورًا فرمایا:

﴿فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ﴾{۹۵} ”اگر واقعی ایسا ہے تو پھر وہ تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا کیوں دیتا ہے؟“

تمہاری حالت تو یہ ہے کہ اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے تمہیں طاعون کے عذاب میں مبتلا کیا گیا، بندر اور خنزیر بنائے گئے، بھلا اللہ اپنے اولیاء پر عذاب بھی نازل کیا کرتا ہے؟

عمل سے کورے مشرکین نے سکونتِ مکہ اور بیت اللہ کا پڑوسی ہونے کو بنیاد بنا کر اپنے آپ کو اللہ کا مقرب بتانے کی کوشش کی، اللہ نے ان کی تردید میں یہ آیت اتاری:

﴿وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾{۹۶} ”وہ اس (مسجدِ حرام) کے جائز متولی نہیں، اس کے متولی ہونے کا حق تو صرف اہلِ تقوی کو حاصل ہے۔“

{۹۴} (بخاری ۲، کتاب الرقاق/۹۶۳)
{۹۵} (المائدۃ ۵/۱۸)
{۹۶} (الانفال ۸/۳۴)

منافقین کو دیکھیے تو وہ ظاہراً اسلام و ایمان کے دعوے کرتے نہیں تھکتے لیکن دل سے آپ کی رسالت پر ایمان نہیں لاتے بلکہ کہا کرتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ کی حیثیت نبی کی نہیں بلکہ ایک حاکم کی ہے......!''

یہ یاوہ گوئی بھی ان بدبختوں کے حصے میں آئی کہ:

محمد ﷺ صرف عام لوگوں کے نبی ہیں، خواص کی طرف نہ آپ کو بھیجا گیا اور نہ ہی انہیں آپ کی اتباع کی ضرورت ہے، خواص کی رہنمائی تو اللہ خود کرتا ہے، جیسا کہ حضرت خضر اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ہذیان بھی انہی حرماں نصیبوں کی زبان پر جاری ہوا کہ:

ہم اوامر ونواہی میں کسی کے محتاج نہیں بلکہ ہمیں بالواسطہ اللہ سے رہنمائی ملتی ہے اور یہ کہ خاتم النبیین ﷺ صرف شرائع ظاہرہ کے لیے مبعوث ہوئے، باطنی حقائق اور تزکیہ نفوس کو معاذ اللہ آپ جانتے ہی نہیں یا جانتے ہیں تو ہم سے کم!

تو ظاہراً اللہ کے تقرّب، اس کی محبوبیّت اور اسلام سے لگاؤ کے دعوے کرنے والے یہ یہود و مشرکین اور منافقین چونکہ عمل سے بے بہرہ ہیں اس لیے یہ ''اولیاء اللہ'' کے نہیں بلکہ ''اعداء اللہ'' کے زمرے میں آتے ہیں، ولایت کے لیے عقیدۂ توحید اور وحی کی تعلیمات کی کامل اتباع کے علاوہ کوئی اور میزان نہیں۔

ولایت، عداوت کی ضد ہے، ولایت اپنے دامن میں محبت و طاعت جیسے پاکیزہ جذبات لیے ہوئے ہے اور عداوت، بغض اور رحمتِ الٰہی سے دوری جیسی کثافتوں کا مرکّب ہے۔

حضور ﷺ کی اطاعت، ولایت کا لازمی جزء ہے:

اس کائنات میں انبیائے کرام علیہم الصلوات والتسلیمات سے بڑھ کر کوئی اللہ کا ولی اور مقرب نہیں ہو سکتا، پھر تمام انبیاء میں ولایت اور تقربِ الٰہی کا جو درجہ ہمارے آقا ﷺ کو نصیب ہوا، وہ صرف آپ ہی کا خاصہ ہے، چنانچہ کوئی شخص اس وقت تک اللہ رب العزت کی قربت کے زینے طے نہیں کر سکتا جب تک دل و جان سرکارِ دو عالم کے قدموں میں نچھاور نہ کر دے اور آپ کی محبت و طاعت میں فنا نہ ہو جائے، حبیبِ کبریا کی تعلیمات سے روگردانی کے باوجود حصولِ ولایت کا دعویٰ دیوانے کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔

اسی رحمتِ مجسم کے واسطہ سے ہمیں ایک پاکیزہ اور آسان شریعت ملی، اوامر و نواہی سے آگاہی ہوئی، وعد و وعید سے آشنا ہوئے اور حلال و حرام کی پہچان ہوئی، لہٰذا آپ کی تعلیمات کا انکار کرنے والا شخص تو مومن بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ وہ اللہ کا ولی ہو، اگرچہ مجاہدوں اور ریاضتوں میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔

ولایت کے متعلق متفرّق بحث:

ولایت کا تعلق، ایمان وتقویٰ سے ہے، جو شخص جس قدر ایمان وتقویٰ میں کامل ہوگا اسی قدر ولایت میں بھی کامل ہوگا۔

اولیاء اللہ کے لیے لباس، وضع قطع، بالوں کی خراش تراش وغیرہ میں عام لوگوں سے ممتاز ہونے کی شرط نہیں ہے اس لیے کہ:

کم من صدیق فی قباء...... وکم من زندیق فی عباء

(بہت سے لوگ قباؤں اور کرتوں میں ہوتے ہیں مگر اللہ کے دوست اور صدیق ہوتے ہیں جبکہ ایسوں کی بھی کمی نہیں جو جبّوں اور عباؤں میں ہوتے ہیں مگر زندیق ہوتے ہیں۔)

پھر امتِ محمدیہ کے ہر طبقہ میں اولیاء اللہ پائے جاتے ہیں، علماء، حاملینِ قرآن، مجاہدین، کاشتکار، تاجر، غرضیکہ ہر طبقہ کے لوگ اپنے اپنے شعبہ میں اگر شریعت کا مکمل لحاظ رکھتے ہیں تو اسی کا نام ہی ولایت ہے۔

اللہ کے ولی کیلئے معصوم ہونا بھی شرط نہیں، اس سے غلطی کا صدور ممکن ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی حکم کو امرِ الٰہی سمجھ رہا ہو حالانکہ اس کا شمار منہیات میں سے ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے صادر ہونے والے کسی خارقِ عادت امر کو منجانب اللہ سمجھ کر کرامت کا درجہ دے رہا ہو حالانکہ وہ کرامت نہ ہو بلکہ شیطان کا تصرّف ہو اور شیطان اس کے درجات کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس پر یہ حقیقت منکشف نہ ہو کہ یہ شیطان کی کارستانی ہے۔

ایسی صورت میں کوئی بھی ولی، ولایت کے درجے سے خارج نہیں ہوتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے اس امت سے خطا ونسیان کو معاف فرمادیا ہے۔

جب اللہ کا کوئی مقرّب اور ولی بھی غلطی سے محفوظ نہیں تو پھر آنکھیں بند کر کے اس کے تمام اقوال کی اندھی تقلید و اتباع بھی درست نہیں بلکہ درجۂ ولایت پر فائز کسی شخصیت کو بھی اپنے بارے میں بہت زیادہ حسنِ ظن سے کام نہیں لینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ دل میں آنے والے ہر خیال کو القاء اور الہام سمجھنے لگے بلکہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شب و روز کے لیے اسوۂ رسول ﷺ کو کسوٹی بنائے، جو بات تعلیماتِ محمدیہ ﷺ سے میل کھاتی ہو اسے لے لے اور جو تعارض کے زمرے میں آئے، اسے رد کردے۔

ولایت کے بارے میں تین قسم کے نظریات:

اولیاء کی اتباع میں بھی لوگ افراط وتفریط سے بچ نہیں پائے، اس بارے میں تین قسم کے لوگ اور تین قسم کے

نظریات سامنے آئے ہیں۔

(۱)......پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو کسی کے درجۂ ولایت پر فائز ہونے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس کی اتباع ہر صورت میں لازم ہے چاہے وہ کسی خلافِ شرع کام کا حکم ہی کیوں نہ دے۔

(۲)......دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو معمولی سی خطا اور غلطی دیکھ کر کسی کو ولایت کے رتبہ سے گرا دیتے ہیں۔

(۳)......تیسرے درجے پر اعتدال پسند طبقہ آ جاتا ہے۔ایسے لوگ اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ اللہ کے کسی ولی سے خطا اور غلطی بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ وہ ان کی موافقِ شرع باتوں کو بسر و چشم تسلیم کر لیتے ہیں اور مخالفِ شرع اقوال کو رد کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگ نہ تو کسی ولی کو واجب الاتباع سمجھتے ہیں اور نہ ہی کسی ایک غلطی کی وجہ سے کسی کی ولایت کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں، یہی طبقہ خیر اور بھلائی کی راہ پر ہے۔

اس میں شک کی ادنیٰ گنجائش نہیں کہ صحابہ کرام اس کائنات کے سب سے بڑے ولی تھے اور ولایت کے لوازمات کو جس قدر انہوں نے اہمیت دی اور جو لحاظ انہوں نے رکھا، قیامت تک کوئی بڑے سے بڑا ولی، قطب اور ابدال اس کا تصور نہیں کرسکتا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بارے میں حسنِ ظن اور غلط فہمی و خوش فہمی کا شکار نہ تھے۔

آپ اندازہ کیجیے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں جانِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لقد کان فیما قبلکم من الأمم ناس محدّثون فان یّک من أمّتی لکان عمر﴾{۹۷}

''اے میرے صحابہ! تم سے پہلی امتوں میں بھی ''محدّث'' رہے ہیں اور میری امت میں اگر کوئی اس عظیم مرتبے پر فائز ہے تو وہ ''عمر'' ہے۔''

محدّث کسے کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں:

(۱) وہ شخص جس کے دل میں ملأ اعلیٰ سے کوئی بات القاء کی جائے۔

(۲) وہ ہستی، جو نبی تو نہ ہو لیکن اس کے باوجود فرشتے اس سے کلام کریں۔{۹۸}

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس شخصیت کو ملأ اعلیٰ سے القاء ہو یا فرشتوں سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہو، اسے کسی اور کی طرف رجوع کی کیا حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے، بعض امور میں ان کی طرف مراجعت فرماتے اور مختلف فیہ مسائل میں خود دلیل دیتے اور دیگر صحابہ کرام

{۹۷} (بخاری ا، کتاب المناقب/ ۵۲۱)

{۹۸} (دیکھیے بخاری جلد اول/ ۵۲۱، حاشیہ ۲)

کے دلائل سنتے اور بعض اوقات ان کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتے، آپ نے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ میں تو محدّث ہوں، مجھے تو ملأ اعلیٰ سے القاء ہوتا ہے لہٰذا تم میری بات مانو اور میرے ساتھ معارضہ نہ کرو، اور آپ اس کا اظہار فرماتے بھی کیوں جبکہ آپ کی تربیت رحمتِ دوعالم ﷺ نے فرمائی، تواضع کی یہ وہی جھلک ہے جو آقا کی زندگی میں قدم قدم پر نظر آتی ہے، پھر یہ عقیدہ بھی مرادِ رسول ﷺ پر کھل چکا تھا کہ کوئی شخص محدّث ہونے کے باوجود بھی معصوم نہیں ہوسکتا، اس لیے بھی آپ صحابہ کی طرف مراجعت میں عار محسوس نہ فرماتے تھے۔

کیا اس کائنات میں کوئی صحابہ کے مقام تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا کوئی درجۂ ولایت میں ان کا ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ یقیناً نہیں! تو پھر کس قدر ضلالت میں ہیں وہ لوگ جو ہیں تو گمراہ مگر دعوٰی ولایت کا کرتے ہیں اور اس بے باکی اور گستاخی کی سزائیں پاتے ہیں کہ سلبِ توفیق کا شکار ہوجاتے ہیں، چنانچہ نماز، روزہ، غیرمحرموں سے پردہ، یہ سب کچھ ان کی لغت سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے، اللہ، ایمان کے ان دشمنوں سے ہماری اور ہماری قوم کی حفاظت فرمائے۔ ایسے ننگِ انسانیت جو کتاب وسنت کو پسِ پشت ڈال کر ولایت کے گھمنڈ میں مبتلا ہیں، انہیں بزرگوں کے ان اقوال کو سامنے رکھنا چاہیے:

حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿عِلْمُنا مقيّد بالكتاب و السنّه﴾ ”ہمارا علم کتاب وسنت کی تعلیمات میں بند ہے۔“

ابوعثمان نیشاپوری فرماتے ہیں:

”جو شخص قولاً وفعلاً سنت کو لازم پکڑ لیتا ہے، اس کی زبان حکمت کے موتی بکھیرتی ہے اور جو قولاً وفعلاً خواہشات کا غلام ہوتا ہے اس کا قلم اور زبان بدعات کی ترویج ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔“

ابوعمرو بن نجید کا یہ قول بھی بہت اہم ہے جس میں انہوں نے فرمایا:

”ہر وہ دعوٰی اور خیال جو کتاب وسنت سے متعارض ہو، اس کے بطلان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔“

الغرض اولیاء اللہ اپنے اعمال وافعال سے پہچانے جاتے ہیں، ان کے بدن سے سرزد ہونے والا ایک ایک عمل کتاب وسنت کی ترجمانی کررہا ہوتا ہے، وہ کچھ کہنے کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ نورِ ایمان خود ان کی پہچان کرواتا ہے، باطنی طہارت اور شرائعِ اسلام کی پابندی کی وجہ سے خلقِ خدا ان کی گرویدہ بن جاتی ہے جبکہ وہ لوگ جو تعلقات میں کسی کی اصلاح کا پہلو کم اور اپنے مفادات کا خیال زیادہ رکھتے ہوں، ان کی لمبی لمبی مجالسِ وعظ بھی تاثیر کے عنصر سے خالی ہوتی ہیں اور عقلِ سلیم رکھنے والے لوگ ان کے حلقۂ مریدین سے آہستہ آہستہ کٹ جاتے ہیں، بالکل ایسے جیسے خشک

ریت مٹھی سے سرک جایا کرتی ہے، البتہ عقل کے اندھے ان کے دامِ فریب کے مستقل شکاری بن جاتے ہیں۔

الغرض، ولایت اور دین سے دوری ایسی دو ضدیں ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتیں، جو شخص طہارت سے بھاگتا اور نجاست کی رغبت رکھتا ہو، جو طیبات کے استعمال پر خبائث کو ترجیح دیتا ہو، جس پر ایمان کی بات گراں گزرے اور رقص و سرود کا رسیا ہو، جس کے پاؤں مسجد کے تصوّر سے ٹوٹتے ہوں اور دم گھٹتا ہو لیکن شباب و کباب کا نام سن کر اس کی طبیعت میں نشاط آجاتا ہو، جو بے پردگی کو اپنے حلقۂ ارادت کا جزء لاینفک سمجھتا ہو، جس کی نظر ہر آن اور ہر لمحہ بہکتی ہو اور جس کی زبان ہذیان بکتی ہو، اس کے ولی اللہ ہونے کا ایک منٹ کے لیے بھی تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔{۹۹}

اقبال نے ایسے ہی لوگوں کو یوں بے نقاب کیا ہے، کہتے ہیں:

سمجھا ہے کہ ہے راگ، عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
گانا ہے جو شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے جہلاء{۱۰۰} کی ہے پرانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

ولی کی اصطلاح کے بارے میں اسلاف کے اقوال:

آج کل ولی کو تصوف و طریقت میں ایک خاص اصطلاح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی اسلافِ امت کے اقوال سماعت فرمائیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں:

''ایک وہ، جس کی تلقین وحیِ الٰہی اور تعلیماتِ انبیاء نے فرمائی ہے اور دوسرے وہ، جسے الہام اور معارفِ اولیاء نے متعین کیا ہے۔''

{۹۹}(تفسیر القاسمی ۹/۵۰-۵۹)
{۱۰۰} یہاں مقام کی مناسبت سے لفظ ''جہلاء'' کو ''شعراء'' کی جگہ لایا گیا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ ''مبادیٔ تصوف'' میں رقمطراز ہیں:

''سلوک دو قسم پر ہے، سلوکِ نبوت اور سلوکِ ولایت! اور دونوں کے آثار و خواص جدا جدا ہیں۔''

صوفیاء کی اصطلاح میں ولی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی کو ولایتِ خاصہ کہتے ہیں، جس کی تعریف حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''قصد السبیل'' میں یوں فرمائی ہے۔

''ان مذکورہ باتوں کے ساتھ ظاہر کو نفلی عبادتوں میں اور باطن یعنی دل کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھے، کسی دم غافل نہ ہو۔''{۱۰۱}

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیرِ مظہری میں لکھتے ہیں:

''کم سے کم چیز جسے صوفیہ کی زبان میں ولایت کہا جاتا ہے اور یہی قرآن کی آیت میں اولیاء اللہ سے مراد ہے، یہ ہے کہ دل یادِ الٰہی میں مستغرق ہو، اللہ کی محبت سے لبریز ہو اور اس میں کسی اور کی گنجائش ہی نہ ہو، اس کی مخلوق سے محبت و بغض کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہو۔''{۱۰۲}

کشف و کرامت، ولایت کا لازمی جزء نہیں:

یہاں ایک اور اہم وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ ہمارے معاشرے میں آج کل ولایت کا کچھ اور ہی تصوّر ہے، قرآنی تعلیمات سے دوری اور درسِ قرآن کے حلقوں کی کمی کی وجہ سے لوگوں میں ایمان و یقین کی انتہائی کمزوری پیدا ہو چکی ہے اور انہوں نے کسی بھی معاملے کو پرکھنے کے لیے قرآن و سنّت کو کسوٹی اور میزان سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور اس کے برعکس وہ بے سند باتوں، غلط سلط نظریات اور فضول قصّے کہانیوں کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھنے لگے ہیں۔

اولیاء اللہ کی بنیادی صفات، جو قرآن نے بتائیں، وہ ایمان اور تقویٰ ہیں جبکہ عوام کسی کی ولایت کو ماننے کے لیے اس وقت تک تیار نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے سامنے اس کی کرامات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

عام لوگ کشف و کرامت کو ولایت کی خصوصی نشانی سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ بہت سے اولیاء کشف سے خالی ہوتے ہیں اور کبھی بطور استدراج دوسرے لوگوں میں اولیاء کے علاوہ بھی خرقِ عادات اور انکشافِ غیبی پایا جاتا ہے، اس لیے کشف و کرامت معیارِ ولایت نہیں۔{۱۰۳}

{۱۰۱} (معالم القرآن ۱۱/۲۶۰ ومابعدها، مولانا محمد علی الصدیقی رحمہ اللہ)
{۱۰۲} (مظہری ۵/۵۱۸)
{۱۰۳} (مظہری ۵/۵۲۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾{۱۰۴}

''آپ کہہ دیجیے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں (مگر مجھے یہ امتیاز ہے کہ) میرے پاس وحی آتی ہے۔''

دوسری جگہ آپ کی زبان سے کہلوایا:

﴿وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ﴾{۱۰۵}

''اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سا نفع حاصل کر لیتا۔''

سورۂ انعام کی آیت (۱۰۹) میں خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ﴾{۱۰۶}

''ان سے کہہ دیجیے کہ نشانیاں دکھانا تو اللہ کے اختیار میں ہے۔''

ولایت......احادیث کے آئینے میں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شھدا، لیکن قیامت کے دن ان کے مرتبۂ قرب کو دیکھ کر انبیاء و شھداء ان پر رشک کریں گے۔''

صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟

آپ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ محض اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں، نہ ان کی آپس میں رشتہ داریاں ہوں، نہ مالی لین دین (کہ قرابت یا مالی لالچ کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے محبت ہو) اللہ کی قسم! ان کے چہرے (قیامت کے دن) مجسم نور ہوں گے، جب لوگوں کو عذاب کا خوف ہوگا، ان کو خوف نہ ہوگا اور جب اور لوگ غم میں مبتلا ہوں گے تو وہ غمگین نہیں ہوں گے۔'' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾{۱۰۷}

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اولیاء اللہ کون ہوتے ہیں؟

آپ نے جواب ارشاد فرمایا کہ جن کو دیکھنے سے اللہ کی یاد آتی ہے۔{۱۰۸}

{۱۰۴} (الکھف ۱۱۰/۱۸)
{۱۰۵} (الاعراف ۱۸۸/۷)
{۱۰۶} (الأنعام ۱۰۹/۶)
{۱۰۷} (مستدرک حاکم ۱۷۰/۴، مسند احمد ۳۴۳/۳)
{۱۰۸} (رواہ البزار بحوالہ ابن کثیر ۵۵۲/۲)

ایک حدیثِ قدسی میں اللہ نے اسی مضمون کو اس پیرائے میں بیان فرمایا کہ:

''میرے بندوں میں میرے اولیاء وہ ہیں جن کی یاد میرے ذکر سے اور میری یاد ان کا ذکر کرنے سے ہوتی ہے۔'' {۱۰۹}

ترمذی کی روایت، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، اس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

اللہ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل کو طلب کر کے حکم دیتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر جبرئیل آسمان پر ندا دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو، اللہ کے ارشاد کے مطابق آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین والوں میں بھی اس کو مقبولیت عطا کر دی جاتی ہے۔

اور جب اللہ کسی بندہ سے نفرت کرنے لگتا ہے تو جبرئیل کو طلب فرما کر حکم دیتا ہے کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اس سے نفرت کرو، حکم کے مطابق حضرت جبرئیل اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر حضرت جبرئیل آسمان والوں کو ندا کرتے اور کہتے ہیں کہ:

''اللہ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اس سے نفرت کرو، لہٰذا آسمان والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، اور پھر زمین والوں کے دلوں میں بھی اس کی نفرت پیدا کر دی جاتی ہے۔ {۱۱۰}

ولیِ کامل کی دس صفات:

یہاں ان دس (۱۰) صِفات کا ضبطِ تحریر میں لانا بھی بہت مفید معلوم ہوتا ہے، جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں:

۱......ضرورت کے موافق علم ہو۔

۲......عقیدہ، عمل اور عادت شریعت کے موافق ہو۔

۳......دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو اور کمال کا دعوٰی نہ کرتا ہو۔

۴......کسی کامل کا صحبت یافتہ ہو۔

۵......اس زمانے کے جو عالم اور درویش، منصف مزاج ہوں، وہ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

{۱۰۹} (بغوی بحوالہ مظہری ۵/۵۲۱)

{۱۱۰} (ترمذی ۲، ابواب التفسیر/۱۴۹)

۶......عام لوگوں کی بہ نسبت خاص لوگ اس کے زیادہ معتقد ہوں۔

۷......اس کے تربیت یافتہ اور صحبت یافتہ افراد، اکثر پابندِ شریعت ہوں اور دنیا کے طامع (لالچی) نہ ہوں۔

۸......وہ اپنے طالبوں کی تربیت جی سے کرتا ہو اور چاہتا ہو کہ یہ صالح ہو جاویں۔

۹......اس کے پاس چندروز کے بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی محسوس ہو۔

۱۰......وہ خود بھی صاحبِ ذکر و فکر ہو۔

جس شخص میں یہ نشانیاں ہوں پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت ظاہر ہوتی ہے یا نہیں، وہ ولی ہے، اس کے دم کو غنیمت جانے، ایسے ہی لوگ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ" کی عملی تفسیر ہیں۔{۱۱۱}

اولیاء اللہ کیلئے دنیوی واخروی سعادت کا وعدہ:

ایسے ہی سعادت مندوں کے لیے دنیوی واخروی بشارتیں ہیں، دنیا میں یہ بشارت ہمارے آقا نے تمام صحابہ کرام کو عموماً اور بعض صحابہ کرام کو خصوصاً عطا فرمائی، مثلاً عشرہ مبشرہ کے نام لے لے کر آپ نے ان کو جنت کی بشارت سنائی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو جنتی نوجوانوں کا سردار قرار دیا، حضرت عبداللہ بن سلام کے جنتی ہونے کی بشارت سنائی، اسی طرح تین خوش نصیب صحابیوں یعنی حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہم کی بابت زبانِ نبوّت نے ارشاد فرمایا کہ جنت ان تینوں کی مشتاق ہے۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا اسید بن حضیر کیسا اچھا آدمی ہے؟ ثابت بن قیس کیسا اچھا آدمی ہے؟ معاذ بن جبل کیسا اچھا آدمی ہے؟ معاذ بن عمرو بن جموح کیسا اچھا آدمی ہے؟ (رضی اللہ عنہم) ان خصوصی بشارات کے علاوہ "خیر القرون قرنی" میں سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں عمومی بشارت موجود ہے۔

مزید برآں "لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ" کی بشارت، موت کے وقت فرشتوں کا "وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ"{۱۱۲} کہنا، سچے خوابوں کا انہیں نظر آنا یا ان کی نسبت دوسرے اللہ والوں کو خواب دکھائی دینا، عوام وخواص میں مقبولیت اور لوگوں کی زبان پر ان کے لیے مدح وثناء اور ذکرِ خیر کا جاری ہونا، یہ سب دنیوی بشارات میں داخل ہیں۔

اور اخروی بشارت یہ کہ جان نکلتے وقت مؤمن کی روح کو قربِ الٰہی کی طرف لے جایا جاتا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے، اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے، اور جو شخص اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ

{۱۱۱} (معالم القرآن ۷۲/۱۱، مولانا محمد علی الصدیقی رحمہ اللہ)

{۱۱۲} (حم السجدۃ ۳۰/۴۱)

بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔''

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ''ہم میں سے کوئی بھی موت کو پسند نہیں کرتا۔'' فرمایا: ''جب مومن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اس کو اللہ کی خوشنودی اور رحمت کی بشارت دی جاتی ہے، پس وہ اللہ سے ملنے کا خواستگار ہو جاتا ہے۔ اور کافر کو موت کے وقت اللہ کے عذاب اور سزا کی اطلاع دی جاتی ہے چنانچہ اس پر اللہ کی ملاقات ناگوار گزرتی ہے اور اللہ بھی اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔'' {۱۱۳}

خود قرآن میں اولیاء اللہ کے لیے یہ اخروی بشارت یوں منصوص ہے:

﴿بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''آج تمہارے لیے ایسے باغات کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔''

لیکن جنت اور حور وقصور کی عظیم نعمتوں کے حصول کے باوجود، اس میں شک ہی کیا ہے کہ اولیاء اللہ کے لیے بلکہ سارے جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت، اللہ کی رضا ہوگی جو ان کی نظروں میں دیگر انعامات کو ماند کر کے رکھ دے گی۔ (اللّٰھمّ اجعلنا منھم)

عزت وسلطنت اللہ کے لیے ہے

﴿۶۵......۶۷﴾

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ

اور رنج مت کر ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کے لیے ہے وہی ہے سننے والا جاننے والا O سنتا ہے اللہ

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے زمین میں اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا

شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ

شریکوں کو پکارنے والے سو یہ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں O وہی ہے جس نے بنایا

لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو اس میں اور دن دیا دکھلانے والا بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے

يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

جو سنتے ہیں O

{۱۱۳} (مسلم ۲، کتاب الذکر/۳۴۳، نسائی ۱، کتاب الجنائز/۲۶۰)

ربط: سورۂ یونس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرکین کے مختلف شبہات ذکر کرنے کے بعد ان کے جوابات دیئے ہیں، یہاں اللہ اپنے پیغمبر کو تسلی دے رہے ہیں کہ ان شبہات سے پریشان نہ ہوں۔

تسہیل: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ صاحبِ اولاد ہے، اس کی ذات پاک ہے اور وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، تمہارے پاس اس دعوے پر کوئی بھی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ کی طرف ایسی بات کی نسبت کرتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ O کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے O ان کے لیے دنیا میں تھوڑے سے فائدے ہیں پھر بالآخر انہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، تب ہم ان کے کفر کی وجہ سے انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے O

﴿تفسیر﴾

﴿۶۵﴾......نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو صبر اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکّل کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ان کی طعن وتشنیع اور کفریات سے آپ کو کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں، یہ اپنی سازشوں اور مکروفریب سے آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، اس لیے کہ عزّت وذلت کا تعلق کسی انسان کی خیر خواہی اور بدخواہی سے نہیں بلکہ اس کا کلّی اختیار صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے، اطاعت گزار اور نافرمان سب اس کے دائرۂ قوّت میں ہیں، وہ ان کی خفیہ تدبیروں سے علماً اور سمعاً خوب واقف ہے (جانتا بھی ہے سنتا بھی ہے) لہٰذا ضرور مخلصین کے لیے راہِ نجات نکالے گا۔

﴿۶۶﴾......زمین وآسمان کی تمام قوتیں اس کی ملکیت ہیں، خاکی انسان، ناری جنّات اور نُوری فرشتے سب اسی کے مملوک ومحکوم ہیں لہٰذا اب یہ سوال ہی ختم ہوگیا کہ کوئی ایسا حاکم بھی موجود ہے جو جزا وسزا دینے میں اللہ کے لیے رکاوٹ پیدا کرسکے۔

﴿وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ......الخ﴾ اپنے خودساختہ معبودوں کو اللہ کی بندگی میں حصہ دار بنانے والے یہ مشرکین وہم وگمان کے پجاری ہیں، خالقِ لیل ونہار کی پرستش ان پر گراں گزرتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی مورتیوں کے سامنے ماتھا ٹیکنا ان کی فطرتِ بد کو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٥﴾﴾ {۱۱۴}

''اور جب بھی ''ایک اللہ'' کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل بیزار ہوجاتے ہیں، اور جب اس کے علاوہ دیگر کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔''

{۱۱۴} (الزمر ۳۹/۴۵)

کفر وشرک کے اندھیروں میں بھٹکنے والے یہ لوگ اپنے شرک پر کوئی بھی دلیل پیش نہیں کر سکتے، یہ فقط اپنے ظنِ فاسد کی اتباع میں لگے ہوئے ہیں اور جہالت کی وجہ سے اللہ کے اختیارات اللہ کے بندوں میں بانٹتے پھرتے ہیں۔

﴿٦٧﴾......اب کائناتی کرشموں کا ذکر کر کے مشرکین کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کیا اس کائناتی حرکت وسکون میں بھی تمہیں اپنے خود تراشیدہ خداؤں کا کوئی عمل دخل نظر آتا ہے؟ وقت کے دوحصے فرما کر ایک کو سیاہ نقاب اوڑھا دیا گیا اور دوسرے کو آفتاب کی ضیا پاشیوں سے منور کر دیا گیا، رات کا تاریک اور خنک ماحول تمہاری استراحت کے لیے ہے اور دن کا اجالا امورِ دنیا نمٹانے کے لیے......!

یہ خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کا ادنیٰ سا کرشمہ اور ایسی دلیلِ ہدایت ہے جو تمہاری زندگی کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......سچے داعی کو اللہ کی نصرت کا مکمل یقین ہوتا ہے اس لیے وہ مخالفین کے بڑے سے بڑے پروپیگنڈے سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔(٦٥)

۲......حقیقی عزت اللہ عزّ وجل کو حاصل ہے، اللہ کے ماسوا کی جو عزّت بظاہر نظر آتی ہے وہ بھی حقیقت میں اللہ کی عزت ہے اور وہ غیر اس عزّت کا مظہر ہے جیسے ضیاء درحقیقت آفتاب کی صفت ہے اور زمین پر ایک گونہ تعلق سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔{۱۱۵}

۳......اس وضاحت کے بعد یہ اشکال دور ہو جانا چاہیے کہ سورۃ المنافقون میں اللہ خود فرماتے ہیں کہ:

"عزت اللہ کے لیے اور اللہ کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔"{۱۱٦}

کیونکہ جو عزت اللہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ہو وہ حقیقت میں اللہ ہی کی عزت ہوتی ہے۔

۴......دنیا میں جہاں بھی اور جس صورت میں بھی غیر اللہ کی عبادت کی جارہی ہے، اس پر عبادت کرنے والوں کے پاس سوائے توہمات کے کوئی ٹھوس دلیل نہیں۔(٦٦)

۵......مظاہرِ قدرت کا حق تعالیٰ شانہٗ کے حکم کے تابع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔(٦٧)

٦......اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کے نظام میں انسانوں کے لیے بے پناہ فوائد اور حکمتیں رکھی ہیں، انسان کے پاس

{۱۱۵} (بیان القرآن ۱۰۵/۲ج۲)
{۱۱٦} وللّٰہ العزّۃ ولرسولہ وللمؤمنین (المنافقون ٦٣/٨)

صرف دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان ہونے چاہئیں۔(۶۷)

۷......دن امورِ دنیا نمٹانے کے لیے ہے لہٰذا اس میں دینوی کام کر لینے چاہئیں اور رات آرام کے لیے ہے اس لیے رات کو سورہنا ہی مصلحتِ الٰہیہ کی موافقت ہے، ہمارے معاشرے میں اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے۔(۶۷)

مشرکین کا افتراء

﴿۶۸......۷۰﴾

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ

کہتے ہیں ٹھہرا لیا اللہ نے بیٹا وہ پاک ہے وہ بے نیاز ہے اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

زمین میں نہیں تمہارے پاس کوئی سند اس کی کیوں جھوٹ کہتے ہو اللہ پر جب بات کی تم کو خبر نہیں ۝

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا

کہہ جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ بھلائی نہیں پاتے ۝ تھوڑا سا نفع اٹھا لینا دنیا میں

ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

پھر ہماری طرف ہے اُن کو لوٹنا پھر چکھائیں گے ہم ان کو سخت عذاب بدلہ ان کے کفر کا ۝

ربط: سابقہ آیات میں بھی شرک اور مشرکین کی تردید اور مذمت تھی یہاں بھی وہی مضمون ہے۔

تسہیل: بعض لوگ کہتے ہیں اللہ بھی اولاد رکھتا ہے، وہ ہر قسم کے نقص سے پاک بھی ہے اور سب سے بے نیاز بھی ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، اس دعویٰ پر تمہارے پاس کوئی بھی دلیل نہیں، کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ ۝ آپ فرما دیجیے کہ یقیناً جو لوگ اللہ کی طرف جھوٹی باتوں کی نسبت کرتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے ۝ ان کے لیے دنیا میں تھوڑے سے فائدے ہیں پھر بالآخر انہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، تب ہم ان کے کفر کی وجہ سے انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے ۝

تفسیر

﴿۶۸﴾......اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ہونے کا بے بنیاد دعویٰ مشرکین بھی کرتے تھے اور یہود و نصاریٰ بھی، یہودیوں کا ایک فرقہ حضرت عزیر علیہ السلام کو، عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

﴿وَلَدًا﴾ کا لفظ مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی لیے ہم نے ترجمہ میں ''ایک بیٹا'' کے بجائے ''اولاد'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اللہ کے لیے اولاد ثابت کرنے میں مشرکین کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ وہ ہے جو اللہ کے لیے ویسے ہی اولاد ثابت کرتا ہے جیسے انسانوں کے لیے حقیقی اور صلبی اولاد ہوتی ہے، دوسرا گروہ ''تبنیت یا اتخاذیت (Adoptionism) کا عقیدہ رکھتا ہے یعنی جنہیں اللہ نے اپنی اولاد قرار دیا وہ اللہ کی حقیقی اولاد نہیں بلکہ اس نے انہیں اولاد بنالیا جیسے انسان کسی کو اپنا متبنّٰی بنالیتے ہیں، ناچیز کا خیال ہے کہ جن قوموں کے ہاں اللہ کے لیے اولاد کا عقیدہ پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ''تبنیت'' پر ہی مبنی ہے۔ واللہ اعلم

مسیحیوں کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے بتاتے ہیں کہ ان کے ہاں اتخاذیوں کے نام سے ایک فرقہ گزرا ہے، اس کا عقیدہ ''اتخاذیت اور تبنیت'' ہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ شروع سے خدا تھے اور نہ ہی بطور خدا پیدا ہوئے تھے، اصل میں تو وہ انسان ہی تھے مگر اقنومِ ثالث یعنی روح القدس کے فیضان کی وجہ سے ان کے اندر روحِ الٰہی ایسے حلول کرگئی کہ اقنومِ اوّل یعنی خدائے برتر نے انہیں اپنا بیٹا قرار دے کر الوہیت میں شریک کرلیا، اب ان کے اندر ربوبیت، خالقیت، رزاقیت اور مالکیت وغیرہ تمام صفاتِ الٰہی پائی جاتی ہیں۔

اس آیت میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یعنی ''اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا'' ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے ''اتخاذیوں'' کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ ان کے باطل کلام پر تعجب کے لیے یہ لفظ لایا گیا ہے، اتخاذیوں اور اثباتیوں کو تنبیہ ہے کہ ایک طرف اللہ کو اللہ بھی جانتے ہو اور دوسری طرف انسانوں کی طرح اس کے لیے اولاد بھی ثابت کرتے ہو، اولاد منہ بولی ہی سہی اسی کے لیے ہوتی ہے جس کے لیے اولاد کا ہونا ممکن ہو یا جسے بڑھاپے یا بیماری اور کمزوری میں کسی سہارے کی محتاجگی کا احساس ہو جبکہ اللہ کا باپ ہے نہ اولاد اور نہ ہی وہ کسی کا محتاج ہے کہ بے اولاد انسانوں کی طرح کسی کو گود لے کر اسے اپنی لاولدی کی تلافی کرنی پڑے۔

﴿هُوَ الْغَنِيُّ﴾ وہ اپنے ماسوا سے بے نیاز ہے، سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔

جو حقیقی غنی اور بے نیاز ہوگا نہ اس کا باپ ہوگا نہ ماں اور جو والدین سے پاک ہوگا وہ اولاد سے بھی پاک ہوگا۔

اور جو غنی ہوگا وہ قدیم اور ازلی ہوگا، اس پر فنا نہیں آسکتی، اولاد اسی کی ہوتی ہے جو فنا کی زد میں آسکتا ہو۔

جو مطلق غنی ہوگا وہ واجب الوجود ہوگا، اگر بالفرض اللہ کی اولاد تسلیم کرلی جائے تو وہ بھی واجب الوجود ہوگی

اولاد باپ ہی کے مساوی ہوتی ہے، اگر اولاد کا واجب الوجود ہونا تسلیم کیا جائے تو کسی دوسرے سے اس کا پیدا ہونا محال ہوگا اس لیے کہ جو واجب الوجود ہوگا وہ ہمیشہ سے ہوگا اور ہمیشہ رہے گا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ پہلے نہیں تھا اور اب وجود میں آ گیا۔

قرآن کی جامعیت اور معنویت کا اندازہ کیجیے کہ "الغنی" کے لفظ سے کیا کچھ ثابت {۱۱۷} ہوگیا۔

﴿لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اس کائنات میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے، مخلوق کے ساتھ اس کا رشتہ مالک اور مملوک کا ہے، باپ اور اولاد کا نہیں، سارے اولیاء اور انبیاء، انسان، جن اور فرشتے اس کی ملکیت ہیں، وہ اپنی کائنات میں جو چاہے تصرف کرتا ہے، جن کمزوریوں کی وجہ سے انسان اولاد کا محتاج ہوتا ہے ان میں سے کوئی کمزوری بھی اس کے اندر نہیں پائی جاتی۔

﴿اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا﴾ اے مشرکو! ایک طرف عقیدۂ توحید ہے جس پر بے شمار نقلی اور عقلی دلائل قرآن میں مذکور ہیں، دوسری طرف تمہارے شرکیہ دعاوی ہیں جن پر جھوٹ، بہتان اور افتراء کے سوا کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر ایسا قول جس پر کوئی دلیل نہ ہو وہ جہالت ہے اور عقائد کے لیے قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے ان میں تقلید کی بالکل گنجائش نہیں۔ {۱۱۸}

﴿۶۹﴾...... اپنی طرف سے جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرنے والوں کو حقیقی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی، "فلاح" ایسا لفظ ہے جس میں دنیا اور آخرت کی ساری سعادتیں آ جاتی ہیں، ائمہ لغت کا اتفاق ہے کہ ہر قسم کی خیر کو بیان کرنے کے لیے فلاح سے جامع لفظ کوئی نہیں۔ {۱۱۹}

﴿۷۰﴾...... جھوٹ گھڑنے والوں کی عیاشیوں، فحاشیوں، حرام کاریوں اور شہوت رانیوں کو دیکھ کر کوئی اس دھوکہ میں مبتلا نہ ہو جائے کہ انہیں فلاح حاصل ہے، یہ فلاح نہیں دنیا کا بہت قلیل {۱۲۰} متاع ہے جو انہیں چند روزہ زندگی میں حاصل ہے۔ یہ متاع قلیل بھی قلیل کو حاصل ہے سب کو نہیں، ان کی اکثریت حسرتوں کے صحراء میں سسک سسک

{۱۱۷} فثبت ان كونه تعالىٰ غنيا من اقوى الدلائل على انه تعالىٰ لاولد له (كبير ۶، ۱۷/ ۱۳۲)

{۱۱۸} "أتقولون على الله مالاتعلمون" فيه دليل علىٰ أن كلّ قول لادليل عليه فهو جهالة وأن العقائد لابدلها من قاطع وان التقليد فيها غير سائغ (بيضاوى ۳/ ۲۰۸)

{۱۱۹} ليس في كلام العرب كله اجمع من لفظة الفلاح لخيري الدنيا والآخرة [illegible] العروس بحواله ماجدى ۱/ ۵۴)

{۱۲۰} والتنوين للتحفير والتقليل (روح المعانى ۷، ۱۱/ ۲۲۸)

کر مر جاتی ہے اور جنہیں یہ متاعِ قلیل اور عیاشی کے مواقع حاصل ہیں ان کا حال بھی یہ ہے کہ امراضِ خبیثہ کی کثرت، قلبی بے سکونی، خاندانی نظام کی ابتری، آرزوؤں کی پامالی اور بے مقصد سفرِ زندگی بسا اوقات انہیں خودکشی پر مجبور کر دیتا ہے، اس "متاعِ قلیل" کی خاطر انہوں نے آخرت کی زندگی تو تباہ کر ہی لی دنیا میں بھی انہیں حقیقی مسرت اور سچا سکون حاصل نہ ہوسکا۔

حکمت وہدایت:

۱......آیت ۶۸ میں اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کے باطل ہونے کے لیے پانچ دلائل مذکور ہیں:

(۱) "سُبْحٰنَهٗ" کیا بیوی اور بچے، کیا شریک اور مشیر وہ سب سے پاک ہے۔

(۲) "الْغَنِيُّ" وہ مطلقاً اپنے ماسوا سے بے نیاز ہے۔

(۳) "لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" ارض وسما میں جو کچھ ہے اسی کی ملکیت اور اسی کی مخلوق ہے اور سب اسی کے بندے ہیں۔

(۴) "اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا" مشرکوں کے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی بھی دلیل نہیں ہے{۱۲۱} اور ایسا دعویٰ باطل ہوتا ہے جو دلیل کے بغیر ہو۔

(۵) "اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" انسان کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس کا اسے علم ہی نہ ہو، اولاد کا ہونا مجانست اور مشابہت کا تقاضا کرتا ہے جبکہ نہ کوئی اللہ کا ہم جنس ہے اور نہ ہی اس کے مشابہ۔

۲......اللہ پر جھوٹ گھڑنے والوں کو نہ دنیا میں کوئی خیر حاصل ہوتی ہے اور نہ آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ (۶۹)

۳......اگر کسی کو دنیا کی ساری مادی نعمتیں بھی مل جائیں تو بھی وہ اخروی نعمتوں کے مقابلے میں حقیر اور قلیل ہیں۔ (۷۰)

تذکرۂ حضرت نوح علیہ السلام

﴿۷۱......۷۴﴾

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ

اور سنا ان کو حال نوح کا جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے تم پر میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے تو

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ

میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ پھر کر

{۱۲۱} "من" زائدۃ لتاکید النفی (روح المعانی ۷/۱۱/۲۲۷)

غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ

گزرو میرے ساتھ اور مجھ کو مہلت نہ دو O پھر اگر منہ پھیرو گے تو میں نے نہیں چاہی تم سے مزدوری میری مزدوری ہے

اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ

اللہ پر اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں فرمانبردار O پھر اس کو جھٹلایا سو ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے

فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰھُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ

کشتی میں اور ان کو قائم کر دیا جگہ پر اور ڈبو دیا ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کا

عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَاۗءُوْھُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

جن کو ڈرایا تھا O پھر بھیجے ہم نے نوح کے بعد کتنے پیغمبران کی قوم کی طرف پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں سوان سے

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

یہ نہ ہوا کہ ایمان لے آئیں اس بات پر جس کو جھٹلا چکے تھے پہلے سے اسی طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں دلوں پر حد سے نکل جانے والوں کے O

ربط: مشرکینِ عرب کے عناد، شبہات اور تکذیب کی تردید کے بعد خاتم النبیین ﷺ کی تسلی کے لیے بعض دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات ذکر کیے جا رہے ہیں۔

تسہیل: اے میرے پیغمبر! آپ کفارِ مکہ کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سنائیے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا، اے میری قوم! اگر تمہارے درمیان میرا قیام کرنا اور اللہ کی آیات کے ذریعے وعظ و نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں صرف اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں، تو ایسا کرو کہ اپنے معبودوں کو ساتھ ملا کر میرے خلاف تدبیر کا پختہ ارادہ کر لو، اس تدبیر کو خفیہ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں جو کچھ کرنا ہے علی الاعلان کرو اور مجھے مہلت دیے بغیر اس پر عمل کر گزرو O اگر تم میری دعوت سے اعراض کیے جاؤ تو اس سے میرا کچھ بھی نقصان نہیں ہے کیونکہ میں نے تم سے اپنی دعوت کا کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا اور نہ ہی اس کا امیدوار ہوں، میرا معاوضہ تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے، اسی کی طرف سے مجھے کہہ دیا گیا ہے کہ میں فرمانبردار بندوں میں شامل رہوں O اس وعظ و نصیحت کے باوجود انہوں نے نوح کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح کو اور ان لوگوں کو جو کشتی میں اس کے ساتھ سوار تھے بچا لیا اور انہیں زمین میں آباد کر دیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا انہیں طوفان میں غرق کر دیا، اب دیکھو کہ جن لوگوں کو کفر کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیسا ہوا؟ O پھر ہم نے نوح کے بعد دوسرے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا جنہوں نے ان کے سامنے اپنی صداقت کے واضح دلائل پیش کیے لیکن جس چیز کو وہ ایک بار جھٹلا

چکے تھے اسے وہ کسی صورت بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے، جیسے انہوں نے سنگدلی کا مظاہرہ کیا یونہی ہم حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیا کرتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۷۱﴾......حضرت نوح علیہ السلام ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو ایک اللہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دیتے رہے مگر قوم سرکشی اور کفر پر نہ صرف اڑی رہی بلکہ انہوں نے اپنے ہاں اللہ کے نبی کے قیام، ان کی تبلیغ اور شکل وصورت سے بیزاری کا اظہار کر دیا تو آپ نے انہیں چیلنج دیا کہ تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف جو بھی منصوبہ تیار کرنا چاہو اس کی خوب اچھی طرح تیاری کر لو، پھر مجھے مہلت دیئے بغیر اس پر عمل بھی کر گزرو۔

﴿۷۲﴾......نہ تو میں تم سے اور تمہارے معبودوں سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی کوئی لالچ رکھتا ہوں، میں اپنی تبلیغ پر اجر و ثواب کی اللہ کے سوا کسی سے امید نہیں رکھتا۔

﴿وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (مجھے کہہ دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہو جاؤں) قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء کا دین ''اسلام'' تھا، بنیادی باتوں میں اشتراک تھا، اختلاف صرف چند فروعی مسائل میں تھا، ایک حدیث میں سرِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿الانبیاء أولاد علات﴾{۱۲۲} ''انبیاء ایسی اولاد ہیں جن کی مائیں مختلف مگر باپ ایک ہی ہے۔''

حکمت وہدایت:

۱......مشرکین کو چاہئے کہ وہ قصۂ نوح علیہ السلام سے عبرت پکڑیں اور اللہ کی وحدانیت اور نبی ﷺ کی رسالت کا اقرار کریں۔(۷۱)

۲......قومِ نوح نے بھی وعدۂ عذاب کو مذاق سمجھا اور بالآخر ہلاک ہو کر رہے، مشرکینِ مکہ بھی عذاب جلدی طلب کر کے ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور مقدّران کا بھی بالآخر ہلاکت ہی ہوگا۔(۷۱)

۳......داعی کو اپنے موقف کی سچائی کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اس کا اللہ پر توکل اتنا ہی زیادہ ہوگا۔(۷۱)

۴......قیامت تک آنے والے داعیانِ دین کو حضرت نوح علیہ السلام کا یہ جملہ تسلّی کا سامان فراہم کرتا رہے گا ''فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ'' (۷۱) (میں اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں، پس تم اپنے شریکوں

{۱۲۲} (بخاری ۱، کتاب الانبیاء/ ۴۸۹، ابوداؤد ۲، باب شرح السنۃ/ ۲۹۴)

کے ساتھ مل کر اپنی تدبیر پختہ کرلو۔)

۵......بگڑی ہوئی فطرت والے انسان دین اور دعوتِ دین دینے والوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکیں گے۔(۷۱)

۶......توکل، صبر و تحمل، شجاعت اور طمانیت جیسی عظیم صفات کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔(۷۱) حضرت نوح علیہ السلام کے دل میں اللہ پر جو توکل تھا، اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ ظاہری وسائل نہ ہونے کے باوجود آپ نے قوم کو چیلنج دینے کے لیے پانچ جملے استعمال فرمائے: ☆میں اللہ پر توکل کرتا ہوں۔☆تم اور تمہارے شریک مل کر میرے خلاف تدبیر پختہ کرلو۔☆ایسی واضح تدبیر کرو کہ تمہارے اوپر کوئی چیز پوشیدہ نہ رہے۔☆ پھر اپنی تدبیر پر عمل کر گزرو۔☆ مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔

۷......انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت پر کسی مادی معاوضہ کے طلبگار نہیں ہوتے۔(۷۲)

۸......قومِ نوح کی طرح قریش اور مشرکین بھی ہلاکت سے دوچار ہو کر رہے، جب جرم ایک تھا تو سزا مختلف کیوں ہوتی؟(۷۳)

۹......بات سمجھانے کے لیے کسی وقوع پذیر معاملے کو پیش کرنا کسی نئے اندازِ ترغیب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔(۷۳)

۱۰......انبیاء اور ان کے متبعین کی تکذیب کافروں کی بہت پرانی عادت ہے۔(۷۴)

۱۱......مسلسل کفر کی وجہ سے انسان کے دل پر مہر لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ برائی کو اچھائی اور اچھائی کو برائی سمجھنے لگتا ہے۔(۷۴)

۱۲......کفر و ایمان کی جنگ بالآخر کفار کی ذلت و ہلاکت اور مومنوں کی فتح و نصرت پر منتج ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

﴿۷۵......۹۳﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر پھر تکبر کرنے لگے

قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶ قَالَ

اور وہ تھے لوگ گناہ گار O پھر جب پہنچی ان کو سچی بات ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ تو جادو ہے کھلا O کہا

مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا

موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو حق بات کو جب وہ پہنچے تمہارے پاس کیا یہ جادو ہے اور نجات نہیں پاتے جادو کرنے والے O بولے کیا تو

لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا

آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس راستہ سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اور تم دونوں کو سرداری مل جائے اس ملک میں اور ہم

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ

نہیں ہیں تم کو ماننے والے ○ اور بولا فرعون لاؤ میرے پاس جو جادوگر ہو پڑھا ہوا ○ پھر جب آئے جادوگر کہا اُن کو

مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو ○ پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے اب اللہ اس کو

سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ

بگاڑتا ہے بے شک اللہ نہیں سنوارتا شریروں کے کام ○ اور اللہ سچا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے

الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ

برا مانیں گناہ گار ○ پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اُس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون سے اور ان کے سرداروں سے

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى

کہ کہیں ان کو بچلا نہ دے اور فرعون چڑھ رہا ہے ملک میں اور اس نے ہاتھ چھوڑ رکھا ہے ○ اور کہا موسیٰ نے

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ

اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرماں بردار ○ تب وہ بولے ہم نے اللہ پر

تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

بھروسہ کیا اے رب ہمارے نہ آزما ہم پر زور اس ظالم قوم کا ○ اور چھڑا دے ہم کو مہربانی فرما کر ان کافر لوگوں سے ○

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر اور بناؤ اپنے گھر

قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ

قبلہ رو اور قائم کرو نماز اور خوشخبری دے ایمان والوں کو ○ اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے

فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا

فرعون کو اور اس کے سرداروں کو رونق اور مال دنیا کی زندگی میں اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے اے رب

اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

مٹا دے ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب دردناک ○

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

فرمایا قبول ہو چکی دعا تمہاری. سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو راہ ان کی جو ناواقف ہیں O

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ

اور پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور تعدی سے

الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ

یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا بولا یقین کر لیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر کہ ایمان لائے بنی اسرائیل اور میں ہوں

الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ

فرمانبرداروں میں O اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور رہا گمراہوں میں O سو آج بچائے دیتے ہیں ہم

بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

تیرے بدن کو تا کہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی اور بے شک بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے O

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا

اور جگہ دی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی یہاں تک کہ

حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

پہنچی ان کو خبر بے شک تیرا رب ان میں فیصلہ کرے گا قیامت کے دن جس بات میں کہ ان میں پھوٹ پڑی O

ربط: سورۂ یونس میں جو چند قصّے مذکور ہیں، یہ ان میں سے پہلا قصہ ہے، یہ قصّہ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے قرآنِ کریم میں بار بار ذکر کیا گیا ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش میں بالآخر فتح حق کی ہوتی ہے۔

تسہیل: پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر انہوں نے تکبر کا رویّہ اختیار کیا اور وہ مجرم لوگ تھے O پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق بات پہنچی تو وہ کہنے لگے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے O موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم حق کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے پاس آ چکا ہے، سوچو تو سہی کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے جبکہ مجھے باطل کے مقابلے میں کامیابی ملی ہے O وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اس راہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا اور اس سرزمین میں تمہاری چودھراہٹ قائم ہو جائے؟ ہم تمہاری بات کبھی نہیں مانیں گے O فرعون نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ ملک بھر میں جتنے ماہر جادوگر ہیں ان سب کو جمع کر کے میرے پاس لاؤ O جب جادوگر مقابلے کے لیے میدان میں آ گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا پھینکو جو کچھ تم نے پھینکنا ہے O جب انہوں

نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینک دیں اور وہ بظاہر سانپ بن کر میدان میں چلتی ہوئی نظر آئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے یہ جادو ہے، یقیناً اللہ اسے ملیامیٹ کر دے گا، بلاشبہ اللہ فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا O اور اللہ اپنے حکم سے سچ کو سچ ہی ثابت کر دکھاتا ہے اگرچہ مجرم اسے ناپسند ہی کریں O پھر یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ان کی قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کوئی بھی ایمان نہ لایا، انہیں بھی فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف سے مسلسل یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ انہیں کسی آزمائش میں نہ ڈال دیں، بلاشبہ فرعون زمین پر بڑا متکبر بنا بیٹھا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر قائم نہیں رہتے O اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا ''اے میری قوم! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ رکھو، اگر تم فرماں بردار ہو'' O انہوں نے عرض کیا ''ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں'' پھر انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے تماشا نہ بنا دینا O اور ہمیں اپنی رحمت سے کافروں کے تسلط سے نجات دے O اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون علیہما السلام کی طرف وحی بھیجی کہ مصر میں اپنے گھر برقرار رکھو اور انہی گھروں کو عبادت گاہ بنا کر ان میں نماز ادا کرتے رہو، اور اے موسیٰ! اہلِ ایمان کو حفاظت اور کامیابی کی بشارت سنا دو O اور موسیٰ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا، اے ہمارے رب! آپ نے فرعون اور اس کے سرداروں کو ظاہری شان و شوکت اور مال و دولت جو عطا کر رکھی ہے اس کا انجام یہ سامنے آ رہا ہے کہ وہ لوگوں کو آپ کے راستے سے ہٹا کر گمراہی کی طرف لے جا رہے ہیں، اے ہمارے رب! ان کے اموال کو تباہ و برباد کر دے اور ان کے دلوں کو اتنا سخت کر دے کہ یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں O اللہ نے فرمایا تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے، پس تم اپنے کام میں ثابت قدمی سے لگے رہو اور ان لوگوں کے راستے پر ہرگز نہ چلنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے O اور ہم نے جب بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتار دیا تو فرعون اور اس کی فوجوں نے ظلم و زیادتی کی نیت سے ان کا تعاقب کیا لیکن وہ دریا کے پار نہ جا سکے، حتّٰی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے کہا ''میں مان گیا ہوں کہ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوتا ہوں لہٰذا مجھے بچا لیا جائے'' O اسے کہا گیا، اب ایمان لاتے ہو حالانکہ ساری زندگی تو نافرمانی ہی کرتے رہے، اور تم بڑے فسادیوں میں سے تھے O تو آج ہم تمہارے جسم کو دریا برد ہونے سے بچا لیں گے تاکہ تم اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جاؤ، کیونکہ بہت سے لوگ، ہماری نشانیوں سے غافل ہیں O اور ہم نے فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو رہنے کے لیے بہت اچھا ٹھکانہ دیا اور انہیں نفیس چیزیں رزق کے طور پر دیں، بجائے اس کے کہ وہ شکر ادا کرتے انہوں نے دین میں اختلاف شروع کر دیا اور اختلاف بھی اس وقت کیا جب ان کے پاس علم آ گیا، یقین رکھو! کہ تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے O

﴿تفسیر﴾

ذیل میں صرف ان آیات اور کلمات کی تفسیر لکھی جا رہی ہے جن میں کوئی وضاحت طلب بات ہے، بقیہ کے سلسلہ میں صرف ''تسہیل'' پر اکتفا کیا گیا ہے (اس قصہ کی مزید تفصیل کے لیے سورۂ اعراف کی متعلقہ آیات کی تفسیر دیکھ لینی چاہیے۔)

﴿۷۵﴾...... ﴿بِاٰیٰتِنَا﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے توحید اور نبوت کے دلائل بھی پیش کیے اور اسے معجزات بھی دکھائے، ''آیات'' کا اطلاق معجزات اور دلائل دونوں پر ہوتا ہے،{۱۲۳} آپ کے بارے میں یہ سوچ غلط ہے کہ آپ ایک قومی لیڈر تھے جن کی زندگی کا مقصد اپنی قوم کی آزادی کے سوا کچھ نہیں تھا، آپ نے یقیناً فرعون سے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے فرعون اور اس کی قوم کو ایمان لانے کی دعوت بھی دی جو کہ ایک پیغمبر کا حقیقی مشن ہوتا ہے۔

﴿۷۷﴾...... ﴿وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ﴾ (جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے) جادو کا کوئی تعلق عملی زندگی کے حقیقی مسائل سے نہیں ہوتا، نہ ہی دین کی دعوت، فکر ونظر کی تبدیلی، دلوں کا تزکیہ اور سوسائٹی میں اعلیٰ اخلاق کی ترویج جادوگروں کے پیشِ نظر ہوتی ہے، ان کے کرشموں اور شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے، انسانی تاریخ میں ایسے کسی ایک جادوگر کا بھی تذکرہ نہیں ملتا جو عوام کے دینی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے حل کا علمبردار بن کر اٹھا ہو۔

﴿۷۸﴾......قبطیوں کی قومی اور وطنی عصبیت بیدار کرنے کے لیے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ تمہارا اصل مقصد ہمیں اپنے بزرگوں کے طور طریقوں سے برگشتہ کرنا اور مصر پر اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔

﴿۷۹﴾......فرعون نے اپنے حواریوں اور درباریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک جادوگر کے سوا کچھ نہیں، حکم دیا کہ ملک بھر سے فن میں مہارت رکھنے والے جادوگروں کو اکٹھا کرو تاکہ وہ موسیٰ کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے سرِ عام شکست دیں۔

﴿۸۰﴾......حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اللہ کی قدرت، نبوت کی صداقت اور ہر قسم کی شعبدہ بازی کے باطل ہونے کا پورا پورا یقین تھا اس لیے انہوں نے بھرپور اعتماد کے ساتھ جادوگروں کو موقع دیا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تماشائی تو رہے ایک طرف خود جادوگر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے شعبدہ بازی اور معجزہ کا فرق جان لیا۔

﴿۸۳﴾......لغت میں ''ذریۃ'' کا اطلاق چھوٹے بچوں پر ہوتا ہے لیکن عرف میں نوجوانوں کے لیے بھی استعمال

{۱۲۳} "بآیاتنا" ای ادلتنا و معجزاتنا (روح المعانی ۷، ۱۱/۲۳۸)

ہوتا ہے، یہ کون سے نوجوان تھے جنہیں قبولِ ایمان کی سعادت حاصل ہوئی؟ ایک قول یہ ہے کہ قبطی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔{۱۲۴} جیسا کہ سورۂ مومن میں واضح طور پر اس مردِ مومن کا ذکر آیا ہے جو فرعون کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا:

﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ﴾{۱۲۵} ''اور فرعون کے خاندان میں سے ایک مومن مرد نے کہا جو اپنا ایمان چھپاتا تھا۔''

دوسرا قول یہ ہے کہ ان نوجوانوں کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا، اس پر اشکال ہوگا کہ بنی اسرائیل تو سبھی ایمان رکھتے تھے پھر یہ کیوں کہا گیا کہ ''چند نوجوانوں کے سوا کوئی بھی ایمان نہ لایا؟'' اس کا جواب یہ ہے کہ ابتداء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے بھی چند نوجوانوں ہی نے ایمان قبول کیا تھا پھر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

یہاں سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ قبولِ ایمان میں سبقت کا شرف نوجوانوں کو حاصل ہوا، یہ معاملہ صرف بنی اسرائیل تک محدود نہیں تھا بلکہ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ کم وبیش تمام انبیاء پر پہلے پہل ایمان لانے والے نوجوان ہی تھے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایمان جن مفادات اور تعلقات کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے، ان کی قربانی کا جذبہ بوڑھوں کے مقابلہ میں جوانوں میں زیادہ ہوتا ہے، عمر رسیدہ افراد تیل اور تیل کی دھار دیکھنے ہی میں زندگی بتا دیتے ہیں جبکہ نوجوان ہر چہ بادا باد کہہ کر میدانِ عمل میں کود پڑتے ہیں۔

﴿۸۵﴾...... وہ نوجوان جانتے تھے کہ فرعون جیسے ستمگر کی موجودگی اور مصر کے کافرانہ ماحول میں قبولِ ایمان کا مطلب اپنے آپ کو مصائب و آلام کے لیے پیش کرنا ہے، اس لیے انہوں نے اللہ پر توکل کا اعلان کرتے ہوئے اللہ سے دعا بھی کی کہ یارب! ہمیں ظالم قوم کے لیے فتنہ، تماشا اور تختۂ مشق نہ بنا دینا، مطلب یہ ہے کہ انہیں اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہمیں دینِ حق سے ہٹانے کے لیے ظلم وستم کا نشانہ بنالیں{۱۲۶} اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں عام لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا دینا کہ وہ ہماری مظلومیت دیکھ کر کہیں کہ اگر یہ لوگ حق پر ہوتے تو فرعون کے ظلم وستم کا نشانہ نہ بنتے جیسا کہ بعض لوگوں کی ذہنیت ہوتی ہے کہ وہ طاقت اور غلبے کو حق پر ہونے کی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔

﴿۸۷﴾...... پہلے ایمان والوں کو توکل کا حکم دیا گیا اور اب حکم دیا جا رہا ہے نماز جیسی عبادت کی ادائیگی کا، اس لیے کہ ایمانی نقطۂ نظر سے مادی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ظاہری تدبیریں کافی نہیں بلکہ روحانی تربیت اور تیاری بھی ضروری ہے جبکہ نماز سے بندے کا تعلق اپنے مالک سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے، نماز بندۂ

{۱۲۴} ''من قومه'' یعنی من قوم فرعون ...... و قیل هم اقوام آباء هم من القبط ...... (قرطبی ۳۲۹/۸)
{۱۲۵} (المؤمن ۲۸/۴۰)
{۱۲۶} ای لا تنصر علینا فیکون ذلك فتنة لنا عن الدین (قرطبی ۳۳۰/۸)

مؤمن کے اندر وہ روحانی طاقت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔

توکل اور عبادت کے درمیان اس گہرے تعلق کی وجہ سے قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر ان دونوں کو اکٹھے ذکر کیا گیا ہے، سورۂ فاتحہ جو کہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اس میں ہے:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

سورۂ ہود میں ہے:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾{۱۲۷} ''تم اسی (اللہ) کی عبادت کرو اور اسی پر توکل کرو۔''

زیرِ نظر آیت میں بنی اسرائیل کو ایک حکم تو یہ دیا گیا کہ مصر میں اپنے گھر برقرار رکھو{۱۲۸} فرعون کے ڈر سے گھر چھوڑ کر بھاگ نہ جانا، دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ اپنے گھروں کو عبادت گاہ{۱۲۹} بنا کر ان میں نماز ادا کرتے رہو، یہ حکم اس لیے دیا گیا کیونکہ فرعون نے ان کی عبادت گاہیں گرا دی تھیں اور انہیں سرِ عام عبادت کی اجازت نہ تھی جبکہ دوسری طرف شریعتِ موسویہ میں عبادت خانے میں نماز ادا کرنا ضروری تھا ہر جگہ نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی، یہ خصوصیت تو امتِ مسلمہ کو حاصل ہے کہ وہ بر و بحر اور زمین اور فضا میں کہیں بھی نماز ادا کر سکتے ہیں مگر مخصوص صورتحال میں بنی اسرائیل کو بھی اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔

﴿۸۸﴾...... جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا پیغام فرعون اور اس کی قوم تک پہنچا دیا اور انہیں معجزات بھی دکھا دیئے اس کے باوجود وہ نہ تو اپنی سرکشی سے باز آئے اور نہ ہی قبولِ ایمان کے لیے آمادہ ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ان پر عذاب بھیجنے کی دعا فرمائی، اس لیے کہ ہر طرح سے اتمامِ حجت کے بعد کسی قوم کا ایمان قبول نہ کرنا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ اس کے اندر قبولِ حق کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور وہ تباہی کی مستحق ہو چکی ہے، بسا اوقات ایسی قومیں خود بھی وقت کے پیغمبر سے اصرار اور تکرار کے ساتھ مطالبہ کرتی ہیں کہ اگر واقعی ہم غلطی پر ہیں تو ہمیں ہلاک کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا فرعونیوں کے مطالبے کے عین مطابق تھی۔

﴿لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ﴾ بجائے اس کے کہ وہ نعمتوں کی کثرت پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور ان اسباب و وسائل کو

{۱۲۷} (هود ۱۱/۱۲۳)

{۱۲۸} أي اتّخذا بها بيوتا مباءة تلازمونها (تفسير قاسمي ۹/۴۲) و قيل: البيوت بيوت السكنى وأمسكوا عن المقصود من هذا البيوت، و هذا القول هو المناسب (التحرير التنوير ۲۶۵/۱۱،۶)

{۱۲۹} "قبلة" مصلّى و قيل مساجد متوجهة نحو القبلة يعني الكعبة و كان موسى يصلّي اليها (بيضاوى ۲۱۲/۳) فقيل: أريد بالبيوت بيوت العبادة اى مساجد يصلون فيها (التحرير والتنوير ۲۶۵/۱۱،۶)

انسانیت کی فلاح و بہبود میں صرف کرتے، وہ ان چیزوں کو بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

﴿لِيُضِلُّوا﴾ پر جو لام داخل ہے اسے لامِ عاقبت کہا جاتا ہے {۱۳۰} جو کہ انجام اور نتیجہ کے معنی میں آتا ہے، انہیں جو بھی نعمتیں عطا کی گئی تھیں ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو گمراہ کریں، لیکن ان کی کج فکری اور بدعملی کی وجہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کے عطا کردہ اموال و اسباب اسی غلط مقصد کے لیے استعمال ہوئے۔

﴿۸۹﴾...... قوم پر اتمامِ حجت کے بعد ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جو دعا کی تھی اس دعا کی قبولیت کا اعلان کرتے ہوئے دونوں کو تاکید کی گئی کہ آپ ثابت قدمی کے ساتھ تبلیغ و دعوت کے کام میں لگے رہیں اور ان جاہلوں کے طور طریقوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں جن کے لیے عذاب کا فیصلہ ہو چکا۔

﴿۹۰﴾...... کہا جاتا ہے کہ اہل و عیال کے علاوہ بنی اسرائیل کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ تھی، فرعون نے بہت بڑے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور طلوعِ آفتاب کے وقت انہیں جا لیا، اسرائیلیوں نے دیکھا تو خوفزدہ ہو گئے، انہوں نے جان لیا کہ اب ہم بچنے کے نہیں، اللہ کے حکم سے سمندر میں ان کے لیے بارہ خشک راستے بن گئے اور وہ بحفاظت پار اتر گئے، انہی راستوں سے جب فرعون نے گزرنا چاہا اور وہ لاؤ لشکر سمیت بیچ سمندر پہنچ گیا تو پہاڑوں کی طرح ٹھہری ہوئی موجیں دوبارہ آپس میں مل گئیں اور وہ سب غرق ہو کر رہ گئے، موت کو سامنے دیکھ کر فرعون نے توحید کا اقرار کر لیا۔

﴿۹۱﴾...... چونکہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ اللہ کا عذاب اور موت کی نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ایمان قبول نہیں ہوتا، اس لیے ایمان کے اقرار سے فرعون کو کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔

﴿۹۲﴾...... قبطی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خدائی کا دعویدار اتنی بے بسی کے ساتھ لقمۂ اجل بن جائے گا، ممکن ہے ان میں سے بعض کو اس کی لاش دیکھے بغیر اس کی موت کا یقین ہی نہ آتا اس لیے سمندر نے اس کی لاش نمونۂ عبرت بنانے کے لیے باہر پھینک دی۔

اعجازِ قرآن:

قرآن نے آج سے سوا چودہ سو سال پہلے بلا خوفِ تردید بتا دیا کہ ہم نے فرعون کے بدن کو بعد والوں کے لیے نشانِ عبرت کے طور پر دریا برد ہونے سے بچا لیا تھا لیکن عرصہ دراز ایسا گزرا کہ اس کی میت کہیں محفوظ نظر نہیں آتی تھی، اس لیے عام طور پر مفسرین اس آیت کی تاویلیں کیا کرتے تھے، ایک مشہور تاویل یہ کی جاتی تھی

{۱۳۰} "لیضلّوا" اختلف فی اللام، وأصحّ ما قیل فیها انها لام العاقبة والصیرورة (قرطبی ۸/۳۴۳)

کہ مرنے کے بعد فرعون کی میت کو کئی ہفتے یا مہینے باقی رکھا گیا، اسے دیکھ دیکھ کر لوگ عبرت حاصل کرتے تھے، اس کے علاوہ کچھ دوسری تاویلات بھی کی جاتی تھیں لیکن آج سے تقریباً سو یا سوا سو سال قبل جب قاہرہ کے قریب کھدائی شروع ہوئی اور وہ عمارتیں کھولی گئیں جو اہرامِ مصر کہلاتی ہیں تو وہاں بہت سے قدیم مصری فرمانرواؤں کی میتیں برآمد ہوئیں۔

مصریوں کا طریقہ تھا کہ جب کوئی اہم شخص مرجاتا تھا تو خاص طریقہ سے مصالحہ لگا کر اس کی میت کو محفوظ کرلیا کرتے تھے، اس میت کو ایک صندوق میں رکھتے اور پھر صندوق کے اوپر مرنے والے کی پوری تفصیل لکھ دیتے تھے کہ یہ شخص کون تھا اور اس کی زندگی کب اور کیسے گزری تھی، پھر دیوار میں ایک طاق بنا کر صندوق اس میں کھڑا کرتے اور طاق کو سامنے سے بند کردیتے تھے، اس طرح بے شمار میتیں ہزاروں سال سے محفوظ تھیں، مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں نہ کبھی اس چیز پر توجہ دی اور نہ کبھی کھول کر دیکھا کہ ان بلند و بالا عمارتوں کے اندر کیا ہے؟ جب دنیائے اسلام پر مغربی ممالک کا غلبہ ہوا تو چونکہ ان کو آثارِ قدیمہ سے بہت دلچسپی ہے، اس لیے انہوں نے اہرامِ مصر کو بھی کھولا اور وہاں موجود مردہ لاشوں کو کھنگالا، چنانچہ جب انہوں نے جستجو کی اور ان طاقوں کو کھولا تو معلوم ہوا کہ یہاں تو مصر کی تاریخ کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے، اسی دوران جب ایک میت کا صندوق کھولا تو پتہ چلا کہ یہ رعمسیس دوم کی میت ہے جو ایک طویل عرصہ (غالباً ۶۸ سال) مصر کا فرمانروا رہا، جب زمانے کا اندازہ کیا گیا تو یہ وہ زمانہ نکلا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں موجود تھے، پھر جب اس کی میت کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے جسم پر پوری طرح نمک لگا ہوا ہے اس سے ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ سمندر میں ڈوب کر مرا ہے اور ڈوبنے سے سمندر کے پانی کے ساتھ سمندر کا نمک بھی اندر چلا گیا اور یہ وہی نمک ہے جو میت کے جسم سے نکل نکل کر باہر آتا رہا اور پوری میت کے جسم پر باہر بھی لگا رہ گیا، گویا پورے طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کے ڈوبنے کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کے جسم (بدن) کو محفوظ رکھنے کی خبر دی گئی ہے، اور دیکھنے والے اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں، اس طرح ''فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ'' والی بات سچ ثابت ہوگئی۔{۱۳۱}

﴿۹۳﴾......اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دشمن کو غرق کردیا اور انہیں اپنے منتخب کردہ علاقے میں سکونت کے لیے ٹھکانہ دیا، اس علاقے سے مراد اردن اور شام کا علاقہ ہے{۱۳۲} جو کہ انتہائی زرخیز بھی ہے اور پُرفضا بھی۔

﴿فَمَا اخْتَلَفُوْا﴾ بجائے اس کے کہ یہود اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور اس کتاب کے حقوق ادا کرتے جو انہیں

{۱۳۱} (محاضراتِ قرآنی / ۲۷۲-۲۷۳)

{۱۳۲} و قیل: الاردن ...... و قال الضحاک: الشام (قرطبی ۳۳۹/۸)

عطا کی گئی تھی، انہوں نے اس کے اندر اختلافات پیدا کر لیے اور دوبارہ اسی طرح شکوک وشبہات کے اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئے جیسے اس کے نزول سے پہلے گم تھے۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جن ''بنی اسرائیل'' کا ذکر ہے اس سے مراد نبی اکرم ﷺ کے ہم عصر یہود مراد ہیں جو کہ مدینہ میں آباد تھے {۱۳۳} اور انہوں نے قرآن کے نزول اور جناب خاتم النبیین ﷺ کی آمد اور دونوں کی صداقت کا علم پا لینے کے بعد ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا، حالانکہ وہ اللہ کے آخری نبی کے لیے سراپا انتظار تھے۔

حکمت وہدایت:

۱......آلِ فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانا، کفر کی اس روایت کا تسلسل تھا جو پہلے سے چلی آ رہی تھی۔(۷۵)

۲......تکبر انتہائی مذموم عمل ہے، بہت سی بلائیں ایسی ہیں جن کا سبب تکبر بنتا ہے، ان میں سے سرِفہرست ہدایت سے محرومی ہے۔(۷۵)

۳......کافر اگر اقتدار پر بیٹھ جائے تو وہ فرعون کی طرح تکبر ورعونت اور ایمان والوں کی دشمنی میں آخری حد تک جانے سے بھی دریغ نہیں کرتا، آج کے کافر لیڈروں کے خون میں بھی فرعونی جراثیم دوڑ رہے ہیں۔(۷۵) قرآن نے فرعون کا قصہ بار بار اس لیے بیان کیا ہے تاکہ ایمان والوں کو بتائے کہ ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی فرعون پیدا ہوتا رہے گا۔

۴......اہلِ حق پر جھوٹے الزامات لگانا اہلِ باطل کا پرانا دستور ہے۔(۷۶)

۵......حق کے مقابلے میں کفر جس صورت میں بھی آئے، شکست اس کا مقدر ہے۔(۷۷)

۶......حق کے واضح دلائل کے مقابلے میں ''تقلیدِ آباء'' کو بطور حجت پیش کرنا کفار کا پرانا وطیرہ ہے۔(۷۸)

۷......جادو کا سیکھنا اور کرنا دونوں حرام ہیں۔

۸......جادوگر فتنہ وفساد پھیلاتا ہے اس لیے اس کی سزا قتل ہے۔

۹......اظہارِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے دشمن کو مقابلے کا چیلنج کرنا درست ہے۔(۸۰) جیسے موسیٰ علیہ السلام نے چیلنج دیا تھا۔

۱۰......جادو کبھی بھی معجزے کا سامنا نہیں کر سکتا اس لیے کہ معجزے میں سچائی ہوتی ہے اور جادو ایک بے حقیقت اور

{۱۳۳} المراد من بنی اسرائیل فی هذه الآیة الیهود الّذین کانوا فی زمان محمد علیه الصلاة والسلام فهذا قال به قوم عظیم من المفسّرین (کبیر ۲۲۹/۱۷،۶)

زوال پذیر چیز کا نام ہے جس کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہوتی ہے۔(۸۱)

۱۱......دشمن کو لاجواب کرنے اور اپنا موقف منوانے کیلئے مؤثر حکمتِ عملی ترتیب دینی چاہئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے فرمایا:

﴿مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ﴾ ''جو کچھ تم نے کیا ہے، یہ جادو ہے، یقیناً اللہ اسے ملیامیٹ کردے گا۔''

اور پھر عملاً ان کے جادو کا توڑ فرما کر ساحروں کو ایمان لانے پر مجبور کردیا۔

۱۲......حق کا غلبہ کافروں پر ہمیشہ گراں گزرے گا لیکن یہ ''تلخ مشروب'' انہیں بہر حال پینا پڑے گا۔(۸۲)

۱۳......سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں دین کے داعیوں کے لیے تسلّی کا سامان ہے کہ معجزات دکھانے کے باوجود ان پر ایمان لانے والے بہت کم لوگ تھے۔(۸۳)

۱۴......اللہ کی زمین پر سرکشی، فتنہ وفساد برپا کرنا اور مفسدوں کا معاون بننا قابلِ مذمّت عمل ہے۔(۸۳)

۱۵......دعوت الی اللہ کے بارِ گراں کی ذمہ داری قبول کرنے والوں کے لیے توکّل علی اللہ سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔(۸۴)

۱۶......اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے وسیلے سے دعا کرنا قبولیت کا باعث ہے، جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے دعا فرمائی: ''پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے کافروں کے تسلط سے نجات دے۔''

۱۷......ظالم حکمرانوں کے شر سے نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی چاہئے اور دعا میں پہلے دین کی سلامتی مانگی جائے اس کے بعد جان کی امان طلب کی جائے۔(۸۵)

۱۸......دشمن کے خلاف ایمان والوں کا اصل ہتھیار اللہ سے مضبوط تعلق ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسبابِ عادیہ کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔(۸۵)

۱۹......نماز بہر حال فرض ہے، یہ تشویشناک حالات میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔(۸۷)

۲۰......نماز قائم کرنے والے مؤمنوں کے لیے دارین میں بھلائی کی خوشخبری ہے۔(۸۷)

۲۱......وہ شخص جسے کوئی شدید مرض لاحق ہو، کسی کی طرف سے زیادتی کا خطرہ ہو یا کسی ظالم حکمران کے ظلم کا نشانہ بن سکتا ہو، وہ گھر میں نماز ادا کرسکتا ہے، ایسا شخص معذور شمار ہوگا۔(۸۷)

۲۲......ظلم جب حد سے تجاوز کر جائے تو ظالم کی ہلاکت کی دعا کی جاسکتی ہے۔(۸۸)

۲۳......مال ومتاع کی کثرت اور اس میں بہت زیادہ انہماک بعض اوقات گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔(۸۸)

۲۴......اجتماعی دعاء میں مقتدی امام کے جواب میں ''آمین'' کہیں، ایسا کرنا قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔(۸۹)

۲۵......دعاء کی قبولیت میں جلدی کرنے والا اپنے عمل سے گویا اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کئی سال بعد قبول ہوئی تھی۔

۲۶......ظالموں اور جاہلوں کی اتباع سے بچنا چاہئے، یہ اتباع ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔(۸۹)

۲۷......ظاہری طور پر کمزور لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال افراد طاقتور دشمن سے ٹکراتے وقت یہ بات دل ودماغ میں راسخ کرلیں کہ اگر وہ کمزور ہیں تو ان کا اللہ بہت بڑی طاقت کا مالک ہے۔

۲۸......اہلِ کفر حق والوں سے ٹکرا کر اپنی موت کو دعوت دیتے ہیں۔(۹۰)

۲۹......ظالم دشمن کا ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو جان وایمان کی سلامتی کے لیے ہجرت کی جاسکتی ہے۔

۳۰......اللہ کا عذاب دیکھ لینے کے بعد توبہ قابلِ قبول نہیں۔(۹۰)

۳۱......فرعون کا یہ کہنا ''اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ'' پوری دنیائے کفر کو توبہ کی دعوت اور اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔(۹۰)

۳۲......کافر حالتِ کفر میں جتنا بھی مضبوط اور بظاہر غالب بھی ہو، اندر سے وہ تذبذب اور شکوک وشبہات کا شکار ہوتا ہے۔

۳۳......مسلمانوں کو اپنے مذہب پر اس قدر شرح صدر ہے کہ ان کی سب سے بڑی آرزو اسلام پر موت ہوتی ہے۔

۳۴......خود گمراہ ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی گمراہی کا سبب بننے والے دوہرے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

۳۵......فرعون کا محفوظ مردہ جسم آج بھی مخلوقِ خدا کے لیے عبرت کا مرقع ہے اور اللہ کے باغیوں کو ان کا انجام بتا رہا ہے۔

۳۶......اللہ کے عذاب کا نشانہ بننے والی سرکش قوموں کے انجام سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔(۹۲)

۳۷......ضد اور عناد میں مبتلا باطل پرستوں کے بارے میں اللہ کا ایک ہی فیصلہ ہے اور وہ ہے ان کی ذلت آمیز ہلاکت، بڑا عقلمند ہوگا وہ شخص جو اس انجام کو سوچ کر کفر کی ظلمت سے ایمان کی روشنی کی طرف لوٹ آئے۔

۳۸......آج دنیا میں اپنی خراب فطرت کے باعث کفر وایمان کی خلیج کو نہ سمجھ سکنے والوں پر کل قیامت کے دن سارا معاملہ کھل جائے گا۔(۹۳)

☆☆☆☆☆

خطاب محبوب سے...... عتاب مغضوب پر

﴿۹۴......۹۷﴾

فَاِنْ كُنْتَ فِىْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ

سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بے شک

لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

آئی ہے تیرے پاس حق بات تیرے رب سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا O اور مت ہو ان میں جنہوں نے جھٹلایا اللہ

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ

کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا O جن پر ثابت ہو چکی بات تیرے رب کی وہ ایمان

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

نہ لائیں گے O اگر چہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں جب تک نہ دیکھ لیں عذاب دردناک O

ربط: سورت اپنے اختتام کی طرف جا رہی ہے، سورت میں جو بھی مضامین بیان ہوئے ہیں ان کی سچائی کو مؤکد کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں ان مضامین کی صداقت کے بارے میں شک ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں جو کسی نہ کسی آسمانی کتاب کے ماننے والے ہیں۔

تسہیل: اگر آپ کو ان مضامین کے بارے میں کچھ شک ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کیے ہیں، تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں جو پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں O یقیناً آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ بنیں O اور نہ ہی ان لوگوں میں سے بنیں جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں، ورنہ آپ خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے O بے شک جن لوگوں کے لیے تیرے رب کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا وہ ایمان نہیں لائیں گے O اگر چہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آ جائیں، جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۹۴﴾...... بظاہر اس آیت میں حضور اکرم ﷺ سے خطاب ہے لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بنا کر ان لوگوں کو سنانا مقصود ہے جو جہالت اور تعصب کی وجہ سے وحیِ الٰہی میں شک کا اظہار کرتے تھے {۱۳۴} ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود

{۱۳۴} الخطاب للنبی ﷺ والمراد غیرہ ای لست فی شک ولکن غیرک فی شک (قرطبی ۸/۳۳۹)

اپنی لائی ہوئی چیزوں میں کیسے شک کر سکتے تھے جن کی طرف آپ ساری دنیا کو دعوت دیتے تھے، اسی سورت کی آیت ۱۰۴ سے بھی ہمارے اس دعوٰی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس آیت میں انسانوں کو مخاطب بنا کر آپ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ ’’اگر تمہیں میرے دین میں کوئی شک ہے تو میں اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت نہیں کر سکتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

﴿لاواللہ ما شک طرفة عین ولا سأل احدا منهم﴾

’’اللہ کی قسم! نہ تو پلک جھپکنے کے برابر آپ شک میں مبتلا ہوئے اور نہ ہی آپ نے اہلِ کتاب میں سے کسی سے اس بارے میں سوال کیا۔‘‘

مزید فرمایا:

﴿لا أشک ولا أسأل بل أشهد أنه الحق﴾{۱۳۵}

’’نہ ہی میں شک کرتا ہوں اور نہ ہی مجھے کسی سے سوال کرنے کی ضرورت ہے بلکہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ حق ہے۔‘‘

﴿۹۵﴾......کفر اور تکذیب کی بیماری کا آغاز شک سے ہوتا ہے، اس لیے پہلی آیت میں حکم دیا گیا کہ اگر قرآن کے مخاطبین میں سے کوئی اس بیماری میں مبتلا ہے تو اسے جلد از جلد اس کا علاج کر لینا چاہیے، جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ نبی امی ﷺ جو حقائق تمہارے سامنے بیان فرماتے ہیں تم ان کے بارے میں ان لوگوں سے سوال کرو جو سابقہ کتب کا علم رکھتے ہیں، اگر ان کا دل و دماغ تعصب سے پاک ہوا تو وہ ضرور گواہی دیں گے کہ یہ حقائق حق اور سچ پر مبنی ہیں۔

﴿۹۶﴾......اگر شک کا علاج نہ کیا جائے تو انسان جدل و نزاع میں مبتلا ہو کر تکذیب اور پھر تکذیب میں اصرار کی وجہ سے اس مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور قبول حق کی استعداد ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

﴿۹۷﴾......جن کے دلوں پر مہر لگ جائے وہ اگر حق و صداقت کی ساری نشانیاں بھی دیکھ لیں تو بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور انہیں ایمان قبول کرنے کی توفیق نہیں ملتی۔

حکمت وہدایت:

۱......قرآنِ کریم اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے برحق ہونے کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ ہر غیر متعصب صاحب علم اس میں بیان کردہ حقائق کی تصدیق پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ (۹۴) اسی لیے ان لوگوں سے سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔

{۱۳۵} (منیر ۱۱/۲۶۴)

۲......بعض اوقات کسی بات میں شک کا فرض کرنا اس کے عکس میں یقین کو ثابت کرتا ہے، (۹۴) بعض جدید فلاسفہ مثلاً ڈیکارٹ نے بھی یہ نظریہ پیش کیا ہے۔ اسی لیے سچا مؤمن ایمانی حقائق میں سے کسی میں بھی شک نہیں کرتا۔

۳......جس کے دل میں کسی دینی مسئلہ کے بارے میں شک پیدا ہوا سے تشفی اور شک کے ازالہ کے لیے فوری طور پر علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (۹۴)

۴......دین کے اصول اور فروع میں شک کرنا خلافِ ایمان ہے (۹۴)

۵......بعض اوقات خطاب کسی اور سے جبکہ اشارہ کسی اور کی طرف ہوتا ہے (۹۴-۹۵) اور اس اندازِ کلام سے مقصود اپنے اصلی مخاطب کے دل ودماغ کو جھنجھوڑنا ہوتا ہے۔

۶......مسلسل کفر وتکذیب کی وجہ سے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور جس کے دل پر مہر لگ جائے اسے قبولِ ایمان کی توفیق نہیں ملتی۔ (۹۶)

۷......عذابِ الٰہی دیکھ لینے کے بعد توبہ مفید نہیں ہوتی۔ (۹۷)

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ

﴿۹۸......۱۰۳﴾

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۚ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ

سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی اٹھالیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب

الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ

دنیا کی زندگانی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک ○ اور اگر تیرا رب چاہتا بے شک ایمان لے آتے جتنے لوگ

كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ

کہ زمین میں ہیں سارے تمام اب کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں با ایمان ○ اور کسی سے نہیں ہو سکتا کہ

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ

ایمان لائے مگر اللہ کے حکم سے اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو نہیں سوچتے ○ تو کہہ دیکھو تو کیا کچھ ہے

وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا

آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتی نشانیاں اور ڈرانے والے ان لوگوں کو جو نہیں مانتے ○ سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں

مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ

مگر انہی کے سے دن جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ راہ دیکھتا ہوں O پھر ہم

نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے اسی طرح ذمہ ہے ہمارا بچا لیں گے ایمان والوں کو O

ربط: حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھ لینے کے بعد توبہ کی تھی، اور ان کی توبہ قبول کرلی گئی تھی اس لیے ان کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔

تسہیل: ایسا کیوں نہ ہوا کہ جن بستیوں پر ہم نے عذاب بھیجنے کا فیصلہ کرلیا تھا ان میں کسی بھی بستی والے اس وقت ایمان قبول کرلیتے جب انہیں ایمان فائدہ دیتا، سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلّت کا عذاب دور کردیا اور مخصوص وقت تک انہیں دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا O اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے بھی لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، تو کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرسکتے ہو؟ O حالانکہ کوئی بھی شخص اللہ کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا اور یاد رکھو! جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اللہ تعالیٰ ان پر گندگی مسلط کردیتا ہے O آپ ان سے فرما دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس میں غور و فکر کرو لیکن جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے انہیں زمین و آسمان کی نشانیوں اور برے انجام سے خبردار کرنے والے پیغمبروں سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا O یہ تو بس اس طرح کے دنوں کا انتظار کررہے ہیں جس طرح کے دن ان لوگوں نے دیکھے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، آپ فرما دیجئے! ٹھیک ہے تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں O ہمارا اصول یہ ہے کہ جب عذاب آتا ہے تو ہم اپنے پیغمبر کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا لیا کرتے ہیں، یونہی ہم نے مومنوں کو عذاب سے بچانا اپنے اوپر لازم کررکھا ہے O

تفسیر

تاریخ کی روشنی میں:

﴿۹۸﴾......قرآن میں حضرت یونس علیہ السلام کا صراحۃً ذکر چار جگہ آیا ہے اور دو سورتوں میں صفاتی نام کے ساتھ ان کا تذکرہ ہے، {۱۳۶} والد کا نام متّی تھا، عراق میں موصل کے مشہور مقام نینویٰ کے رہنے والے تھے، نینویٰ دریائے

{۱۳۶} (دیکھیئے سورۃ النساء ۴/۱۶۳، الانعام ۶/۸۶، یونس ۱۰/۹۸، صافات ۳۷/۱۳۹، الأنبیاء ۲۱/۸۷، اور القلم ۶۸/۴۸)
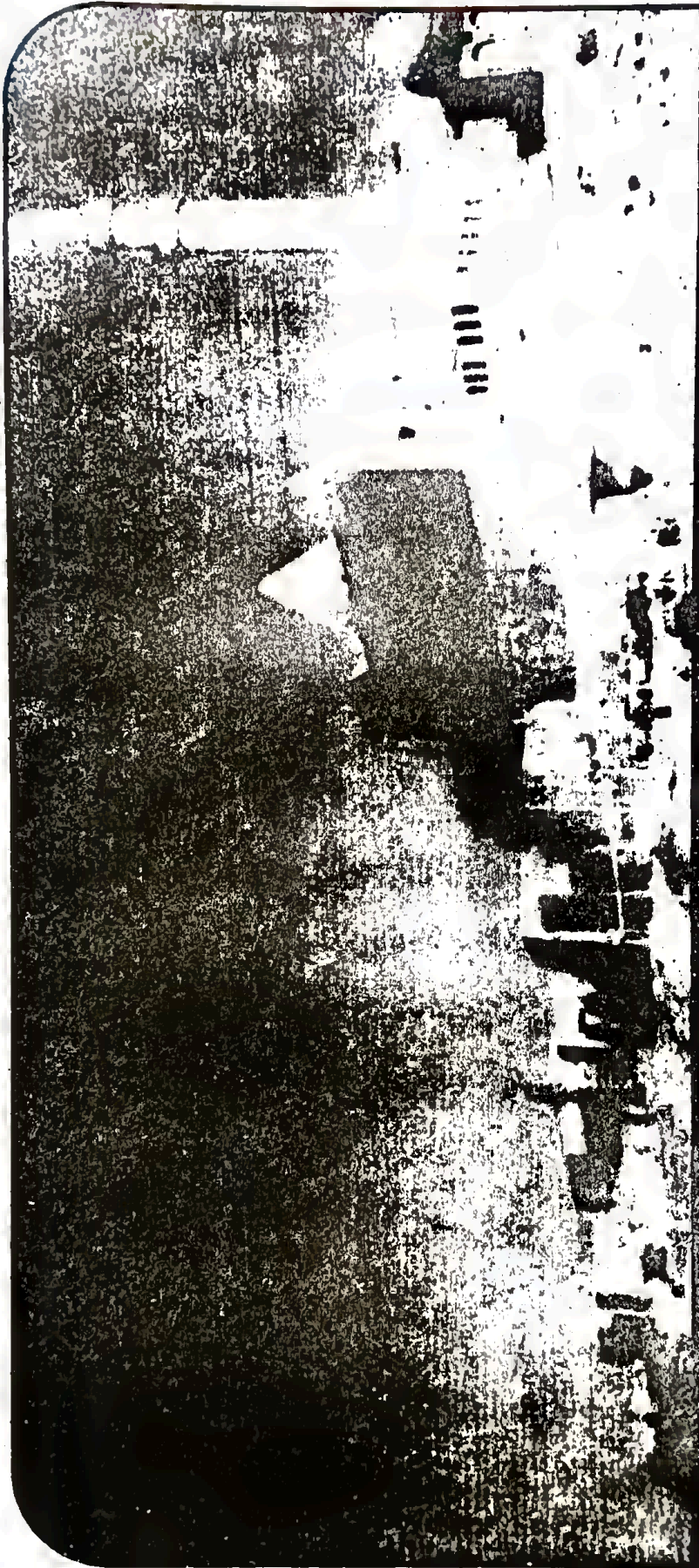
عراق میں حضرت یونس علیہ السلام کا مزار اور ملحقہ مسجد

دجلہ کے بائیں کنارہ پر واقع تھا، اس وقت شہر کا رقبہ ۱۸۰۰(ایکڑ) تھا، اس کا ذکر حمورابی کے نوشتوں یعنی ۲۲۸۵ق م میں بھی ملتا ہے، نینوٰی کے باشندوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد تھی، آپ نے انہیں ایمان کی دعوت دی جسے انہوں نے رعونت کے ساتھ ٹھکرا دیا، حضرت یونس علیہ السلام نے انہیں بتایا کہ تین دن کے اندر تم پر عذاب آنے والا ہے، یہ وعید سنانے کے بعد وہ شہر سے باہر چلے گئے، صبح ہوئی تو سیاہ بادلوں کی صورت میں ان پر عذابِ الٰہی منڈلانے لگا، اسے دیکھ کر وہ حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش میں لگ گئے، جب وہ انہیں کہیں بھی نہ ملے تو انہیں یقین آ گیا کہ اب ہم عذاب سے نہیں بچ سکتے آخری تدبیر کے طور پر انہوں نے یہ کیا کہ سارے مرد، عورتیں اور بچے بستی سے باہر نکل آئے جانوروں کو بھی ساتھ لے لیا اور انتہائی عجز و انکساری کی ہیئت اختیار کرتے ہوئے توبہ و استغفار میں لگ گئے، حالت یہ تھی کہ ان کی آہ وزاری سے پورا میدان گونج رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور ان سے عذاب ہٹا دیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے اہلِ مکّہ کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ بھی عذاب آنے سے پہلے قومِ یونس کی طرح ایمان قبول کر لیں۔

﴿۹۹﴾......اگر اللہ چاہتا تو روئے زمین پر بسنے والے سارے انسان مومن ہوتے ان میں ایک بھی کافر نہ ہوتا، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ سب کو پیدائشی مؤمن بنا دیا جاتا، اپنی مرضی سے کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا ہی نہ جاتا، اس کی دوسری صورت یہ ممکن تھی کہ انہیں کوئی ایسی نشانی دکھا دی جاتی جسے دیکھ کر وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے، مثلاً ہر کافر اور مشرک کو اذیت ناک بیماری یا انتہا درجے کے فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیا جاتا جبکہ مومن نہ تو بیمار ہوتا اور نہ ہی اسے غربت کا آزار ستاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا کیونکہ ایمان کے معاملے میں اللہ کسی پر جبر نہیں کرتا اور جبر کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا، نبی کی ذمہ داری بھی صرف تبلیغ تک محدود ہے، تبلیغ کے بعد بھی اگر لوگ ایمان قبول نہ کریں تو اس کے بارے میں نبی سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

﴿۱۰۰﴾......اللہ تعالیٰ کا اصول یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کی مرضی اور توفیق کے بغیر ایمان قبول نہیں کر سکتا، اور یہ توفیق اسی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی عطا کی ہوئی عقل استعمال کرتا ہے، اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر کفر و شرک کی گندگی مسلط کر دی جاتی ہے۔

﴿۱۰۱﴾......اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ وہ لوگ جو آپ سے نت نئے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں آپ ان سے فرما دیجئے کہ ارض و سماء میں اللہ کی قدرت کی جو بے شمار نشانیاں ہیں ان میں غور و فکر کرو تو تمہیں ایمان کے لیے کسی دوسری نشانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی، یہ کروڑوں کی تعداد میں چاند، سورج اور

ستارے، یہ رات اور دن کا ادل بدل، یہ بارش اور اس کے ذریعے اگنے والی لاکھوں قسم کی نباتات، سبزیاں، پھل اور اناج، یہ ہزاروں قسم کے جانور، پرندے اور چوپائے، ان میں سے ہر ایک اللہ کے وجود، اس کی توحید اور قدرت کا شاہدِ عدل ہے۔

﴿وَمَا تُغْنِي الْآيٰتُ﴾ ان نشانیوں اور خبردار کرنے والے پیغمبروں سے {۱۳۷} ایسے لوگوں کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو عقل کو استعمال نہیں کرتے اور جو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے۔ {۱۳۸}

حکمت و ہدایت:

۱...... بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظاہر میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے اور انہیں مسلسل توبہ کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ (۹۸)

۲...... عذاب کا مشاہدہ ہو جانے سے پہلے توبہ قبول ہو جاتی ہے اور صرف علاماتِ عذاب کا دیکھ لینا قبولیت سے مانع نہیں ہوتا۔ (۹۸) حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے بھی صرف علامات دیکھی تھیں، اگر وہ عینِ عذاب کو دیکھ لیتے تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی۔

۳...... تشریعی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی ہے کہ سارے انسان ایمان قبول کر لیں مگر تکوینی اعتبار سے اللہ تعالیٰ سب کو قبولِ ایمان پر مجبور نہیں کرتے۔ (۹۹)

۴...... دین میں جبر و اکراہ جائز نہیں، داعی نہ تو انسانوں کو قبولِ ایمان پر مجبور کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے کفر و فسق کی وجہ سے حد سے زیادہ پریشان ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ خیر کی راہ پر وہی چلتا ہے جسے اللہ تعالیٰ چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ (۱۰۰)

۵...... خالق کی معرفت حاصل کرنے کے لیے زمینی اور آسمانی دلائل میں غور و فکر کرنا واجب ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿تفکروا فی الخلق ولا تفکروا فی الخالق فانکم لا تقدرون قدره.﴾ {۱۳۹}

"مخلوق میں تو غور و فکر کرو مگر خالق میں نہیں کیونکہ تم اس کی حقیقت نہیں جان سکتے۔"

۶...... یہ ممکن ہے کہ شیخ اپنے مرید پر ہونے والے اللہ کے انعام سے مطلع نہ ہو اگرچہ وہ انعام اسے شیخ ہی کی صحبت سے

{۱۳۷} "الآیات" ای الدلالات "والنذر" ای الرسل (قرطبی ۸/۳۴۳)
{۱۳۸} ای لا یتوقع ایمانهم و هم الذین لا یعقلون (کشاف ۲/۳۵۴)
{۱۳۹} (ابن حبان بحواله منیر ۱۱/۲۷۸)

حاصل ہوا ہو جیسے حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی قوم کے ایمان لانے کا علم نہ تھا اگرچہ قوم کا ایمان لانا آپ ہی کی دعوت کا نتیجہ تھا۔{۱۴۰}

۷......جو ازلی بدنصیب ہیں اور جن کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے وہ دلائل اور نشانیوں کے باوجود ایمان قبول نہیں کرتے۔(۱۰۱)

۸......ہر زمانے اور ہر علاقے کے ظالم اور باغی حقیقت میں اسی ذلت اور عذاب کے منتظر ہیں جو ان سے پہلے ظالموں اور باغیوں پر نازل ہو چکا۔(۱۰۲)

۹......اللہ تعالیٰ کی دائمی سنت ہے کہ جب وہ ظالموں کو ہلاک کرتا ہے تو اپنے مخلص بندوں کو ہلاکت اور عذاب سے بچا لیتا ہے۔(۱۰۳)

فیصلہ کن اعلان

﴿۱۰۴......۱۰۹﴾

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ

کہہ دے اے لوگوں اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو

دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں O

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ

اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا دین پر حنیف ہو کر اور مت ہو شرک والوں میں O اور مت پکار

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اس وقت ہو ظالموں میں O

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ

اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں اس کو ہٹانے والا اس کے سوا اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں

يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ

اس کے فضل کو پہنچائے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں اور وہی ہے بخشنے والا مہربان O کہہ دے اے لوگوں پہنچ چکا

{۱۴۰} (بیان القرآن ۱/۵۰۱، ۳۰)

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ

حق تم کو تمہارے رب سے اب جو کوئی راہ پر آئے سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ

اپنے برے کو اور میں تم پر نہیں ہوں مختار ○ اور تو چل اُسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ اور وہ ہے

خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ○

ربط: دین کی صداقت اور توحید کی حقانیت کے دلائل ذکر کرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے فیصلہ کن اعلان کرایا جارہا ہے تاکہ کفار پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ نہ تو توحید اور شرک میں کوئی سمجھوتہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی اللہ کے نبی ان کی مادی تدبیروں اور طاقت سے خوفزدہ ہیں۔

تسہیل: اے میرے حبیب! آپ فرما دیجئے، اگر تم میرے دین کے حق ہونے کے بارے میں شک کرتے ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کر سکتا بلکہ میں تو اسی اللہ کی عبادت کرتا رہوں گا جو تمہیں موت دیتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں شامل رہوں ○ اور مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ تم یکسوئی کے ساتھ دینِ حق پر قائم رہو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں ○ اور اللہ کو چھوڑ کر ان خودساختہ معبودوں کو نہ پکارو جو نہ تو فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان دے سکتے ہیں اور اگر بالفرض تم نے ایسا کیا تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ○ اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اسے دور کر سکے اور اگر وہ تمہارے لیے بھلائی کا ارادہ فرمالے تو کوئی نہیں جو اس کے فضل کا رخ پھیر سکے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دیتا ہے اور وہ بڑا غفور رحیم ہے ○ اے میرے پیغمبر! آپ فرما دیجئے، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، تو اب جو شخص ہدایت کا راستہ اختیار کرے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو گمراہی میں پڑا رہے گا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا، اور میں تمہارے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں ○ اور تم اس وحی کی اتباع کرو جو تمہاری طرف بھیجی جارہی ہے اور ثابت قدم رہو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ○

حکمت وہدایت:

۱......اہلِ ایمان اور کفار کے درمیان بنیادی فرق توحید و شرک ہے، مومن خالص توحید پر قائم رہتا ہے جبکہ کافر عام طور پر کسی نہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہوتا ہے۔(۱۰۴)

۲......مومن پر لازم ہے کہ وہ حق کے بارے میں شک میں مبتلا نہ ہو، اگر چہ سارے انسان اس میں شک کرتے رہیں۔(۱۰۴)

۳......دینی فرائض پر استقامت، گناہوں سے اجتناب اور دین کے ماسوا سے اعراض کمالِ دین کی علامت ہے۔

(۱۰۵) امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں نورِ ایمان میں استغراق اور ماسوا سے کلی اعراض کی طرف اشارہ ہے۔{۱۴۱}

۴......اللہ کے سوا کوئی بھی نفع اور نقصان نہیں دے سکتا اس لیے نفع اور نقصان کے لیے کسی کو پکارنا ظلم ہے۔(۱۰۶)

۵......کوئی بھی انسان کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے دل میں یہ یقین پیدا نہ ہو جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ خیر یا شر کا ارادہ کرلے تو دنیا کی کوئی طاقت نہ تو اسے محروم رکھ سکتی ہے نہ بچا سکتی ہے۔(۱۰۷) آیت نمبر ۱۰۷ کے اختتام پر اللہ کی دو صفات لائی گئی ہیں یعنی غفور اور رحیم۔ غفوریت کا تعلق اخروی عطیات اور رحمت کا تعلق دنیوی عطیات سے ہے۔{۱۴۲}

۶......قرآن، رسول اور اسلام حق ہیں (۱۰۸) وہ لوگ خوش نصیب ہیں جنہیں باری تعالیٰ نے قبولِ حق کی توفیق عطا فرمائی اور ان سے بھی زیادہ خوش نصیب وہ ہیں جو صرف دل اور زبان سے نہیں عمل سے بھی قبول کرتے ہیں۔

۷......انسان کی سعادت و شقاوت کا مدار اس کے اپنے اعمال پر ہے نہ کہ دوسرے کے اعمال پر۔(۱۰۸)

۸......وحیِ الٰہی کی اتباع واجب ہے، اتباع کا حکم نبی اور غیر نبی سب کے لیے ہے (۱۰۸) وحیِ الٰہی میں قرآن اور سنتِ صحیحہ دونوں آجاتے ہیں۔

۹......صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراخی کا انتظار کرنا بڑا افضیلت والا عمل ہے۔(۱۰۹)

☆☆☆☆☆

{۱۴۱} "وأن أقم وجهك للدين حنيفا" اشارة الى الاستغراق فى نور الايمان و الاعراض بالكلية عما سواه (كبير ۲،۱۷/ ۳۰۹)

{۱۴۲} (تفسير ماجدى ۲/ ۴۹۹)

سُورَةُ هُود
مَكِّيَّةٌ

سورۂ ھود کے اہم مضامین

سورۂ ھود کی صرف پانچ آیات گیارھویں پارہ میں ہیں بقیہ پوری سورت بارھویں پارہ میں ہے، یہ مکی سورت ہے، اس میں ۱۲۳ آیات اور ۱۰ رکوع ہیں، اس سورت کی ابتداء میں قرآنِ کریم کی عظمتِ شان بیان کی گئی ہے کہ یہ اپنی آیات، معانی اور مضامین کے اعتبار سے مُحکم کتاب ہے اور اس میں کسی بھی اعتبار سے فساد اور خلل نہیں آسکتا اور نہ اس میں کوئی تعارض یا تناقض پایا جاتا ہے۔ اس کے محکم ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کی تفصیل اور تشریح اس ذات نے کی ہے جو حکیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے، اس کا ہر حکم کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہے اور اسے انسان کے ماضی، حال، مستقبل، اس کی نفسیات، کمزوریوں اور ضروریات کا بخوبی علم ہے۔

کتاب اللہ کی عظمت بیان کرنے کے بعد توحید کی دعوت ہے جو عقیدہ اور یقین کی بنیاد ہے، دعوتِ توحید کے بعد دلائلِ توحید کا بیان ہے جو کہ پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں، بتایا گیا ہے کہ ساری مخلوق کو رزق دینے والا اللہ ہی ہے، خواہ وہ مخلوق انسان ہوں یا جنات، چوپائے ہوں یا پرندے، پانی میں رہنے والی مچھلیاں ہوں یا کہ زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے، آسمان اور زمین کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے لیکن جو لوگ ان دلائل میں غور وفکر نہیں کرتے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں پر ضد اور عناد کی پٹی باندھ رکھی ہے، وہ توحید کا بھی انکار کرتے ہیں اور قرآنِ کریم کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے ہیں، ان منکرین کو چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر واقعی قرآن انسانی کاوش ہے تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ۔ (۱۱:۱۳)

منکرین کو تین بار چیلنج کیا گیا تھا، پہلی بار پورے قرآن کی مثال لانے، دوسری بار قرآن جیسی دس سورتیں اور تیسری بار سورۂ بقرہ میں قرآن کریم جیسی صرف ایک سورت بنا کر لانے کا چیلنج دیا گیا تھا لیکن تینوں بار وہ اس چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز رہے۔

اس کے علاوہ جو اہم مضامین سورۂ ہود میں بیان کئے گئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

﴿۱﴾......انسانوں کے دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جن کی زندگی اور جہد وعمل کا ہدف صرف دنیا ہے، وہ ہر وقت اسی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور کبھی بھولے سے بھی انہیں آخرت یاد نہیں آتی، دوسرا توفیق یافتہ گروہ وہ ہے جو دنیا کے لیے بھی تگ ودَو کرتا ہے مگر اس کی کوششوں کا محور آخرت ہے، وہ اخروی زندگی ہی کو سامنے رکھ کر دنیا کی زندگی گزارتا ہے۔ (۱۱:۱۵-۱۷)

پہلے گروہ کی مثال اندھوں اور بہروں جیسی ہے اور دوسرے گروہ کی مثال بینائی اور شنوائی کی نعمت سے سرفراز لوگوں جیسی ہے۔

﴿۲﴾......قرآنِ کریم کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ دلائل کے ذریعہ کفار اور مشرکین کے نظریات کی تردید کے بعد گزشتہ اقوام اور انبیاء کے واقعات اور قصص بیان کرتا ہے، ایسا کرنے سے دلائل کی تاکید بھی ہو جاتی ہے اور کلام میں تفنن اور تنوع بھی پیدا ہو جاتا ہے، انسان کی طبیعت تنوع پسند ہے، اللہ تعالیٰ نے جیسے تکوینی آیات یعنی اس حسی اور مادّی جہان میں تنوع کا لحاظ رکھا ہے یونہی تشریعی آیات یعنی قرآن میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے، آپ حسّی جہاں میں دیکھیں تو لحہ بہ لحہ مناظر، موسم اور اوقات بدلتے جاتے ہیں، کہیں پھول، کہیں کانٹے، کہیں بلند و بالا پہاڑ، کہیں ہموار میدان، کہیں دریاؤں کی سرکش موجیں، کہیں اُڑتی ہوئی خاک، پھر کبھی سردی کبھی گرمی، کبھی بہار کبھی خزاں، کبھی صبح کبھی دوپہر اور کبھی شام، یوں ہی اس تشریعی جہاں میں مضامین بدلتے رہتے ہیں، احکام کے ساتھ اخبار، دلائل کے ساتھ قصص و واقعات، مواعظ کے ساتھ جنت اور جہنم کے مناظر، بشارت کے ساتھ انذار اور وعدوں کے ساتھ وعیدوں کا بیان ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور کلام ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف، ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف، ایک قصہ سے دوسرے قصہ کی طرف اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے اور پڑھنے سننے والا اُکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

سورۂ ہود میں بھی قرآن کے اس خاص انداز کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے، پہلے قرآن کی صداقت اور توحید و رسالت کی حقانیت کے دلائل ذکر کئے گئے ہیں، اس کے بعد حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے قصے بیان کئے گئے ہیں، یہ تمام قصے وحی کے اثبات، محمد ﷺ کی نبوت کی سچائی اور قرآن کے معجزہ ہونے کو بیان کرنے کے لیے لائے گئے ہیں، مشرکینِ مکہ بخوبی جانتے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ اُمی ہیں، آپ نہ قرأت جانتے ہیں نہ ہی کتابت سے آشنا ہیں اور نہ ہی آپ نے کسی کی شاگردی اختیار کی لیکن اس کے باوجود اتنی صحت، باریکی اور کامل درجہ کی درستگی کے ساتھ ان واقعات کو بیان کرنا، وحی کے بغیر کیسے ممکن تھا، خود قرآن نے اس نکتے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے انبیاء اور مرسلین کے واقعات بیان کرنے کے بعد عام طور پر وحی اور نبوت کا تذکرہ کیا ہے، زیرِ نظر سورت میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا: ”یہ (حالات و واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو تم ان کو جانتے تھے اور نہ ہی تمہاری قوم جانتی تھی، پس صبر کرو کہ پرہیزگاروں ہی کا انجام اچھا ہوتا ہے۔“ (۱۱:۴۹)

یونہی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا قصہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ”یہ (پرانی) بستیوں کے تھوڑے سے حالات ہیں جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں، ان میں بعض بستیاں تو باقی ہیں اور بعض تہس نہس ہو گئیں۔“ (۱۱:۱۰۰)

ان واقعات میں ایک طرف تو عقل وفہم اور سمع وبصر رکھنے والوں کے لیے بے پناہ عبرتیں اور نصیحتیں ہیں اور دوسری طرف حضورِ اکرم ﷺ اور مخلص اہلِ ایمان کے لیے تسلّی اور ثابت قدمی کا سامان اور سبق ہے، اسی لیے یہ واقعات بیان کرتے ہوئے آپ کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے جو کہ حقیقت میں پوری امت کو حکم ہے، استقامت ایک ایسا حکم ہے جس کا تعلق عقائد، اقوال، اعمال اور اخلاق سب ہی کے ساتھ ہے۔ استقامت کوئی آسان چیز نہیں ہے بلکہ انتہائی مشکل صفت ہے جو اللہ کے مخصوص بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے، استقامت کا مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی ان تعلیمات کے مطابق گزاری جائے جن کے مطابق گزارنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر اس آیت سے زیادہ سخت آیت کوئی نازل نہیں ہوئی، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ایک موقع پر ریش مبارک میں چند سفید بال دیکھتے ہوئے عرض کیا، یارسول اللہ! بڑھاپا بہت تیزی سے آرہا ہے، تو آپ نے فرمایا: ''مجھے ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔'' علماء کہتے ہیں کہ آپ کا اشارہ سورہ ہود کی اسی آیت کی طرف تھا جس میں آپ کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ علمائے ربانیین نے استقامت کو عینِ کرامت قرار دیا ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ استقامت سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے۔ یہاں استقامت کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کی اللہ سے دُعاء کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی تدبّر ضروری ہے جس میں فرعون کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''اور تمہارا پروردگار جب نافرمان بستیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اس کی پکڑ اسی طرح کی ہوتی ہے، بے شک دکھ دینے والی اور سخت۔ ان (قصوں) میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جو عذابِ آخرت سے ڈرتا ہے۔'' (۱۱:۱۰۲۔۱۰۳)

گویا یہ بتادیا گیا ہے کہ جس اللہ نے کل کی نافرمان بستیوں پر عذاب نازل کیا تھا وہ آج بھی سرکش قوموں کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے، اسی طرح آیت ۱۱۶ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر کسی قوم پر اللہ کا عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب اس کے اندر دو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ ایسے دردمند اور ہوشمند لوگ نہیں رہتے جو انہیں فتنہ وفساد سے منع کریں اور دوسری خرابی یہ کہ وہ قوم حد سے زیادہ عیش پرستی اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ اور اہلِ ایمان کے لیے تسلی اور صبر واستقامت کے پہلو کو مذکورہ واقعات کے بعد اس سورت کی اختتامی آیات میں بیان کیا گیا ہے، آیت ۱۲۰ میں ہے:

''(اے محمد ﷺ) انبیاء کے وہ سب حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں، ان کے ذریعے ہم تمہارے دل کو مضبوط رکھتے ہیں اور ان قصوں میں تمہارے پاس حق آگیا ہے اور مؤمنوں کے لیے نصیحت اور عبرت ہے۔''

☆☆☆☆☆

دعوتِ قرآن

﴿ ۱ ..... ۵ ﴾

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ

الرٰ...... یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے ○ کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی

لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى

میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں ○ اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے

اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ

تم کو اچھا فائدہ ایک وقتِ مقرر تک اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے

يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ

دن کے عذاب سے ○ اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ○ سنتا ہے! وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے

لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ

سینے تاکہ چھپائیں اس سے، سنتا ہے! جس وقت اوڑھتے ہیں اپنے کپڑے جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں وہ تو

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

جاننے والا ہے دلوں کی بات ○

ربط: سورۂ یونس اور سورۂ ھود میں ایسی گہری مناسبت ہے کہ لگتا ہے کہ سورۂ ھود سورۂ یونس ہی کا تتمہ ہے، اس میں بھی وہی مضامین ہیں جو سورۂ یونس میں تھے، اگر فرق ہے تو صرف اجمال اور تفصیل کا، ابتداء اور اختتام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں سورتوں میں قرآن اور حضور اکرم ﷺ کی صداقت کا ذکر ہے، دونوں کا آغاز بھی ”الٓرٰ“ سے ہوا ہے۔

تسہیل: الف۔ لام۔ را۔ یہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں اور انہیں حکیم اور خبیر ذات کی طرف سے کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے ○ اس کا سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، میں اللہ کی طرف سے تمہیں ڈرانے اور خوشخبری سنانے والا ہوں ○ اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اسی کی طرف رجوع کیے رہو، وہ تمہیں ایک معین وقت تک اچھی زندگی عطا کرے گا اور زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ اجر دے گا، اور

اگر تم اعراض ہی کرتے رہے تو مجھے تم پر بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے○ تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے○ سن لو! وہ لوگ اپنے سینوں کو دوہرا کیے رہتے ہیں تا کہ اللہ سے اپنی باتوں کو چھپائیں، مگر یاد رکھو! یہ اس وقت بھی اس کی نظر میں ہوتے ہیں جب اپنے اوپر کپڑے لپیٹ لیتے ہیں، وہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں، بلاشبہ وہ دلوں کے بھیدوں سے خوب باخبر ہے○

تفسیر

﴿۱﴾...... یہ عظیم الشان کتاب ہے {۱} اس کی آیات نظم اور ترکیب، دلائل وشواہد، بلاغت اور تاثیر کے اعتبار سے محکم اور مضبوط ہیں، نہ ان میں کوئی خلل ہے اور نہ ہی کوئی نقص اور عیب!

﴿ثُمَّ فُصِّلَتْ﴾ یہ آیات صرف محکم ہی نہیں مفصل بھی ہیں {۲} اگر کوئی مضمون ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر بیان کیا ہے تو دوسری جگہ اسے تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔

﴿مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾ اس عظیم کتاب میں تضاد کیسے ہو سکتا ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نکتہ چینی کیسے کی جا سکتی ہے؟ اس کی ایک ایک آیت علم و حکمت کا شاہکار ہے، اس لیے کہ اس کو نازل کرنے والی ہستی حکیم و خبیر ہے، اس کے ہر فعل میں بے پناہ حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور وہ کائنات کے موجودہ اور آئندہ حالات سے باخبر ہے۔

احکمت اور فصلت کے بعد "مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ" کے اضافے نے قرآن مجید کے درجۂ استناد کو رفعت کے آخری مقام تک پہنچا دیا ہے۔

﴿۲﴾...... اس محکم و مفصل کتاب کو نازل کیے جانے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو دعوتِ توحید دی جائے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے عبادت کا تعلق نہ رکھیں، نہ صرف ہمارے آقا ﷺ کی بعثت اس مقصدِ جلیل کے لیے ہوئی بلکہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر انبیاء کے دنیا میں تشریف لانے کا مقصد بھی کفر و شرک کے اندھیروں میں بھٹکی انسانیت کو توحید کے نور کی طرف لانا تھا، سورۂ انبیاء میں ارشادِ باری ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ {۳}

"اور تم سے پہلے ہم نے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس پر ہم نے یہ وحی نازل نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا صرف میری ہی عبادت کرو۔"

{۱} "كتٰبٌ" والتنوين فيه للتعظيم (روح المعاني ۲۹۸/۱۱،۷)

{۲} ان معنى "ثم" ليس التراخي في الوقت ولكن في الحال۔ (روح المعاني ۳۰۰/۱۱،۷)

{۳} (الانبياء ۲۱/۲۵)

سورۂ نحل میں یہ حقیقت یوں بیان کی گئی ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ {۴} ''اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔''

ایک سچے مومن کا نظریہ اور مقصدِ حیات یہی ہونا چاہئے کہ نظامِ زندگی اللہ کا ہو، عبادت اللہ کی ہو اور اطاعت و حکمرانی بھی صرف اور صرف اللہ ہی کی ہو، قرآن کا اہلِ ایمان سے یہی مطالبہ ہے کہ اللہ کی بے قید اطاعت بھی کرو اور اسے غیر مشروط طور پر حقیقی فرمانروا بھی مانو۔

﴿إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ﴾ توحیدِ باری تعالیٰ کے بعد اب مقصد رسالت کا ذکر ہے اور وہ ہے انذار اور تبشیر! انسانی ہدایت کے لیے یہ دونوں پہلو ناگزیر ہیں، انذار کا مطلب ہے کفر و معاصی سے روکنا اور ان کے نتائجِ بد سے آگاہ کرنا، اور قرآنی اصطلاح میں اسی کا نام نہی عن المنکر ہے، تبشیر کا فریضہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کی دعوت دی جائے اور ان کے فضائل بیان کر کے ان کے خوشگوار نتائج پر مطلع کیا جائے۔

انذار اور تبشیر میں سے یہاں انذار کو مقدم کیا گیا ہے، اس لیے کہ جب ہمارے آقا نے دعوت کا آغاز کیا تھا تو رذائل اس معاشرے کی رگ و پے میں رچے بسے ہوئے تھے، ان حالات میں رذائل کے خلاف آواز بلند کرنا ہی حکمت کا تقاضا تھا۔

توبہ اور استغفار:

﴿۳﴾...... ﴿وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ﴾ ''اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو'' یہاں قرآن نے دو صیغے استعمال کیے ہیں، استغفار اور توبہ! استغفار کا تعلق سابقہ گناہوں سے ہے اور توبہ کا تعلق آئندہ معاصی کے قریب نہ جانے کے عزم سے، اور یہی دو شرطیں ہیں جو سچی توبہ کی ترجمان ہیں، اور اگر کوئی شخص زبان سے توبہ توبہ کرتا ہے لیکن عملی زندگی کی اقدار اور ترجیحات اسلام سے اخذ نہیں کرتا تو اسلاف نے ایسے شخص کو ''کذابین'' میں شمار کیا ہے۔{۵}

یہاں استغفار سے مراد ''ام الرذائل'' یعنی شرک سے معافی طلب کرنا مراد ہے۔ مطلب یہ کہ پہلے کفر و شرک جیسے منکرات سے جنابِ الٰہی میں معافی کی درخواست کر کے ایمان صحیح اختیار کرو اور پھر عملاً اطاعت و بندگی میں ڈوب کر اللہ کی طرف رجوع کرو۔{۶} استغفار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دل میں رجوع الی اللہ کا میلان زندہ ہے۔

{۴} (النحل ۳۶/۱۶)

{۵} قال بعض الصلحاء: الاستغفار بلا إقلاع توبة الكذابين (قرطبی ۷/۹)

{۶} قیل: استغفروا من الشرك ثمّ توبوا إلى الله بالطاعة (بیضاوی ۲۲۰/۳)

﴿یُمَتِّعۡكُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا﴾ ''وہ تمہیں اچھی زندگی عطا کرے گا'' اللہ کے سامنے اپنے گناہوں پر نادم ہوکر معافی چاہنے والوں کو اللہ دنیا وآخرت دونوں میں اپنی نعمتوں سے نوازے گا{۷} دنیا میں حیاتِ طیبہ اور آخرت میں ان عالی ہمت طالبانِ حق کو ان کی جانکاہیوں کے مطابق درجات نصیب ہوں گے۔ دنیا میں ''متاعِ حسن'' کبھی کیت (مقدار) کے اعتبار سے ہوتا ہے تو کبھی کیفیت اور معیار کے اعتبار سے، لیکن آخرت میں یہ معیار اور مقدار دونوں کے اعتبار سے ہوگا اور لامحدود ہوگا۔

متاعِ حسن:

یہاں ذہن میں آنے والے ایک اشکال کا دفعیہ ضروری ہے، وہ یہ کہ قرآن نے تو نیکوکاروں کے لیے دنیاوی زندگی میں متاعِ حسن کا صریح وعدہ کیا ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے پاکباز اور توبہ استغفار کرنے والے برگزیدہ لوگ اس دنیا میں جسم وروح کا رشتہ بڑی تنگی ترشی سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں؟

اس اشکال کے جواب کے لیے ہمیں اس آیت میں پائی جانے والی معنویت کو سمجھنا ہوگا، کچھ دیر کے لیے ہم یہ بات تسلیم کرلیتے ہیں کہ واقعتاً نیک اور راست باز افراد اس دنیا میں بے پناہ مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں، مصائب و آلام کی ایک یلغار ہے جس کا سامنا انہیں کرنا پڑ رہا ہے لیکن ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ معاشرہ ایمان باللہ کی اساس پر تشکیل نہیں پایا۔ یہاں صالح نظام رائج نہیں ہے، عدل وانصاف کی فراہمی عنقاء ہے، اللہ کو شارع اور قانون ساز تسلیم نہیں کیا گیا، اعمال واخلاق وکردار کی پستی کی کوئی حد نہیں اور قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ ایک حقیقی مومن کی دنیوی زندگی تبھی ''متاعِ حسن'' بنے گی جب معاشرہ مذکورہ رذائل سے پاک وصاف ہوگا۔ بھیڑیوں کے درمیان بکری کی سلامتی کا خواب کیسے دیکھا جاسکتا ہے؟

دوسرا اور حقیقی جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ وسائل کی کمی اور مسائل کی بہتات کے باوجود مومنِ کامل کی دنیوی زندگی حیاتِ طیبہ ہی شمار ہوگی، اس لیے کہ سختیوں اور تکلیفوں کے ہوتے ہوئے بھی اسے اطمینانِ قلب، تعلق مع اللہ، اخروی جزا کا یقین اور اللہ کے فضل وکرم کی جو امید ہوتی ہے، یہ روحانی دولت اس کے لیے سب سے بڑی ''متاعِ حسن'' ہوتی ہے۔

﴿إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى﴾ بتا دیا گیا کہ امن وراحت، وسعتِ رزق اور مصائب والی اس دنیاوی زندگی کا بہرحال ایک وقت مقرر ہے، بالآخر موت ان سب چیزوں کا خاتمہ کردے گی اور پھر موت کے بعد دائمی راحتوں کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔

{۷} ای ویعط کل ذی فضل فی العمل الصالح فی الدنیا اجرہ، و ثواب فضلہ فی الآخرۃ (تفسیر قاسمی ۹/۹۳)

﴿وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ﴾ صاحب اعمال کو اللہ اپنا فضل یعنی جنت عطا فرمائے گا۔ جو جس قدر مخلصانہ اطاعت والی زندگی گزارے گا اتنا ہی نوازا جائے گا اس لیے کہ اطاعت وتقوٰی کی طرح اخروی درجات کی بھی کوئی حد نہیں۔{۸}

قرآن کسی عمل کی ترغیب دیتے ہوئے اس کا فائدہ بیان کرتا ہے تو کسی عمل کے لیے ترہیب کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے نفرت بھی دلاتا ہے، ایمانی دعوت میں ان دو پہلوؤں میں سے ہر ایک اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ اطاعت وفرمانبرداری کا دنیوی واخروی نتیجہ بیان کرنے کے بعد نافرمانی اور اعراض کی سزا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے:

﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ﴾ ''اگر تم اعراض ہی کرتے رہے تو مجھے تم پر بڑے دن کے عذاب کے آنے کا اندیشہ ہے۔'' کار نبوت کی راہ میں حائل ہو کر مشکلات پیدا کرنے والوں کے بارے میں ادنیٰ شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ نہیں پائیں گے۔

اسے یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا تھا کہ میری دعوت ٹھکرانے کا یقینی اور لازمی نتیجہ دنیوی واخروی رسوائی ہے، لیکن ''إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ'' ارشاد فرما کر اس عمومی شفقت ورحمت کی طرف اشارہ فرمادیا جو ہمارے آقا ﷺ کے معصوم دل میں اپنی امت کے لیے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔{۹}

یہاں جس ''یوم کبیر'' کا ذکر ہے، اس سے کون سا دن مراد ہے؟

بعض حضرات نے اس سے ''یوم بدر'' مراد لیا ہے۔{۱۰} لیکن دیگر مفسرین نے ''یوم کبیر'' کا مصداق قیامت کے دن کو ٹھہرایا ہے{۱۱} اور یہی قول زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ قیامت کا دن اپنی وسعت وہولناکی کی وجہ سے ''یوم کبیر'' کہلانے کا زیادہ حقدار ہے، اور اگر آگے آنے والے ارشاد پر غور کیا جائے تو اس رائے کو مزید تقویت ملتی ہے، ارشاد ہے:

﴿۴﴾......﴿إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ ''تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' اس میں شک ہی کیا ہے کہ انسان کا دنیا وآخرت کا ایک ایک لحہ اور ایک ایک لحظہ اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے، البتہ قرآنی تعبیرات کی رو سے ''مَرْجِعُكُمْ'' سے مراد دنیاوی زندگی کے بعد کی حالت ہے۔ اس ایک فقرے میں اللہ کے حکموں سے سرتابی کرنے والوں کے لیے کس

{۸} فلما كان الاعراض عن غير الحق والاقبال على عبوديةالحق درجات غير متناهية فكذلك مراتب السعادات الاخروية غير متناهية (کبیر ۲،۷/۳۱۶)

{۹} (تفسیر عثمانی ۲/۱۱۹۔ معہد ام القریٰ)

{۱۰} وقيل الكبير هو يوم البدر (قرطبی ۹/۸)

{۱۱} هو يوم القيامة (روح المعانی ۷،۱۱/۳۰۶) ای یوم القيامة هو كبير لمافيه من الاهوال (قرطبی ۹/۸)

قدر شدید وعید ہے؟ عقل والے ہی اسے سمجھ سکیں گے۔

﴿وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے'' مشرکین اخروی زندگی کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار تھے، وہ اسے مستبعد سمجھتے تھے، بتا دیا گیا کہ اللہ جو کہ لامحدود قدرت کا مالک ہے، اس کے لیے تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا قطعاً مشکل نہیں لہٰذا تمہیں نظامِ آخرت اور سلسلۂ جزا وسزا پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

سینے دہرے کرنے والے:

﴿۵﴾......﴿أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ﴾ ''سن لو! وہ لوگ اپنے سینوں کو دوہرا کیے رہتے ہیں۔''

سب سے پہلے تو اس آیت کے شانِ نزول اور شانِ نزول کی بنیاد پر کی جانے والی تفسیر کے متعلق چند گزارشات کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شانِ نزول:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں اس آیت کا یہ شانِ نزول ذکر فرمایا ہے:

''بعض مسلمانوں پر حیا کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ استنجاء یا جماع وغیرہ جیسی بشری ضروریات کے وقت بھی وہ بدن کو برہنہ کرنے سے شرماتے تھے اور اگر برہنہ ہونا پڑتا تو شرمگاہ کو چھپانے کے لیے سینہ دوہرا کر لیتے تھے، پیشِ نظر یہ بات تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔'' {۱۲}

مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس آیت کے حوالے سے جو روایات ذکر کی ہیں، ان سب میں امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت صحیح ترین ہے اور یہی روایت اس آیت کی تفسیر کے لیے اساسی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن ناچیز کی نظر میں وہ مطلب زیادہ صحیح ہے جو اکابر میں سے حضرت تھانوی، حضرت مفتی محمد شفیع اور مولانا ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ جیسے بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ:

کافر اور منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو باتیں کرتے ہیں، وہ اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو جائے لیکن جس کو اللہ کے ''عالم الغیب اور علیم بذات الصدور'' ہونے اور نبی اکرم ﷺ کے صاحب وحی ہونے کا یقین ہوگا وہ کبھی بھی ایسی خفیہ تدبیریں نہیں کرے گا اور کافروں کا یہ اخفاء بدلالتِ حال اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اللہ سے اپنے ارادوں کو چھپانے کی کوششیں کر رہے ہیں تو انہیں جان لینا چاہئے کہ ان کی یہ کاوش عبث ہے اس لیے کہ اللہ تو سینوں میں چھپے رازوں سے بھی واقف ہے چہ جائیکہ ان باتوں سے باخبر نہ ہو جو زبان سے ادا ہو چکیں۔

{۱۲} (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۷۷)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو بقیہ روایات کے مقابلہ میں صحیح ترین قرار دینے کے باوجود فرماتے ہیں:

''اس روایت کے سہارے تفسیر کرنا اشکال سے خالی نہیں اور بالآخر یہی کہنا پڑے گا کہ قرآن کے اس ارشاد کے مخاطب مشرکینِ مکہ ہیں نہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ۔{۱۳}

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کی بناء پر مذکورہ آیات کا مطلب بیان کرنے میں کون سے اشکال وارد ہوتے ہیں؟ وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

۱......قرآن مجید کی آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو دعوتِ حق سے اعراض کی وجہ سے دھمکی دی جارہی ہے اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق قرآن کے مخاطب حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اور صحابہ کرام اگر جماع یا استنجاء وغیرہ کی حالت میں ستر میں مبالغہ کرتے تھے تو وہ محض ادب اور حیا کی بناء پر تھا اور یہ بات مسلّم ہے کہ کسی مغلوب الحال کو اس کے ادب اور حیاء کی بناء پر سرزنش نہیں کی جاسکتی۔

۲......سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ صحابہ کرام کا یہ عمل صفاتِ الٰہی سے بے خبری کی وجہ سے تھا اور وہ کسی درجے میں یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ ہوسکتی ہے اور یہ بات قطعاً تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ حضور کی صحبت کے بعد بھی صحابہ کا یہ اعتقاد ہو۔

۳......حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اللہ کے علم کی وسعت و گہرائی سے جانثارانِ محمد ﷺ کو باخبر کیا جارہا ہے، حالانکہ کون انکار کرسکتا ہے کہ صحابہ کرام کے مقابلے میں مشرکین کو یہ بات سمجھانے کی زیادہ ضرورت تھی۔

ان اشکالات سے تبھی بچا جاسکتا ہے جب آیت کا مصداق مشرکین کو قرار دیتے ہوئے اس کا وہی مطلب بیان کیا جائے جو حضرت حکیم الامت، حضرت کاندھلوی اور حضرت مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ نے مستند تفاسیر کی روشنی میں بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ:

نبی اکرم ﷺ کے مخالفین میں سے ایک گروہ ایسے سازشی عناصر پر مشتمل تھا، جو آپ کے اور آپ کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہمہ وقت سازشوں میں مصروف رہتا تھا، یہ لوگ اپنی سازشوں کے منظرِ عام پر آنے سے خوفزدہ

{۱۳} والذی یقتضیه السیاق ویستدعیه ربط الآیات کون الآیة فی المشرکین (روح المعانی ۷، ۱۱/۳۰۸)

رہتے تھے اس لیے آپس میں سرگوشیاں کرتے، دروازے بند کردیتے حتیٰ کہ اس قدر افراط سے کام لیتے کہ اپنے سینوں کو دوہرا کرلیتے اور اپنے اوپر کپڑے الگ سے ڈالتے تھے، اس قدر چھپ کر سازشوں کے تانے بانے تیار کرنے والے یہ احمق سمجھتے تھے کہ ہماری یہ حرکتیں کسی کی نظر میں نہیں۔{۱۴}

روایات میں اس حوالے سے اخنس بن شریق اور دیگر منافقین کے نام آئے ہیں۔{۱۵}

مگر علامہ بیضاوی نے یہ فرما کران روایات کو محلِ نظر قرار دیا ہے کہ:

"یہ آیت مکی ہے جبکہ نفاق کا آغاز مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔"{۱۶}

حکمت وہدایت:

۱......قرآنِ کریم کی آیات محکم بھی ہیں اور مفصّل بھی، ان میں کسی قسم کا تضاد نہیں اور ان میں وہ دلائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جو توحید، نبوّت اور بعث بعد الموت پر دلالت کرتے ہیں۔(۱)

۲......قرآنی تعلیمات کا مرکزی عنوان یہ ہے کہ انسان اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرکے غیر اللہ سے امیدیں وابستہ کرنا چھوڑ دے۔(۲)

۳......دنیا میں آنے والے ہر نبی کے ذمہ انذار وتبشیر کا فریضہ تھا یعنی گناہگاروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا اور نیکوکاروں کو اجروثواب کی خوشخبری سنانا۔(۲)

۴......مکی سورتوں اور ابتدائی مدنی سورتوں میں انذار مقدم ہے تبشیر پر؛ اس میں اشارہ ہے کہ جب معاشرے میں منکرات عام ہوجائیں تو پہلے انہیں ختم کرنے کی کوشش کی جائے، نیز یہ کہ دین کے داعی کے لیے حالات اور جذبات کی رعایت ضروری ہے۔

۵......ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے سچے دل سے توبہ کرے۔(۳)

۶......رسالت میں دو چیزیں نمایاں ہوتی ہیں، بشارت اور نذارت۔

۷...... "وَاِنۡ تَوَلَّوۡا" فرما کر بتادیا گیا کہ عناد کے ہوتے ہوئے دل میں دعوتِ حق کے لیے پذیرائی کے جذبات کبھی پیدا نہیں ہوسکتے۔(۳)

{۱۴} روی أن طائفة من المشركين قالوا: إذا أغلقنا أبوابنا وأرسلنا ستورنا واستغشينا ثيابنا وثنينا صدورنا علىٰ عداوة محمد فكيف يعلم بنا؟ (كبير۶،۱۷/۳۱۸)

{۱۵} قيل: نزلت في المنافقين...... وقيل: نزلت في الأخنس بن شريق (تفسير الحسن البصری ۲۰۹/۳)
روی أنها نزلت في الأخنس بن شريق...... وقيل نزلت في المنافقين (كشاف ۳۶۰/۲)

{۱۶} وفيه نظر إذ الآية مكية والنفاق حدث بالمدينة (بيضاوی ۲۲۰/۳)

۸.....توبہ اور استغفار کرنے والوں کو اخروی کامیابی کے علاوہ دنیوی فلاح بھی عطا کی جاتی ہے اور اس سے اعراض کا نتیجہ دنیوی اور اخروی رسوائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۹.....مرنے کے بعد تمام مخلوقات کا مرجع اس اللہ کی طرف ہوگا جو عذاب وثواب پر قادر ہے۔(۴)

۱۰.....کفار کا نبی اکرم ﷺ کی دعوت سے اعراض اور آپ کی رسالت کا انکار، ان کی غباوت و جہالت پر دلالت کرتا ہے۔(۵)

۱۱.....اللہ تعالیٰ انسان کی نیت اور دل میں چھپے ارادوں سے خوب واقف ہے، انسان اگر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ میرے سینے کے رازوں پر مطلع نہیں تو یہ اس کی حماقت ہے۔(۵)

۱۲.....ہر وقت اللہ کے حاضر ناظر ہونے کا یقین انسان کو گناہ سے بچانے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۱۳.....اللہ تعالیٰ کی صفات کو انسانوں کی صفات کے پیمانے سے ناپنا نری حماقت ہے، کفار اسی حماقت کی بناء پر اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے اور سمجھتے تھے کہ جس طرح کوئی انسانی آنکھ ہمیں نہیں دیکھ رہی اسی طرح ہماری عیاریاں اللہ سے بھی پوشیدہ ہیں۔

اللہ کا فضل وعلم اور اس کی قدرت

﴿۶.....۷﴾

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا

اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے سب کچھ

كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ۝ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

موجود ہے کھلی کتاب میں O اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں

وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ

اور تھا اس کا تخت پانی پر تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام اور اگر تو کہے کہ تم

مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

اٹھو گے مرنے کے بعد تو البتہ کافر کہنے لگیں یہ کچھ نہیں مگر جادو ہے کھلا ہوا O

ربط: ماقبل آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و مخفی ہر معاملہ کو جانتا ہے، یہاں بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم اور قادر ہونے کے ساتھ خالق ورازق بھی ہے اور بندوں کے احوال سے باخبر بھی۔

تسہیل: زمین پر حرکت کرنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، وہ ہر ایک کی جائے قرار کو بھی جانتا ہے اور مدفن کو بھی جانتا ہے، یہ سب کچھ لوحِ محفوظ میں درج ہو چکا ہے ○ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا، تمہیں پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے، اے پیغمبر! اگر آپ ان سے کہتے ہیں کہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو کافر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۶﴾...... ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ یہاں لفظ ﴿دَآبَّةٍ﴾ اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور اس میں تمام حیوانات شامل ہیں{۱۷} چاہے وہ انسان ہوں یا حیوان، سینے کے بل رینگنے والے ہوں یا پاؤں کے سہارے چلنے والے، خشکی میں رہنے والے ہوں یا تری میں، سطحِ زمین پر ہوں یا زیرِ زمین ان کا مسکن ہو، الغرض زمین پر حرکت کرنے والے لاتعداد اور بے شمار جانداروں کی اقسام میں سے جو قسم بھی ہو اور زمین کے اطراف واکناف میں جہاں بھی ہو وہ اللہ کے علمِ محیط میں ہے، یہ علم ہر وقت تمام مخلوقات کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اور اسی علم کے سہارے ہر جاندار کو زمین میں رزق پہنچایا جا رہا ہے۔

لفظ ﴿عَلَى﴾ اس آیت میں وجوب کے لیے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمام جانداروں کو غذا اور معاش مہیا کرنا اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے اور یہ وجوب فقط اس کا فضل ہے{۱۸} ورنہ وہ مالک الملک بھلا کسی ضابطے اور قانون کا پابند کیسے ہو سکتا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظِ "عَلَى" عربی زبان میں وجوب کے لیے آتا ہے اور یہاں دو باتیں بتانے کے لیے لایا گیا ہے:

اوّل یہ کہ رزق کی ضمانت وکفالت جب اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے تو وہ بالضرور پوری ہو کر رہے گی۔

دوئم یہ کہ بھروسہ اسباب پر نہیں خالق اسباب پر ہونا چاہیے{۱۹}

حضرت تھانوی رحمہ اللہ "بیان القرآن" میں لکھتے ہیں کہ:

{۱۷} المراد بهذا اللفظ فى هذه الآية الموضوع الاصلى اللغوى فيدخل منه جميع الحيوانات و هذا متفق عليه بين المفسرين (كبير ۶،۱۷/۳۱۸)

{۱۸} وانما هو تفضل (كشاف ۲/۳۶۰)

{۱۹} وانما أتى بلفظ الوجوب تحقيقا لوصوله و حملا على التوكل فيه (بيضاوى ۳/۲۲۱)

''آدمی اگر اسباب وتدابیر اختیار کرتے وقت نظر مسبب الاسباب پر رکھے تو یہ توکل کے منافی نہیں البتہ حق تعالیٰ کی قدرت کو ان اسباب کا تابع نہ سمجھا جائے، خلاصہ یہ کہ وثوق اور ربطِ قلب حق تعالیٰ کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ {۲۰}

قرآن کا یہی منطوق یعنی ''ہر جاندار کے لیے رزق کی ضمانت'' دوسرے مقام پر ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ دَآبَّةٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَهَا ۚ اللّٰهُ يَرۡزُقُهَا وَاِيَّاكُمۡ﴾ {۲۱} ''کتنے ہی جاندار ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، انہیں اور تمہیں روزی دینا اللہ کی ذمہ داری ہے۔''

﴿وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا﴾ ''وہ ہر ایک کی جائے قرار کو بھی جانتا ہے اور مدفن کو بھی جانتا ہے۔''

مستقر اور مستودع کے بارے میں شارحینِ قرآن کے متعدد اقوال ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ''مستقر'' سے دنیوی زندگی اور مستودعٔ سے مراد جائے دفن ہے، {۲۲} حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مستقر سے رحمِ مادر اور مستودع سے صلبِ پدر مراد ہے، حضرت عطاء بن رباح کا قول اس کے برعکس ہے جبکہ علامہ ابنِ کثیر کی رائے اس بارے میں یہ ہے:

﴿و انّه يعلم مستقرّها و مستودعها اى يعلم اين منتهى سيرها فى الارض و اين تأوى إليه من و كرها﴾ {۲۳} ''زمین میں جہاں تک چلے پھرے وہ مستقر ہے اور چل پھر کر جہاں واپس آئے وہ مستودع ہے۔''

﴿كُلٌّ فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ﴾ ''سب کچھ لوحِ محفوظ میں درج ہو چکا ہے'' علمِ الٰہی میں یہ سب چیزیں ہونے کے باوجود کتابِ مبین یعنی لوحِ محفوظ میں بھی منضبط اور درج ہیں اور لوحِ محفوظ بھی علمِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی قسمت زمین وآسمان کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے لکھ دی تھی اور اس وقت اللہ کا تخت پانی پر تھا۔'' {۲۴}

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک رحمِ مادر میں چالیس روز تک بصورتِ نطفہ رہتا ہے، اتنی ہی مدت ''علقہ'' (جما ہوا خون) اور

{۲۰} (بیان القرآن، حصہ اول، جلد۵/۳۵، دیکھئے حاشیہ "مسائل السلوک")
{۲۱} (العنکبوت ۲۹/۶۰)
{۲۲} (قبس من نور القرآن الکریم ۱۳/۵)
{۲۳} (ابن کثیر ۲/۵۶۹)
{۲۴} (مسلم ۲، کتاب القدر/۳۳۵)

اتنی ہی مدت ایک بے جان لوتھڑے کی شکل میں ہوتا ہے، پھر اللہ ایک فرشتے کو حکم دیتے ہیں کہ اس کے بارے میں چار باتیں لکھ دو:

اوّل اس کا عمل، دوم مدّتِ زندگی، سوم رزق اور چہارم اس کا خوش بخت یا بد بخت ہونا۔" {۲۵}

الغرض ہر جاندار کے عارضی اور مستقل ٹھکانے کا علم بھی اللہ کو ہے اور اس کے ظاہر و باطن میں جو کچھ ہے اسے بھی اللہ خوب اچھی طرح جانتا ہے۔

﴿۷﴾......﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔"

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ایک اور مظہر سامنے لایا گیا کہ اس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، ان دنوں سے کون سے دن مراد ہیں؟ ظاہر ہے کہ ۲۴ گھنٹے کا یہ دن تو مراد لیا نہیں جاسکتا لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس سے چھ حالتیں اور چھ ادوار مراد ہیں، اگرچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ "ایام" سے مراد وہ مقدارِ وقت ہے جو آسمان و زمین کی پیدائش کے بعد آفتاب کے طلوع سے غروب تک ہوتا ہے {۲٦} جبکہ علامی قشیری رحمہ اللہ کے نزدیک اس سے مراد آخرت کا دن ہے جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے۔{۲۷}

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ چاہتا تو پلک جھپکنے کی دیر میں زمین و آسمان کو پیدا کرسکتا تھا لیکن چھ دن کی مقدار میں پیدا کرنے میں یہ حکمت ہے کہ وہ بندوں کو ٹھہراؤ کی تعلیم دینا چاہتا ہے {۲۸}

حدیث میں ہے:

الاناة من الله و العجلة من الشيطن {۲۹} "آہستگی رحمٰن کا کام ہے اور جلد بازی شیطان کی خصلت ہے۔"

کائنات کا چھ دوروں میں درجہ بدرجہ ظہور میں آنا اور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ خالقِ کائنات نے اپنے ارادہ، ترتیب و حکمت کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے۔

﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ "اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا" کہا جاسکتا ہے کہ یہ جاہلی دماغوں میں پیدا

{۲۵} (بخاری ۲، کتاب القدر/۹۷۲)
{۲٦} (مظہری ۴/۳۱۴)
{۲۷} قال: و معنى "فى ستة ايام" اى من ايام الآخرة، كل يوم الف سنه (قرطبى ۷/۱۹۵)
{۲۸} قال ابن عباس: لوشآء لخلقها فى أقل من لحظة ولكن أرادأن يعلم عباده التريث فخلقها فى ستة ايام (قبس من نور القرآن الكريم ۵/۱۳)
{۲۹} (ترمذی ۲، کتاب البر والصلة/۲۱)

ہونے والے اس سوال کا جواب ہے کہ جب نہ عالم تھا اور نہ ہی وہ سب کچھ جو عالمِ کون و مکاں میں ہے تو اللہ کی حکومت کس پر تھی؟

جواب ارشاد فرمایا کہ اس عالم سے پہلے اللہ کی حکومت اس عالم پر تھی جو اس وقت موجود تھا یعنی عالمِ آب!

جس پانی پر عرشِ الٰہی تھا، اس پانی سے یہی پانی مراد ہے جس کے متعلق ارشادِ باری ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ {۳۰} ''ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا۔''

البتہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''فعلیت یعنی کام کرنے کی قدرت وصلاحیت کا نام عرش ہے اور قوت کا معنی پانی ہے۔{۳۱}

لیکن آیت میں ان امور کی تفصیلات مذکور نہیں لہٰذا کسی قول کو قطعی اور حتمی نہیں کہا جا سکتا۔

- علامہ بقاعی رحمہ اللہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

عرش کے پانی پر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پانی سے ملا ہوا تھا، بلکہ عرش پانی پر ایسے ہی تھا جیسے اب آسمان زمین پر ہے۔{۳۲}

عرش کے پانی پر ہونے کی بابت صحیح احادیث بھی کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ زمین وآسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔{۳۳}

امام بخاری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں ایک حدیث قدسی لائے ہیں، اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتے ہیں:

اے انسان! تو میری راہ میں خرچ کر، میں تجھے دوں گا، خرچ کرنے سے اللہ کے ہاں کوئی کمی نہیں آتی، اے انسانو! سوچو کہ اللہ نے زمین وآسمان کی پیدائش سے لے کر اب تک کتنا خرچ کیا ہوگا؟ لیکن اس کے باوجود جو کچھ اس کے داہنے ہاتھ میں تھا اس میں کمی واقع نہیں ہوئی اور اس کا عرش پانی پر تھا، اس کے ہاتھ میں میزان ہے اسے جھکاتا اور اٹھاتا ہے۔{۳۴}

{۳۰} (الانبیاء ۲۱/۳۰)
{۳۱} (معالم العرفان ۹/۳۲۶)
{۳۲} ولا يلزم من ذلك الملاصقة كما ان السماء على الارض من غير ملاصقة (نظم الدرر ۳/۵۰۵)
{۳۳} (تقدم تخريجه)
{۳۴} (بخاري ۲، كتاب التفسير/۶۷۷)

﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ''تا کہ {۳۵} تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔''

''آفرینش کی غرض وغایت ہی امتحان وآزمائش ہے، ورنہ خود زمین وآسمان کا پیدا کرنا کوئی مقصد نہ تھا۔''

سورۂ انعام میں یہی حقیقت ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ﴾{۳۶} ''اور تم میں سے بعض کا رتبہ بعض کے مقابلے میں بلند کیا تا کہ اس نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے، اس میں تمہیں آزمائے۔''

سورۂ ملک میں ارشاد ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾{۳۷} ''اس (اللہ) نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ جانچ لے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

ایسی ہی تعبیر سورۂ کہف میں بھی ہے، فرمایا:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾{۳۸} ''ہم نے زمین کی تمام چیزوں کو اس زمین کے لیے زینت بنایا تا کہ ہم پرکھ لیں کہ ان میں سے عملاً سب سے اچھا کون ہے۔''

ان آیات کی روشنی میں اس بات کا سمجھنا قطعاً مشکل نہیں رہتا کہ یہ دنیوی زندگی ایک امتحان گاہ ہے تا کہ معلوم کیا جا سکے کہ کون ہے جو مخلوق میں غور وتدبر کے ذریعے مالکِ حقیقی کی صحیح معرفت حاصل کرتا اور محسن شناسی کا فطری فرض بجالاتا ہے اور کون احمق اور غافل اس منعمِ حقیقی سے منہ موڑتا اور کفر واستکبار کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انسانی فطرت میں اختیار کی جو قوت رکھی گئی ہے اس کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلاء وامتحان ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ''أَحْسَنُ عَمَلًا'' کی قید لگائی ہے یعنی کون اچھے عمل کرنے والا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرنے والا ہے، معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ کی کثرت سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے، وہ حسنِ عمل ہے، اخلاص کے ساتھ سنت کے مطابق کیا جانے والا تھوڑا سا عمل اس زیادہ عمل سے کہیں بہتر ہے جس میں یہ اوصاف نہ ہوں یا کم ہوں۔{۳۹}

{۳۵} اللام (فی لیبلوکم- راقم) للتعلیل (روح المعانی ۱۲،۷/۱۵)
{۳۶} (الانعام ۶/۱۶۵)
{۳۷} (الملک ۶۷/۲)
{۳۸} (الکہف ۱۸/۷)
{۳۹} (ابن کثیر ۲/۵۷۱)

﴿وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ......﴾ ''اگر آپ ان سے کہتے ہیں کہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔''

دنیا جب امتحان گاہ قرار پائی تو ضروری ہے کہ امتحان ختم ہونے کے بعد جزا اور سزا کا سلسلہ بھی ہو، تاکہ کامیاب کو نوازا جائے اور ناکام ہونے والے کو سزا دی جائے، اسی لیے یہاں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ذکر کیا گیا، لیکن کفارِ مکہ بعث بعد الموت کو امرِ محال سمجھتے تھے اور جب کبھی نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر سنتے تو کہتے:

﴿اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ﴾ ''یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔''

قرآن کی اثر آفرینی دیکھئے کہ دشمنی اور عناد کے باوجود ان کے پاس ''انکار'' کی جرأت نہ تھی بلکہ وہ اسے ''جادو'' کہنے پر مجبور تھے۔ کتاب اللہ کی حیرت انگیز تاثیر پر اس سے بڑی شہادت کون سی لائی جائے؟

خلاصہ یہ کہ کفار اور منافقین کو شریعتِ اسلامیہ کی کوئی بات سمجھ نہ آئے تو وہ اسے کوئی سا بھی ''نام'' دے کر ٹال دیتے ہیں۔ بعض مستشرقین بھی اسی قبیل سے ہیں، یہ لوگ حضور ﷺ کے کارہائے نمایاں کا انکار نہیں کر سکتے بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں، آپ کے لائے ہوئے عظیم انقلاب کا انکار بھی ان کے بس میں نہیں، وہ کہتے ہیں کہ آپ بے حد ذہین، بڑے عقلمند اور عظیم انسان تھے، آپ نے وہ انقلاب برپا کیا جو حضرت موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی برپا نہ کر سکے لیکن ان سے سوال کیا جائے کہ کیا تم ایسی عظیم شخصیت کو اللہ کا نبی تسلیم کرتے ہو؟ تو وہ انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ بلاشبہ آپ بے شمار اوصاف کے حامل ہیں لیکن اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ {۴۰}

حکمت و ہدایت:

۱...... اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تمام مخلوقات کا رزق اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ (۶)

۲...... انسان کے دنیا میں آنے سے لے کر زیر زمین جانے تک بلکہ بعد کے سارے معاملات بھی اللہ کے علم میں ہیں۔ (۶)

۳...... کسب معاش کے وسائل و اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں لیکن نظر مسبب الاسباب پر ہونی چاہیے۔

۴...... اللہ تعالیٰ ان تمام اطوار و ادوار کو جانتا ہے جن سے کوئی حیوان گزر کر اپنی موجودہ حالت تک پہنچتا ہے۔ (۶)

۵...... ''مستودع'' کی تعبیر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کی گود میں بطور امانت دیا جاتا ہے اور ایک دن آئے گا جب زمین اللہ کی یہ امانت اللہ کے سپرد کر دے گی۔

۶...... آسمان و زمین اور ان کے درمیان جتنی مخلوقات ہیں، ان سب کا خالق اللہ ہے۔

{۴۰} (معالم العرفان ۹/۳۲۸ و مابعدھا)

۷......"فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ" سے معلوم ہوا کہ یہ تمام کائنات یکبارگی ظہور میں نہیں آئی بلکہ اس پر تخلیق کے مختلف دور یکے بعد دیگرے طاری ہوئے ہیں۔(۷)

۸......درجہ بدرجہ کائنات کا وجود میں آنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے باقاعدہ ارادہ کے ساتھ وجود عطا کیا ہے۔

۹......مخلوقات میں سب سے بڑی مخلوق اللہ کا عرش ہے، جو سات آسمانوں پر بغیر ستون کے ٹھہرا ہوا ہے اور اس سے اوپر کوئی چیز نہیں۔(۷)

۱۰......انسان کو دنیا میں بھیج کر اللہ اسے پرکھنا چاہتا ہے کہ یہ میرا مطیع بن کر زندگی گزارتا ہے یا بغاوت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔(۷)

۱۱......"لِيَبْلُوَكُمْ" تمام کائنات کے مقابلے میں صرف انسان کو ایمان و کفر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا جو اختیار حاصل ہے، درحقیقت اسی اختیار کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر "ابتلاء" ہے۔

۱۲......دلائلِ عقلیہ و نقلیہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی کہ مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی ہے جس میں انسانوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ ہوگا، نیکو کاروں کو دائمی نعمتیں اور مسرتیں حاصل ہوں گی اور کافر و مشرک عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔(۷)

نعمت اور مصیبت میں مومن اور کافر کا رویہ

﴿۸......۱۱﴾

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ

اور اگر ہم روکے رکھیں ان سے عذاب کو ایک مدتِ معلوم تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک دیا عذاب کو؟ سنتا ہے! جس دن آئے گا

لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ

ان پر نہ پھیرا جائے گا ان سے اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے ۝ اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو

مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ

اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید ناشکر ہوتا ہے ۝ اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام بعد تکلیف کے

مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا

جو پہنچی تھی اس کو تو بول اٹھے دور ہوئیں برائیاں مجھ سے وہ تو اترانے والا شیخی خورا ہے ۝ مگر جو لوگ صابر ہیں

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱

اور کرتے ہیں نیکیاں ان کے واسطے بخشش ہے اور ثواب بڑا ۝

ربط : کفار کی ایک اور بری خصلت کا ذکر ہے، وہ یہ کہ تاخیرِ عذاب کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہوئے اپنی اصلاح کے بجائے وہ استہزاءً سوال کرتے ہیں کہ عذاب آنے میں رکاوٹ کیا ہے؟

تسہیل : اور اگر ہم ایک معین مدت تک کے لیے عذاب مؤخر کردیں تو یہ کہتے ہیں، وہ کونسی چیز ہے جس نے عذاب کو روک رکھا ہے؟ یاد رکھو! جس دن ان پر عذاب آپڑے گا اسے ٹالا نہیں جاسکے گا اور جس عذاب کا یہ مذاق اڑاتے ہیں وہ انہیں آکر گھیر لے گا○ اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھادیں پھر اسے اس سے محروم کردیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہوجاتا ہے○ اور اگر ہم مصیبت اور پریشانی کے بعد اسے راحت کا مزہ چکھادیں تو وہ کہتا ہے، میرے سارے دکھ درد دور ہوگئے، حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا اکڑنے والا اور شیخی بگھارنے والا ہے○ البتہ وہ لوگ جو صبر کرنے والے ہیں اور نیک عمل کرتے رہتے ہیں، وہ ایسے نہیں ہوتے، انہی کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے○

﴿تفسیر﴾

﴿۸﴾......اللہ تعالیٰ کائنات کے سارے نظام کو اپنی خاص حکمت کے ساتھ چلا رہا ہے، اس کے ہاں ہر معاملے کا ایک وقت مقرر ہے، کوئی امر نہ اپنے وقت سے ایک گھڑی پہلے وقوع پذیر ہوسکتا ہے نہ ایک لحہ تاخیر سے، یونہی اللہ کے ہاں عذاب اور ہلاکت کا بھی ایک وقت مقرر ہے لیکن مشرکین جس طرح بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں اور اسے کائنات کے اٹل اصولوں کی روشنی میں نہیں سمجھتے، اسی طرح دنیوی عذاب کو بھی نہیں سمجھ پارہے، اس لیے وہ ازراہِ تمسخر پوچھتے ہیں کہ عذاب کیوں نہیں آرہا؟

وہ نہ تو اللہ کی حکمت سے واقف تھے اور نہ اس کی رحمت سے، ورنہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یہ وعید اور ڈراوا افسانہ نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ تاخیرِ عذاب میں اللہ کی ایک حکمتِ کارفرما ہے، وہ یہ کہ عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک ہدایت کے ذریعے قوم کے صالح اجزاء ان کے فاسد عناصر سے الگ نہیں ہوجاتے۔

﴿اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْھِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْھُمْ﴾ فرمایا کہ کفار کو عذابِ الٰہی کے بارے میں اس قدر بے چین ہونے کی ضرورت نہیں، جب عذاب کے سارے عوامل فراہم ہوجائیں گے اور عذاب کا وقتِ موعود آجائے گا تو وہ اس کا دفاع نہیں کرسکیں گے، فرعون کا وقتِ موعود آیا تو وہ غرق ہوکر رہا، قومِ عاد و ثمود کی مدتِ مہلت ختم ہوئی، تو وہ نیست و نابود ہوگئے، قومِ لوط اور دیگر سرکش قوموں کی ہلاکت اللہ کے عذاب سے ہوئی، اسی طرح جب ان پر عذاب آئے گا تو پھر یہ بھی بچ نہیں سکیں گے۔

﴿وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ عذاب میں تاخیر اس لیے ہو رہی ہے کہ مہلت دینا اللہ کی عادت ہے، لیکن جب یہ مہلت ختم ہو جائے گی تو وہ عذاب ان کو اپنی گرفت میں لے لے گا{۴۱} جسے یہ دل لگی سمجھ کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

قرآنِ کریم کا ایک انداز یہ ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کے وقوع کے یقینی ہونے کی وجہ سے مستقبل کے کسی واقعہ یا حادثہ کو لفظِ ماضی سے تعبیر کر دیتا ہے جیسے یہاں مشرکین کو آئندہ پیش آنے والے عذاب کے لیے "حَاقَ" کا صیغہ لایا گیا ہے۔

﴿۹﴾......اس آیتِ کریمہ میں انسان کی ایک فطری کمزوری کا بیان ہے کہ جب وہ صحت کے بعد بیماری اور عزت کے بعد ذلت کا شکار ہوتا ہے تو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اللہ کے انعامات واحسانات کو بھلا کر کفرانِ نعمت میں مبتلا ہو جاتا ہے حالانکہ جب صبر کی جگہ مایوسی اور شکر کی جگہ کفران آ جائے تو پھر حالات کی ناسازگاریوں کا سامنا مشکل ہو جاتا ہے، قرآن ایک مؤمن کو یہ نظریہ دیتا ہے کہ حالات کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں مایوسی کو اپنے قریب نہ آنے دیا جائے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ﴾ {۴۲} "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔"

﴿لَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ﴾ {۴۳} "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔"

﴿۱۰﴾......ایک طرف تو انسان کا یہ حال ہے کہ وہ بدحالی میں مایوسیوں کو گلے لگا کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسری طرف اسے خوشحالی نصیب ہو تو وہ گھمنڈ کرنے لگتا ہے حالانکہ اسے تو اپنی پچھلی حالت یاد کر کے اللہ کے احسانات کے سامنے جھک جانا چاہیے تھا۔

ان آیات میں جن دو اخلاقی رذائل کا بیان ہے یعنی تنگ حالی میں ناامیدی اور خوشحالی میں تکبر اور غرور، ہمارے آقا ﷺ کے مخاطب خاص طور پر ان میں مبتلا تھے۔

آیت میں "أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ" کی تعبیر پر علامہ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ نے بڑی عمدہ بات لکھی، فرماتے ہیں:

{۴۱} دار ووجب ونزل (تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس/۲۳۲)
{۴۲} (الزمر ۳۹/۵۳)
{۴۳} (یوسف ۱۲/۸۷)

''دنیا میں انسان نعمت ''چکھ'' کر اتراتا ہے، اگر پیٹ بھر کر نعمتیں حاصل ہوتیں جیسا کہ عالمِ آخرت میں ہوں گی تو حضرت انسان کیا کرتے؟''{۴۴}

الغرض انسان کو معقول اور صحیح رویے پر قائم رہنا چاہیے، حالات سازگار ہوں تو بڑائی کے نشے میں مدہوش ہو کر بہک نہ جائے اور اگر مصائب میں پھنس جائے تو اپنے جوہرِ انسانیت کو پامال نہ ہونے دے۔

﴿۱۱﴾ ...... جو لوگ صبر کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور اعمالِ صالحہ کے عادی ہیں، ان کا حال عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتا، وہ مصیبت میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور امن وراحت کے لمحات کو ادائے شکر میں گزارتے ہیں۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ کے استثناء سے متعلق علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

''یئوس'' اور ''کفور'' میں عدمِ صبر اور عدمِ شکر کے معنی پائے جاتے ہیں اس لیے استثناء لا کر ان اولوا العزم لوگوں کا ذکر کیا جو ان رذائل کی جگہ صبر و شکر جیسی صفات سے متصف ہیں۔{۴۵}

اللہ تعالیٰ ان اوصاف کی وجہ سے انہیں ان کی کوتاہیوں کے نتائج سے محفوظ رکھے گا اور وہ مغفرت اور بہت بڑے اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مومن ہر حال میں خیر پر ہوتا ہے، راحت میں شکر کرتا ہے تو راحت اس کے لیے خیر کا سبب بن جاتی ہے اور اگر دکھ اور مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے لہٰذا یہ دکھ اس کے حق میں خیر بن جاتا ہے۔''{۴۶}

فخر المفسرین علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قرآن نے ''مَّغْفِرَةٌ'' اور ''اَجْرٌ كَبِيْرٌ'' یہ دو لفظ لا کر دو مطلوب بیان کر دیے۔ ایک آخرت کے سخت حساب سے خلاصی، اس کے لیے ''مَّغْفِرَةٌ'' کا لفظ لایا گیا ہے اور دوسرے دنیا میں کیے جانے والے اعمال کا ثواب، اس کی طرف ''اَجْرٌ كَبِيْرٌ'' کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔{۴۷}

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الفاظ کے انتخاب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے معانی میں کتنی وسعت و گہرائی پائی جاتی ہے۔

{۴۴}(تفسیر حقانی ۲/۵۵۹)
{۴۵}کانّه قیل: الا المومن الصابر الشاکر(روح المعانی ۷، ۱۲/۲۴)
{۴۶}(مسلم ۲، کتاب الزھد/۴۱۳)
{۴۷}(کبیر ۶، ۱۷/۳۲۳)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں جو مغفرت کو مقدم کیا تو اس کا مزہ عشاق سے پوچھو، غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی، وہ تو سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمالِ صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخش دیے گئے، نہ جنت کا ذکر نہ حور وقصور کا تذکرہ، مگر عشاق کے دل تو اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلبِ رضا ہی میں مرتے ہیں اور جنت کی طلب بھی اس کی رضا ہی کے لیے کرتے ہیں۔{۴۸}

حکمت و ہدایت:

۱......کفار سے کیے گئے وعدۂ عذاب کو اللہ ضرور پورا فرمائیں گے، نہ اس عذاب کے وقوع میں شک وشبہ کی گنجائش ہے نہ کسی کو اس کے ٹالنے کی مجال ہے۔

۲......معصیت میں ڈوبے ہوئے افراد اللہ کی طرف سے دی گئی ڈھیل سے دھوکے کا شکار نہ ہوں، وہ کسی وقت بھی عذابِ الٰہی کی گرفت میں آسکتے ہیں۔(۸)

۳......عذاب میں تاخیر اللہ کی کسی خاص حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔

۴......اللہ کی دی ہوئی ڈھیل سے کافر شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں اور سرکشی میں اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

۵......انسان کی ایک طبعی کمزوری یہ ہے کہ کسی نعمت کے چھن جانے کے بعد ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور خوشحالی میں شکر کے بجائے اترانا شروع کر دیتا ہے۔(۹-۱۰)

۶......دنیا کے حالات ایک جیسے نہیں رہتے، مومنِ کامل بلکہ انسانِ کامل وہی ہے جو ہر تغیر وانقلاب اور ہر رنج وراحت میں اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرے۔

۷......کافر نعمتوں کے حصول کو اتفاقِ محض سمجھتا ہے اس لیے نعمت کے چھن جانے سے پریشان اور مایوس ہو جاتا ہے جبکہ ایک مومن نعمتوں کو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کا نتیجہ سمجھتا ہے تو نعمت سے محروم ہونے پر زیادہ پریشان نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیشِ نظر یہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ﴾{۴۹} ''کیا عجب ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر بدلہ عطا فرمادے۔''

''اَذَقْنَا'' لفظِ ''ذوق'' (چکھنا) لا کر اس طرف توجہ دلادی کہ دنیا کی خوشی اور غم آخرت کی خوشی اور غم کا ادنیٰ معمولی سا نمونہ ہیں۔{۵۰}

{۴۸} (اشرف التفاسیر ۲/۳۸۰)
{۴۹} (القلم ۶۸/۳۲)
{۵۰} (بیضاوی ۳/۲۲۳)

۸......صبر اور اعمالِ صالحہ کو اپنا ہتھیار بنانے والے حالات کی رو میں نہیں بہتے۔(۱۱)

۹......مذکورہ دو صفات (صبر اور اعمالِ صالحہ) سے متصف انسانوں کو اللہ عذاب سے بھی محفوظ رکھے گا اور اپنے فضل سے ان کی نیکیوں کا ثواب بھی ان کو عطا کرے گا۔(۱۱)

حضور کو تسلی اور معاندین کو چیلنج

﴿۱۲......۱۴﴾

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ

سو کہیں تُو چھوڑ بیٹھے گا کچھ چیز اس میں سے جو وحی آئی تیری طرف اور تنگ ہو گا اس سے تیرا جی اس بات پر کہ

اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾

وہ کہتے ہیں کیوں نہ اترا اس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ فرشتہ، تُو تو ڈرانے والا ہے اور اللہ ہے ہر چیز کا ذمہ دار O

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

کیا کہتے ہیں کہ بنا لایا ہے تُو قرآن کو؟ کہہ دے! تم بھی لے آؤ ایک دس سورتیں ایسی بنا کر اور بلا لو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر ہو تم سچے O پھر اگر نہ پورا کریں تمہارا کہنا تو جان لو کہ قرآن تو اترا ہے اللہ کی وحی سے

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور یہ کہ کوئی حاکم نہیں اس کے سوا پھر اب تم حکم مانتے ہو؟ O

ربط: مشرکین نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے تسلیم کرنے کو بے ہودہ اور لغو قسم کی شرائط سے مشروط کرتے جس سے قلب اطہر حزین و ملول ہو جاتا، فرمادیا گیا کہ اس قدر غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ آپ اپنی جان ہی کو ہلاک کر ڈالیں، آپ کا کام تو فقط تبلیغ کرنا ہے۔

تسہیل: کیا آپ کفار کے کہنے پر اس وحی میں سے کچھ باتیں چھوڑ دیں گے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے؟ (یقیناً نہیں) اور ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ان کے اس مطالبہ سے قلبی اذیت ہوتی ہے کہ اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آتا؟ آپ تو صرف خبردار کرنے والے ہیں، مطالبات کا پورا کرنا آپ کی ذمہ داری نہیں، ہر چیز کا نگہبان اللہ ہے تو آپ اسی پر توکل کیجیے O کیا یہ قرآن کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ

نے اسے خود گڑھ لیا ہے؟ آپ فرمادیجیے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ، تمہیں یہ بھی اجازت ہے کہ اللہ کے سوا اپنی مدد کے لیے جس جس کو بلا سکتے ہو، بلالو O اے مسلمانو! اگر یہ کفار تمہارا مطالبہ پورا نہ کرسکیں تو ان سے کہو کہ اب تو یقین کرلو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی تم اسلام لاتے ہو یا نہیں؟ O

تفسیر

﴿۱۲﴾......علامہ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ مشرکین نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ جو قرآن آپ لے کر آئے ہیں، اس میں ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا گیا ہے لہٰذا کوئی ایسا قرآن پیش کرو جو ہمارے معبودوں کی تردید نہ کرتا ہو، ان کے اس فضول مطالبہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ {۵۱}

اس شانِ نزول کی بناء پر "مایُوحی" سے مراد وہ آیات ہوں گی جن میں معبودانِ باطلہ کی نفی اور توحید کی دعوت ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اس آیت میں "لعلّ" کا لفظ آیا ہے جس میں "توقّع" کا معنی پایا جاتا ہے، مطلب یہ ہوگا کہ اگر یہ کفار اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے، تو توقّع ہے کہ آپ ان کی رعایت کرتے ہوئے آیاتِ توحید بیان کرنا چھوڑ دیں گے، حالانکہ یہ توقع اللہ کے نبی کی شان کے خلاف ہے؟

علامہ بیضاوی اس شبہ کے ازالہ کے لیے لکھتے ہیں:

"بعض اوقات کسی کام کے اسباب موجود ہوتے ہیں لیکن کسی مانع کے پائے جانے کی وجہ سے اس کا وقوع نہیں ہوتا، یہاں بھی ایسی ہی صورت ہے کہ ترکِ تبلیغ کا سبب موجود ہے اور وہ ہے مشرکین کی ضد، ہٹ دھرمی، تکذیب اور طعن و تشنیع لیکن اس سبب کے ساتھ ایک مانع بھی پایا جاتا ہے اور وہ ہے پیغمبرانہ عصمت، جس سے خیانت اور ترکِ تبلیغ کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ {۵۲}

اس سے بھی دلنشین جواب جو دیا گیا ہے، وہ یہ کہ:

آپ کو دعوتِ حق پیش کرنے میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، انہیں دیکھ کر مخالفین آپ سے ترکِ تبلیغ کی توقع لگائے بیٹھے ہیں۔ {۵۳}

اس جواب کی رو سے توقع کا مرکز حضور کے مخاطبین ہیں نہ کہ خود حضورِ اکرم ﷺ۔

{۵۱}(تفسیر البغوی ۲/۲۱۷......دار الکتب العلمیہ)
{۵۲}(بیضاوی ۳/۲۲۴)
{۵۳} ای یظن بك الناس ذلك (المفردات/۴۵۱)

بعض حضرات نے "لعلّ" سے پہلے حرفِ استفہام کو مقدر مان کر اسے استفہامِ انکاری پر محمول کیا ہے، اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ آپ کفار کی یاوہ گوئی سے پریشان ہوکر دعوت وتبلیغ نہ چھوڑیں۔{۵۴}

یہ ساری بحث تو اس وقت ہے جب لعلّ کو ترجی (امید) کے لیے مانیں، لیکن اگر اسے "تبعید" (بعید ہونا) کے معنی میں لیں جیسا کہ اس معنی میں یہ محاورۂ عرب میں استعمال ہوا ہے{۵۵} تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ کفار ومشرکین کے اوچھے ہتھکنڈوں اور ناشائستہ مطالبات کے باوجود تبلیغ کو ترک کرنا آپ سے محال ہے۔

﴿إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ﴾ قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ جب بھی معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا تو جواب میں انہیں نبوت کی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا، یہاں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، فرمایا جارہا ہے کہ کفار کو معجزات کا مطالبہ کرتے وقت یہ سوچنا چاہیے کہ نبوت اور معجزات میں کوئی تلازم نہیں، نبوت کے اصل لوازم تو وحی، مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، تعلیم اور انذار ہیں، ہر نبی نے فرائضِ نبوت کماحقہ انجام دیے اور آپ بھی بطریقِ احسن انہیں نبھا رہے ہیں۔

﴿وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٖ وَكِيلٌ﴾ (ہر چیز کا نگہبان اللہ ہے) حضور ایک کٹھن دور سے گزر رہے تھے، ماننے والوں کی تعداد کم تھی اور جھٹلانے والے زیادہ تھے، پلکیں فرشِ راہ کرنے والا کوئی نہ تھا اور کانٹے بچھانے والے بہت تھے، غمگساری کے لیے کوئی موجود نہ تھا اور غم دینے میں سب پیش پیش تھے، سینے سے لگانے والا کوئی نہ تھا اور ٹھکرانے پر سارا معاشرہ تلا ہوا تھا، ان حالات میں اللہ کے اس ارشاد سے آپ کے اعصاب کو کس قدر سکون ملا ہوگا اور کیسی تازگی نصیب ہوئی ہوگی؟ اس کا اندازہ آپ ہی لگا سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں۔

﴿۱۳﴾...... اس آیت میں کفار کو جو چیلنج کیا گیا ہے، اس بارے میں قدیم مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ چیلنج ایک خاص ترتیب سے دیا گیا تھا، پہلے کہا گیا کہ اس قرآن جیسا قرآن لاؤ، اس سے عاجز آئے تو چیلنج دیا گیا کہ دس سورتیں اس جیسی لے آؤ، پھر بھی نامراد ہوئے تو فرمایا گیا کہ ایک سورت اس جیسی لے آؤ۔

لیکن اس ترتیب پر کوئی قوی اور ٹھوس دلیل موجود نہیں ہے اور بظاہر دلیل اس کے خلاف ہے کیونکہ سورۂ یونس، جو اس سورت سے پہلے نازل ہوئی ہے، اس میں ایک سورت کا چیلنج ہے جبکہ اس سورت میں دس سورتوں کا! البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آیات کا نزول سورتوں کی ترتیب کے مطابق نہیں۔ ممکن ہے کہ سورۂ ہود کی یہ

{۵۴} ویجوز ان یقدر استفہام حذفت أداته، والتقدیر: "ألعلّك تارك" ویکون الاسفهام مستعملا فی النفی للتحذیر۔ (التحریر والتنویر ۱۲،۶/۱۶)

{۵۵} قیل انّ "لعلّ" ھنا لیست للترجیّ بل ھی للتبعید وقد تستعمل لذلك کما تقول العرب: لعلك تفعل کذا لمن لا یقدر والمعنی لاتترك۔ (روح المعانی ۱۲،۷/۲۸)

آیت سورۂ یونس کی اس آیت سے پہلے نازل ہوئی ہو،جس میں ایک سورت پیش کرنے کا چیلنج ہے۔

لیکن مبرد نے اس جواب کو خلافِ واقعہ کہا اور صراحت کی کہ سورۂ یونس نزول کے اعتبار سے سورۂ ہود پر مقدم ہے، اس صورت میں اشکال برقرار رہے گا کہ جب وہ ایک سورۃ لانے سے عاجز تھے تو انہیں دس سورتوں کے چیلنج کا کیا مطلب؟ کیا اس قسم کا کلام نامناسب اور مہمل قرار نہیں پائے گا؟ اس کا جواب مبرد نے یوں دیا کہ دونوں سورتوں میں چیلنج کی نوعیت جداجدا ہے۔ سورۂ یونس میں انہیں دعوت دی گئی کہ قرآن جیسی ایک ایسی سورت لے آؤ جو غیبی اطلاعات، احکام، وعدۂ ثواب اور وعیدِ عذاب میں اس جیسی ہو، لیکن جب وہ ایسا نہ کرسکے تو فرمایا گیا کہ اچھا اگر اتنی نزاکتوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو صرف فصاحت وبلاغت اور حسنِ طرز میں قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر پیش کردو۔{۵۶}

بہرحال مشرکین یہ کہتے تھے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ اس مدعیٔ نبوت حضرت خاتم النبیین ﷺ کا ساختہ و پرداختہ ہے، فرمایا گیا کہ اگر محمد ﷺ اُمّی ہونے کے باوجود اتنا بڑا مجموعہ مرتّب کرنے پر قادر ہوسکتے ہیں تو تم بھی تو اہلِ زبان ہو، فصاحت وبلاغت میں تمہاری برابری کوئی نہیں کرسکتا، سو تم بھی کوئی ایسی تالیف لے آؤ جو قرآن جیسی ہو۔

قرآنی چیلنج کی نوعیت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نظیر لانے کا جو چیلنج کیا ہے، اس کی نوعیت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مخلوق میں سے کوئی بھی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے قرآن کی مثل پیش نہیں کرسکتا اور قرآنِ کریم اس لحاظ سے معجزہ ہے۔{۵۷}

لیکن دیگر مفسرین کا فرمانا یہ ہے کہ:

قرآن مجید کو صرف فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے معجز قرار دینا اس کے چیلنج کو صرف عربوں تک محدود کردینے کے مترادف ہے، اس لیے کہ عربی زبان کا تعلق عربوں ہی سے ہے، جبکہ قرآن کا چیلنج پوری دنیا کے انسانوں اور جنوں کو ہے لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ فصاحت وبلاغت کے علاوہ قرآن میں جو سلاست، تازگی، حلاوت، جامعیت، وقار، خوبصورتی، غیبی خبریں، احکام اور حکمتیں، وعدے اور وعیدیں، امثال اور عبرتیں پائی جاتی ہیں، وہ کسی دوسرے کلام

{۵۶}(تفسیر مظہری ۲۷/۶)

{۵۷} والمختار عندی وعند الأکثرین انه معجز بسبب الفصاحة (کبیر ۱۷،۶/ ۳۲۵)

میں نہیں ہیں۔{۵۸}

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے، فرماتے ہیں:

جو حکمتیں اور مصلحتیں قرآنِ حکیم کی آیات اور سورتوں میں پائی جاتی ہیں، ساری مخلوق مل کر ان کا عشرِ عشیر بھی پیش نہیں کرسکتی، قرآنِ پاک فصاحت وبلاغت، علوم ومعارف، مصلحت وحکمت اور دلائل وعلل کے اعتبار سے معجزہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام کمالات کے پیشِ نظر اس کی نظیر لانے کا چیلنج کیا ہے۔{۵۹}

دنیا میں عقل سے عاری ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے قرآن کے مقابلہ میں اپنا کلام پیش کیا{۶۰} لیکن انہیں رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا، حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کا بنایا ہوا کلام تو کجا اس کی فصاحت وبلاغت کے معجزانہ کمال کی کوئی دوسری آسمانی کتاب بھی حریف نہیں بن سکتی۔

قرآن کا یہ چیلنج کل کے معاندین کو بھی تھا آج کے مخالفین کو بھی ہے اور قیامت تک آنے والے کفار ومشرکین بھی اس کی زد میں رہیں گے، بہ لحاظِ معنویت اس کا چیلنج ساری دنیا کو ہے اور بہ لحاظِ ادب وانشاء صرف اہلِ عرب کے لیے، اس لیے کہ غیر عرب اس چیلنج کے اہل ہی نہیں۔

﴿۱۴﴾......﴿فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ﴾ یہاں جو "لکم" میں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے، یہ مومنین کے لیے ہے اور اس سے قرآنی چیلنج کی ابدیت کی طرف اشارہ ہے کہ جیسے آپ ﷺ نے کفار کو چیلنج کیا تھا یونہی یہ امت بھی کرسکتی ہے۔{۶۱} اور اگر "لکم" کی ضمیر مؤمنین کے لیے نہ ہو بلکہ اس سے مراد مشرکین ہوں تو پھر مطلب یہ بنے گا کہ:

اے مشرکین! اگر تمہارے مزعومہ مددگار اور شرکاء تمہاری مدد کے لیے نہ آئیں تو یقین کرلو کہ یہ قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے۔{۶۲}

﴿فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ﴾ قرآن کے کلام اللہ ہونے کا علم اور یقین تو ایمان والوں کو کفار کا عجز ظاہر ہونے

{۵۸} مثل احتوائه على أساليب البلاغة واساليب العذوبة والمتانة والفحولة والرشاقة...... والأخبار بالمغيباب والحكم والاحكام والوعدوالوعيد والأمثال۔(نظم الدّرر ۳/۵۱۰)

{۵۹}(معالم العرفان ۹/۳۴۱)

{۶۰} بعض احمقوں نے سورۂ فیل کے مقابلے میں یہ کلام پیش کیا: الفيل ماالفيل۔ وماأدراك ماالفيل، له ذنب وبيل وخرطوم طويل...... سورۂ کوثر کا معارضہ یوں کیا: إنّا اعطيناك الجواهر، فصلّ لربّك وجاهر، إنّ شانئك هوالكافر (قبس من نورالقرآن الكريم ۵/۱۹)

{۶۱} جمع الضمير لأنّ المومنين ايضًا كانوا يتحدّونهم۔(بيضاوی ۳/۲۲۵)

{۶۲} ووجه آخر: وهوأن يكون الخطاب للمشركين...... يعنى: فان لم يستجب لكم من تدعونه من دون الله الى المظاهرة اعلىٰ معارضة...... "فاعلموا" أى أنزل ملتبسا بمالايعلمه الّاالله......(كشاف ۲/۳۶۴)

سے پہلے ہی حاصل تھا، یہاں "فَاعْلَمُوْٓا" سے مراد علم کی قوت ہے، معلوم ہوا کہ خوارق کو قوتِ اعتقاد میں خاص دخل ہے۔{۶۳} یعنی معجزات اور خوارق کے دیکھنے سے ایمان والوں کا علم اور ایمان مزید قوی ہو جاتا ہے۔

﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ کلام کا یہ سوالیہ طرز طلب فعل اور امر کا ایک بلیغ اسلوب ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ جب تم اور تمہارے شریک قرآن کی مثل لانے سے قاصر آچکے ہیں تو اب ہر قسم کا عذر ختم ہو گیا ہے اور یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ قرآن کسی انسان کا نہیں، اللہ کا کلام ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......نبی اکرم ﷺ نے مخلوق تک اللہ کا دین پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔(۱۲)

"فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ" "کیا آپ کفار کے کہنے پر اس وحی میں سے کچھ باتیں چھوڑ دیں گے؟ اس ارشاد سے آپ کی عصمت پر کوئی آنچ نہیں آتی، یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۂ مائدہ میں اللہ نے آپ کو مخاطب کر کے محض تاکیدی طور پر ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾{۶۴}

"اے ہمارے پیغمبر! آپ پر جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے، وہ سب کا سب لوگوں تک پہنچا دیجیے۔"

۲......دین کے احکامات کھل کر بیان کرنے چاہییں چاہے لوگ راضی ہوں یا ناراض!(۱۲)

۳......مشرکین اور معاندین نے حق بات تسلیم کرنے میں ہمیشہ ضد وعناد اور تکبر کی روش اختیار کی ہے۔

۴...... ہدایت اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے کسی رسول کے اختیار میں نہیں، رسول کا کام صرف انذار وتبشیر ہے۔(۱۲)

۵......فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ......الخ سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے سلوک سے متعلق دو نکتے اخذ کیے ہیں:

(۱) مرید کو شیخ کے کلام کی طرف رغبت نہ ہو تو شیخ کا دل منقبض (تنگ) ہو جاتا ہے۔

(۲) اگر ارشاد ضروری ہو تو شیخ کو انقباض کے باوجود ترکِ کلام پر عمل نہ کرنا چاہیے۔{۶۵} یعنی اگر مرید اور شاگرد کو کسی بات کا سمجھانا ضروری ہو تو شیخ اور استاد کو چاہیے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی بات چیت کا سلسلہ جاری رکھیں۔

{۶۳}(بیان القرآن حصہ اوّل، جلد ۵/۳۸)

{۶۴}(المائدۃ ۵/۶۷)

{۶۵}(بیان القرآن ، حصّہ اوّل، جلد ۵/۳۸)

۶......کافر کل کے ہوں، موجودہ دور کے یا آئندہ آنے والے، قرآن قیامت تک انہیں یہ چیلنج کرتا رہے گا کہ اگر تم سچے ہو تو قرآن کی مثل چند سورتیں یا ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ (۱۳)

۷......نبی کریم ﷺ کو ملنے والے معجزات میں سے صرف قرآن کا معجزہ ایسا معجزہ ہے جس کی مثال لانے کا چیلنج خود قرآن میں مذکور ہے اور یہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ (۱۳)

۸......مشرکین جب قرآن کی مثل لانے سے عاجز ہیں اور تا قیامت عاجز ہی رہیں گے، تو پھر انہیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ (۱۴)

طالبینِ دنیا کی آخرت میں محرومی

﴿۱۵......۱۶﴾

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا

جو کوئی چاہے دنیا کی زندگانی اور اس کی زینت، بھگتا دیں گے ہم ان کو ان کے عمل دنیا میں اور ان کو

لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا

اس میں کچھ نقصان نہیں O یہی ہیں جن کے واسطے کچھ نہیں آخرت میں آگ کے سوا اور برباد ہوا جو کچھ کیا تھا

فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

یہاں اور خراب گیا جو کمایا تھا O

ربط: ماقبل آیات میں قرآن کے منجانب اللہ ہونے کو ثابت کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ حضرت محمد ﷺ کا اپنا بنایا ہوا کلام نہیں ہے، اب بتایا جا رہا ہے کہ قرآن کے معارضہ کا سبب فقط بغض وعناد اور دنیا پرستی ہے اور کچھ نہیں۔

تسہیل: جن لوگوں کی جہد وسعی کا مقصد دنیا کی زندگی اور زیب وزینت کا حصول ہے ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے لیے کچھ کمی نہیں کی جاتی O یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور انہوں نے دنیا میں جو کچھ کیا تھا، وہ آخرت میں بے کار ثابت ہوگا اور حقیقت میں تو جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ آج بھی فضول ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۵-۱۶﴾......جو لوگ دنیا کی عیش وراحت ہی کو اپنا مقصدِ وحید بنائے بیٹھے ہیں اور انہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں تو

اللہ انہیں ان کی جہد وسعی کے بقدر دنیا ضرور عطا فرمائے گا، سورۂ بنی اسرائیل میں اسی حقیقت کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی گئی ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ﴾ {۶۶}　''جو شخص دنیا کا فوری فائدہ چاہتا ہے تو ہم جس کے لیے چاہتے ہیں، جتنا چاہتے ہیں، اسے یہیں پر جلدی دے دیتے ہیں۔''

لیکن دنیا میں اپنی کاوشوں کا صلہ پالینے کے بعد جب اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو وہاں وہ اجر وثواب سے یکسر محروم کر دیے جائیں گے، اس لیے کہ آخرت کا تخیل تو سرے سے ان کے دماغوں میں تھا ہی نہیں۔{۶۷}

ثواب سے یہ محرومی کفار ومنافقین کے لیے تو ہے ہی، ان مسلمانوں کے لیے بھی ہے جن کے اعمال میں ریا کا عنصر پایا جاتا ہے اور ان کے دل میں اللہ کی رضا سے زیادہ بندوں سے داد وصول کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث وارد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

''دنیا پرست اور ریا کار عالم، صدقہ کرنے والا سخی اور جان لڑا دینے والا مجاہد روزِ محشر دربارِ الٰہی میں حاضر ہوں گے، ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا کہ تمہارے پیشِ نظر کیا چیز تھی؟ ہر ایک اپنا مقصود رضائے الٰہی بتائے گا لیکن اللہ جو دلوں کا حال خوب اچھی طرح جانتا ہے، فرمائے گا کہ تمہارے علم، صدقہ اور جہاد کی غرض دنیا والوں سے آفریں حاصل کرنا تھا سو تمہارا مقصد حاصل ہو چکا اور اب میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں، پھر فرشتوں کو حکم ہو گا کہ انہیں جہنم میں ڈال دو۔''{۶۸}

تو فسادِ نیت کی وجہ سے اعمال کے کھوکھلا اور بودا ہونے کا عملی مشاہدہ قیامت کے دن سب کے سامنے ہو گا لیکن وہاں حسرت وندامت کے سوا اور کچھ نہ ہو سکے گا۔

مسندِ احمد کی ایک روایت جو حضرت ابو سعید بن فضالہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے:

''قیامت کے دن، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اللہ سب کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا کہ جس نے کوئی عمل غیر اللہ کے لیے کیا ہے وہ اپنا اجر بھی اسی سے لے لے، اس لیے کہ اللہ شریکوں سے پاک ہے۔{۶۹}

{۶۶} (بنی اسرائیل ۱۷/۱۸)
{۶۷} "وباطل ما كانوا يعملون"...... لأنه لم يعمل لوجه صحيح والعمل الباطل لاثواب له (كشاف ۲/۳۶۴)
{۶۸} (مسلم ۲، کتاب الأمارة/۱۴۰)
{۶۹} (مسند احمد بحوالہ مظہری ۶/۳۰)

معلوم ہوا کہ اگر نیک اعمال بھی محض دنیوی نفع کے خیال سے انجام دیے جائیں تو وہ موجبِ ثواب نہیں ہوں گے اور آخرت میں ان پر کوئی اجر مرتّب نہیں ہوگا۔{۷۰}

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حیات اور زینتِ حیات سے محبت ایک طبعی چیز ہے اور اس کا آرزو مند ہونا تقویٰ کے منافی نہیں، البتہ آخرت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے دنیا ہی کو مقصد بنا لینا مذموم ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......دنیا والوں کو دکھانے کے لیے کیے جانے والے نیک اعمال پر آخرت میں کسی قسم کا ثواب مرتّب نہیں ہوگا اور یہی اللہ کے عدل اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

۲......کفر، دنیوی نعمتوں کے حصول میں مانع نہیں بلکہ کافر کو اس کی جدوجہد اور تقدیر کے مطابق دنیا دے دی جاتی ہے۔(۱۵)

۳......آخرت میں ثوابِ اعمال کے لیے ایمان بنیادی شرط ہے۔

۴......لفظ ''یُرِیْدُ'' میں پایا جانے والا دوام واستمرار کا معنٰی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت کو بھول کر صرف دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنا لینا غلط ہے۔(۱۵)

۴......کافر اور ریا کار مسلمان دونوں عذاب کے مستحق ہوں گے، البتہ کافر دائمی جہنمی ہے اور ریا کار مسلمان اپنی سزا بھگت کر بالآخر جنت میں ضرور داخل ہوگا۔(۱۶)

۶......کافر دنیا میں کتنے ہی اچھے اعمال کیوں نہ کرے، آخرت میں اجر سے محروم ہی رہے گا۔(۱۶)

۷......نیک اعمال کے بدلے دنیا کی آرزو کرنا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔

۸......کافر کو دنیا کا حاصل ہو جانا بلکہ عموماً زیادہ حاصل ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ کی نظر میں دنیا کی کوئی قیمت نہیں۔

۹......اسلام دنیا کے بجائے اخروی اعمال کی دعوت دیتا ہے، البتہ دنیا وآخرت دونوں کا طلب کرنا بھی شرعاً جائز ہے۔

منکرین اور مصدقین

﴿۱۷﴾

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ

بھلا ایک شخص جو ہے صاف راستہ پر اپنے رب کے اور اس کے ساتھ ساتھ ہے ایک گواہ اللہ کی طرف سے اور اس سے پہلے گواہ تھی موسیٰ کی کتاب

{۷۰} "من كان يريد الحيوة الدّنيا" فيه اخبار ان من عمل عملا للدنيا لم يكن له به في الآخرة نصيب (جصاص ۱۶۴/۳)

إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ

راستہ بتلاتی اور بخشواتی (اوروں کے برابر ہے) یہی لوگ مانتے ہیں قرآن کو اور جو کوئی منکر ہو اس سے سب فرقوں میں سے سو دوزخ ہے ٹھکانا

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

اس کا سو تو مت رہ شبہ میں اس سے بے شک وہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور پر بہت سے لوگ یقین نہیں کرتے O

ربط: تکذیب کفار کے بعد اب بتایا جا رہا ہے کہ مومنین مخلصین ٹھوس دلائل کی بنیاد پر قرآن کے کلام اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں، ساتھ ہی منکرین کے لیے عذاب کا بھی ذکر ہے۔

تسہیل: اچھا یہ بتاؤ کہ وہ شخص جو صرف دنیا کا طلبگار ہے کیا اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہے؟ اس کے علاوہ اس کے پاس اللہ کی جانب سے ایک گواہ بھی ہے اور قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو کہ انسانوں کے لیے امام اور رحمت تھی وہ بھی قرآن کی تصدیق کرتی ہے، اس قسم کے لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی قرآن کا انکار کرے گا، اس کے وعدے کی جگہ دوزخ ہے، تو دیکھو! تم قرآن کے بارے میں کسی قسم کے شک میں نہ پڑو، بلاشبہ یہ سچی کتاب ہے جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۷﴾......کیا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی عظیم بیّنہ {۷۱} اور دلیل عطا کی ہو اور اس بیّنہ کی سچائی کا ایک گواہ خود اس کے اندر ہی موجود ہو اور قرآن سے بھی پہلے موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب بھی ہدایت اور رحمت بن کر آچکی ہے اور اس کتاب میں بھی وہی مضامین تھے جو قرآن میں ہیں، تو یہ شخص بھلا اس جیسا ہوسکتا ہے جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کو ہر سچائی حتیٰ کہ وحیِ الٰہی پر بھی ترجیح دیتا ہے؟ یقیناً یہ دونوں شخص ایک جیسے نہیں ہوسکتے۔

اس آیتِ کریمہ میں "بَيِّنَةٍ" اور "شَاهِدٌ" کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، ہم نے "بَيِّنَةٍ" سے مراد قرآن اور "شَاهِدٌ" سے مراد قرآن کا اعجاز لیا ہے {۷۲} کیونکہ جس طرح نورِ بصیرت، نقلی اور عقلی دلائل اور معجزات پر بیّنہ کا اطلاق ہوسکتا ہے، اسی طرح جبریلِ امین، حضورِ اکرم ﷺ کی مبارک زبان، صورت و سیرت اور آپ کی تصدیق کرنے والوں پر بھی "شَاهِدٌ" کا لفظ بولا جاسکتا ہے، مگر ہمارے آقا ﷺ اور سارے مسلمانوں کے

{۷۱} "بینۃ" والتنوین فیھا ھھنا للتعظیم ای بینۃ عظیمۃ الشان والمراد بھا القرآن (روح المعانی ۷، ۱۴/۴۰)
{۷۲} الاعجاز فی نظمہ (حوالہ مذکورہ)

پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑی دلیل "بَيِّنَةٍ" یعنی قرآنِ کریم ہے اور خود قرآن کی صداقت کا واضح ثبوت اس کا اعجاز ہے۔

﴿وَمِنْ قَبْلِهِ كِتٰبُ مُوْسٰى﴾ یہاں تورات کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تورات میں بھی آپ کی علامات مذکور ہیں جیسا کہ دوسری جگہ واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ:

﴿يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ {۷۳} ''ان کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ یہی لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صورت میں عظیم دلیل عطا فرمائی ہے اور یہ اس پر قائم ہیں، یہی ہیں قرآن پر ایمان رکھنے والے {۷۴}

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ﴾ یہاں بھی قرآن ہی کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ اس کی صداقت بارے شک نہ کریں، اگر تو عام خطاب ہے تو اس کا مقصد ایسے غور وفکر کی ترغیب دینا ہے جو شک کو زائل کر دے اور اگر ہمارے آقا ﷺ سے خطاب ہے تو یہ ان لوگوں سے تعریض ہے جو اس میں شک کرتے ہیں، انہیں بتایا جارہا ہے کہ قرآن شک کا محل اور مقام نہیں ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......جو لوگ دنیا کو آخرت پر اور خواہشات کو آسمانی تعلیمات پر ترجیح دیتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقام کو نہیں پہنچ سکتے جنہیں اللہ نے عقلِ سلیم عطا کی ہے اور وہ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔(۱۷)

۲......تورات اور انجیل میں حضورِ اکرم ﷺ کی علامات واضح طور پر مذکور ہیں اسی لیے ان کتابوں پر دل سے ایمان رکھنے والے آخری نبی پر بھی ضرور ایمان لاتے ہیں۔(۱۷)

۳......قرآن کا کلام اللہ ہونا عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہے، لہٰذا اس میں کسی کو بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔(۱۷)

۴......زیرِ تفسیر آیت میں "بَيِّنَةٍ" سے مراد قرآن لیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس آیت میں سات ضمیریں ایسی ہیں جو قرآن کی طرف راجع ہیں، گویا اس آیت میں آٹھ بار قرآن کا ذکر آیا ہے۔ اہلِ علم وعقل غور کریں تو ان ضمیروں کو سمجھ لیں گے۔

{۷۳} (الأعراف ۷/۱۵۷)

{۷۴} ای یصدقون بالقرآن حق التصدیق (روح المعانی ۷، ۱۲/۴۳)

مکذبین اور مصدقین کا انجام

﴿۱۸.....۲۴﴾

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ، وہ لوگ روبرو آئیں گے اپنے رب کے اور کہیں گے

الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾

گواہی دینے والے یہی ہیں جنھوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر، سن لو پھٹکار ہے اللہ کی ناانصاف لوگوں پر ○

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈتے ہیں اس میں کجی اور وہی ہیں آخرت سے منکر ○

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ

وہ لوگ نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر اور نہیں ان کے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی

اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

دونا ہے ان کے لیے عذاب نہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ دیکھتے تھے ○

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ

وہی ہیں جو کھو بیٹھے اپنی جان اور گم ہو گیا ان سے جو جھوٹ باندھا تھا ○ اس میں شک نہیں کہ

فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ

یہ لوگ آخرت میں یہی ہیں سب سے زیادہ نقصان میں ○ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کیے نیک اور عاجزی کی اپنے رب کے سامنے

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ

وہ ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں رہا کریں گے ○ مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا اور بہرا اور دوسرا

وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

دیکھتا اور سنتا، کیا برابر ہے دونوں کا حال؟ پھر کیا تم غور نہیں کرتے؟ ○

ربط: ماقبل سے مناسبت واضح ہے کہ پہلے مخلص مومنین اور معاندین کا ذکر تھا، یہاں انھی دو گروہوں کی چند صفات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا انجام بھی بتایا جا رہا ہے۔

تسہیل: اور اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو جھوٹ بول کر اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دے؟ ایسے لوگ قیامت

کے دن اللہ کے سامنے پیش کیے جائیں گے، اس دن گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی طرف جھوٹی باتوں کی نسبت کی تھی، یادرکھو! ایسے ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے O جو انسانوں کو نہ صرف اللہ کی راہ سے روکتے ہیں بلکہ اس میں کجی تلاش کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، یہی ہیں جو آخرت کا انکار کرتے ہیں O یہ لوگ نہ تو زمین میں اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ ہی اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی حمایتی بن سکتا ہے، قیامت کے دن انہیں دوگنا عذاب دیا جائے گا، نہ تو ان کے اندر حق بات سننے کی صلاحیت باقی رہی تھی اور نہ ہی یہ دیکھ سکتے تھے O یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود برباد کیا اور جو معبود انہوں نے فرض کر رکھے تھے وہ سب غائب ہو گئے O اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے یہی لوگ ہوں گے O لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی اختیار کیے رکھی، یہی لوگ ہیں جو جنت کے حقدار ہیں، یہ وہاں ہمیشہ رہیں گے O ان دونوں فرقوں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص اندھا بھی ہو اور بہرا بھی اور دوسرا دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور! کیا ان دونوں کا حال برابر ہو سکتا ہے، کیا تم غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟ O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۸﴾...... وہ لوگ کس قدر حق ناشناس ہیں جو اپنے خالق پر دروغ گوئی سے بھی باز نہیں آتے اور بلا دلیل اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن سے ذات گرامی پاک اور منزّہ ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید، نبی اکرم ﷺ کی رسالت یا قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے سے انکار کرنا، یہ سب صورتیں "افتراء علی اللہ" کے زمرے میں آتی ہیں، یونہی فرشتوں کو اپنے مقام سے گرا کر پیش کرنا اور اپنے خود ساختہ معبودوں کے بارے میں اللہ کے ہاں جبری شفاعت کا عقیدہ رکھنا بھی اللہ پر جھوٹ گھڑنا ہے۔{۷۵}

﴿وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ﴾ ایسے افتراء پرداز لوگ جب اللہ کے حضور سب کے سامنے پیش ہوں گے اور ان کی شرارتوں کے دفتر کھولے جائیں گے اور گواہی دینے والے ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ انتہائی رسوائی سے دوچار ہوں گے۔

﴿الْأَشْهَادُ﴾ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار ومنافقین کے خلاف گواہی دینے والوں میں اعمال لکھنے والے فرشتے، انبیاء اور مومنین شامل ہوں گے نیز ان کے اعضاء بھی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔{۷۶}

{۷۵} بما نسب اليه مالا يليق به كقولهم: الملائكة بنات الله، تعالىٰ الله عن ذلك علوّا كبيرا وقولهم لآلهتهم "هؤلاءِ شفعاؤنا عندالله" (روح المعانی ۷،۱۲/۴۴)

{۷۶} قيل المراد بهم الملائكة والانبياء والمؤمنون (روح المعانی ۷،۱۲/۴۵)...... أومن جوارحهم (بیضاوی ۳/۲۲۸)

﴿۱۹﴾......اس آیت میں کفار کے مزید تین جرائم ذکر کیے گئے ہیں:

۱......وہ انسانوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں: کفار کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی اور آج بھی ہے کہ انسانیت کو ہدایت کے راستے سے جس طرح ہو سکے روکا جائے، اس وقت دنیا میں عیسائیوں کی آبادی تقریباً اڑھائی ارب ہے جو اسلام کے خلاف مسلسل سازشیں کر رہے ہیں، مراکش کے رہنے والے ایک اسکالر ڈاکٹر حمید بن قلاب اور ان کے ایک ساتھی لبنانی اسکالر محمد اقبال نے ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک کا آٹھ سالہ عرصہ اس تحقیق میں گزارا کہ یورپ میں اسلام کشی کی مہم کا اندازہ لگایا جا سکے، اپنی تحقیق کے بعد جو نتائج انہوں نے مرتب کیے ان کے مطابق اس عرصہ میں صرف امریکہ میں اسلام کی مخالفت میں 25 ہزار کتابیں چھپیں، 30 ہزار رسائل شائع ہوئے، 60 ہزار مضامین لکھے گئے اور 2500 فلمیں بنائی گئیں، فرانس اور سویڈن میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد 15 ہزار بتائی گئی جبکہ 12 ہزار رسائل، 50 ہزار مضامین اور 3 ہزار فلمیں اس کے علاوہ ہیں {۷۷} یہ ایک جھلک ہے اور وہ بھی آج سے نصف صدی قبل کی، اگر تازہ اعداد و شمار مرتب کیے جائیں تو ہوشربا نتائج سامنے آئیں گے، لیکن اسلام ہے کہ اس کی اشاعت روکے نہیں رک رہی اور نہ قیامت تک رک سکے گی۔

کفار کا ہمنوا ایک اور شاطر طبقہ جنہیں مستشرقین کہا جاتا ہے، وہ بھی "يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ" کا صحیح ترین مصداق ہے، علم و تحقیق کے نام پر یہ صیہونی ایجنٹ مسلمانوں کے دل و دماغ میں وہ جراثیم ڈال دیتے ہیں جس سے ایک عام مسلمان اسلام کے ماضی سے بدگمان، حال سے بیزار اور اس کے مستقبل سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہ اسلام کی ایک مہیب اور تاریک شکل پیش کرنے میں اس عیاری سے کام لیتے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی، ان کی کتب اور تحقیقات میں اتنا تشکیلی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین اور حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو، پورے اسلام سے روک دینے کے لیے کافی ہے۔ ان ظالموں نے ہمیشہ تحقیق کے نام پر قرآن کی مخالفت اور تردید کرنے کی کوشش کی ہے۔

الغرض اللہ کی راہ سے روکنے کا نہ کوئی روایتی طریقہ ہے اور نہ اس کی کوئی متعین شکل ہے، وقت گزرنے اور زمانہ بدلنے سے دشمنانِ اسلام یہ طریقے بھی بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے لیکن نورِ ہدایت نہ پہلے ان اوچھے ہتھکنڈوں سے کبھی ماند پڑا تھا، نہ آج ماند پڑا ہے اور نہ آئندہ پڑے گا۔

{۷۷} (عالمِ اسلام پر یہود و نصاریٰ کے ذرائع ابلاغ کی یلغار/ ۲۸۵......ادارہ اشاعتِ اسلام)

۲......دوسرا جرم ان کا یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے میں کجی تلاش کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرمایا کہ:

﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾{۷۸} ''دین میں کوئی کجی نہیں۔''

لیکن جو لوگ ہیں ہی کج دماغ، وہ بھلا اس طریقِ ہدایت کا وزن کیسے محسوس کر سکتے ہیں؟ وہ اپنی کجی پسند ذہنیت کی بنا پر ہر وقت کافرانہ افکار کی عظمت اور اسلامی افکار کی کمزوری ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں تاکہ ایک مسلمان کا اسلام سے رشتہ کمزور پڑ جائے اور وہ راہِ ہدایت سے بھٹک کر شرک میں مبتلا ہو جائے۔{۷۹}

۳......کفار کے سنگین جرائم میں سے ایک اخروی زندگی کا انکار بھی ہے، آخرت کا تصور ہی تو انسانی سوچ کا قبلہ درست رکھتا ہے اگر یہ تصور ختم ہو جائے اور اس کا انکار کر دیا جائے تو پھر انسان محض ایک حیوان بن کر رہ جائے گا جس کا مقصدِ زندگی کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

﴿وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ یہاں ''هُمْ'' ضمیر کا مکرر ذکر کرنا ان کے کفر کی تاکید کے لیے ہے{۸۰} اور بتایا جا رہا ہے کہ روزِ آخرت کا انکار ان کی سرشت میں داخل ہے۔

﴿۲۰﴾......افتراء پردازی، راہِ حق میں رکاوٹ بننے، انتہائی کج فکر ہونے اور آخرت کا منکر ہونے کے باوجود یہ پکڑ میں کیوں نہیں آ رہے؟ کیا ان کی سزا میں کوئی مانع حائل ہے؟

اس شبہ کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اگر اللہ انہیں سزا دینا چاہے تو لمحہ بھر میں انہیں نشانِ عبرت بنا دے، وہ اللہ سے چھپے ہوئے نہیں، مگر اس نے خود ہی ان کے عذاب کو ٹال رکھا ہے تاکہ انہیں لافانی اور دائمی عذاب میں مبتلا کر دے، اور جب ان کی باری آئے گی تو ان کے فرضی معبودان کے کچھ کام نہ آئیں گے اور کسی میں ان کی حمایت کی تاب نہ ہو گی۔

﴿يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ﴾ ''انہیں دوگنا عذاب دیا جائے گا'' خود گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کی سزا! علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مفہوم کو آیت کا صحیح ترین مصداق قرار دیا ہے۔{۸۱}

اس مشہور معنی کے علاوہ ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان پر سزا بڑھتی رہے گی، اور عجب نہیں کہ ''يُضٰعَفُ''

{۷۸} الکہف ۱۸/۱

{۷۹} ای یعدلون بالناس عنها إلى المعاصي والشرك (قرطبی ۲۰/۹)

{۸۰} قال الزجاج: کلمة "هم" كررت على جهة التوكيد (كبير ۶، الجزء السابع عشر/۳۳۲)

{۸۱} والأصوب ان يقال: انهم مع ضلالهم الشديد سعوا في الاضلال (كبير ۶، الجزء السابع عشر/۳۳۳)

جو صیغۂ مضارع ہے، اس میں پایا جانے والا استمرار اور دوام اسی پر دلالت کے لیے ہو۔

﴿مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ﴾ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جس بات سے ضد اور نفرت دل میں بیٹھ جاتی ہے اس کے سننے کی تاب دل میں باقی رہ جاتی ہے نہ دیکھنے کی، کفار بھی شدید عناد اور قلبی بصیرت سے محروم ہونے کی بناء پر نہ ہدایت کی بات سن سکتے ہیں اور نہ چشمِ بصیرت سے حق کو دیکھ سکتے ہیں۔

﴿۲۱﴾......ایسے لوگ ایک عظیم اور تباہ کن خسارے سے دوچار ہوں گے، اپنے افترائی افکار واعمال کی وجہ سے انہوں نے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہی سے دوچار کر دیا۔

﴿وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ جن خود تراشیدہ معبودوں کی شفاعت کے سہارے {۸۲} ان کی مذہبی زندگی قائم تھی وہ سب کافور ہو جائیں گے۔

﴿۲۲﴾......وہ بے وقوف انسانوں میں سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے جنہوں نے آخرت کی لازوال نعمتوں کے بدلے آخرت کا دائمی عذاب پسند کر لیا اور جنہوں نے سرمدی باغات، شیریں چشموں اور حسین بیویوں کے مقابلے میں دہکتی آگ، بھڑکتے شعلوں، کھولتے پانی، زنجیروں اور کوڑوں کی ضربوں کو ترجیح دی۔

﴿۲۳﴾......کفار کے انجام کے بعد اس آیت میں مخلص مومنین کا انجام مذکور ہے اور ان کے لیے اخروی بشارت ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ ایمان والے دنیا میں اس شان سے رہتے ہیں کہ کبھی بھی اپنے خالق سے بے اعتنائی اور لاپرواہی کا طریقہ اختیار نہیں کرتے، وہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد ایمان کے سارے تقاضے پورے کرتے ہیں، انہیں ہر وقت رضائے الٰہی کی فکر رہتی ہے اور ان کے سارے اعمال وحرکات اور احساسات وجذبات اللہ ہی کے لیے خاص ہوتے ہیں، ایمان لانے کے بعد ان کے اعضاء اور جوارح سے وہی افعال سرزد ہوتے ہیں جو وجدانی ایمان کے صحیح ترجمان ہوتے ہیں۔

﴿وَأَخْبَتُوا﴾ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ اہلِ جنّت کی ایک اور خصوصیت ''اخبات'' یعنی عاجزی کو ذکر فرمایا، عاجزی ان چار اخلاق میں سے ایک ہے جو تمام آسمانی شریعتوں میں بنی نوع انسان کے لیے ضروری قرار دیے گئے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چار اخلاق ایسے ہیں جو کسی نبی کی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے اور ہم بھی ان کے پابند ہیں، وہ چار اخلاق یہ ہیں:

☆طہارت ☆سماحت ☆اخبات ☆عدالت {۸۳}

{۸۲}(''وضلّ عنهم ما كانوا يفترون'' من الألهة وشفاعتها۔(روح المعانی ۷، ۱۲/۴۸)

{۸۳}(معالم العرفان ۹/۳۶۳)

اخبات کو تزکیۂ نفس سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں آیتِ کریمہ سے اصحابِ جنت کے اوصاف کی ترتیب واضح ہوتی ہے یعنی ایمان، اعمالِ صالحہ اور تزکیۂ نفس۔

لفظ ''اخبـــــات'' سے ایک حقیقی مومن اور اس کے رب کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی بہت عمدہ تصویر کشی ہوتی ہے کہ ایک حقیقی مومن پر جس طرح کے حالات آئیں، اسے امن، قرار اور رضا کی کیفیت حاصل رہتی ہے۔

﴿۲۴﴾...... یہ دونوں فریق جن کا ذکر سابقہ آیات میں ہوا، ایک فریق وہ ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے، سچائی کی راہ سے روکتا ہے، اس میں کجی تلاش کرتا ہے اور آخرت کا انکار کرتا ہے، دوسرے فریق کے حالات بالکل برعکس ہیں، ان میں سے پہلے فریق کی مثال اندھے اور بہرے کی سی ہے اور دوسرے کی مثال سننے اور دیکھنے والے کی سی ہے کیونکہ جو آنکھیں راہِ حق نہ دیکھیں اور جو کان سچی بات نہ سنیں وہ گویا ہیں ہی نہیں۔

مومن وکافر کے اس تقابل کے بعد سوال ہوتا ہے کہ کیا یہ دونوں قسم کے لوگ برابر ہوسکتے ہیں؟ اس سوال کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا گیا اس لیے کہ جواب کی ضرورت ہی نہیں، کون نہیں جانتا کہ ہدایت سے موصوف لوگ سرخرو اور کامیاب ہیں جبکہ ہدایت سے محروم طبقہ ہلاکت وبربادی سے دوچار ہوتا ہے۔

﴿اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ ''کیا تم غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟'' سوچو تو سہی! ایک طرف حق کا انکار کرنے والے ہیں جو اندھے ہونے کی وجہ سے راہِ حق دیکھ نہیں سکتے اور بہرے ہونے کی وجہ سے حق کی پکار سُن بھی نہیں سکتے، کیا یہ ان ایمان والوں جیسے ہوسکتے ہیں جو حقیقت کی نشانیوں کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی باتیں سنتے بھی ہیں؟

حکمت وہدایت:

۱...... اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبتیں قائم کرنے سے بدتر گناہ اور کوئی نہیں۔ (۱۸) اور غلط نسبتوں کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً اللہ کے کلام کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا، اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اس کے لیے اولاد ثابت کرنا اور بتوں کے لیے اس کے سامنے حقِ شفاعت کا عقیدہ رکھنا۔

۲...... کفار ومنافقین کے لیے اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوگی کہ قیامت کے دن تمام مخلوقات کے سامنے ''هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ'' (یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے رب پر جھوٹ بولتے تھے) کہہ کر ان کا تعارف کروایا جائے گا۔ (۱۸)

۳......وہ شخص بھی "افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا"، ''اللہ پر جھوٹ گھڑنے'' کے زمرے میں آتا ہے جو دعویٰ تو ولایت و تقویٰ کا کرے لیکن باطن میں فاسق وفاجر ہو۔{۸۴}

۴......خود حق بات کو ٹھکرانے اور دوسروں کے لیے راہِ ہدایت اختیار کرنے میں رکاوٹ بننے والے، اللہ کی لعنت و پھٹکار سے نہیں بچ سکیں گے۔(۱۹)

۵......اللہ کے احکامات کو باطل تاویلات کے ذریعے بگاڑ کر پیش کرنا اہلِ کفر کا وطیرہ ہے۔(۱۹)

۶......آخرت میں کافروں پر سزا بتدریج بڑھتی رہے گی۔(۱۹)

۷......کافر روحانی طور پر مردہ ہوتا ہے اس لیے حق بات سنتا نہیں اور آنکھوں سے مظاہرِ قدرت دیکھتا نہیں۔(۱۹)

۸......زمین کی وسعت کے باوجود کافر اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں نہ جا سکیں گے، ان کی تباہی ناگزیر ہے۔(۱۹)

۹......مومن اپنی روحانیت کے ذریعے وسائلِ ایمان یعنی سمع وبصر سے مکمل فائدہ اٹھاتا ہے۔(۱۹)

۱۰......اخروی نعمتیں فقط مومنوں کے لیے ہیں، کفار کا ان میں کوئی حصّہ نہیں، وہ ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار رہیں گے۔

۱۱......ان آیات (۱۸-۲۳) میں غور وفکر سے اہلِ جنّت کے تین اوصاف ثابت ہوتے ہیں یعنی ایمان، عملِ صالح اور اللہ کے سامنے خشوع، جبکہ دوزخیوں کے چودہ اوصاف سامنے آتے ہیں:

☆ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ ☆ رسوا کرنے کے لیے انہیں اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ☆ ان کے خلاف سرِ عام گواہوں کو کھڑا کر کے انہیں ذلیل کیا جائے گا۔ ☆ اللہ کے ہاں یہ ملعون ہیں۔ ☆ یہ انسانوں کو راہِ حق سے روکتے ہیں۔ ☆ دلوں میں شبہات اور وساوس پیدا کرتے ہیں۔ ☆ پکّے کافر ہیں۔ ☆ اللہ کے عذاب سے بھاگ نہیں سکتے۔ ☆ قیامت کے دن ان کی حمایت میں کوئی نہیں اٹھے گا۔ ☆ انہیں دگنا عذاب دیا جائے گا۔ ☆ ایمان اور معرفت کے جو ظاہری وسائل ہیں انہوں نے معطل کر رکھے ہیں۔ ☆ اللہ کی عبادت کے بجائے کمزور بتوں کی عبادت کی وجہ سے یہ خسارے میں ہیں۔ ☆ جو معبود انہوں نے گھڑ رکھے ہیں، مصیبت پڑنے پر وہ سب غائب ہو جائیں گے۔ ☆ دنیا کی طرح آخرت میں بھی یہ خسارے سے دوچار ہوں گے۔

۱۲......مخاطب کے دل میں بات اتارنے کے لیے اس کے سامنے نفع وضرر دونوں پہلو واضح کر دینا چاہییں۔

{۸۴} (بیان القرآن، حصّہ اوّل، جلد۵/۴۱)

قصہ حضرت نوح علیہ السلام

﴿۲۵......۳۱﴾

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیْۤ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ میں تم کو ڈر کی بات سناتا ہوں کھول کر ○ کہ نہ پرستش کرو اللہ کے سوا، میں

اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ

ڈرتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے ○ پھر بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم کے ہم کو تو

اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ

تُو نظر نہیں آتا مگر ایک آدمی ہم جیسا اور دیکھتے نہیں کوئی تابع ہوا ہو تیرا، مگر جو ہم میں نیچ قوم ہیں بلا تامل اور ہم نہیں دیکھتے

وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى

تم کو اوپر اپنے کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو ○ بولا، اے قوم! دیکھو تو اگر میں ہوں صاف راستہ پر

بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ

اپنے رب کے اور اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے، پھر اس کو تمہاری آنکھ سے مخفی رکھا، تو کیا ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں

لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا

اس پر اور تم اس سے بیزار ہو؟ ○ اور اے میری قوم! نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال، میری مزدوری نہیں مگر اللہ پر اور میں

بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ یٰقَوْمِ مَنْ

نہیں ہانکنے والا ایمان والوں کو ان کو ملنا ہے اپنے رب سے لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ جاہل ہو ○ اور اے قوم! کون چھڑائے

یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ

مجھ کو اللہ سے اگر ان کو ہانک دوں کیا تم دھیان نہیں کرتے؟ ○ اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ

وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ

میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری آنکھ میں حقیر ہیں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی

اللّٰهُ خَیْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾

اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے جی میں ہے، یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں ○

ربط: اس سے قبل توحید و رسالت، وقوعِ قیامت، فلاحِ مؤمنین اور خسرانِ کفار جیسے موضوعات ذکر ہوئے، اب ان

سب کی تائید وتقریر کے لیے چند قصے ذکر کیے جاتے ہیں۔

تسہیل: ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا، انہوں نے اپنی قوم سے کہا میں تمہیں واضح طور پر خبردار کر رہا ہوں O کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو ورنہ مجھے تمہارے بارے میں دردناک عذاب کا اندیشہ ہے O جواب میں ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری اتباع وہ لوگ کر رہے ہیں جو ہم میں نچلے درجے کے اور سطحیت پسند ہیں اور تمہاری ذات میں ہمیں کوئی زائد بات بھی نظر نہیں آتی بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں O نوح علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے نبوت بھی عطا کی ہو لیکن تمہیں دکھائی نہ دے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ کیا ہم تمہیں قبولِ ہدایت پر مجبور کر سکتے ہیں جبکہ تم اسے پسند ہی نہیں کرتے؟ O اور اے میری قوم! دین کی دعوت پر میں تم سے کسی قسم کے معاوضہ کا طلبگار نہیں ہوں میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے ، یہ بھی سن لو کہ میں ان لوگوں کو اپنے سے دور نہیں ہٹا سکتا جو ایمان قبول کر چکے ہیں، یہ لوگ اپنے رب سے ملنے والے ہیں، وہیں پر ان کے مقام اور مرتبے کا پتہ چلے گا لیکن میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ تم واقعی جہالت کی باتیں کرتے ہو O اور اے میری قوم! یہ تو سوچو کہ اگر میں ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نکال دوں تو مجھے اللہ کی پکڑ سے کوئی بچا سکے گا؟ کیا تم اس واضح حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے؟ O میں نہ تو یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو فرشتہ کہتا ہوں اور نہ ہی ان ایمان والوں کے بارے میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اللہ انہیں کوئی بھلائی عطا نہیں کرے گا جنہیں تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، ان کے دلوں کا حال اللہ خوب جانتا ہے ایسی جسارت کرنے سے میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا O

تفسیر

اگرچہ ہم سورۂ اعراف میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کر چکے ہیں مگر یہاں قدرے تفصیل سے ان کے متعلق بتانا چاہتے ہیں:

حضرت نوح علیہ السلام کے والد کا نام لامک یا ملک تھا جو حضرت ادریس علیہ السلام کے بیٹے متوشالح کے فرزند تھے، حضرت نوح علیہ السلام سے قبل تین نبی گزرے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام، جن سے نسلِ انسانی کا دور چلا، حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند حضرت شیث علیہ السلام اور پھر سیدنا آدم علیہ السلام کی اولاد میں کئی پشتوں کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، جن کا نام کتبِ سابقہ میں ''اخنوخ'' بتایا گیا ہے۔

حضرت شیث علیہ السلام کی ملت میں بنیادی عقائد یعنی توحید وغیرہ موجود تھے، اس کے علاوہ نماز، روزہ، طہارت وغیرہ عبادات بھی موجود تھیں البتہ شرعی احکام تفصیلاً موجود نہ تھے بلکہ زیادہ تر دنیا کی آبادی سے متعلق مسائل تھے۔

اس کے بعد سیدنا ادریس علیہ السلام کا دور آیا تو بنیادی عقائد وعبادات کے علاوہ آپ کو انسانی ضروریات کی بہت سی چیزیں بذریعہ وحی سکھائی گئیں مثلاً کپڑے سینے کی سوئی، کھیتی باڑی کے آلات، ظروف سازی و پارچہ بافی وغیرہ!

البتہ تفصیلی شرعی احکام اس وقت بھی نازل نہ ہوئے تھے، روئے زمین پر سیدنا نوح علیہ السلام ہی وہ اوّل رسول ہیں جنہیں مستقل شریعت عطا ہوئی۔ ساڑھے نوسو سال تک اللہ کے یہ اولوالعزم پیغمبر دعوتِ توحید کا پرچار کرتے رہے مگر ایک محدود جماعت کے علاوہ قوم کی غالب اکثریت آپ کی مخالف ہی رہی جن پر اللہ کی طرف سے عذاب آیا، یہ ایک عالمی طوفان تھا جو ساری دنیا میں آیا جبکہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ طوفان دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی دوآبہ تک محدود رہا، اہلِ ایمان میں سے ۸۰ مرد وزن کے علاوہ کوئی انسان زندہ نہ بچا، سیدنا نوح علیہ السلام کی بیوی اور ایک بیٹا بھی ہلاک ہوئے البتہ آپ کے تین فرزند جو مومن تھے وہ محفوظ رہے۔ آپ کو ۴۰ سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی، ۹۵۰ سال آپ نے دعوت وتبلیغ فرمائی اور طوفان کے بعد آپ مزید ۶۰ ساٹھ برس تک زندہ رہے، اس لحاظ سے آپ کی عمر ایک ہزار پچاس سال بنتی ہے سورۂ ہود، جس کا مرکزی موضوع ہی قصصِ انبیاء ہے، اس میں سیدنا نوح علیہ السلام کا قصہ قدرے تفصیل سے آیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ قرآن نے مختلف مقامات پر مختلف قصص بیان فرمائے بلکہ بعض قصوں کو مکرر بھی ذکر کیا لیکن مقتضائے حال کے مطابق جتنی ضرورت تھی اتنا ہی بیان کیا، یہی وجہ ہے کہ تکرار و اعادہ کے باوجود ہر جگہ نیا لطف اور نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بھی قرآن میں متعدد بار آیا ہے، ان قصوں سے قرآن کا مقصود موعظت وعبرت ہوتی ہے خود قصہ مقصود نہیں ہوتا۔

﴿۲۵-۲۶﴾...... حضرت نوح علیہ السلام کو جب رسالت سے نوازا گیا تو آپ نے اپنی تبلیغ کی ابتداء میں فرمایا کہ میں تمہیں تمہارے برے انجام سے خبردار کررہا ہوں، قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت کا خلاصہ بتانے کے لیے تقریباً ایک جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اسی سورۃ کی آیت (۲) میں آپ نے پڑھا کہ ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا:

﴿ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّا ٱللَّهَ ۚ إِنَّنِى لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴾

اور یہاں سیدنا نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنی دعوت کے آغاز میں فرمایا:

﴿اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ﴾

آیت کے مفہوم میں یکسانیت یہ بات بتانے کے لیے ہے کہ تمام انبیاء کا مشن اوران کی دعوت ایک ہی رہی ہے۔

﴿۲۷﴾......حضرت نوح علیہ السلام کی اس مخلصانہ دعوت کے جواب میں قوم نے طنز اوراعتراض کے طور پر چار باتیں کہیں:

(۱)......آپ تو ہماری مانند بشر ہیں۔

(۲)......آپ کی اتباع کرنے والے لوگ معاشرے میں گھٹیا پوزیشن والے کمین لوگ ہیں۔{۸۵}

(۳)......ہمیں آپ کی ذات میں کوئی ایسی فضیلت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے ہم آپ کو اپنا پیشوا اور رہنما تسلیم کریں۔

(۴)......ہم آپ کو دعوائے نبوت میں اور آپ کے متبعین کو آپ کی تصدیق کرنے میں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

قومِ نوح نے تو نجانے حضرت نوح علیہ السلام کے حساس دل کو اپنی بدزبانی سے کس قدر رنجیدہ کیا ہوگا اور سفاہت وجہالت میں نمعلوم کیا کچھ کہا ہوگا لیکن قرآن کے اندازِ تعبیر پر صد جان سے قربان جایئے جو اپنے اظہار یہ میں فصاحت وبلاغت اور حسنِ طرز کے علاوہ کلام کی تازگی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا، قومِ نوح کے متکبّر وسرکش زعماء نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کے لیے جن چار باتوں کو بطور دلیل پیش کیا یہ صرف انہی کا خاصانہ تھا بلکہ ہر دور کے جہلاء نے اپنی فکری پستی اور مادہ پرستانہ نگاہ کے قصور کی بناء پر دعوتِ حق کو انہی نظریات کی بنا پر ٹھکرایا، ہمارے آقا ﷺ کو بھی قریشِ مکّہ کی جانب سے ایسے ہی جواب ملے تھے۔

اب آیئے ان چار اعتراضات کا مختصر تجزیہ کریں:

☆......یہ جہالت بعض انسانوں میں ہمیشہ سے پائی جاتی رہی کہ انسان حاملِ رسالت نہیں ہوسکتا، حالانکہ یہ ایک جاہلانہ تصوّر ہے، سوچنا چاہیے کہ اگر انسان کرۂ ارض کی خلافت جیسے عظیم منصب کا حامل ہوسکتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس میں وہ صلاحیتیں بھی ودیعت رکھی ہوں گی جو منصبِ رسالت کے شایانِ شان ہوں، کیا وہ مالک الملک ایسا کرسکتا ہے کہ کسی انسان پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالے؟

یہ غلط فہمی بھی مادیت پرستوں میں ہمیشہ سے رہی کہ نبوت اگر کسی انسان کو ملنی ہی ہے تو پھر اس کا معیار مال ودولت ہونا چاہیے۔

اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ انسانی زاویۂ نگاہ کی غلطی ہے، انسان کے نزدیک دنیاوی عزت اور مرتبے کی طرح نبوت کے عظیم منصب کے لیے بھی مال وجاہ اور سوشل مقام ومرتبہ ضروری ہے لیکن اللہ کے ہاں اس ذمہ داری کے لیے الگ خصوصیات درکار ہیں، ان میں سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ منصبِ نبوت کے لیے ایسے انسان کا انتخاب کیا جاتا ہے

{۸۵} اخساؤنا وسقطنا وسفلتنا۔(قرطبی ۹/۲۳)

جس میں وہ روحانی قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہوں جو اس امانتِ کبریٰ کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہوں۔

☆......معاشرے کے کمزور لوگوں کا دعوتِ حق قبول کرنا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مالداری اور عیاشی کی وجہ سے ان کی فطرت بگڑی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ انہیں یہ ڈر بھی نہیں ہوتا کہ اسلام قبول کر کے وہ اس چرائے ہوئے مقام کو گنوا دیں گے جو انہوں نے لوگوں کو نادان بنا کر حاصل کیا ہے۔

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ ولایت میں ''شرافتِ عرفی'' شرط نہیں البتہ نبوّت کو اللہ تعالیٰ نے شرفاء کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اس لیے کہ اس میں وہ مصلحتیں ہیں جو نبوّت سے مقصود ہیں (کہ لوگ ان کی اتباع کریں، اس لیے کہ شرفاء کو شرفاء کی اتباع سے عار نہیں آتی۔){۸۶}

☆......''مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ'' ''تمہاری ذات میں ہمیں کوئی زائد بات نظر نہیں آتی۔''

یہ نظریہ اس وقت پروان چڑھتا ہے جب کسی معاشرے سے عقیدۂ توحید غائب ہو جاتا ہے اور پھر ہدایت کو بھی دنیا پرستی پر قیاس کرنا شروع کر دیا جاتا ہے، عقیدۂ توحید کے نور سے دور اور شرک کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی سوسائٹی ان اقدار کی تحقیر کرتی ہے جن کی وجہ سے انسان، انسان بنتا ہے، جیسے قومِ نوح کا حال تھا کہ ایمان جیسی عظیم نعمت سے مالا مال ایمان والوں اور خود اللہ کے پیغمبر کو جو پوری کائنات کے لیے سراپائے رحمت ہوتا ہے، کہنے لگے:

''ہم تو تمہیں کسی معاملے میں اپنے سے فضیلت والا نہیں پاتے۔''

☆...... ''بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ'' بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں:

یہ وہ آخری الزام ہے جو سوسائٹی کے صدر نشین اللہ کے رسول اور اس کے متبعین کے سر تھوپتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ہر بات پر یقین کر لینا اور دوٹوک بات کرنا سطحی رائے والے نادان لوگوں کی عادت ہے، ہم تو بڑے لوگ ہیں جو مفکرانہ انداز میں تحفظ کے ساتھ بات کرتے ہیں، لیکن ایسے احمق یہ نکتہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ سچائی کو قبول کرنا فطرتِ سلیمہ کی نشانی ہے اور اسے ٹھکرا دینا فطرت کے بگاڑ کی علامت! یہ لوگ اللہ کے نبی کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس پیغام کو جھوٹا کہتے ہیں جو وہ ان کے پاس لے کر آتے ہیں۔

قوم کی اس یاوہ گوئی کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام جس حقیقت پسندانہ اور گہرے شعور و یقین کے ساتھ ان جہلاء سے ہمکلام ہوتے ہیں وہ ایک نبی کا خاصہ ہی ہو سکتا ہے، فرمایا:

﴿۲۸﴾......اے میری قوم! ایک تو اللہ نے مجھے نورِ فطرت عطا کیا ہے، دوسرے اس نے مجھ پر اپنی وحی

{۸۶} (بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد ۵/۴۲)

اور رحمت بھی نازل فرمائی{۸۷} جبکہ تم اپنے نورِ فطرت کو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ختم کر چکے ہو جس کی وجہ سے تمہارے اندر ہدایت کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی، اب میں کیا کر سکتا ہوں؟

﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا﴾ جب تم خوش دلی سے پیغامِ حق کو نہیں مانتے تو دوسری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ میں اپنے نظریات تمہارے اوپر زبردستی ٹھونس دوں، اور یہ میرے فرائض میں شامل نہیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! اگر حضرت نوح علیہ السلام کے بس میں ہوتا تو وہ ضرور قوم کو ہدایت سے بہرہ ور فرما دیتے لیکن انہیں یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔{۸۸}

﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا﴾ میں استفہام انکاری ہے یعنی میں ایسا نہیں کر سکتا۔{۸۹}

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اَنُلْزِمُكُمُوْهَا ...... الخ" سے اس طرف اشارہ ہے کہ منکر کو اہل اللہ سے استفادہ نہیں ہو سکتا اور جب تک وہ منکر رہے گا ان سے مستفید نہیں ہو سکتا۔{۹۰}

﴿۲۹-۳۰﴾...... ایک بے لوث اور بے غرض ناصح اور داعی کے پیشِ نظر صرف اللہ کی رضا ہوتی ہے کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا اور اللہ کے نبی سے بڑھ کر اخلاص ووفا کا سرچشمہ کون ہو سکتا ہے؟ اس لیے آپ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں تم سے کسی معاوضہ کا طلبگار نہیں ہوں میرا اجر تو میرا اللہ مجھے عطا فرمائے گا، جب میں امرِ حق کی دعوت دینے میں تم سے کسی اجرت کا طالب نہیں تو پھر مجھے تمہاری بیزاری کی پرواہ بھی نہیں۔

اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ میں تم جیسے بے طلب لوگوں کی خاطر مخلص اہلِ ایمان کو اپنی صف سے خارج نہیں کر سکتا۔

نبی اکرم ﷺ کو بھی مکہ میں یہ صورت پیش آئی جب رؤسائے کفار نے کہا تھا کہ آخر ہم بلال وصہیب اور عمار رضی اللہ عنہم جیسے غلاموں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ اللہ نے اپنے حبیب کو حکم دیا:

﴿لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾{۹۱}　"اور ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیے جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔"

{۸۷}(روح المعانی ۱۲،۷/۵۷)

{۸۸} قال قتادة: والله لو استطاع نبی الله نوح علیه السلام لألزمها قومه ولكنّه لم يملك ذلك (خازن ۳/۲۲۸)

{۸۹} "أنلزمكموها"...... فالاستفهام للانكار- أی لا نقدر علی ذلك (تفسير القاسمی ۹/۱۱۴) والاستفهام للانكار ای لا نفعل ذلك (صفوة التفاسير ۲/۱۳)

{۹۰} وفيه اشارة إلى أن المنكر لا يمكن له الاستفادة من اهل الله ولا يكاد ينتفع بهم مادام منكرًا (بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد۵/۴۳)

{۹۱} (الانعام ۶/۵۲)

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے متکبرین کی جہالت آمیز گفتگو کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں ان مقرّبینِ بارگاہِ الٰہی کو اپنی مجلس سے نہیں اٹھا سکتا۔{۹۲} اگر میں ایسا کروں تو ہدایاتِ ربانی کی نافرمانی ہوگی اور اگر انہوں نے قیامت کے دن اللہ کے حضور میرے اس طرزِ عمل کی شکایت کی{۹۳} تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

﴿مَنْ يَّنْصُرُنِيْ﴾ میں استفہام انکاری ہے، مطلب یہ کہ کوئی میری مدد نہیں کر سکے گا۔{۹۴}

﴿۳۱﴾......اس آیتِ کریمہ میں مشرکین کے چار اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں، وہ کہتے تھے:

۱......اگر نوح، اللہ کا نبی ہے تو اس کے پاس مال و دولت کے خزانے کیوں نہیں؟

۲......یہ ہمیں غیبی امور کی خبریں کیوں نہیں بتاتا؟

۳......یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے؟ نبی ہوتا تو فرشتہ ہوتا۔

۴......اس کی اتباع کرنے والے سوسائٹی کے کمزور، غریب اور کمین لوگ ہیں۔

جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اعتراضات منصبِ رسالت کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں، دنیا کی کھوٹی قدروں کا اس عظیم منصب سے کوئی تعلق نہیں، یہ الگ بات ہے کہ جاہلانہ سوچ کے حامل افراد اور اقوام بس یہی چاہتے ہیں کہ جس کا دامن تھامیں اس کے وسیلہ سے دنیوی ترقیاں اور مفادات حاصل کریں، سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ ثروت وغنا کا نبوت سے کوئی تعلق نہیں، اگر تم میری اتباع کو امارت سے مشروط کرتے ہو تو میں تمہیں اپنی حقیقت واضح طور پر بتاتا ہوں کہ میرے پاس مال کی کثرت اور سونے چاندی کے خزانے نہیں ہیں{۹۵} اور نہ ہی میں عالم الغیب ہوں کہ جو بات چاہوں اور جب چاہوں جان لوں، اسی طرح میں مافوق البشر ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا بلکہ میں بشر اور انسان ہوں البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے انسانیت کے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے، رہا میرے متبعین کے بارے میں تمہارا یہ متکبرانہ قول کہ یہ خیر سے محروم ہیں، تو سنو! میں ان کی قسمت کی بھلائی سے انکار کرنے والا کون؟ اگر یہ غریب اور کمزور لوگ مخلص اور صادق ہیں تو دنیا اور آخرت کی فلاح ان کا حصّہ ہے۔

اس بات کی شہادت کہ سب سے پہلے غرباء ایمان قبول کیا کرتے ہیں، قیصرِ روم نے بھی دی تھی، جب نبی اکرم ﷺ کا نامہ مبارک اسے پیش کیا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اگر عرب کا کوئی باشندہ موجود ہو تو اسے پیش کیا جائے، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ

{۹۲} لاأطردهم ولاأبعدهم عن مجلسي لأنهم من أهل الزلفى المقربون الفائزون عندالله (روح المعاني ۱۲،۷/۶۱)

{۹۳} أي لوفعلت ذلك لخاصموني عندالله (قرطبي ۹/۲۶)

{۹۴} والاستفهام للانكار، أي لاينصرني أحد من ذلك (روح المعاني ۱۲،۷/۶۲)

{۹۵} لاأقول لكم عندي المال الوافر الكثير وخزائني مملوءة بالذهب والفضة (قبس من نورالقرآن الكريم ۵/۳۲)

جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، ان کا تجارتی قافلہ وہاں موجود تھا، آپ جب قیصرِ روم کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے منجملہ دیگر سوالات کے ایک سوال یہ بھی کیا کہ اس نبی کے ماننے والے کمزور لوگ ہیں یا با اثر طبقہ ہے؟ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ وہ کمزور لوگ ہیں، قیصرِ روم نے فوراً کہا:

﴿وھم اتباع الرّسل﴾{۹۶} ''ابتداء میں انبیاء کی تصدیق کرنے والے کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔''

﴿تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُکُمْ﴾ ''جنہیں تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو'' چونکہ ''طبقۂ اشرافیہ'' سیدنا نوح علیہ السلام کے پیروکاروں کی ناداری و مفلسی کو ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر انہیں حقیر سمجھتا تھا اس لیے حقیر جاننے کی نسبت آنکھوں کی طرف کردی گئی ورنہ تحقیر و اعزاز کا تعلق آنکھوں سے نہیں دل و دماغ سے ہے۔{۹۷}

تو فرمایا کہ صرف تمہارے حقیر جاننے سے میں اپنے پیروؤں کو بھلائی سے محروم نہیں سمجھوں گا بلکہ ان کے دل کے حالات اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس کے عقائد و خصائل صحیح ہیں اور کون باطل پر ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱......تمام انبیاء کی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مرکزی نکتہ بھی توحید کا اثبات اور شرک کا رَدّ تھا۔(۲۵)

۲......کفر و شرک پر اصرار آخرت کے دردناک عذاب کا سبب بنتا ہے۔(۲۶)

۳......نافرمانوں کو دعوت دیتے وقت ان کے سامنے اللہ کے عذاب کی شدت اور ہولناکی بیان کی جائے، شاید وہ کفر و شرک سے باز آجائیں۔(۲۶)

۴......دین کی نصرت و حمایت میں فقراء اور کمزور لوگ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں جبکہ طبقۂ اشرافیہ کے حصے میں عموماً حق کی مخالفت ہی آئی ہے، قومِ نوح کا حال بھی ایسا ہی تھا(۲۶) انہوں نے مفلس و نادار مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اعلیٰ و برتر تصور کیا اور تکبر کی وجہ سے قبولِ ایمان سے محروم رہے۔

۵......بشریت اور نبوت کا جمع ہوجانا کل کے مشرکوں کے لیے بھی باعثِ تعجب تھا اور دورِ حاضر کے بعض جہلاء کی عقل بھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔

۶......معاشی لحاظ سے کمزور اہلِ ایمان کو متکبر وڈیروں اور سرداروں نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔

۷......قومِ نوح کا سیدنا نوح علیہ السلام کے متبعین کو ''بادی الرأی'' (سطحِ رائے والے) کہنا حقیقت میں مذمتی کلمہ

{۹۶} (بخاری ۱، باب بدء الوحی/۴، مسلم ۲، کتاب الجھاد والسیر/۹۸)

{۹۷} (مظھری ۶/۴۱)

بن ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ حق واضح ہو جانے کے بعد اس کی اتباع ضروری ہو جاتی ہے، عقل و فکر اور کسی کی ذاتی رائے کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی، ایسے موقع پر اگر کوئی عقلی گھوڑے دوڑانا شروع کر دے تو یہ اس کی غباوت و جہالت کی دلیل ہے۔(۲۷)

۸......لوگوں کی اکثریت کی مخالفت کے باوجود انبیائے کرام وحی کی تعلیمات اور نبوت و رسالت کے فریضے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔(۲۸)

۹......انبیائے کرام نے اپنی ایمانی دعوت قبول کرنے پر کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا۔(۲۸)

۱۰......انبیائے کرام نے دعوت کے بدلے کبھی دنیوی مفاد پیشِ نظر نہیں رکھا۔(۲۹)

۱۱......حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشائخ کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے (یعنی مالی مفادات لوگوں سے نہیں رکھنا چاہییں) کیونکہ مرشد کے دل میں مسترشدین سے مال کی طلب ان اسباب میں سے سب سے قوی سبب ہے جو استفادہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔{۹۸}

۱۲......اہلِ ایمان کا احترام واجب اور انہیں حقیر سمجھنا حرام ہے۔

۱۳......کمزور اہلِ ایمان کافر سرداروں اور جاگیرداروں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے قابلِ ترجیح ہیں۔

۱۴......مخلص مؤمنین کو صرف ان کے فقر اور افلاس کی وجہ سے دور کرنا اور کفار و منافقین کو اپنے قریب کرنا، عقلی، طبعی اور اخلاقی کسی لحاظ سے درست نہیں، ایسا کرنے سے نصرتِ الٰہی سے محرومی اور اللہ کی یقینی ناراضگی ہے(۲۹-۳۰)

علامہ رازی فرماتے ہیں: کفار کی رضا کے لیے مومنین صادقین کو اپنے آپ سے دور کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔{۹۹}

۱۵......جو شخص حق کی طرف متوجہ ہو اس سے اعراض نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی طرف حق تعالیٰ بھی متوجہ ہوتے ہیں تو اس سے اعراض کرنا حق تعالیٰ سے اعراض کرنا ہے۔{۱۰۰}

۱۶......جہلاء کی ضد اور ہٹ دھرمی کے جواب میں حلم و بردباری سے کام لینا اخلاقِ انبیاء ہے۔

۱۷......صاحبِ ارشاد کا علم و عمل کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے، کشف یا ضروریاتِ بشریہ میں ممتاز ہونا شرط نہیں۔{۱۰۱}

۱۸......کمالِ مطلق کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

☆......استغنائے مطلق......حضرت نوح علیہ السلام نے "وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ" فرما کر اس کی نفی کی۔

{۹۸}(بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد۵/۳۳)

{۹۹}طرد المؤمنین لطلب مرضاة الکفار من اصول المعاصی۔(کبیر۹، الجزء السابع عشر/۳۴۰)

{۱۰۰}(بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد۵/۳۳)

{۱۰۱}(حوالہ مذکورہ)

☆......علمِ تام......اس کی نفی "وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ" فرما کر کی۔

☆......کامل ومکمل قدرت...... "وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ" سے اس صفت کی نفی مقصود ہے، اس لیے کہ قدرت وقوت کے اعتبار سے فرشتوں سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق نہیں۔

ان تین صفات کی نفی فرما کر سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے عجز کا اظہار فرمایا کہ میں بشری اعتبار سے اگر چہ کامل ہوں لیکن کمالِ مطلق کا دعویٰ نہیں کرتا کیونکہ یہ صرف باری تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔

۱۹....کسی کے استہزاء واعتراض کی وجہ سے مومنین کاملین کا اجر ضائع ہوتا ہے اور نہ اس میں کمی واقع ہوتی ہے، جو ذات ایمان والوں کے دلوں کے حالات سے باخبر ہے، وہ انہیں بہترین اجر سے بھی ضرور نوازے گی۔(۳۱)

☆......رزق کے خزانوں کا مالک بھی صرف اللہ ہے اور غیب کا علم بھی اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔(۳۱)

☆......تمام انبیائے کرام نہ صرف یہ کہ بشر تھے بلکہ وہ بشریت کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے، کسی نبی نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔(۳۱)

☆...... "وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ" سے بعض علماء نے انسانوں پر فرشتوں کی فضیلت ثابت کی ہے اور اس کی وجہ اطاعتِ الٰہی پر ان کی مداومت کو قرار دیا ہے۔(۳۱)

قوم کا حضرت نوح علیہ السلام سے مباحثہ

﴿۳۲......۳۵﴾

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

بولے اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا اب لے آ جو تو وعدہ کرتا ہے ہم سے اگر تو سچا ہے O

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ

کہا کہ لائے گا تو اس کو اللہ ہی اگر چاہے گا اور تم نہ تھکا سکو گے بھاگ کر O اور نہ کارگر ہوگی تم کو میری نصیحت جو چاہوں

اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

کہ تم کو نصیحت کروں اگر اللہ چاہتا ہوگا کہ تم کو گمراہ کرے، وہی ہے رب تمہارا اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے O کیا کہتے ہیں کہ

افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾

بنالایا قرآن کو؟ کہہ دے اگر میں بنالایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا ذمہ نہیں جو تم گناہ کرتے ہو O

تسہیل: مخالفین نے کہا اے نوح! تم نے ہمارے ساتھ نہ صرف جھگڑا کیا بلکہ اس جھگڑے کو بہت طول دے دیا، اب فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اگر تم دعوائے نبوت میں واقعی سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ڈراتے رہتے ہو وہ لے آؤO آپ نے فرمایا عذاب تو صرف اللہ ہی لاسکتا ہے بشرطیکہ اسے منظور ہو اور تم اسے عاجز نہیں کر سکتےO اگر اللہ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کرلے تو میری خیر خواہی تمہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتی اگر چہ میں کیسی ہی خیر خواہی کا ارادہ کرلوں، وہی تمہارا رب ہے اور بالآخر اسی کی طرف تم نے لوٹ کر جانا ہےO کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود کلام بنالیا ہے؟ آپ فرما دیجیے کہ اگر بالفرض میں نے اسے خود بنایا ہے تو اس گناہ کا وبال میرے اوپر ہے اور جو گناہ تم کرتے ہو میں اس سے بری ہوںO

﴿تفسیر﴾

﴿۳۲﴾......قومِ نوح جب دلیل کے میدان میں مقابلے سے عاجز آ گئی تو اطاعت واتباع کے بجائے تکبر اور ہٹ دھرمی پر اتر آئی اور بحث ومباحثہ اور غور وفکر کی راہ ترک کر کے کھلم کھلا پیغمبرِ وقت کو عذاب لے آنے کا چیلنج دینے لگی، حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغِ حق میں جس قدر جدوجہد فرمائی، قوم کی جانب سے بغض وعناد میں اسی قدر سرگرمی کا اظہار ہوا، کہنے لگے:

اے نوح! تم نے تو ہمارے ساتھ جھگڑا ہی شروع کر دیا ہے، اچھا جاؤ! ہم نہیں مانتے۔ اور اگر تمہارے دعوی میں صداقت ہے تو جس عذاب کا تم ہم سے وعدہ کرتے تھے، وہ لے آؤ۔

قومِ نوح کی فطرت اس قدر مسخ ہو چکی تھی اور دل اتنے ویران ہو چکے تھے کہ حضرت نوح علیہ السلام انہیں دارین کی خیر کی طرف بلا رہے تھے اور وہ آپ کی اس شفقت کو فساد اور جھگڑا بتا رہے تھے، یہ فہم کے الٹا ہونے کی انتہائی صورت ہوتی ہے۔

﴿۳۳﴾......قوم کے اس بے ہودہ مطالبہ کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ عذاب لانا یا نہ لانا میرے اختیار میں نہیں، یہ قدرت تو صرف اللہ کے پاس ہے اور جب وہ عذاب کا فیصلہ کرے گا تو تم اسے عاجز نہیں کر سکو گے بلکہ تباہی سے دوچار ہو گے۔ میرا کام تو اللہ کے فرامین تم تک پہنچانا ہے۔

﴿إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ﴾ "عذاب تو صرف اللہ ہی لاسکتا ہے" حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا کہنا اہلِ حق کی شان ہے ورنہ اہلِ باطل کی زبان پر بڑے بڑے بول رہتے ہیں کہ جو میرا مخالف ہوگا اس کا یہ حال کردوں گا

اور وہ کر دوں گا۔{۱۰۲}

جو جواب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دیا، ہر نبی کی طرف سے قوم کے سرکش افراد کو یہی جواب ملا۔

﴿۳۴﴾......قرآن نے جگہ جگہ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ بلاوجہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ گمراہی کے اسباب انسان کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، حق بات تسلیم کرنے کے بجائے اسے ٹھکرا دینا، ضد، تعصب اور عناد یہ سب گمراہی تک پہنچانے والے اعمال ہیں اور جو ان مذموم صفات کو اپنا لیتا ہے تو اللہ اس کے دل پر مہر جباریت لگا دیتا ہے، پھر کسی نبی اور مرشد و مبلغ کی تبلیغ اس پر کچھ اثر نہیں کرتی بلکہ وہ گمراہی میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

قومِ نوح کی حالت بھی ایسی ہی تھی، اس لیے اللہ کے نبی نے فرمایا کہ اگر تمہارے تعصب اور عناد کی وجہ سے اللہ کو تمہاری اصلاح منظور نہیں تو میری نصیحت تمہیں کچھ مفید نہیں ہو سکتی، میری لاکھ کوشش کے باوجود تم گمراہی اور انجام بد سے نہیں بچ سکتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی مشیت کے خلاف نہیں ہو سکتا البتہ اس کے حکم کے خلاف ہونا ممکن ہے، ممکن ہی نہیں عملاً ہو رہا ہے{۱۰۳} جیسے اللہ نے نماز، روزہ، صلہ رحمی، ظلم نہ کرنے وغیرہ کا حکم دیا ہے مگر ہم اس کے خلاف کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

﴿وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ تمہاری استعداد کی خرابی کی وجہ سے تمہارے بارے میں میری کوئی کوشش تو بار آور ثابت نہ ہو سکی اور تم سرتا سر گمراہی میں ڈوبے رہے لیکن یاد رکھو کہ دنیا کی اس عارضی زندگی کے بعد تمہیں اللہ کی عدالت میں بھی پیش ہونا ہے اور پھر وہاں جزائے عمل کا سامنا کرنا ہوگا۔

﴿۳۵﴾......﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ﴾ حکایت حضرت نوح علیہ السلام کی چل رہی تھی اور آگے بھی وہی چلے گی، درمیان میں مقام کی مناسبت سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے معاند معاصرین سے متعلق یہ آیت لائی گئی ہے۔{۱۰۴}

نزولِ قرآن کے زمانے کے مشرکین سے شکوہ کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ کیا قرآن کی بابت ان کا نظریہ یہ ہے کہ محمد ﷺ اپنی طرف سے بنا کر اسے پیش کرتے ہیں؟

آپ انہیں جواب دیجیے کہ اگر میں نے بقول تمہارے، یہ کلام اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو اس جرم کا ذمہ دار میں

{۱۰۲}(بیان القرآن حصہ اوّل، جلد۵/۴۳)
{۱۰۳}(مظہری ۴۲/۶، دارالاشاعت، کراچی)
{۱۰۴} عن مقاتل: أنها في شان النبيّ ﷺ مع مشركي مكة (روح المعانی ۲۰۷/۱۲، ۷۱/۱).

ہی ہوں اور اگر میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں اور تم مجھے جھٹلاتے ہو تو اس کا وبال تمہارے سر ہی ہوگا۔{۱۰۵}

اللہ کا سچا نبی سچائی کی مسلسل دعوت اور مخالفوں کے مسلسل انکار کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا جو اللہ کے نبی نے کہا کہ میں اپنے افعال کا ذمہ دار ہوں اور تمہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے تیار رہنا چاہیے، یہ جواب اللہ کے نبی کی حق پرستی کو ظاہر کرتا ہے جو اپنے معاند مخاطبین کو بغیر جبر کے بڑے مؤثر انداز میں سوچنے، سمجھنے اور اس کے بعد فیصلہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کو بھی قصۂ نوح علیہ السلام سے متعلق بتاتے ہیں، اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے سیاق وسباق پر نظر کرتے ہوئے اسی قول کو پسند کیا ہے۔{۱۰۶}

حکمت وہدایت:

۱......ضد اور ہٹ دھرمی قبولِ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے، دلائل کی کثرت بھی ضدی شخص کو حق بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کرسکتی۔(۳۲)

۲......دین کے معاملے میں شکوک وشبہات دور کرنے کے لیے حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے بحث کی جاسکتی ہے۔(۳۲)

۳......اہل اللہ اپنے مخالفین کا انجام اللہ کے سپرد کردیتے ہیں، مخالفین کو دھمکیاں دینا ان کا طریقہ کبھی نہیں رہا۔(۳۳)

۴......کوئی بات مانے یا ٹھکرائے، دعوت کا فریضہ بہرصورت ساقط نہیں ہوگا۔

۵......ہدایت شیخ کے قبضہ میں بھی نہیں۔{۱۰۷}

۶......جب تک کسی کی کفر پر موت نہ آئے، اس سے پہلے اس کے انجام کے بارے میں توقف کیا جائے۔

۷......ہر انسان اپنی ذات کے بارے میں جوابدہ ہوگا، اچھے اعمال پر اس کی رحمت اور غلط نظریات پر اس کی سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔(۳۵)

☆☆☆☆☆

{۱۰۵} ان کنت افتریته فعلّی عقاب جرمی وان کنت صادقا وکذبتمونی فعلیکم عقاب ذلك التکذیب (کبیر ۶، ۱۷/۳۴۳)

{۱۰۶} قال ابن عباس: هو من محاورة لقومه وهو أظهر لأنّه لیس قبله ولابعده الاّ ذکر نوح و قومه فالخطاب منهم ولهم۔(قرطبی ۹/۲۸)

{۱۰۷} (بیان القرآن، حصّہ اوّل، جلد۵/۴۳)

قومِ نوح کی ہلاکت

﴿۳۶......۴۱﴾

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا

اور حکم ہوا طرف نوح کی کہ اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر

كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ۚۖ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ

جو کر رہے ہیں O اور بنا کشتی روبرو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں

ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ

کے حق میں یہ بے شک غرق ہوں گے O اور وہ کشتی بناتا تھا اور جب گزرتے اس پر سردار اس کی قوم کے

سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ

ہنسی کرتے اس سے، بولا! اگر تم ہنستے ہو ہم سے تو ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو O اب جلد جان لو گے کہ

يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ

کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب دائمی O یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا تنور نے

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ

کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں ہر قسم سے جوڑا دو عدد اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور سب ایمان

وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْــرٖ۩ىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ

والوں کو، اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے O اور بولا! سوار ہو جاؤ اس میں، اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور

اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ٹھہرنا تحقیق میرا رب ہے بخشنے والا مہربان O

تسہیل: اور نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع دی گئی کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے، ان کے سوا کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا لہٰذا آپ ان کی حرکتوں پر غم نہ کریں O اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے ایک کشتی تیار کیجیے اور ظالموں کی نجات کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا کیونکہ انہیں غرق کرنے کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے O چنانچہ وہ کشتی تیار کرنے لگے، اس تیاری کے دوران جب کبھی ان کی قوم کے سرداروں کا وہاں سے گزر ہوتا تو وہ ان کا مذاق اڑاتے، آپ جواب میں فرماتے کہ اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی ویسے ہی تمہارا مذاق اڑائیں گے

جیسے تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو○ تم بہت جلد جان لو گے کہ دنیا میں کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کس پر آخرت میں دائمی عذاب نازل ہوگا○ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور زمین سے پانی ابلنے لگا تو ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو دو جانور کشتی میں سوار کرلو اور اپنے گھر والوں کو اس میں بٹھا لو سوائے اس کے جسے غرق کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے، اپنے اہلِ خانہ کے علاوہ ایمان والوں کو بھی بٹھا لیجیے، اور ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی○ اور نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا، اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور ٹھہرنا سب اللہ ہی کے نام سے ہے، بلاشبہ میرا رب غفور رحیم ہے○

تفسیر

﴿۳۶﴾......حضرت نوح علیہ السلام کا استقلال دیکھیے کہ صدیاں بیت گئیں قوم کے پیچھے پھر پھر کر انہیں توحید کی دعوت دے رہے ہیں اور شرک سے منع کر رہے ہیں، آپ جب قوم کے ہاتھوں بہت زیادہ ستائے جاتے تو یہ امید باندھ لیتے کہ شاید آئندہ آنے والی نسل ایمانی دعوت کو سینے سے لگا لے لیکن ہر پچھلی نسل اگلی سے زیادہ سرکش ہوتی، وہ ظالم اللہ کے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں کہتے کہ یہ دیوانہ اور پاگل تو ہمارے باپ دادا کے دور سے چلا آ رہا ہے۔ (العیاذ باللہ)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ نے قوم کی ہلاکت کے لیے ہاتھ اٹھا کر فرمایا:

﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ {۱۰۸} ”اے میرے پروردگار! ان کفار میں سے کسی ایک فرد کو بھی زمین پر باقی نہ رکھیے۔“

قومِ نوح کی سزا کا ذکر توریت (پیدائش ۶:۱۳) میں ان الفاظ کے ساتھ ہے:

”اور خدا نے نوح سے کہا کہ سب بشر کی اجل میرے پاس آ پہنچی ہے، اس لیے کہ ان کے سبب زمین ظلم سے بھر گئی ہے اور دیکھو میں ان کو زمین کے ساتھ نابود کر دوں گا۔ {۱۰۹}

اسی طرح پیدائش باب ۶:۱۷ میں ہے:

”اور دیکھو! میں، ہاں! میں ہی زمین پر طوفان کا پانی لاتا ہوں کہ ہر ایک جسم کو جس میں زندگی کا دم ہے، آسمان کے

{۱۰۸} (نوح ۷۱/۲۶)

{۱۰۹} (دیکھیے عہد عتیق/صفحہ ۷، مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال روما ۱۹۵۸ء)

نیچے مٹا ڈالوں، اور سب جو زمین پر ہیں مرجائیں گے۔'' {۱۱۰}

بہرحال جب قومِ نوح کی بغاوت اور سرکشی حد سے بڑھ گئی اور اللہ کے نبی نے فریاد کی:

﴿أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ﴾ {۱۱۱} ''اے میرے رب! میں مغلوب وضعیف ہوں، تو میری مدد فرما۔''

﴿رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ﴾ {۱۱۲} ''پروردگار! ان کی تکذیب کے بالمقابل آپ میری مدد کیجئے۔''

تو اللہ نے وحی کے ذریعے آپ کو تسلی دی کہ جن گنے چنے افراد کی قسمت میں ایمان لانا تھا وہ ایمان لا چکے، اب کوئی اور ان میں ایمان لانے والا نہیں لہٰذا آپ ان کی عداوت وتکذیب سے غمگین نہ ہوں، ان پر حجت قائم ہو چکی اور عقوبت وسزا کی گھڑی آ پہنچی ہے، عنقریب ایسا عذاب آنے والا ہے جو ان شریروں کا خاتمہ کر ڈالے گا۔

﴿۳۷﴾...... حکم دیا گیا کہ ہمارے حکم اور تعلیم کے موافق ایک کشتی تیار کرنا شروع کریں اور اپنی ظالم قوم کے بارے میں مجھ سے عذاب میں تاخیر یا تعجیل کا مطالبہ نہ کریں۔ {۱۱۳}

قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کی اس کشتی کے بارے میں لفظ ''الْفُلْكَ'' سے زیادہ کوئی تصریح نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے متبعین کی تعداد کے مناسب اس کشتی کو تیار کیا ہوگا لیکن تورات میں اس کشتی کی لمبائی، چوڑائی، اونچائی کے علاوہ اس کے تین درجوں کا بھی ذکر ہے، نیز روشندانوں، کھڑکیوں، دروازوں اور کوٹھڑیوں تک کی تصریح ہے اور آخر میں یہ بھی لکھا ہے: پھر خدا تعالیٰ نے رحمت کی، آسمان کا پانی بند ہوا، زمین کا پانی زمین میں پیوست ہوا اور سیدنا نوح علیہ السلام کشتی سے اتر کر ملکِ آرمینیہ میں ایک جگہ آرہے، جہاں ایک گاؤں ارگوری نام کا تھا جو ۱۸۴۰ء کو اس پہاڑ کی آتش فشانی سے غارت ہوگیا، پہلے زلزلہ آیا اور لال دھواں نکلا، پھر میلوں تک بڑے بڑے پتھر پہاڑ سے جا کر گرتے تھے۔ {۱۱۴}

اسلاف نے ان ابحاث کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور فرمایا کہ کشتی کے بارے میں اتنا ہی سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں اتنی گنجائش تھی کہ اس وقت کی مومن آبادی اور جانوروں کے جوڑے اس میں سما گئے تھے، قرآنی آیات اسی پر دلالت

{۱۱۰} (حوالہ مذکورہ)
{۱۱۱} (القمر ۵۴/۱۰)
{۱۱۲} (المومنون ۲۳/۲۶)
{۱۱۳} ''ولاتخاطبني'' فيه وجوه: الاوّل: يعني لاتطلب مني تأخير العذاب عنهم...... والثاني: في تعجيل ذلك العقاب على الّذين ظلموا۔ (كبير ۶، الجزء السابع عشر/۳۴۵)
{۱۱۴} (تفسیر حقانی ۲/۵۶۹...... اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی-۲)

کرتی ہیں۔{۱۱۵}

﴿۳۸﴾......قصۂ نوح علیہ وسلم کا ایک اور منظر سامنے آتا ہے:

سیدنا نوح علیہ السلام وعظ و نصیحت کا سلسلہ منقطع کر کے کشتی کی تیاری میں شب و روز مصروف ہیں اور آپ کے اردگرد سے مسخرے گزر رہے ہیں، ایسے لوگ جو صرف ظاہری امور پر نظر رکھتے تھے لیکن ظاہری حالات کے پسِ پشت جو حکمتِ ربانی کارفرما تھی وہ ان کی نظروں سے اوجھل تھی، کشتی اس سے پہلے انہوں نے کبھی دیکھی نہ تھی اور اس کے فوائد اور ضرورت سے بھی وہ ناواقف تھے، کشتی کا حجم بھی بہت بڑا تھا اور جہاں یہ قوم آباد تھی وہ کوئی نشیبی علاقہ نہ تھا بلکہ ایک بلند میدان تھا اور قریب ترین سمندر خلیج فارس سے صدہا میل کے فاصلہ پر تھا، اس پر مستزاد یہ کہ نہ بارش کے آثار نہ طوفان کی علامات! پھر آپ سالہا سال سے عذابِ الٰہی سے قوم کو ڈرا رہے تھے مگر حکمتِ الٰہی کی بناء پر وہ مؤخر ہو رہا تھا، بصیرت سے محروم اس قوم نے اللہ کے نبی سے تمسخر شروع کر دیا، کہنے لگے:

اے نوح! اگر آپ سچے ہیں تو آپ کا اللہ اس مشقت طلب کام سے آپ کی جان چھڑا کیوں نہیں دیتا؟{۱۱۶}

بعض شوخ زبان بولے:

نبوت کے بعد کیا آپ نے بڑھئی کا پیشہ سنبھال لیا ہے؟{۱۱۷}

غرض نوح علیہ السلام "سفینۂ نجات" کی تیاری میں مشغول رہے اور ساتھ ہی ساتھ سوال و جواب اور تمسخر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

قوم کے استہزاء کا جواب سیدنا نوح علیہ السلام نے یہ دیا کہ تم تو میرا مذاق اس لیے اڑا رہے ہو کہ بادوباراں کا نام ونشان نہیں اور میں کشتی کی تیاری میں مصروف ہوں اور مجھے ہنسی آ رہی ہے کہ عذابِ موعود سر پر ہے مگر تم ایمان اور اطاعت پر آمادہ نہیں۔{۱۱۸}

اور اگر "نَسْخَرُ" میں حال کے بجائے مستقبل کے معنٰی مراد لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تم ہم پر ہنس رہے ہو مگر

{۱۱۵} (کبیر ۶، الجزء السابع عشر/۳۴۵) فالحری بحال من لایمیل الی الفضول ان یؤمن بانّه علیه السلام صنع الفلك حسبما قصّ الله تعالیٰ فی کتابه۔ (روح المعانی ۷، ۱۲/۷۵)

{۱۱۶} انهم کانوا یقولون له: لوکان صادقا فی دعواك لکان إلٰهك یغنیك عن هذا العمل الشاق (کبیر ۶، الجزء السابع عشر/۳۴۵)

{۱۱۷} روی انهم قالوا له: أتحوّلت نجارا بعد ان کنت نبیًّا؟ (تفسیر المراغی ۷، ۱۲/۱۲/۳۴)

{۱۱۸} "فانّا نسخر منکم" مما أنتم فیه من الاعراض عن استدفاعه بالایمان والطاعة۔ (روح المعانی ۷، ۱۲/۷۵)

عنقریب جب تم دنیا میں طوفان میں غرقاب ہوگے اور آخرت میں عذاب میں مبتلا ہوگے تو ہم تم پر ہنسیں گے۔{۱۱۹}

اس سے معلوم ہوا کہ جواب بالمثل سے انتقام لینا مکارمِ اخلاق کے منافی نہیں۔{۱۲۰}

﴿۳۹﴾......بس ذرا پردہ گرنے کا انتظار کرو، دنیا میں پانی کی غرقابی کا عذاب کس کے لیے ہے{۱۲۱} اور آخرت کا دائمی عذاب کس کا مقدر ہے، یہ سب نکھر کر سامنے آجائے گا۔

﴿۴۰﴾......مہلت کی مدّتِ مدید ختم ہوئی اور وہ وقتِ مقررہ آپہنچا جس کا انتظار تھا، تو یہ منظر سامنے آیا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ ''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور زمین سے پانی ابلنے لگا'' تنور سے کیا مراد ہے؟ روٹیوں کا تنور یا فقط روئے زمین؟ نیز یہ کہ یہ تنور کہاں واقع تھا، کوفہ، شام یا ہند میں؟ (نمعلوم ہند سے ہندوستان مراد ہے یا عراق کا ایک مقام) یہ وہ ساری باتیں ہیں جو قیاس اور گمان پر مبنی ہونے کی وجہ سے یقینی نہیں، قرآن نے ان باتوں کی تصریح نہیں کی اس لیے بغیر رہنمائی کے کسی مقام کے تعین پر اصرار کرنا بہتر نہیں۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

''اگرچہ ''التَّنُّوْرُ'' کے معنیٰ میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں لیکن حقیقت میں یہ کوئی اختلاف نہیں، اس لیے کہ طوفان کی ابتداء ہوئی تو زمین کی ہر چیز سے پانی ابلنے لگا چاہے وہ سطحِ زمین ہو یا کوئی تنور! اور اس بارے میں جتنے اقوال ہیں ان سے یہی بات سمجھ آتی ہے کہ پانی کا یہ ابلنا عذاب کی علامت تھا۔{۱۲۲}

بہرحال اب قومِ نوح پر عذاب کی آمد آمد ہے، آسمان کے دھانے کھل گئے، زمین کے پردے پھٹ گئے، اور سطحِ زمین پر چہار سو پانی ہی پانی ہے، تورات کی غلط بیانی دیکھیے کہ ایک بات کہنے کے بعد دوسری جگہ خود ہی اس کی تکذیب کرتی نظر آتی ہے، طوفانِ نوح کی مدت کے بارے میں تورات، سفرِ تکوین، باب ۷، آیت ۱۷ میں ہے:

''اور طوفان چالیس دن زمین پر رہا''

اس کے بعد ''تکوین باب ۷، ہی کی آیت ۲۴ میں لکھا ہے:

''اور پانی کی باڑھ ڈیڑھ سو دن تک زمین پر رہی۔''{۱۲۳}

{۱۱۹} ''فانّا نسخرمنکم'' یعنی فی المستقبل (کشاف ۲/۳۷۲)

{۱۲۰} (بیان القرآن حصّہ اوّل، جلد۵/۴۶)

{۱۲۱} والمراد بذلك العذاب الغرق (روح المعانی ۷،۱۲/۷۶)

{۱۲۲} فهذه الاقوال تجتمع فی ان ذلك علامة (قرطبی ۹/۳۲)

{۱۲۳} (عہدعتیق/ص ۸-۹ مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال، ۱۹۵۸ء)

طوفان کی علامت دیکھ کر حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں جانوروں کا ایک ایک جوڑا سوار کر لیا یعنی وہ جانور جو نر اور مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لیے تمام دریائی جانور اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادّہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض نکل گئے۔

اس حوالے سے تورات میں کیا لکھا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے:

''سب پاک جانوروں میں سے سات سات نر اور مادہ اور ناپاک جانوروں میں سے دو دو نر اور مادہ لے۔'' {۱۲۴}

یہ تصریحات بائبل ہی کا خاصہ ہیں، قرآن کا دامن ان سے پاک ہے، یہ سچی کتاب مقصد کی بات ذکر کرتی ہے جس سے موعظت وعبرت کا کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہو، واقعات کی جزئیات اور غیر ضروری تفصیلات بیان نہیں کرتی۔

﴿وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ کشتی میں سوار ہونے والوں میں آپ کے مومن اہل وعیال تھے، آپ کی کافرہ بیوی جس کا نام ''واہلہ'' تھا وہ اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والا کنعان، یہ دونوں طوفان میں غرق ہوئے۔

﴿إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ سے یہی دونوں مراد ہیں۔ {۱۲۵} استثنیٰ کو اس لیے مجمل رکھا گیا تا کہ صراحتاً بیوی اور بیٹے کا نام لینے سے آپ علیہ السلام کا دل آزردہ نہ ہو۔

﴿وَمَنْ آمَنَ﴾ اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان نوح سے باہر کے کچھ لوگ بھی ایمان لا چکے تھے، اگر چہ قرآن نے بتا دیا کہ ان کی تعداد زیادہ نہ تھی بلکہ بہت کم تھی، اس تعداد کا تعین بھی قرآن نے نہیں کیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کی تعداد اسّی (۸۰) منقول ہے {۱۲۶} اس کے علاوہ ۷۸ اور ۷۹ کی تعداد کے اقوال بھی ہیں {۱۲۷} لیکن قرآن یا صحیح حدیث کی تعیین کے بغیر کسی بھی عدد کا قول محض تخمین وگمان ہی ہوگا۔ {۱۲۸}

﴿۴۱﴾ ......طوفان کی علامات شروع ہوتے ہی حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مؤمن عیال اور متبعین کو کشتی میں سوار ہونے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اب اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کی قدرت اور اس کے حکم ہی سے ہوگا {۱۲۹} اس لیے

{۱۲۴} (عہد عتیق، سفرِ تکوین، باب ۷، آیت ۲/ص ۸۔ سوسائٹی آف سینٹ پال، ۱۹۵۸ء)

{۱۲۵} قال الضحاك: أرادا ابنه وامرأته (كشاف ۲/۳۷۳) فالمراد ابنه وامرأته وكانا كافرين۔ (كبير ۶، ۱۷/۳۴۸)

{۱۲۶} وكانوا ثمانين انسانا (تنوير المقباس من تفسير ابن عباس/۲۳۷)

{۱۲۷} قيل: ثمانية و سبعين وقيل والرواية الصحيحة انهم كانوا تسعة وسبعين (روح المعانى ۷، ۱۲/۸۲)

{۱۲۸} ولم يبيّن الله ورسوله لنا عددهم فحصره فى عدد معيّن من قبيل الحدس والتخمين (تفسير المراغى ۱۲/۳۷)

{۱۲۹} اى بقدرته أو بامره أو باذنه۔(روح المعانى ۷، ۱۲/۸۵)

کہ جب بپھری ہوئی لہریں اٹھتی ہیں تو ان میں انسانوں کی قوتِ مدافعت ختم ہوجاتی ہے اور وہ سرکش لہروں کے حوالے ہوجاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کشتی پر سوار ہوتے وقت اس دعا کا پڑھ لینا میری امت کے لوگوں کے لیے غرقابی سے بچاؤ کا ذریعہ ہے:

"بسم اللہ الملک ماقدروا اللہ حق قدرہ بسم اللہ مجرھا و مرسٰھا انّ ربّی لغفورٌ رّحیم"{۱۳۰}

اگر زائد حصّہ یاد نہ ہو تو قرآنی آیت والا حصہ ہی کافی ہے۔

یہ اسلامی تعلیمات کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر حال میں انسانی فکر و شعور میں یہ بات بٹھاتی ہیں کہ انسان قدم قدم پر اللہ کا محتاج ہے، وہ اپنی ذات میں کچھ نہیں اور حالات کی شدت و حدت کے مقابلے کا اس کو یارا نہیں، کشتی میں سوار ہونے کا موقع ہی دیکھ لیجیے کہ ایک مومن نہ صرف یہ کہ اس کے ذریعے جسمی مسافت طے کرتا ہے بلکہ عالمِ روحانی سے بھی روشناس ہوجاتا ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ جملہ لا کر بتادیا کہ ہماری نجات محض اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے ہے، ورنہ اگر وہ ہمیں ایمان کی توفیق نہ دیتا تو ہم بھی قوم کے ساتھ غرق ہوجاتے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس جملہ پر ایک شبہ ظاہر کر کے پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے۔ شبہ یہ ہے کہ:

عین اس وقت جب طوفان اپنے عروج پر تھا اور ہلاکت کا وقت تھا، ایسے وقت میں یہ جملہ بے جوڑ سا لگتا ہے۔

جواب میں فرماتے ہیں کہ اس چیز کا اندیشہ تھا کہ بچ جانے والوں کے دل میں یہ خیال آئے کہ ہم اپنے علم اور عبادت کی وجہ سے بچ گئے، اس لیے فرمایا "اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" اگر نجات حاصل ہوئی ہے تو وہ محض اللہ کی رحمت اور کرم کا نتیجہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔{۱۳۱}

حکمت و ہدایت:

۱......کفریہ نظریات پر جمے رہنے کا انجام عذابِ الٰہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔(۳۶)

۲......دلائل کے ساتھ حق بات سمجھانے کے باوجود بھی اگر کوئی نہیں مانتا تو اس کے بارے میں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہدایت اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

۳......اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ہلاکت کی پیشگی اطلاع اس لیے دی تاکہ اچانک عذاب سے آپ پریشان نہ ہوجائیں اور یہ آپ پر اللہ کا خصوصی انعام تھا۔(۳۶)

{۱۳۰} (بحوالہ ابن کثیر ۲/۵۸۱)

{۱۳۱} (کبیر ۶، الجزء السابع عشر/ ۳۴۹)

۴......سب سے پہلی کشتی سیدنا نوحِ علیہ السلام نے تیار کی، جو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے بنائی گئی تھی۔(۳۷)

۵......بدفطرت لوگوں نے ہمیشہ دین کے داعیوں کا مذاق اڑایا ہے۔(۳۸)

۶......اللہ اپنے وعدے پورے کر کے دکھاتا ہے، چاہے وہ عذاب کا وعدہ ہو یا انعام کا۔(۳۹)

۷......اللہ ایمان والوں کو اپنے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔(۴۰)

۸......آیت (۴۱) سے علماء نے ہر کام کی ابتداء ''بسم اللہ'' سے کرنے پر استدلال کیا ہے۔

طوفانِ نوح کی انتہا

﴿۴۲......۴۷﴾

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ

اور وہ لیے جا رہی تھی ان کو لہروں میں جیسے پہاڑ، اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے، اے بیٹے!

ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ۝ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ

سوار ہو جا ساتھ ہمارے اور مت رہ ساتھ کافروں کے ۝ بولا جا لگوں گا کسی پہاڑ کو جو بچا لے گا مجھ کو پانی سے کہا کوئی

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ۝

بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے مگر جس پر وہی رحم کرے اور حائل ہوگئی دونوں میں موج پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں ۝

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ

اور حکم آیا اے زمین! نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور کشتی ٹھہری

عَلَى الْجُودِيِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ

جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا کہ دور ہو قوم ظالم ۝ اور پکارا نوح نے اپنے رب کو کہا اے رب!

إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ۝ قَالَ

میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے ۝ فرمایا

يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ

اے نوح! وہ نہیں تیرے گھر والوں میں اس کے کام ہیں خراب سو مت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں

إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ

میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو کہ نہ ہو جائے تو جاہلوں میں ۝ بولا اے رب! میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ پوچھوں تجھ سے جو

لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ؀

معلوم نہ ہو مجھ کو اور اگر تو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے تو میں ہوں نقصان والوں میں O

تسہیل: اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی، تب نوح علیہ السلام نے اپنے اس بیٹے کو آواز دی جو ان سے الگ چل رہا تھا، اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں کا ساتھ مت دو O اس نے جواب دیا، میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا جو مجھے غرق ہونے سے بچالے گا، نوح علیہ السلام نے فرمایا، آج اللہ کے حکم سے کوئی نہیں بچا سکتا، ہاں! جس پر اللہ رحم کرے وہی بچ سکتا ہے، اسی اثناء میں ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے غرق ہو گیا O جب کفار غرق ہو گئے تو اللہ کی طرف سے حکم آ گیا اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان! تو تھم جا، چنانچہ پانی جذب ہو گیا اور قصہ ختم ہو گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو O بیٹے کے ڈوبنے سے پہلے نوح علیہ السلام نے اپنے رب کی بارگاہ میں التجا کی اے میرے رب! آپ نے میرے گھر والوں کو بچانے کا وعدہ فرمایا تھا اور آپ کا ہر وعدہ سچا ہے، میرا یہ بیٹا بھی میرے اہل خانہ میں سے ہے، میں اپنا مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش کرتا ہوں کیونکہ آپ سب سے بڑے حاکم ہیں O اللہ نے فرمایا اے نوح! یہ تمہارے ان اہلِ خانہ میں سے نہیں ہے جن کی نجات کا وعدہ کیا گیا تھا کیونکہ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں، لہٰذا تم مجھ سے ایسی چیز کی درخواست نہ کرو جس کی حقیقت کا تمہیں علم نہیں ہے، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں ایسے سوالات کی وجہ سے جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ O نوح علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ آئندہ میں آپ سے کوئی ایسی درخواست کروں جس کی حقیقت کا مجھے علم نہ ہو اور جو غلطی مجھ سے ہو چکی وہ معاف فرما دیجیے، اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا O

﴿۴۲﴾...... کشتی نوح پہاڑوں جیسی بلند موجوں کے درمیان ہچکولے کھا رہی ہے، پانی کی سطح اس قدر بلند ہے کہ بلند سے بلند وادی اور ٹیلہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا، اتنے میں حضرت نوح علیہ السلام کی نظر کنعان پر پڑتی ہے، اسے دیکھتے ہی پدری شفقت جاگ اٹھتی ہے، آپ اسے ہلاکت سے حفاظت کی دعوت دیتے ہیں، قرآن نقشہ کھینچتا ہے:

﴿وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ﴾ نوح علیہ السلام دور کنارے پر کھڑے بیٹے سے بڑی شفقت سے {۱۳۲} فرماتے ہیں:

"اے بیٹا! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں میں سے نہ ہو جا۔"

بعض مفسرین کا قول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کا مشرک ہونا معلوم تھا مگر انہوں نے سمجھا کہ شاید اس ہولناک طوفان کو دیکھ کر ایمان لے آئے، اس لیے اسے اپنے ساتھ سوار ہونے کی دعوت دی لیکن بہت سے محققین جیسے امام ماتریدی وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ منافق تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ

{۱۳۲} "یابُنَیَّ" التصغیر للشفقۃ (بیان القرآن حصہ اول، جلد ۵/۴۷- دیکھیے ملحقات الترجمہ)

دینِ توحید پر ہے، اس لیے اسے سوار ہو جانے کو کہا۔{۱۳۳}

﴿۴۳﴾......﴿قَالَ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ﴾ غافل اور احمق لڑکا اندازہ نہیں کر پاتا کہ طوفان کس قدر شدید ہے، وہ اسے سرسری طوفان سمجھتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ آپ فکر نہ کریں میں پہاڑ پر چڑھ کر طوفان سے بچ جاؤں گا۔

سیدنا نوح علیہ السلام عذاب کی ہولنا کی سے مکمل طور پر واقف تھے، وہ جانتے تھے یہ اللہ کا عذاب ہے جو روئے زمین سے ہر ذی روح کا صفایا کر دے گا، اس لیے آپ نے فرمایا کہ آج بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی، حفاظت کی صورت بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اللہ خود کسی پر رحم فرمائیں۔

﴿وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ باپ بیٹے کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی، کنعان ڈوب کر ہلاک ہو گیا، چشمِ زدن میں قصہ تمام ہوا اور اب...... نہ پکار ہے نہ انکار!

قارئین کرام! ضمناً یہ بات کہتا چلوں کہ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت اس کا کھینچا ہوا نقشہ اپنے تصوّر میں بھی ضرور لائیں، اللہ کی قسم! طوفانِ نوح کی ہیبت ناکی، بپھری موجوں کا نقشہ، ان بلند و مہیب موجوں میں ڈولتی کشتی، ان حالات میں سیدنا نوح علیہ السلام کے جذباتِ پدری، ان تمام اجزاء کی جو تصویر کشی قرآن نے کی ہے اس سے زیادہ اچھی منظر کشی ہو نہیں سکتی۔ ہزاروں صدیاں گزر گئیں کہ طوفانِ نوح نے اس عالم کو لپیٹ میں لیا تھا لیکن قرآن کی تعبیر اتنی جاندار ہے کہ اس ہولناک صورتحال کا تصور کر کے آج بھی ہماری سانس رُک جاتی ہے، اور اس قدر ہیبت طاری ہوتی ہے کہ گویا یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اب اگلا منظر پیشِ خدمت ہے کہ جب یہ طوفان تھم جاتا ہے، تلاطم میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور جو ہونا تھا ہو جاتا ہے، اور آپ قرآن کے انداز میں غور کریں تو محسوس فرمائیں گے کہ جیسے طوفان کی شدت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے ایسے ہی الفاظِ قرآن میں بھی ایک قسم کا ٹھہراؤ اور سکون آ گیا ہے، ذرا تلاوت فرمائیے:

﴿۴۴﴾......﴿وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ﴾ زمین کو حکم ہے کہ اپنا پانی نگل لے اور آسمان کو امر ہے کہ تھم جا! چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے، آسمان صاف ہے، پانی نہیں برسا رہا اور زمین نے نگلا ہوا پانی چوس لیا، قومِ نوح پر کس قدر ہیبت ناک اور غضبناک طوفان آیا کہ اس وقت زمین نے جو پانی اپنے اندر جذب کیا، صدیوں تک اسے نکال کر انسانی ضروریات پوری کی جاتی رہیں۔ اور جو پانی سطحِ زمین پر باقی رہ گیا وہ چشموں اور ندی نالوں کی صورت اختیار کر گیا، سورۂ زمر میں ارشاد ہے:

{۱۳۳} وقيل: انما ناداه لانّه كان ينافقه فظنّ أنّه مؤمن واختاره كثير من المحققين كالماتريدي وغيره وقيل: كان يعلم أنّه كافر الى ذالك الوقت لكنّه عليه السلام ظنّ أنّه عند مشاهدة تلك الاهوال وبلوغ السيل الربى ينزجر عما كان عليه- (روح المعانی۷، ۱۲/۸۸)

﴿فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ﴾{۱۳۴} ''اللہ نے اسے (پانی کو) زمین کے سوتوں میں اتار دیا۔''

﴿وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ﴾ ''پانی جذب ہوگیا اور قصہ ختم ہوگیا'' قومِ نوح کی غرقابی کے بعد اب طوفان کے تمام ذرائع ختم ہوگئے۔

جودی پہاڑ:

﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ﴾ کشتی جودی پہاڑ پر آ ٹھہری...... تورات میں اس بارے لکھا ہے:

''اور ساتویں مہینہ کی سترہویں تاریخ کو کوہِ ارارات پر کشتی ٹھہر گئی۔''{۱۳۵}

مسٹر میتھر پادری اپنی کتاب ''لغاتِ بائبل'' میں ارارات سے متعلق کہتے ہیں:

''ارارات یہ سرزمینِ ملک آرمینیہ کا ایک صوبہ ہے لیکن ملک کے کونسے پہاڑ پر کشتی ٹکی، معلوم نہیں۔''

سکندر کے زمانہ میں بروسس نے بتایا کہ جبالِ جودی کردستان کے پہاڑوں میں اور آرمینیہ کے دکھن کی طرف واقع ہے لیکن اتر کی طرف ایک اور پہاڑ ہے جسے ولایتی لوگ ارارات، آرمینی ے سیس، ترک اگری، داغ یا بہاری پہاڑ اور فارسی کوہِ نوح کہتے ہیں۔

ولیم پنک نے اپنے جغرافیہ میں تحریر کیا ہے کہ شہر اریوان، جو کبھی آرمینیہ کا پایہ تخت تھا اور بالفعل اس کا قصبہ ہے، اس کے پاس کوہِ ارارات واقع ہے جس پر کشتی ٹھہری تھی۔

صاحبِ مراصد کی رائے یہ ہے:

''الجودیّ (بیاء مشدّدة) جبل مطلّ علی جزیرة ابن عمر فی شرقی دجلة من اعمال الموصل استوت علیه سفینة نوح لما نضب المآء''{۱۳۶}

''جودیؔ اس بلند و بالا پہاڑ کا نام ہے جو جزیرۂ ابنِ عمر میں دجلہ کے مشرق کی سمت موصل کے مضافات میں واقع ہے، طوفانِ نوح کا پانی خشک ہوجانے کے بعد اسی مقام پر حضرت نوع علیہ السلام کی کشتی ٹھہری تھی۔''

مفتیِ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب نوّر اللہ مرقدہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے، اس کا محلِ وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطنِ اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرۂ ابنِ عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصّہ کا نام جودی ہے،

{۱۳۴} (الزمر ۳۹/۲۱)
{۱۳۵} (عہدِ عتیق، سفر تکوین، باب ۸، آیت ۴/۹)
{۱۳۶} (بحوالہ تفسیر حقانی ۲/۵۶۹)
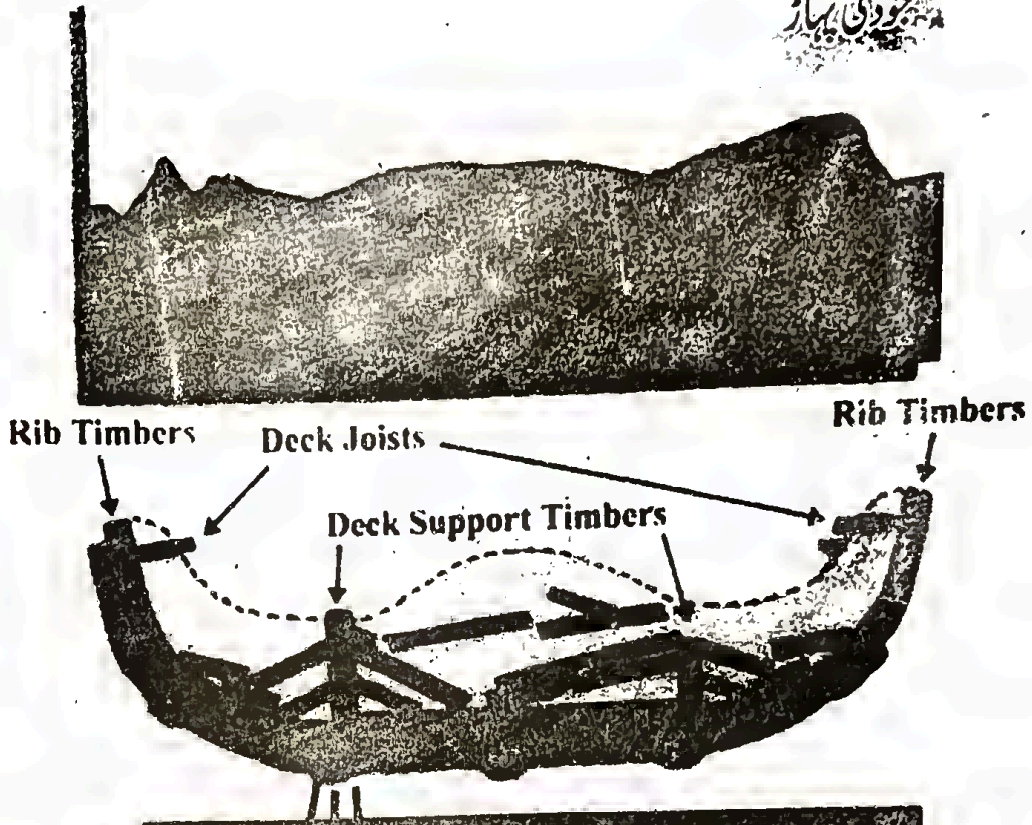
جودی پہاڑ، کشتی نوح کے ٹھہرنے کی جگہ نمایاں۔

اسی کے ایک حصے کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ توراۃ میں کشتی ٹھہرنے کا مقام اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں مگر مشہور قدیم تاریخوں میں یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہری تھی۔'' {۱۳۷}

﴿وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو'' جن لوگوں نے اللہ کی توحید، انبیاء کی رسالت اور بعث بعد الموت کا انکار کیا اور رجوع الی اللہ کی استعداد سے کام نہ لے کر اسے ضائع کیا، ایسے بدبختوں کے لیے ہلاکت اور اللہ کی رحمت سے دوری ہے۔

﴿۴۵﴾...... ﴿وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ﴾ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے بارے میں بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے کہ اے اللہ! آپ کا وعدہ تھا کہ میرے اہل کو ہلاک نہیں کریں گے، میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے؟

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو مومن سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ منافق تھا، اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے، ورنہ اللہ کے نبی سے یہ بات محال ہے کہ وہ پہلے کفار کی ہلاکت کی دعا کریں اور پھر ان میں سے بعض کی نجات کی درخواست بھی کر دیں۔ {۱۳۸}

پھر اللہ نے صراحتاً فرما بھی دیا تھا:

﴿وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾

اگر سیدنا نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کے کفر کو جانتے ہوتے تو ناممکن تھا کہ اس صاف و صریح حکم کی خلاف ورزی کرتے۔

﴿وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ﴾ فرمایا یا اللہ! میں نے بیٹے کی نجات کا سوال ضرور کیا ہے مگر مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ تو حاکموں کا حاکم ہے، تیرے فیصلے اٹل ہیں ان کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر میرے بیٹے کی ہلاکت مقدر تھی تو میں اسے کیسے بچا سکتا تھا؟

﴿۴۶﴾......اس آیتِ کریمہ میں اللہ کے ہاں مقبول ہونے کا معیار بتایا گیا ہے اور وہ انبیاء کی دعوت کے ساتھ نظریاتی ہم آہنگی ہے، خون اور رشتہ کا یہاں کوئی دخل نہیں، اللہ نے اپنے پیغمبر کو جواب دیا کہ آپ کا بیٹا آپ کے دین پر نہیں تھا۔ {۱۳۹} وہ آپ کے ساتھ نظریاتی ہم آہنگی نہیں رکھتا اور نظریاتی تعلق کے سوا کوئی اور قوتِ جامعہ ہمیں منظور نہیں چنانچہ اپنے فاسد نظریات و اعمال کی وجہ سے وہ ہلکان ہوا جن کا ارتکاب وہ تا دمِ آخر کرتا رہا۔ {۱۴۰} ایسا سر تا سر

{۱۳۷} (معارف القرآن ۴/۶۲۷)

{۱۳۸} إذ محال أن يسأل هلاك الكفار ثم يسأل في انجاء بعضهم (قرطبي ۹/۴۲)

{۱۳۹} أي انه ليس من أهل دينك۔ (کبیر ۱۸۰۶/۳۵۷)

{۱۴۰} "انه عمل غير صالح" وأصله "انه ذو عمل فاسد" فحذف "ذو" للمبالغة بجعله عين عمله لمداومته عليه (روح المعاني ۱۲،۷/۱۰۲)

بے عمل شخص آپ کے اہل میں سے کیسے ہوسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایمان سے دامن خالی ہو تو نبی کی قرابت بھی فائدہ نہیں دے سکتی، نبی کریم ﷺ نے اپنے خاندان والوں اور اپنی چہیتی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

یابنی کعب بن لویّ یابنی مرة بن کعب	''اے بنو کعب بن لوی، اے بنو مرۃ بن کعب،
یا بنی عبدشمس ویابنی عبدمناف	اے بنو عبد شمس، اے بنو عبد مناف، اے بنو ہاشم
ویابنی هاشم ویابنی عبدالمطّلب	اور اے بنو عبدالمطلب! اپنے آپ کو نارِ دوزخ
أنقذوا أنفسكم من النّار ویافاطمة	سے بچالو، اور اے فاطمہ! تم بھی آگ سے بچاؤ
أنقذی نفسک من النّار إنّی لا أملک	کا سامان کرلو، میں اللہ کے ہاں تمہارے لیے کچھ
لکم من الله شیئًا.{۱۴۱}	نہ کرسکوں گا۔''

آج کا معاشرہ اپنے آپ کو لاکھ ترقی یافتہ کہے لیکن درحقیقت یہ ایک جاہلی سوسائٹی ہے جہاں زمانہ جاہلیت کی طرح رنگ، وطن اور زبان کے اصنام پوجے جارہے ہیں، دوستی اور دشمنی کی کسوٹی یہ چیزیں قرار پاچکی ہیں اور اسلامی اخوت کا نام باقی نہیں رہا، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب کتاب وسنت کے خلاف اور عصبیت میں شامل ہے، اس عصبیت کے بارے میں جب نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿أن تعین قومک علی الظلم﴾{۱۴۲}	''یہ کہ تُو ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرے۔''

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لیس منّا من دعا إلی عصبیّة ولیس	''جس نے عصبیت کی طرف پکارا وہ ہم میں سے نہیں،
منّا من قاتل علیٰ عصبیّة ولیس منّا من	جس نے عصبیت کی بناء پر قتل وقتال کیا وہ ہم سے نہیں
مّات علیٰ عصبیّة﴾{۱۴۳}	اور جو عصبیت پر مرا وہ ہم میں سے نہیں۔''

اس وقت عصبیت کے ناسور کو دفن کرنے اور اسلامی اخوت کو عام کرنے کی ضرورت ہے، ہم عربی، عجمی، ہندی، سندھی وغیرہ بعد میں ہیں، سب سے پہلے ہم مسلمان ہیں، یہ نظریہ دل ودماغ میں راسخ کرلیجیے اور اپنی استطاعت کی بقدر اسے عام سے عام تر کرنے کی کوشش کیجیے، یہ ہم سب کا اجتماعی فریضہ ہے۔

﴿فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ ''مجھ سے ایسی چیز کی درخواست نہ کرو جس کی حقیقت کا تمہیں علم نہیں ہے۔''

{۱۴۱} (نسائی ۲، کتاب الوصایا/۱۳۱)
{۱۴۲} (ابوداؤد ۲، کتاب الادب/۳۵۱)
{۱۴۳} (حوالہ مذکورہ)

جمہور مفسرین کا مذہب یہی ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کے بارے میں سوال کرنا ان کی ایک اجتہادی لغزش تھی جسے نہ صغیرہ گناہ قرار دیا جاسکتا ہے نہ کبیرہ، لیکن انبیاء کا مقام چونکہ عام لوگوں سے بہت بلند اور ارفع و عالی ہوتا ہے، اس لیے انہیں معمولی سی بات پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت الفاظ میں تنبیہ ہوتی ہے، بعض غیر محتاط اصحابِ قلم نے اس مقام پر جو یہ لکھا کہ نبی اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو کر معیارِ کمال سے گر بھی سکتا ہے اور اس پر مستزاد حضرت نوح علیہ السلام کی طرف جذبۂ جاہلیت کی نسبت، تو یہ نہایت خطرناک اور مقامِ نبوت سے ناآشنائی کی عبرت انگیز مثال ہے۔

﴿اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ﴾ ''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں ایسے سوالات کی وجہ سے جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔'' یہ فیصلہ ہم ازل ہی میں کر چکے ہیں کہ جو ایمان سے محروم رہے گا وہ دنیا میں لعنت کا حقدار ہوگا اور آخرت میں دوزخ کا سزاوار! خواہ اس کا نسب کتنا ہی ممتاز کیوں نہ ہو، لہٰذا اگر آپ بیٹے کے حالات سے ناواقف ہونے یا اس کی محبت میں مغلوب ہو کر اس کے بچاؤ کے لیے اصرار کریں گے تو یہ نادانی کی بات ہوگی۔

﴿۴۷﴾...... اصل حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے بے محل سوال پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا اور رحمت کی درخواست کی۔

اللہ! اللہ! کیا انبیاء کرام علیہم السلام کی حیاتِ مبارکہ کی کوئی گھڑی، کوئی لحہ مناجات اور رجوع سے خالی بھی ہوتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں، وہ تو ہر وقت اس کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

سیدنا نوح علیہ السلام کی شانِ عبودیت دیکھیے کہ محض ایک اجتہادی لغزش جو فہم و تعبیر کی بناء پر ہوئی تو اللہ کے سامنے جبینِ نیاز جھکا دی اور مناجات اور دعا کا ایک اور موقع پالیا، فرمایا:

''اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں'' ...... اور یہ کہ:

﴿وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾ ''اور اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔'' یہ وہی الفاظ ہیں جو سیدنا آدم علیہ السلام کو اللہ نے سکھائے تھے، اس وقت جب وہ جنت سے زمین پر اتر آئے تھے۔ آپ سورۂ اعراف میں پڑھ چکے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جونہی غلطی کا احساس ہوا آپ نے ہاتھ اٹھا دیے:

﴿وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾ {۱۴۴} ''اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم یقیناً خسارے میں رہیں گے۔''

{۱۴۴} (الاعراف ۷/۲۳)

سیدنا نوح علیہ السلام کے الفاظ پر غور فرمائیں کہ آپ نے توبہ تو کی لیکن یہ نہ کہا کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لغزش سے بچنا انسان کے اپنے بس میں نہیں، یہ تبھی ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملِ حال ہو۔

حکمت وہدایت:

۱......بھرتی موجوں کے درمیان کشتیوں اور بحری جہازوں کا چلنا اللہ کی قدرت کی دلیل ہے۔(۴۲)

۲......ایک شفیق والد کا دل اپنی اولاد کی خیرخواہی سے لبریز ہوتا ہے، اگرچہ اولاد نافرمان ہی کیوں نہ ہو۔(۴۲-۴۵)

یہاں ایک سوال ہے، اور وہ یہ کہ آیت (۴۳) میں لفظ "عاصم" لایا گیا ہے حالانکہ اِلَّا مَن رَّحِمَ کے لیے تو "معصوم" کی تعبیر ہونا چاہیے تھی؟ اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ یہاں عاصم بمعنی معصوم ہے، جیسے سورۂ طارق میں ہے:

"خُلِقَ مِن مَّآءٍ دَافِقٍ" یہاں دافق بمعنی مدفوق ہے۔ لیکن مولانا یعقوب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عاصم کو معصوم کے معنیٰ میں لینا تکلف ہے اور بے تکلف تفسیر یہ ہے کہ یہاں دو جملے تھے:

ایک "لاعاصم الیوم الا اللہ" (آج اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہے) دوسرا "لامعصوم الا من رحم" (صرف وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ رحم فرمائے) دونوں کو ملا کر ایک جملہ میں ادا کر دیا گیا: لاعاصم الیوم الا من رحم۔{۱۴۵}

۳......عذابِ الٰہی کے سامنے بڑے سے بڑے پہاڑ بھی خس وخاشاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔(۴۳)

۴......ایمان سببِ نجات ہے اور کفر ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔

۵......والدین کی نافرمانی دنیوی واخروی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

۶...... نسبی شرافت کا ایمان کے بغیر کوئی اعتبار نہیں۔(۴۳)

۷......اللہ عادلِ مطلق ہے، وہ جب کوئی فیصلہ کر لے تو کوئی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، کنعان، جو کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا اپنے کفر کی وجہ سے پانی میں غرق ہوا، سیدنا نوح علیہ السلام اللہ کے محبوب پیغمبر تھے لیکن یہ محبوبیت بھی کنعان کو عذاب سے نہ بچا سکی، اس لیے کہ اللہ کے ہاں حسب ونسب کی بناء پر نہیں بلکہ ایمان واعمالِ صالحہ کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں۔(۴۳)

۸......کائنات کی ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے۔(۴۴)

{۱۴۵} (اشرف التفاسیر ۲/۳۸۲)

۹......جب تک کسی معاملے میں اللہ کا حکم معلوم نہ ہو اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔(۴۶)

۱۰......حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''مشائخ سے دعا کی درخواست کی جائے تو وہ احتیاط سے کام لیں کیونکہ مشتبہ الحال (جس کے حالات کا علم نہ ہو) کے بارے میں دعا سے منع کیا گیا ہے، اور جوامر معلوم الفساد (جس کا فساد ظاہر) ہو اس کی دعا سے نہی بدرجہ اولیٰ مفہوم ہوگی، حضرت رحمہ اللہ کا فرمان یہ بھی ہے کہ:

''ہمارے زمانہ کے مشائخ کا حال یہ ہے کہ ان سے جس امر کے لیے درخواست کی جاتی ہے وہ اس کے لیے دعا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اسی طرح بعض سالکین بعض احوال ومواجید (وجد جیسی کیفیات) کی دعا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا ضرر و نفع کچھ معلوم نہیں۔'' {۱۴۶}

۱۱......ایسا ممکن ہے کہ والدین تو زہد و تقویٰ کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں مگر اولاد سرکش اور اللہ کی باغی ہو، جیسے سیّدنا نوح علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے مگر آپ کا بیٹا کافر تھا۔ (۴۶) ہمارے معاشرے میں بھی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

۱۲......غلطی کے فوراً بعد اس کا اقرار اور پھر اللہ سے معافی کی درخواست، فطرتِ سلیمہ کی دلیل اور انبیاء کی سنّت ہے۔ (۴۷)

قصہ نوح علیہ السلام کی حکمت

﴿۴۸......۴۹﴾

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ

حکم ہوا اے نوح! اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ تجھ پر اور ان فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں، اور دوسرے فرقے ہیں کہ

ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ

فائدہ دیں گے ان کو پھر پہنچے گا ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک O یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف، نہ تجھ کو

اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۭ فَاصْبِرْ ۭ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

ان کی خبر تھی اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے سو تُو صبر کر البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا O

تسہیل: اللہ کی طرف سے حکم ہوا، اے نوح! ہماری طرف سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور تمہارا ساتھ دینے والی جماعتوں پر نازل ہوتی رہیں گی، کشتی سے اتر جاؤ، اور کچھ جماعتیں ایسی بھی ہوں گی جنہیں ہم دنیا میں چند روزہ عیش دیں گے، پھر ان پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آئے گا O اے میرے پیغمبر! یہ قصہ غیب کی ان

{۱۴۶} (بیان القرآن ۵۰۱/۴۸)

خبروں میں سے ہے جو وحی کے ذریعے ہم آپ کو بتاتے رہتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ کو اس کا علم تھا اور نہ ہی آپ کی قوم کو علم تھا، تو آپ صبر کیجیے کیونکہ اچھا انجام صبر اور تقویٰ والوں ہی کا ہوتا ہے O

﴿تفسیر﴾

قصہ کے اختتام پر سیدنا نوح علیہ السلام کے زمین پر اترنے اور آپ پر برکت وسلامتی کے نزول کا ذکر ہے۔

﴿۴۸﴾......﴿قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ﴾ ''اللہ کی طرف سے حکم ہوا، اے نوح! اتر جایئے۔''

اس سے کشتی سے اترنا بھی مراد ہوسکتا ہے اور جودی پہاڑ سے بھی، حکیم الامت رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔{۱۴۷}

چونکہ طوفان کی وجہ سے روئے زمین کا نظام زیروزبر ہو کر رہ گیا تھا، اس لیے اب جب نوح علیہ السلام زمین پر اترنے لگے تو طبعی طور پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب ضروریاتِ زندگی کے ذرائع معدوم ہوں گے تو ہماری بشری ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟ اور ہم کیسے زندہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے فرمایا:

﴿بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ﴾ یعنی اے میرے پیغمبر! میں آپ کو بے یارومددگار تھوڑا ہی چھوڑوں گا بلکہ آپ کے وجودِ مسعود کی برکت سے زمین کی گود سلامتی و برکت جیسی نعمتوں سے بھر دوں گا۔

آفات سے سلامتی، امن اور وسعتِ رزق کے اس وعدۂ الٰہی نے شیخ المرسلین علیہ السلام کے دل کو یقیناً اطمینان کی دولت سے مالا مال کر دیا ہوگا۔

﴿وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ﴾ ''اور تمہارا ساتھ دینے والی جماعتوں پر'' (برکتیں نازل ہوتی رہیں گی) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کشتی میں سوار وہ خوش نصیب مومن ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔{۱۴۸}

سیدنا نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والے مؤمنین میں سے آہستہ آہستہ سب فوت ہو گئے لیکن نسل کسی کی نہ چل سکی، توالد وتناسل کا سلسلہ اس کائنات میں مزید بڑھا تو وہ آپ کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث سے بڑھا اس لیے ''اُمَمٍ'' سے مراد وہی امتیں ہوسکتی ہیں جو ان تینوں سے پوری دنیا میں پھیلیں ورنہ اس وقت کسی اور امت کا وجود نہ تھا۔

{۱۴۷} (بیان القرآن ۵/۱۰۱، ۴۹)
{۱۴۸} "ممن معك" في السفينة من أهل السّعادة (تنوير المقباس/۲۳۶)

سورۂ صٰفّٰت کی یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے:

﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ﴾{۱۴۹} ''اور ہم نے نوح کی اولاد کو ہی باقی رکھا۔''

دیکھا جائے تو برکت وسلامتی کی یہ خوشخبری جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت سیدنا نوح علیہ السلام کو سنائی تھی، قیامت تک آنے والے مومنوں کو شامل ہے{۱۵۰} اس لیے کہ قیامت تک آنے والی قومیں اور امتیں آپ کی اولاد ہی سے تو ہیں، البتہ ایمان والوں کے لیے اگر برکت وسلامتی ہوگی تو جو لوگ نسلِ انسانی میں کافر ہوں گے ان کا کیا بنے گا، فرمایا:

﴿وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ ''کچھ جماعتیں ایسی ہوں گی جنہیں ہم چند روزہ عیش دیں گے پھران پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آئے گا۔'' دنیا میں یہ لوگ خوب خوش عیشی سے زندگی گزاریں گے، نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، لیکن جودوعطا کی یہ بارش اس لیے نہیں ہوگی کہ انہیں اللہ کی رضا حاصل ہے بلکہ یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ آخرت میں ان کے نصیبے میں فقط محرومی ہی محرومی ہوگی، عذاب ہی عذاب ہوگا، آخرت کے یقینی عذاب کے علاوہ کافر کی دنیوی زندگی بھی ایک مستقل عذاب ہوتی ہے، اللہ سے دوری، انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت سے بغاوت، ایمان والوں سے دشمنی، اسلام کے ہر لحہ پھیلتے ہوئے نور کو کم کرنے کی ناپاک کوشش، ناکامی پر جھنجلاہٹ اور مالِ دنیا جمع کرنے میں پاگل پن کی حد تک انہماک!

علامہ بقاعی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں بڑی عمدہ بات فرمائی، لکھتے ہیں کہ:

آیت کے الفاظ کی ترکیب اور بناوٹ کی نزاکت ولطافت دیکھیے کہ جہاں ''برکات وسلام'' کا ذکر ہے وہاں ''متاع'' کا نام ونشان نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے لیے حقیقی خزانہ اخروی نعمتیں ہی ہوں گی، دنیا کے اعزاز و اکرام کی ان کے دل میں تمنا نہیں ہونی چاہیے۔

اور پھر ''سَنُمَتِّعُهُمْ'' کی باری آئی تو ''برکت وسلامتی'' حذف ہوگئی کہ کافر اللہ کے علم وارادہ کے مطابق دنیا کی فانی خوشیاں تو ضرور سمیٹ لے گا لیکن آخرت میں تہی دامن رہے گا۔{۱۵۱}

﴿۴۹﴾...... ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَا إِلَيْكَ﴾ ''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے آپ پر وحی کی ہیں۔''

آخر میں قرآن مجید کا یہ مختصر مگر جامع تبصرہ قرآنی قصص کے مقاصد سمجھنے میں مدد دیتا ہے، چونکہ یہ قصے قرآن مجید میں بار بار آئے ہیں اس لیے ہم ان کے مقاصد درج کیے دیتے ہیں۔

{۱۴۹} (الصّافات ۳۷/۷۷)

{۱۵۰} وقد دخل فی هذا الكلام كل مؤمن ومؤمنة إلى يوم القيامة (نظم الدرر ۳/۵۳۶)

{۱۵۱} (نظم الدرر ۳/۵۳۶)

۱......مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک ''۱۶۴۲ سال'' کا عرصہ تھا جبکہ آنحضرت ﷺ کے زمانۂ نبوت سے شیخ المرسلین کا زمانہ تقریباً ''۴۴۰۰ سال'' قبل کا ہے۔ آپ ﷺ نے چار سو صدی پہلے کا جو واقعہ بلا کم و کاست مشرکینِ مکہ کو سنایا تو اس کے بعد قرآن کے کلام اللہ ہونے پر شبہ کا کیا جواز باقی رہتا ہے؟

۲......ان قصص کا اللہ کی طرف سے وحی ہونا یوں بھی ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو آپ ﷺ کے پاس کوئی ذریعۂ علم تھا نہ ان نصوص کا کوئی ریکارڈ موجود تھا۔

۳......قرآن نے قصص میں مکذبین کے جو اعتراضات نقل کیے ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں، اور ایسے سدا بہار ہیں کہ قیامت تک کے منکرین کے لیے کسوٹی کا درجہ رکھتے ہیں، آپ قرآن کی نظر سے کل کے معاند اور آج کے کافر کی ذہنیت دیکھیں تو میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ ضرور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ اسلام کے قدیم و جدید دشمن ایک ہی گھاٹ سے پانی پینے والے ہیں۔

۴......قصص کے مقاصد میں سے ایک مقصد انبیاء کے نظریہ وعقیدہ کی ہم آہنگی اور یکجہتی بیان کرنا بھی ہوتا ہے، یہ نظریاتی ہم آہنگی ''آدم ثانی'' سیدنا نوح علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ تک تمام انبیاء کرام میں رہی۔

۵......انسانوں کے ذہنوں میں عقیدۂ توحید راسخ کرنا اور انہیں ہر قسم کے شرک سے دور رکھنا بھی قرآنی قصوں کا ایک اہم موضوع و مقصد ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی عاجزی، ان سے شفاعتِ قہری کی نفی، ان کا خود مصائب و آلام میں مبتلا ہونا، ان کے عالم الغیب اور مختارِ کل ہونے کے نظریے کی تردید، یہ سب باتیں عقل والوں کو پکار پکار کر اللہ ہی سے لو لگانے اور غیر اللہ سے اپنی توجہ کو یکسر ہٹا لینے کا درس دیتی ہیں۔

۶......قرآن، قصص کے ذریعے اسلامی اخوت کا پرچار اور عصبیت جیسی لعنت کی نفرت ایمانی قلوب میں بٹھانا چاہتا ہے۔

۷......قرآن ان قصوں کے ذریعے یہ حقیقت بھی سمجھانا چاہتا ہے کہ کفر و اسلام کی جنگ میں بالآخر غلبہ اسلام کو حاصل ہوگا اور شکست کافروں کا مقدر ٹھہرے گی۔{۱۵۲}

اب آیئے آیت کی تفسیر کی طرف!

اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کو غیب کی خبروں میں سے ایک اہم خبر قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے

{۱۵۲} (فی ظلال القرآن ۳/ ۹۵۰)

محبوب! نزولِ وحی سے قبل قصۂ نوح کی ان تفصیلات سے نہ آپ آگاہ تھے نہ آپ کی قوم باخبر تھی، اور اس قصہ کو آپ پر کھولنے سے مقصود آپ کے سامنے سیدنا نوح علیہ السلام کی سیرت کے اہم پہلو اور ملتِ ابراہیمی کے ایک بڑے اصول، صبر کو نمایاں کرنا ہے کہ جیسے انہوں نے ایک طویل عرصہ تک قوم کی طرف سے پہنچنے والی ہر چھوٹی بڑی تکلیف پر صبر کیا، آپ بھی مشرکینِ مکہ کی ہٹ دھرمی دیکھ کر دلبرداشتہ نہ ہوں، آج کے اکڑے ہوئے سروں کو کل آپ اپنے قدموں میں جھکا ہوا پائیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ انبیاء میں پائے جانے کی نفی کرنا واجب ہے یعنی یہ کہ نبی مخلوق ہے، اس کا علم محدود ہے، نہ وہ علیمِ کل ہے نہ قادرِ مطلق! اور ایسا کہنا نبی کی توہین نہیں تعریف ہے۔{۱۵۳}

﴿اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''بے شک نیک انجام متقیوں کے لیے ہی ہے۔''

پہلے صبر کا حکم تھا، اب اس صبر کی علت بیان کی جا رہی ہے{۱۵۴} کہ صبر کی وجہ سے صبر والوں کو اللہ ہمیشہ دنیا و آخرت میں سرخرو فرماتا ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''عاقبة'' اگر بغیر اضافت کے استعمال ہو تو یہ ثواب اور اجرِ خیر کے معنی کے لیے مخصوص ہوتا ہے، جیسے زیرِ تفسیر آیت میں مستعمل ہے، اور اگر یہ اضافت کے ساتھ آئے تو اس میں عقوبت و سزا کے معنی پائے جاتے ہیں{۱۵۵} جیسے قرآن مجید میں ارشادِ باری ہے:

﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ﴾{۱۵۶} ''ان دونوں (شیطان اور اس کے پیروکاروں) کی سزا یہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہوں گے۔''

یہ ایک مثال بطور نمونہ پیش کی گئی ہے ورنہ قرآن میں ایسی دسیوں مثالیں موجود ہیں۔

حکمت و ہدایت:

۱...... برکات و سلامتی کا جو سلسلہ سیدنا نوح علیہ السلام اور آپ کے پیروؤں پر اللہ کی طرف سے شروع ہوا تھا، قیامت تک ایمان والے اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔(۴۸)

{۱۵۳} (بحوالہ معالم العرفان ۹/۴۳۰)

{۱۵۴} وجملة "إن العاقبة للمتقين" علة للصبر المأمور به (التحرير والتنوير ۶، الجزء الثاني عشر/۹۳)

{۱۵۵} "والعاقبة" إطلاقها يختصّ بالثواب...... وبالإضافة قد تستعمل في العقوبة (المفردات/۳۴۰)

{۱۵۶} (الحشر ۵۹/۱۷)

۲......کافر دنیوی اعتبار سے چاہے جتنی ترقی کرے، انجام اس کا دائمی عذاب ہے۔(۴۸)

۳......دنیا کو مقصود بنانا کافروں کا شیوہ ہے، ایمان والوں کے مدِّنظر آخرت ہونی چاہیے۔

۴......قومِ نوح اور مشرکینِ مکّہ میں جو چیز قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی تھی وہ عذاب جلدی لانے کا مطالبہ تھا۔

۵......قصہ نوح اور اسی طرح دیگر انبیائے کرام کے واقعات کا ٹھیک ٹھیک بیان کرنا نبی کریم ﷺ کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔(۴۹)

۶......صبر انتہائی فضیلت والا عمل ہے، اور دشمن کی طرف سے ملنے والی اذیتوں پر صبر کرنے سے اللہ تعالیٰ فتح و نصرت کے دروازے کھول دیتا ہے، سیدنا نوح علیہ السلام نے قوم کی طرف سے پیش آنے والی تکالیف پر صبر کیا تو اللہ نے ان کی مدد فرمائی، اسی طرح ہمارے آقا ﷺ نے مشرکینِ مکّہ کی طرف سے پیش آنے والے مصائب پر صبر کیا اور بالآخر اللہ کی مکمل نصرت شاملِ حال ہوئی اور آپ کفارِ مکّہ پر غالب آئے۔(۴۹)

۷......ایمان اور اعمالِ صالحہ سے متصف افراد کا انجام بہر صورت دائمی کامیابی ہے۔(۴۹)

قصہ حضرت ہود علیہ السلام

﴿۵۰......۶۰﴾

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی ہود کو، بولا اے قوم! بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے تم سب

مُفْتَرُوْنَ ۝ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا

جھوٹ کہتے ہو ○ اے قوم! میں تم سے نہیں مانگتا اس پر مزدوری میری مزدوری اسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر کیا تم

تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱ وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ

نہیں سمجھتے؟ ○ اور اے قوم! گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اسی کی طرف چھوڑے گا تم پر آسمان سے دھاریں اور

مِّدْرَارًا وَّیَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۵۲ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا

زیادہ دے گا تم کو زور پر زور اور روگردانی نہ کرو گناہ گار ہو کر ○ بولے، اے ہود! تو ہمارے پاس

جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۳

کوئی سند لے کر نہیں آیا اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے ٹھاکروں (معبودوں) کو تیرے کہنے سے اور ہم نہیں تجھ کو ماننے والے ○

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوٓءٍ ۗ قَالَ إِنِّيٓ أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوٓا أَنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے ٹھاکروں (معبودوں) نے بری طرح، بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو اور تم گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں

تُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾ مِن دُونِهِ ۖ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ﴿٥٥﴾ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ

ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو O اُس کے سوا، سو برائی کرو میرے حق میں تم سب مل کر پھر مجھ کو مہلت نہ دو O میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رب ہے

مَّا مِن دَآبَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَآ ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٦﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ

میرا اور تمہارا، کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے ہاتھ میں ہے چوٹی اس کی بے شک میرا رب ہے سیدھی راہ پر O پھر اگر تم منہ پھیرو گے

أَبْلَغْتُكُم مَّآ أُرْسِلْتُ بِهِۦٓ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُۥ شَيْـًٔا ۚ إِنَّ

تو میں پہنچا چکا تم کو جو میرے ہاتھ بھیجا تھا تمہاری طرف اور قائم مقام کرے گا میرا رب کوئی اور لوگ نہ بگاڑ سکو گے اللہ کا کچھ،

رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾ وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُۥ

تحقیق میرا رب ہے ہر چیز پر نگہبان O اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور جو لوگ ایمان لائے تھے اس کے ساتھ

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا

اپنی رحمت سے اور بچا دیا ان کو ایک بھاری عذاب سے O اور یہ تھے عاد کہ منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں سے اور نہ مانا

رُسُلَهُۥ وَاتَّبَعُوٓا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٥٩﴾ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ

اس کے رسولوں کو اور مانا حکم ان کا جو سرکش تھے مخالف O اور پیچھے سے آئی ان کو اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن بھی، سن لو!

أَلَآ إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾

عاد منکر ہوئے اپنے رب سے، سن لو! پھٹکار ہے عاد کو جو قوم تھی ہود کی O

ربط: قصۂ نوح علیہ السلام کے بعد قصۂ ہود علیہ السلام ذکر کیا جا رہا ہے، دونوں انبیاء علیہما السلام کی حیاتِ طیبہ میں قدرِ مشترک دین کی دعوت، قوم کی طرف سے تکالیف اور ان کی خودسری و انکار اور بالآخر مومنین کی نجات اور کفار کی ہلاکت ہے۔

تسہیل: اور ہم نے قومِ عاد کی طرف ان کے قومی بھائی ہود کو پیغمبر بنا کر بھیجا، انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! تم صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی بھی معبود ہونے کے لائق نہیں، اس کے سوا تمہارا کسی اور کو معبود بنانا بہتان کے سوا کچھ نہیں O اے میری قوم! میں اپنی دعوت و تبلیغ پر تم سے کسی بھی قسم کا صلہ نہیں مانگتا، مجھے صلہ دینے کا ذمہ تو اس اللہ نے اپنے اوپر طے کر رکھا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، یہ سب کچھ جاننے کے باوجود تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے؟ O اور اے میری قوم! کفر و شرک پر اپنے رب سے استغفار کرو پھر اسی کی طرف متوجہ رہو، وہ تم پر آسمان

سے موسلا دھار بارش برسائے گا اور تمہاری قوت میں مزید اضافہ کر دے گا، اور دیکھو! مجرم بن کر ایمان سے اعراض نہ کرو O قوم نے جواب میں کہا، اے ہود! تم نے ہمارے سامنے اپنی نبوّت پر کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی اور ہم صرف تمہارے کہنے پر اپنے معبودوں کو بھی نہیں چھوڑ سکتے اور تم پر ایمان لانے والے بھی نہیں O ہماری سوچی سمجھی رائے تو بس یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تمہاری دماغی حالت کو متاثر کر دیا ہے، ہود نے کہا، میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اللہ کے سوا ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو O تو تم سب مل کر میرے خلاف جو بھی تدبیر کر سکتے ہو کر لو پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو O میں اللہ پر توکل کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا رب ہے، جتنے بھی جاندار ہیں سب کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے، یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے O اگر میری فہمائش کے باوجود تم اعراض ہی کرتے رہو گے تو اس بارے میں مجھ سے سوال نہیں ہوگا کیونکہ میں وہ پیغام تم تک پہنچا چکا ہوں جسے پہنچانے کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا، میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لا کر بسا دے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے O اور جب ہمارے عذاب کا حکم آ پہنچا تو ہم نے ہود کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے فضل وکرم سے بچا لیا، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں انتہائی سخت عذاب سے بچا لیا O یہ قومِ عاد تھی جس نے محض ضد کی وجہ سے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی اور ان لوگوں کے حکم کی اتباع کی جو ظالم اور ضدّی تھے O ان کی بدعملیوں کے نتیجے میں اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی لگی رہے گی، لوگو سن لو! قومِ عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، یہ بھی سن لو! کہ اس کفر کی وجہ سے قومِ ھود پر اللہ کی لعنت ہوئی O

﴿تفسیر﴾

﴿۵۰-۶۰﴾......سیدنا ھود علیہ السلام اور آپ کی سرکش قوم کے درمیان ہونے والا مکالمہ مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

اللہ کے نبی نے انہیں جن امور کی طرف متوجہ کیا وہ یہ ہیں:

۱......سب سے پہلے آپ نے انہیں توحید کی دعوت دی۔ یہ حقیقت شاید ہی کسی سے مخفی ہو کہ دنیا میں آنے والے تمام انبیاء ورسل کی دعوت کا آغاز توحیدِ باری تعالیٰ سے ہوا، حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی مشرک قوم کو سمجھانے کی سر توڑ کوشش کی کہ یہ پتھر کے بت اور مٹی کی مورتیں نہ صاحبِ اختیار ہیں نہ بندگی و پرستش کا استحقاق رکھتے ہیں۔

۲......اللہ! اللہ! وقت کا نبی، دنیا اور آخرت کی فلاح کا داعی خود سر قوم کو اپنی دعوت کے بے لوث ہونے کا یقین دلاتے

ہوئے کہتا ہے:

''دیکھو! مت سمجھنا کہ میں تم سے اپنی دعوت کے بدلے دنیوی منفعت کا خواہاں ہوں، میں اپنی دنیاوی ضروریات کا کفیل بھی اسی ذات کو سمجھتا ہوں جس سے میں اخروی انعامات اور اجر وثواب کی امید رکھتا ہوں۔''

۳......اس کے بعد آپ نے قوم کو توبہ واستغفار کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر تم قحط سالی سے نجات چاہتے ہو، اپنے ملک کو سرسبز وشاداب دیکھنے کے خواہشمند ہو تو اللہ سے مغفرت طلب کرو اور کفر وشرک سے توبہ کرو۔

اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ رجوع الی اللہ کا سب سے بڑا فائدہ دل کی پاکیزگی اور عمل کی اصلاح ہے، لیکن سیدنا ہود علیہ السلام نے اپنی مشرک قوم کے سامنے اس کے ظاہری فوائد انہیں توبہ واستغفار کی ترغیب کے لیے بیان فرما دیے کہ شاید زبان سے ندامت کا اظہار ان کے ضمیر کو بھی بیدار کر دے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی استغفار کو دافع بلیات نسخہ ارشاد فرمایا، آپ کا ارشاد گرامی ہے:

''من لزم الاستغفار جعل اللہ له من ضيق مخرجا ومن كل همّ فرجا ورزقه من حيث لايحتسب.''{۱۵۷}

''جو شخص استغفار کو لازم پکڑے، اللہ اس کے لیے شدائد ومصائب سے نجات کا انتظام فرماتے ہیں، اس کے غموں کو دور فرماتے ہیں اور اس کے لیے ایسے مقام سے رزق کا انتظام کرتے ہیں جس کا اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔''

قوم پر اس عظیم ناصح کی باتیں شاق گزریں، انہوں نے اللہ کے نبی کو جھوٹا کہا اور ان کی حقانیت وصداقت کے یقینی دلائل دیکھ کر بھی دعوتِ حق سے اعراض ہی کیا، یہ ان کی فکری کج روی کی انتہا تھی کہ وہ پیغمبرانہ دعوت کو ہذیان سمجھتے تھے (العیاذ باللہ)......حضرت ہود علیہ السلام نے ان شوریدہ سروں کی گستاخانہ باتوں کو بڑے صبر وتحمل سے سنا اور جب ان کی اصلاح سے مایوس ہوگئے تو انہیں چیلنج کیا، اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس چیلنج میں بھی یہی حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ وہ بغاوت اور سرکشی چھوڑ کر عبادت واطاعت کی طرف لوٹ آئیں، آپ نے فرمایا:

میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں، اپنے اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں، اگر تم میری دعوت کو لائقِ قبول نہیں سمجھتے تو پھر سب مل کر مجھے کوئی ضرر پہنچانے کی کوشش کرو، مجھے کسی قسم کی مہلت بھی نہ دو فوراً یہ کام کر دکھاؤ، کیا تم اور تمہارے خودساختہ معبود اللہ کے حکم کے بغیر ایسا کر سکتے ہیں؟

{۱۵۷} (ابوداؤد ا، کتاب الصلوٰۃ/۲۲۰)

علامہ ابو سعود نے اس موقع ا ہے کہ:

''سیدنا ہو علیہ السلام کا قوم سے یہ خطاب معجزانہ شان رکھتا ہے، ایک طرف آپ تنِ تنہا ہیں اور دوسری طرف پوری قوم اور قوم بھی سرکش اور باغی، ایسے مجمع کے سامنے توحید کا اعلان اور معبودانِ باطلہ کا عجز اور کمزوری بیان کرنا اور انہیں مبہوت کر دینا واقعی کسی ایسی شخصیت کا اقدام ہو سکتا ہے جس کی دل کی گہرائیوں میں ایمان اترا ہوا ہو، اسے اللہ کی نصرت کا یقین ہو اور غیب کے پردوں میں پوشیدہ وعدے اس کے لیے موجود و محسوس کا درجہ حاصل کر لیں۔ {۱۵۸}

اس دوٹوک گفتگو کے ساتھ ہی حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کی قوم کے درمیان مکالمہ ختم ہو گیا، وقتِ جزا آ پہنچا اور قومِ عاد کو نیست و نابود کر کے تاریخ کی گمنام وادیوں میں دھکیل دیا گیا۔

اگر آپ اس واقعہ کو تھوڑی سی توجہ دیں تو محسوس کریں گے کہ اللہ نے قومِ عاد کی ہلاکت کا ذکر اشارۃً کیا لیکن ان کے جرائم بڑی تفصیل سے سامنے لائے گئے، کیوں؟ اس لیے کہ قرآن امتِ اسلامیہ کو ان رذائل سے پاک دیکھنا چاہتا ہے جو گزشتہ قوموں کی دنیوی و اخروی رسوائی اور ذلت کا سبب بنے تھے۔

حکمت و ہدایت:

۱......سیّدنا نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم النبیّین تک تمام انبیاء کی دعوت کا محور ''توحید'' تھا۔ (۵۰)

۲......مشرکین و مبتدعین کا شرعی دلیل کے بغیر غیر اللہ کی عبادت کرنا ''افتراء علی اللہ'' کے زمرے میں آتا ہے۔ (۵۰)

۳......داعی کے لیے ''اخلاص'' بنیادی شرط ہے۔ (۵۱)

۴......استغفار مصائب و آلام سے نجات کا اکسیر نسخہ ہے۔ (۵۲)

۵......اپنے گناہوں سے توبہ کرنا ہر گنہگار پر واجب ہے۔ (۵۲)

۶......زبان سے گناہوں کا اعتراف کرنے سے دل بھی اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ (۵۲)

۷......استغفار سے روحانی پاکیزگی تو حاصل ہوتی ہی ہے، مادی راحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ (۵۲)

۸......تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمان و مکان کے مشرکین نے حق کے مقابلے میں ہمیشہ خودسری کی روش اپنائی۔ (۵۲)

۹......عقیدۂ توحید کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں فقط فطرتِ سلیمہ کا وجود اور ضمیر کی بیداری شرط ہے۔

۱۰......قدیم مشرکین ہوں یا جدید جہلاء، انہوں نے ہمیشہ حق والوں کے مصائب کو ''غیر اللہ'' کی تردید کا نتیجہ سمجھا ہے۔ (۵۴)

{۱۵۸} (ارشاد العقل السلیم لمزایا القرآن الحکیم ۲۱۸/۴)

۱۱......جس کے دل میں عقیدۂ توحید رچ بس جائے وہ حق بات کا اظہار بے باکی سے کرتے ہوئے مخالفین کی عددی کثرت کو خاطر میں نہیں لاتا۔(۵۵)

۱۲......اہلِ ایمان کا مؤقف کفار کے مقابلے میں ہمیشہ یکساں رہا ہے۔(سیّدنا نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے اپنی قوم کے اعراض وتکبّر کے جواب میں ایک جیسی گفتگو فرمائی۔)

۱۳......کائنات کی کوئی چیز اللہ کے ارادہ وعلم سے باہر نہیں ہے۔(۵۶)

۱۴......سچ اور سچائی کی تائید میں ماننے والوں کا اپنا فائدہ ہے کہ وہ عذابِ الٰہی سے محفوظ رہتے ہیں اور حق کی مخالفت کرنے والے اپنا ہی نقصان کرتے ہیں کہ وہ رہتی دنیا تک نمونۂ عبرت بن جاتے ہیں۔(۵۷-۵۸)

۱۵......قومِ عاد کے تین بڑے جرائم یہ تھے:

☆ آیاتِ الٰہی کا انکار ☆ اللہ کے رسولوں کی نافرمانی ☆ بغیر دلیل وبرہان کے اپنے جاہل آباء کی تقلید۔(۵۹)

۱۶......تکبّر اور عناد بہت ساری اخلاقی کمزوریوں کا سرچشمہ ہیں۔

۱۷......قصصِ قرآنی کا مقصد صرف تاریخ فہمی نہیں بلکہ یہ ہمارے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں۔

۱۸......حق کا انکار اور اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والوں کے لیے ہلاکت کی دعا کرنا کمال کے منافی نہیں۔{۱۵۹}

قصہ سیدنا صالح علیہ السلام

﴿۶۱......۶۸﴾

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ

اور ثمود کی طرف بھیجا ان کا بھائی صالح، بولا اے قوم! بندگی کرو اللہ کی کوئی حاکم نہیں تمہارا اس کے سوا اسی نے بنایا تم کو زمین سے اور بسایا

الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوْا

تم کو اس میں سو گناہ بخشواؤ اس سے اور رجوع کرو اس کی طرف تحقیق میرا رب نزدیک ہے قبول کرنے والا O بولے اے

يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ

صالح! تجھ سے تو ہم کو امید تھی اس سے پہلے، کیا تو ہم کو منع کرتا ہے کہ پرستش کریں جن کی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادے؟ اور ہم کو تو شبہ ہے

{۱۵۹}(بیان القرآن حصہ اوّل، جلد۵/۵۱)

مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي مِنْهُ

اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا O بولا اے قوم! بھلا دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ مل گئی اپنے رب کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی

رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ ٱللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُۥ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾ وَيَٰقَوْمِ هَٰذِهِۦ

رحمت اپنی طرف سے پھر کون بچائے مجھ کو اس سے اگر اس کی نافرمانی کروں؟ سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے O اور اے قوم! یہ

نَاقَةُ ٱللَّهِ لَكُمْ ءَايَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِىٓ أَرْضِ ٱللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ

اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لیے نشانی سو چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں اور مت ہاتھ لگاؤ اس کو بری طرح پھر تو آ پکڑے گا

عَذَابٌ قَرِيبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا۟ فِى دَارِكُمْ ثَلَٰثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ

تم کو عذاب بہت جلد O پھر اس کے پاؤں کاٹے تب کہا فائدہ اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن یہ وعدہ ہے جو

مَكْذُوبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَٰلِحًا وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْىِ

جھوٹا نہ ہوگا O پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے

يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ ٱلْقَوِىُّ ٱلْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾ وَأَخَذَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ ٱلصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا۟ فِى

بے شک تیرا رب وہی ہے زور والا زبردست O اور پکڑ لیا ان ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں

دِيَٰرِهِمْ جَٰثِمِينَ ﴿٦٧﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا۟ فِيهَآ ۗ أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ﴿٦٨﴾

اوندھے پڑے ہوئے O جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں، سن لو! ثمود منکر ہوئے اپنے رب سے، سن لو! پھٹکار ہے ثمود کو O

تسہیل: اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے قومی بھائی صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا، صالح نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اسی نے تمہیں اس میں آباد کیا لہٰذا اسی سے تم اپنے گناہوں کی معافی مانگو پھر ہمیشہ اسی کی طرف متوجہ رہو، بے شک میرا رب بہت قریب ہے اور بندوں کی دعا قبول کرنے والا ہے O یہ تقریر سن کر قوم نے کہا اے صالح! اس سے قبل ہمیں تم سے بڑی امیدیں تھیں، کیا تم ہمیں ان معبودوں کی عبادت سے منع کرتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں؟ اور جس دین کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کے بارے میں ہمارے دل میں ایسے شکوک وشبہات ہیں جنہوں نے ہمیں تردّد میں ڈال رکھا ہے O صالح نے کہا اے میری قوم! اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے نبوت کی صورت میں خصوصی رحمت بھی عطا فرمائی ہو، اس کے باوجود اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو کون ہے جو مجھے اس کے عذاب سے بچا سکے گا؟ تمہارے غلط مشورے مان کر مجھے نقصان کے علاوہ کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ O اے میری قوم! یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک معجزہ ہے لہٰذا تم اسے اللہ کی زمین پر چل پھر کر کھانے

کے لیے آزاد چھوڑ دو اور اسے نقصان پہنچانے کی نیت سے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ تمہیں فوراً عذاب آ پکڑے گا O قومِ ثمود نے سب کچھ سن لینے کے باوجود اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا تو صالح نے کہا، تم اپنے گھروں میں تین دن مزید بسر کرلو، اس کے بعد اللہ کا عذاب آ کر رہے گا، یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوسکتا O جب ہمارے عذاب کا وقت آ پہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو عذاب سے اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا، اے پیغمبر! بے شک آپ کا رب قوت والا اور ساری مخلوق پر غالب ہے O اور ظالموں کو ایک ہولناک چنگھاڑ نے آلیا جس سے وہ صبح کو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے O گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، دیکھو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا، یہ بھی دیکھو کہ اس کفر کے نتیجے میں وہ لعنت کے حقدار بن گئے O

﴿تفسیر﴾

﴿۶۱﴾ ...... حضرت صالح علیہ السلام نے بھی کلمۂ توحید ہی سے اپنی دعوت کا آغاز کیا جو ہر نبی کی دعوت کی اساس رہا ہے۔

﴿هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ ”اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔“

زمین سے پیدا کرنے کا مطلب یہ کہ زمینی مادہ سے تمہاری تخلیق کی ہے۔{۱۶۰}

﴿وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا﴾ ”اور اسی نے تمہیں اس میں آباد کیا۔“

معلوم ہوا کہ زمین کی آبادی واجب ہے اور اس آبادی میں فصلیں، باغات اور تعمیرِ عمارات سب شامل ہیں۔{۱۶۱}

توحیدِ باری تعالیٰ پر مذکورہ دو دلیلیں دینے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو توبہ واستغفار کی طرف متوجہ کیا۔

﴿إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُجِيبٌ﴾ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دورِ حاضر کے قبر پرستوں کی طرح قومِ صالح بھی بلا واسطہ اللہ کے قرب کو بعید از قیاس تصور کرتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے کسی وسیلے اور واسطے کی ضرورت درکار ہے، اس لیے فرمایا کہ میرا رب قریب بھی ہے اور دعاؤں اور التجاؤں کو سنتا بھی ہے۔

قومِ ثمود کا جواب:

﴿۶۲﴾ ...... چونکہ اعلانِ نبوت سے قبل حضرت صالح علیہ السلام حاجتمندوں کی حاجت براری کرتے، بے کسوں اور ناداروں پر نظر رکھتے اور ان کی ہر ممکن مدد فرماتے تھے، اس لیے قوم نے کہا اے صالح! ہم تو تم سے بڑی بلند

{۱۶۰} نسبهم الى الأرض لأنّ أصلهم وهو آدم خلق من تراب والناس كلهم من آدم عليه السلام۔ (جصاص ۳/۱۶۵)

{۱۶۱} وفيه الدلالة على وجوب العمارة للزراعة والغراس والابنية۔ (جصّاص ۳/۱۶۵)

توقعات رکھتے تھے، لیکن تم تو کچھ انوکھی باتیں کرنے لگے ہو۔ بھلا بتاؤ! اپنے باپ دادوں کی رِیت رسم کو کیسے ترک کر دیں؟

﴿وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ﴾ ''اور جس دین کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو، اس کے بارے میں ہمارے دل میں ایسے شکوک وشبہات ہیں جنہوں نے ہمیں تردّد میں ڈال رکھا ہے۔''

مشرکین کا دعوتِ حق کے بارے میں یہ شبہ کسی دلیل پر مبنی نہ تھا بلکہ محض اس لیے تھا کہ ان کے آباء واجداد متعدد الٰہوں کے سامنے سر جھکاتے تھے۔

﴿۶۳﴾...... قوم کو جب صدائے توحید نامانوس لگی اور انہوں نے اللہ کے نبی کو اس سے روکنے کی کوشش کی تو حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا:

توحید کی حقیقت جان لینے اور اللہ کی رحمت یعنی نبوت {۱۶۲} کے عالی منصب پر فائز ہونے کے بعد دعوتِ توحید میں غفلت یا اللہ کے کسی بھی حکم سے انکار ممکن ہی نہیں اور اگر میں نے (بفرضِ محال) ایسا کیا تو بجز نقصان کے مجھے کیا حاصل ہوگا؟

﴿۶۴﴾...... قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے ان کی صداقت پر دلیل مانگی اور دلیل بھی بڑی عجیب، یعنی ایک اونٹنی جو گابھن بھی ہو، وہ سامنے والے پہاڑ کی چٹان سے ظاہر کر دیں۔

یہ معجزہ ظاہر ہوگیا اور سیدنا صالح علیہ السلام نے انہیں تنبیہ فرمادی کہ اس کی اذیت کے درپے نہ ہونا ورنہ ہلاکت سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

﴿۶۵﴾...... بدقسمتی سے ثمودی اس اونٹنی کے وجود کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور بالآخر اسے ہلاک کر دیا، سیدنا صالح علیہ السلام کو خبر ہوئی تو آپ نے انہیں بتایا کہ اب تمہاری مہلتِ عمر صرف تین دن رہ گئی ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکے گی۔

﴿۶۶-۶۸﴾...... جب وقتِ موعود آپہنچا تو سرکش ثمودیوں سے بڑی ذلت کے ساتھ حیاتِ مستعار چھین لی گئی، رات کے وقت ایک ہیبتناک آواز نے انہیں آلیا اور جو جہاں تھا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ البتہ سنتِ الٰہیہ کے مطابق مؤمنین اس عذاب سے محفوظ رہے، جن کی تعداد علامہ آلوسی نے صرف ۱۲۰ ذکر کی ہے {۱۶۳}

قومِ ثمود اس سرعت سے فنا کے گھاٹ اتری اور ان کا نام ونشان یوں مٹا کہ یوں لگتا تھا جیسے نہ کبھی یہاں کوئی بستی تھی اور نہ کسی بستی کے مکین......!

{۱۶۲} "رحمة"...... نبوّة (بیضاوی ۳/۲۴۳)

{۱۶۳} روی أنه علیه السلام خرج فی مائة وعشرین من المسلمین۔ (روح المعانی ۸،۵/۲۴۹)

حکمت وہدایت:

۱......قومِ ثمود کا انکار دراصل اسی روایت کا تسلسل تھا جو ان کے آباء واجداد سے چلی آ رہی تھی، انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی پرخلوص اور مدلّل دعوت پر اپنے آباء وجداد کی اندھی تقلید کو ترجیح دی، صرف اس لیے کہ حضرت صالح ان کے کنبے اور قبیلے ہی کے ایک فرد تھے جن کی دعوت کو قبول کرنا ان کے خیال میں باعثِ عار تھا، حالانکہ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کی وحدانیت اور اس کے معبود ہونے پر کافی شافی دلائل ان کے سامنے پیش کر دیے تھے۔

۲......گناہوں سے توبہ استغفار کرنا دعا کے جلدی قبول ہونے کا سبب ہے، اس لیے کہ اللہ بندوں کے قریب بھی ہے اور اپنے بندوں پر انتہائی مہربان بھی ہے۔

۳......اللہ تعالیٰ بندوں کے بہت قریب ہے اور ان کی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔(۶۱)

۴......راست بازی اور پاکیزگی کی جو گواہی قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں دی، یہ اخلاقی اوصاف شروع ہی سے ہر پیغمبر کا خاصہ رہے ہیں۔(۶۲)

۵......حق بات کا اظہار کرنے کے بعد داعیٔ حق کو مخالفت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔(۶۲)

۶......تقلیدِ آباء سے عقلِ انسانی جمود کا شکار ہو کر ثابت شدہ حقائق کا انکار کرنے لگتی ہے، عقیدۂ توحید اس جمود کا خاتمہ کر کے انسان کو فکری آزادی عطا کرتا ہے۔

۷......اہلِ باطل کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے، ان کی دعوت قبول کرنے میں سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔(۶۳)

۸......منہ مانگا مطالبہ پورا ہونا ایمان کو مستلزم نہیں، قومِ ثمود نے ایک مخصوص معجزہ کا مطالبہ کیا، اللہ نے وہ معجزہ دکھا دیا مگر بدبخت ایمان سے محروم ہی رہے۔(۶۴)

۹......انابت (اللہ کی طرف رجوع) کے بغیر بڑے سے بڑا معجزہ بھی دلوں کی ظلمت دور کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہوتا ہے، چٹان سے گابھن اونٹنی کا نکلنا بہت عجیب اور بڑا عظیم معجزہ تھا مگر ضدی لوگوں پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔(۶۴)

۱۰......آیت (۶۵) سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ تین دن حکمِ اقامت سے خارج ہیں۔{۱۶۴} لہٰذا اس مدت میں نماز قصر کی جائے گی۔

۱۱......انبیائے کرام علیہم السلام کے اپنی قوموں سے کیے گئے وعدے ہمیشہ صحیح اور سچے ثابت ہوئے، حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے تین دن کے بعد اللہ کے عذاب کا وعدہ فرمایا تھا، چنانچہ تین دن گزرنے کے بعد چوتھے دن اللہ

{۱۶۴} استدلّ علماؤنا بارجاء اللہ العذاب عن قوم صالح ثلاثة ایام...... لان الثلاثة الأیام خارجة عن حکم الإقامة۔ (قرطبی ۹/۵۴)

کا عذاب نازل ہو کر رہا۔ (۶۵)

۱۲......مومنوں کو عذاب کی گرفت سے بچانا اور مشرکین کو نیست و نابود کرنا اللہ کے عدل کا تقاضا ہے۔ (۶۶)

۱۳......انبیاء کی دعوت سے اعراض اور کفر و شرک کی وجہ سے قومِ ثمود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور وہ اللہ کی لعنت اور پھٹکار کے مستحق ٹھہرے۔ (۶۷-۶۸) سرکش اقوام کے بارے میں آج بھی اللہ کی یہی سنت ہے اور قیامت تک یہ سنت برقرار رہے گی۔

قصہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام

﴿۶۹......۷۶﴾

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ

اور البتہ آ چکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر، بولے سلام، وہ بولا سلام ہے، پھر دیر نہ کی لے آیا ایک

حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ

بچھڑا تلا ہوا O پھر جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا وہ بولے مت ڈر! ہم بھیجے

اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ

ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی O اور اس کی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی اس کو اسحاق کے پیدا ہونے کی اور

اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ

اسحاق کے پیچھے یعقوب کی O بولی اے خرابی، کیا میں بچہ جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں اور یہ خاوند میرا ہے بوڑھا؟ یہ تو ایک

عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ

عجیب بات ہے O وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے؟ اللہ کی رحمت ہے اور برکتیں تم پر اے گھر والو، تحقیق اللہ ہے

حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ

تعریف کیا گیا بڑائیوں والا O پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اس کو خوشخبری، جھگڑنے لگا ہم سے

قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ

قومِ لوط کے حق میں O البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا O اے ابراہیم! چھوڑ یہ خیال، وہ تو آ چکا

قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

حکم تیرے رب کا اور ان پر آتا ہے عذاب جو لوٹایا نہیں جاتا O

تسہیل: اور ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے آپ کو سلام کیا، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے O پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو آپ کو وحشت سی ہوئی اور ان کے حوالے سے دل میں خوف محسوس کیا، فرشتوں نے کہا آپ کسی طرح کا خوف نہ کیجیے، ہمیں قومِ لوط کی طرف بھیجا گیا ہے O اس گفتگو کے دوران ابراہیم کی بیوی قریب ہی کھڑی تھی، وہ سن کر ہنس پڑی تو ہم نے اسے ان فرشتوں کے ذریعے اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری سنائی O اس نے کہا ہائے ہائے! کیا میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا حالانکہ میں بھی بڑھیا ہوں اور میرا شوہر بھی سن رسیدہ ہے؟ واقعی یہ بڑی عجیب بات ہے O فرشتوں نے کہا کیا تم اللہ کے فیصلے پر تعجب کرتی ہو؟ جبکہ اس خاندان پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہی رہتی ہیں، بلاشبہ اللہ تعریف کے لائق اور بڑی شان والا ہے O پھر جب ابراہیم کے دل سے خوف جاتا رہا اور انہیں خوشخبری بھی مل گئی تو وہ قومِ لوط کے بارے میں ہمارے فرشتوں کے ساتھ بحث کرنے لگا O بے شک ابراہیم بڑے بردبار، بڑے نرم دل اور بات بات میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے O اے ابراہیم! قومِ لوط کے بارے میں سفارش نہ کرو، ان سے متعلق تمہارے رب کا حکم آ چکا، ان پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا O

تفسیر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ سورۂ ذاریات میں اپنی واقعی ترتیب کے ساتھ موجود ہے، قرآن کے طرزِ بیان سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں یہ واقعہ قصۂ لوط کی تمہید کے طور پر ذکر ہے، اس لیے کہ ان دونوں قصوں میں کئی اعتبار سے ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔

﴿۶۹﴾ ...... یہ فرشتے جن کی تعداد تین سے لے کر بارہ تک بیان کی گئی ہے {۱۶۵} قومِ لوط کی تباہی کی غرض سے نازل ہوئے تھے، لیکن انسانی شکل وصورت میں پہلے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے، آپ انہیں آدم زاد مہمان سمجھ کر بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لے آئے، اگر آپ کو علم ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ ایسا نہ کرتے۔ {۱۶۶}

﴿۷۰-۷۶﴾ ...... لیکن جب ان کی بے رغبتی دیکھی تو خوف دامن گیر ہوا، اس لیے کہ اس وقت کے رسم ورواج کے مطابق جو شخص کسی کے گھر کا کھانا کھا لیتا تو اہلِ خانہ کے ساتھ کسی قسم کی برائی نہیں کرتا تھا {۱۶۷} چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کی نیت پر شک ہوا کہ کہیں یہ کسی جرم یا دشمنی کے ارادے سے نہ گھس آئے ہوں۔

{۱۶۵} روی عن ابن عباس انهم كانوا اثنى عشر ملكا...... وفی روایة ابن عباس وابن جبیر انهم ثلاثة...... (روح المعانی ۷، ۱۲/۱۳۸-۱۳۹)

{۱۶۶} قال الطیبی　لوعرفهم بانهم ملائكة لم یحضر بین ایدیهم الطعام۔ (روح المعانی ۷، ۱۲/۱۴۳)

{۱۶۷} وكانوا إذا رأوا الضیف لا یأكل ظنوا بهم شرًّا۔ (قرطبی ۹/۵۸)

خوف کے آثار دیکھ کر فرشتوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سامنے وضاحت کردی کہ آپ کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ نہ کیجیے، ہم تو قومِ لوط کی تباہی کے لیے آئے ہیں، آپ کو تو یہ بشارت سنانا مقصود ہے کہ اللہ آپ کو ''اسحاق'' نامی ایک فرزندِ ارجمند سے نوازیں گے اور ان کے ہاں ایک فرزند ''یعقوب'' نام کا ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عمر کے ۱۰۰ ویں یا ۱۲۰ ویں سال میں داخل ہو چکے تھے، آپ کی زوجۂ مطہرہ سیّدہ سارہ کی عمر نوّے یا ننانوے برس تھی، {۱۶۸} ظاہری حالات کے پیشِ نظر اولاد کی امید باقی نہ رہی تھی، ایسے میں دوہری خوشخبری (بیٹے اور بیٹے کے بیٹے یعنی پوتے) اور فرشتوں کی زبانی اپنی سلامتی کی خبر سن کر {۱۶۹} حضرت سارہ فرطِ مسرّت سے ہنس پڑیں اور تعجب سے پوچھنے لگیں، کیا اس حالت میں ہمارے ہاں اولاد ہوگی جبکہ ہم دونوں بڑھاپے کی آخری منزل پر پہنچے ہوئے ہیں؟

﴿۷۳﴾......حضرت سارہ کا تعجب دیکھ کر فرشتوں نے اظہارِ حیرت کیا کہ پیغمبر کے گھر میں رہتے ہوئے اور معجزات و کرامات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اس عمر میں اولاد کے حصول پر حیرت کیا معنیٰ؟ اللہ کے لیے یہ امر کیا مشکل ہے وہ جب کسی کو نوازنے کا فیصلہ کرلے تو نواز ہی دیتا ہے، چاہے ظاہری اسباب مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔

﴿اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ پیغمبر کی ازواج بھی اہلِ بیت میں داخل ہیں {۱۷۰} اور یہی اہلسنّت والجماعت کا مذہب ہے۔

جو لوگ اہلِ بیت کا مصداق صرف سیدنا علی المرتضیٰ، سیدہ فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو قرار دیتے ہیں وہ شاید قرآنِ کریم میں غور نہیں کرتے اور لغتِ عرب کا مطالعہ نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سمیت تمام ازواجِ مطہرات آپ کے اہلِ بیت میں سے ہیں۔

﴿۷۴-۷۵﴾......حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ کے بھیجے ہوئے قاصدوں کی حقیقت معلوم ہوئی کہ یہ قومِ لوط کی ہلاکت کے لیے آئے ہیں، تو اپنی فطری نرم خوئی کے سبب انہوں نے فرشتوں سے بحث شروع کردی، یہ عرض معروض کیا تھی؟ اس کی تفصیل کے بجائے قرآن نے اللہ کا یہ حکم ذکر کردیا:

﴿۷۶﴾......اے ابراہیم! اس معاملے کو جانے دو! اللہ کا حکم اٹل ہوتا ہے، قومِ لوط کی تباہی کا وقت آچکا، اب تقدیم و تاخیر ممکن نہیں، قومِ لوط ضرور ہلاک ہوگی البتہ ملتِ حنیف کے پیرو حضرت لوط اور آپ کے متبعین آپ کی بیوی کے ماسوا، اللہ کے عذاب سے مامون رہیں گے۔

{۱۶۸} قال مجاهد: كانت بنت تسع وتسعين سنه، وقال ابن اسحق: كانت بنت تسعين سنة...... وقيل: كان ابراهيم ابن مائة وعشرين سنة وقيل: ابن مائة۔ (قرطبی ۹/۶۲)

{۱۶۹} "فضحكت" لكما حصلت البشارة بزوال الخوف فقد حصلت البشارة ايضًا بحصول الولد (کبیر ۶، ۱۸/ ۳۷۴...... فخر المفسرین امام رازی رحمہ اللہ نے اس توجیہ کو سب سے عمدہ اور صحیح کہا ہے۔)

{۱۷۰} يدلّ علىٰ ان ازواج النبی ﷺ من أهل بيته۔ (جصاص ۳/۱۶۶)

ابراہیم علیہ السلام
ابوالانبیاء — خلیل الرحمٰن
قریباً 1800 ق م
اناطولیہ (ترکی)
بحیرۂ قزوین (بحیرۂ خزر)
جھیل وان
جھیل اورسیہ
طبرستان
فارس (ایران)
خلیج فارس
صحرائے دھناء
جزیرہ نمائے عرب
نجد
صحرائے نفود
صحرائے شام
شام
جزیرہ
دریائے فرات
دریائے دجلہ
دریائے کارون
حران
نینویٰ
حلب
دمشق
قبرص
بحیرۂ روم
بیت المقدس
الخلیل
ایلہ
سیناء
اتت تاوی (جیزہ کے آثار)
فیوم
مصر
طیبہ (الاقصر)
فراعنہ
صحرائے نوبیہ
دریائے نیل
افریقہ
بحیرۂ قلزم (بحیرۂ احمر)
یثرب
جدہ
مکہ مکرمہ
بابل
کوثیٰ
اور
عراق
1000
800
600
400
200
کلومیٹر

حکمت وہدایت:

۱......آیت (۶۹) سے انبیاء اور فرشتوں کا باہم سلام کرنا ثابت ہوتا ہے۔

۲......مہمان نوازی کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ جو کچھ گھر میں موجود ہو فوراً مہمان کے سامنے حاضر کر دیا جائے۔ (۶۹) پھر اگر اللہ نے وسعت عطا فرما رکھی ہو تو مزید انتظام بھی کر دے لیکن اگر استطاعت نہ ہو تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشقّت میں نہ ڈالے۔

۳......مہمان نوازی انبیاء کی سنت اور صلحاء کی عادت ہے۔ (۶۹) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه" {۱۷۱} "جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اُسے چاہیے کہ مہمان کی مہمان نوازی کرے۔"

۴......ملاقات کے وقت ہر مسلمان کو سلام کرنا سنّت اور سننے والے پر سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

۵......بعض اوقات بعض حکمتوں کے سبب کاملین کو بھی کشف نہیں ہوتا جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اوّل وہلہ (پہلی مرتبہ) میں ملائکہ کو نہیں پہچانا۔ (۶۹) {۱۷۲}

۶......ابنِ جریر الطبری ؒ نے لکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب فرشتوں کے سامنے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم قیمت ادا کیے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"کھانے کی قیمت یہی ہے کہ اس کے شروع میں اللہ کا نام لیا جائے اور آخر میں اللہ کی حمد وثناء کی جائے۔" {۱۷۳}

اس سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ کھانے کے شروع میں "بسم اللہ" اور آخر میں "الحمد للہ" کہنا پہلی امتوں میں بھی مشروع رہا ہے۔

۷......مہمان سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کھا رہا ہے یا نہیں (البتہ بے چارے کے لقمے گننا اس کی عزتِ نفس اور آدابِ مہمانی کے خلاف ہے۔)

۸......میزبان کی طرف سے پیش کی جانے والی چیز کا قبول کرنا آدابِ معاشرت میں سے ہے۔

۹......اچھی خبر یا خواب پر خوشی کا اظہار جائز ہے، جیسے حضرت سارہ نے فرشتوں سے بیٹے اور پوتے کی خوشخبری سن کر مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔ (۷۱)

{۱۷۱} (بخاری ۲، کتاب الادب/۸۸۹، مسلم ۱، کتاب الایمان/۵۰)
{۱۷۲} (بیان القرآن حصّہ اوّل، جلد۵/۵۵)
{۱۷۳} الطبری بحوالہ منیر ۱۲/۱۱۰)

۱۰......اسباب کے اعتبار سے کسی انہونے واقعے پر تعجب کرنا مسبب الاسباب کے ساتھ کامل یقین رکھنے کے منافی نہیں۔(۷۲){۱۷۴}

۱۱......ملائکہ کا غیر نبی کے ساتھ کلام کرنا ممکن ہے۔(۷۳){۱۷۵}

۱۲......بیوی انسان کے اہلِ بیت میں شامل ہے، انبیاء کی ازواجِ مطہرات بھی ان کے اہلِ بیت میں سے ہیں، ہمارے آقا ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات بشمول سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، آپ کے اہلِ بیت میں سے ہیں۔(۷۳)

۱۳......جن معاملات میں مخلوقِ خدا کی بھلائی نظر آتی ہو ان میں مجادلہ اور لوگوں کی سفارش جائز ہے بشرطیکہ وہ کوئی شرعی حد نہ ہو۔

۱۴......سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قومِ لوط کی ہلاکت کے بارے میں عرض معروض گناہ نہیں، اگر یہ گناہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ''اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ'' فرما کر آپ کی مدح نہ فرماتے، دراصل آپ اپنی فطری نرمی اور حلم و بردباری کے سبب یہ چاہتے تھے کہ اگر قومِ لوط پر آنے والا عذاب مؤخر ہو جائے تو ممکن ہے کہ انہیں ایمان کی توفیق مل جائے۔(۷۴-۷۵)

۱۵......بردباری اور انابت، اللہ تعالیٰ کے مقرّب لوگوں کی صفات ہیں۔(۷۵)

۱۶......اللہ تعالیٰ کے فیصلے اٹل ہیں، وہ کسی کام کا ارادہ کر لے تو اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔(۷۶)

قصہ حضرت لوط علیہ السلام

﴿۷۷......۸۰﴾

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ۝

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا ان کے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں اور بولا آج دن بڑا سخت ہے ۝

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ

اور آئی اس کے پاس قوم اس کی دوڑتی بے اختیار اور آگے سے کر رہے تھے برے کام، بولا اے قوم! یہ میری

هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ

بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو ان سے، سو ڈرو تم اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں کیا تم میں ایک مرد بھی

{۱۷۴} (حوالہ مذکورہ)
{۱۷۵} (بیان القرآن حصہ اوّل، جلد ۵/۵۵)

رَشِيدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿۷۹﴾

نہیں نیک چلن؟O بولے تُو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیںO

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ﴿۸۰﴾

کہنے لگا کاش! مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور ہوتا، یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میںO

تسہیل: اور جب ہمارے فرشتے خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں لوط کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر سخت غمگین اور تنگدل ہو گئے اور کہنے لگے، آج کا دن بڑا سخت ہےO خوبصورت نوجوانوں کی آمد کا سن کر لوط کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور یہ لوگ پہلے ہی سے بدکاریوں میں ملوّث تھے، لوط نے ان کے غلط عزائم دیکھ کر فرمایا اے میری قوم! یہ جو میری بہو بیٹیاں ہیں یہ پاک بھی ہیں اور قضاءِ شہوت کے لیے کافی بھی ہیں، پس اللہ سے ڈرو اور مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی شریف آدمی نہیں ہے؟O انہوں نے جواب دیا، اے لوط! تم جانتے ہو کہ تمہاری بہو بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور جس مقصد کے لیے ہم آئے ہیں وہ تمہیں خوب معلوم ہےO لوط نے کہا اے کاش! میرے اندر تمہارا مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط جماعت ہوتی جو میرا ساتھ دیتیO

تفسیر

انبیائے سابقین کے تذکرہ میں جو ترتیب سورۂ اعراف میں گزر چکی، یہاں (سورۂ ہود میں) بھی اسی ترتیب سے قصص مذکور ہیں۔ البتہ یہاں قصۂ لوط سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی ذکر ہے اور اس کے بعد بطور تتمہ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں یہ جان لیجیے کہ آپ جنوبی عراق کے قدیم شہر "اُور" (UR) میں پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیم کا مولد بھی ہے، یہ شہر دریائے فرات کے کنارے بابل اور نینوا سے بھی پہلے آباد تھا، جہاں یہ شہر آباد تھا آج کل وہاں تل العبید واقع ہے۔

برٹش میوزیم اور امریکا کی فلاڈلفیا یونیورسٹی کے چند ماہرین نے بیسویں صدی کے اوائل میں تل العبید کی کھدائی کا کام شروع کیا اور سات آٹھ سال کی محنت کے بعد یہ شہر نمودار ہو گیا۔ اس بات کا بہت قوی امکان ہے کہ اس شہر کی دریافت سے قرآن مجید اور انبیائے کرام علیہم السلام کے متعدد گوشے اور بابلی تہذیب و ثقافت کے کئی پہلو واضح ہو جائیں گے۔{۱۷۶}

{۱۷۶} (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱۸/۱۴۹ ...... مزید دیکھیے تسہیل البیان ۳/۱۰۳)

﴿۷۷-۷۸﴾......سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ فرشتوں کا مکالمہ بڑے خوشگوار ماحول میں ہوا، اب اس خوش کن منظر کے بعد ایک ہیبتناک منظر سامنے آتا ہے جو سدومیوں کے عبرتناک انجام کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

فرشتے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سے رخصت ہو کر خوبرو اور نوخیز لڑکوں کی صورت میں حضرت لوط علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے، اِدھر قومِ لوط فطرتِ سلیمہ سے متصادم ایک غلیظ بیماری میں مبتلا تھی، وہ عورتوں کے بجائے مردوں سے شہوت رانی کرتے تھے، فرشتوں کی صورت میں حسن و جمال کے پیکر نوجوانوں کو دیکھ کر ان کے غلیظ جذبات بھڑک اٹھے اور حضرت لوط علیہ السلام سے مطالبہ کرنے لگے کہ انہیں ہمارے حوالے کیا جائے، اللہ کے نبی ان کی خوئے بد سے خوب واقف تھے، صورتحال کی نزاکت دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوگئے اور فاسقوں کے اس مجمع کو سمجھانے لگے کہ دیکھو! اور کچھ نہیں تو میری عزت کا خیال کرو، یہ میری بیٹیاں ہیں، ان سے فطری طریقے سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرو، کیا تم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو فہم ودانش سے کام لے؟

﴿هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ﴾ سے مراد قوم کی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں اور خود حضرت لوط علیہ السلام کی صلبی بیٹیاں بھی۔{۱۷۷}

اگر صلبی بیٹیاں مراد لی جائیں تو اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرع اور عرف کا تعارض ہو تو ترجیح شرع کو ہوگی، اپنی لڑکیوں کو خود پیش کرنا عرف کے خلاف تھا لیکن دوسری طرف امرِ شرعی یعنی اپنے مہمانوں کی آبرو کی حفاظت تھی لہٰذا حضرت لوط علیہ السلام نے اس شرعی حکم کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی بیٹیاں نکاح کے لیے پیش کیں۔{۱۷۸}

﴿۷۹﴾......دل سخت اور عقل ماؤف ہو جائے تو انسان بھی اخلاق کی کن پستیوں میں ڈوب جاتا ہے؟ پاکیزگی کس جنس کا نام ہے اور شرم وحیا کس چڑیا کو کہتے ہیں؟ لگتا یوں ہے کہ قومِ لوط کی ڈکشنری سے اخلاقِ حمیدہ کا باب حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا تھا۔ اللہ کے نبی ان سے اپیلیں ہی کرتے رہے کہ تم حسی واخلاقی پاکیزگی اختیار کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے مہمانوں کے معاملے میں بے توقیر نہ کرو، لیکن ان سنگدلوں پر کچھ اثر نہ ہوا، برائی کے ارتکاب کے لیے وہ ایسے بے چین تھے جیسے رعشے کی بیماری میں مبتلا شخص بے اختیار کانپتا ہے، فہمائشِ نبوی کا جواب انہوں نے یوں دیا کہ:

''ہمیں تمہاری بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں،{۱۷۹} جس ارادے سے ہم آئے ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔''

اللہ اکبر! آدمیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور انسانیت زمین میں گڑ جاتی ہے، جب قومِ لوط کے آوارہ منش

{۱۷۷} قال الحسن بن الفضيل: انه عليه السلام عرض بناته عليهم بشرط الاسلام...... وأخرج ابوالشيخ عن ابن عباس...... أنّ المراد ببناته عليه السلام نساء أمته۔ (روح المعانی ۷، ۱۲/۱۵۹)

{۱۷۸} (بیان القرآن حصّہ اوّل، جلد ۵/۵۷)

{۱۷۹} "فی بناتك من حق" من حاجة (بیضاوی ۳/۲۴۸)

باشندوں کا یہ جواب سامنے آتا ہے، غلاظت پسندی کا یہ اظہار کسی عام انسان کے سامنے کرنا بھی بڑی کمینگی کی بات ہے چہ جائیکہ اللہ کے معصوم اور پاک نبی کے سامنے کھلم کھلا اس کا اظہار کیا جائے۔ توریت میں ہے:

''شہر کے مردوں نے جوان سے لے کر بوڑھے تک سب لوگوں نے ہر طرف سے اس کے گھر کو گھیر لیا اور کہا کہ وہ مرد جو آج کی رات تیرے ہاں اترے ہیں، انہیں باہر لا تا کہ ہم ان سے صحبت کریں، لوط نے کہا بھائیو! ایسی شرارت تو نہ کرو، ان مردوں سے کچھ نہ کرو، کیونکہ وہ میری چھت کے سائے میں آئے ہیں۔{۱۸۰}

﴿۸۰﴾......ایک طرف قوم ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں تک رسائی کے لیے بے تاب ہے اور کسی طور بھی اپنے ارادے سے باز آنے والی نہیں اور دوسری طرف وہ مہمان نوجوان ہیں جو اس قدر مضبوط نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں اور خود حضرت لوط علیہ السلام کی اپیلیں بھی وہ ظالم مسترد کر چکے، مصیبت کی اس گھڑی میں اضطراب ایک فطری امر تھا، آپ نے بڑی حسرت سے کہا کہ افسوس! پردیس میں ہونے کی وجہ سے نہ میرے پاس معتد بہ قوت ہے کہ تمہارا مقابلہ کر سکوں اور نہ کوئی ایسی پناہ گاہ ہے کہ جہاں اپنی اور اپنے مہمانوں کی حفاظت کے لیے پناہ لے سکوں۔

حکمت وہدایت:

۱......مومن اللہ کی حدود کی پامالی کبھی برداشت نہیں کر سکتا، خصوصاً جب برائی ہو رہی ہو اور اسے روکنے کی طاقت نہ ہو تو اس سے زیادہ کربناک لمحہ مؤمن کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اسی لیے جب فرشتے انسانی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے پاس تشریف لائے تو اپنی بے بسی اور دوسری طرف قوم کی فطرتِ بد کو دیکھ کر اللہ کے نبی نے فرمایا: ''هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ'' (آج کا دن بڑا سخت ہے۔)(۷۷)

۲......قومِ لوط کا برائی کے ارتکاب کی غرض سے جلدی آنا در حقیقت اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو جلدی دعوت دینا تھا۔(۷۸)

۳......مہمان کی مہمان نوازی اور ہر شر اور مصیبت سے اس کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔(۷۷)

۴......امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معاشرے سے اٹھ جانا کسی بھی قوم کی ہلاکت کے مترادف ہے۔(۷۸)

۵......کوئی بھی سلیم الفطرت اور اعلیٰ کردار کا حامل شخص اپنے مہمانوں کی بے تعظیمی برداشت نہیں کر سکتا۔(۷۸)

۶......جن لوگوں کے دل و دماغ پر غلاظت ڈیرے جما لے، انہیں طہارت و پاکیزگی سے وحشت ہونے لگتی ہے، اسی لیے قومِ لوط نے کہا تھا۔ ''مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ''(۷۹)(تمہاری بہو بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔)

۷......برائی سے نفرت اور اسے روکنے کے لیے قوت و طاقت کی خواہش کا دل میں پایا جانا ایمان کی علامت ہے۔(۸۰)

{۱۸۰} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۱۹:۴-۸/ص ۲۰)

قومِ لوط کی تباہی

﴿۸۱......۸۳﴾

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ

مہمان بولے اے لوط! ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک، سو لے نکل اپنے لوگوں کو

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ

کچھ رات سے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں کوئی مگر عورت تیری کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو ان کو پہنچے گا ان کے

الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

وعدہ کا وقت ہے صبح، کیا صبح نہیں ہے نزدیک؟ ○ پھر جب پہنچا حکم ہمارا کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر نیچے

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ

اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے تہہ بہ تہہ ○ نشان کیے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی

مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

ان ظالموں سے کچھ دور ○

تسہیل: لوط کی بے چارگی دیکھ کر مہمان بول اٹھے اے لوط! آپ پریشان نہ ہوں ہم آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے (فرشتے ہیں)، نہ یہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی آپ پر قابو پا سکتے ہیں، آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے اہل وعیال کو لے کر یہاں سے نکل جایئے، پھر تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے، سوائے آپ کی بیوی کے کیونکہ وہ بھی اسی عذاب سے دوچار ہونے والی ہے جو اس نافرمان قوم پر آئے گا، اس قوم کی ہلاکت کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے، کیا صبح قریب نہیں ہے؟ ○ جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے قومِ لوط کی بستیوں کو الٹ کر نیچے اوپر کر دیا اور ہم نے ان پر لگاتار ایسے پتھر برسائے ○ جن پر تمہارے رب کے ہاں خاص نشان لگے ہوئے تھے اور یہ بستیاں مکہ کے ظالموں سے زیادہ دور نہیں ○

تفسیر

﴿۸۱﴾......حضرت لوط علیہ السلام کا اضطراب دیکھ کر فرشتوں نے آپ کو تسلی دی کہ ہم عام انسان نہیں آپ کے پروردگار کے فرستادہ ہیں، رنج نہ کیجیے، ہم تک تو پہنچنے کا انہیں یارا ہی نہیں، آپ کو بھی یہ کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے، اب ان

کا وقت قریب آ پہنچا ہے لہٰذا آپ رات ہی کے کسی حصّے میں اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ ان سے علیحدہ ہوجایئے ،اور یہ ہدایت پیشِ نظر رہے کہ جب قوم عذاب میں گرفتار ہوگی توان کے نالہ وفریاد پر کان نہ دھریے گا۔

﴿اِلَّا امْرَاَتَكَ﴾ہاں! آپ کی اہلیہ جو کفار ہی کے گروہ کا حصّہ ہے،وہ صبر نہ کرسکے گی اور پلٹ کر ضرور دیکھے گی، یوں ہلاک ہوجائے گی۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی ہلاکت کا ذکر تورات میں یوں آیا ہے:

''اور اس کی بیوی نے اپنے پیچھے پھر کے دیکھا تو وہ نمک کا ستون بن گئی۔''{۱۸۱}

﴿اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ﴾''کیا صبح قریب نہیں ہے؟''اشارہ ہے کہ بس اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے۔

﴿۸۲﴾......﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا﴾''علامہ بغوی نے اس مقام پر لکھا ہے کہ قومِ لوط کی پانچ بستیاں تھیں جن کی آبادی چار لاکھ یا چار کروڑ تھی، جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھایا اور یوں الٹا پٹخا کہ سب زیروزبر ہوکر رہ گئیں۔''{۱۸۲}

اللہ کا عذاب بھی کس قدر سخت ہوتا ہے، جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس قوت سے سدومیوں کی بستی کو زمین پر دے مارا کہ آج وہ حصہ سطحِ سمندر سے جتنا نیچے ہے پورے کرۂ ارض پر اور کوئی قطعۂ زمین اس قدر نیچا نہیں۔

قومِ لوط پر ٹوٹنے والے قہرِ الٰہی کا حال توریت کی زبانی سنیے:

''اور جب سورج زمین پر طلوع ہوا۔ لوط صوؔعر میں داخل ہوا اور خداوند نے سدوم اور عمورہ پر خداوند کی طرف سے گندھک اور آگ آسمان سے برسائی، اور اس نے ان شہروں کو، قرب وجوار کو اور ان شہروں میں رہنے والوں کو اور جو کچھ زمین سے اگتا ہے، نیست کیا۔''{۱۸۳}

﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ﴾اور ہم نے ان پر لگاتار پتھر برسائے۔''

قرآن کے وہ حقائق جو انسان کی محدود عقل میں نہیں سماسکتے تھے، کفار وملحدین نے انہیں شک وارتیاب کی نظر سے دیکھ کر قرآن کی صداقت کو دھندلانے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن جوں جوں انسان کا علم ترقی کرتا گیا وہ قرآنی حقائق کی تصدیق پر مجبور ہوتا گیا۔

قومِ لوط پر جو پتھروں کی بارش ہوئی، اس پر اہلِ ایمان تو یقین رکھتے تھے مگر کفار اس کا انکار کرتے تھے کہ کیسے مان لیا جائے کہ ''موت کی بارش'' بھی برس سکتی ہے؟

{۱۸۱}(عہدِ تکوین، تکوین باب ۱۹:۲۶/ص ۲۱)
{۱۸۲}(تفسیر البغوی ۳۳۴/۲......دار الکتب العلمیہ)
{۱۸۳}(عہدِ عتیق، تکوین، باب ۱۹:۲۳-۲۵/ص ۲۱)

قرآن کا یہ بیان ان کی سمجھ میں تب آیا جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرادیئے گئے، دھاکوں کے بعد آسمان پر کالے بادل چھاگئے اور تابکار کرپٹوں کی بارش پڑنے لگی، ان شہروں میں جو دو لاکھ انسان ضائع ہوئے، ان میں سے اکثر کی موت کا سبب یہی تابکاری بارش تھی۔ اس تباہ کن واقعہ کے بعد جب قرآنی بیان کی صداقت واضح ہوئی تو ملحدین اپنا سا منہ لے کر رہ گئے بلکہ اس عجوبے پر وہ سائنسدان بھی حیرت زدہ رہ گئے جنہوں نے خود یہ ایٹم بم بنائے تھے۔{۱۸۴}

قرآنی صداقت کے اظہار کے لیے اس واقعہ کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے، ممکن ہے مستقبل میں کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جو "وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ" کا اس سے بھی بڑا مظہر اور مصداق ہو۔ نیز قرآنی حقیقت سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس واقعہ کو ان صفحات میں جگہ دی گئی ہے ورنہ اس قسم کی تحقیقات کے ذکر سے ہم نے حتی الوسع اجتناب کیا ہے۔

﴿۸۳﴾...... ﴿مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ﴾ "جن پر تمہارے رب کے ہاں خاص نشان لگے ہوئے تھے۔"

ممکن ہے کہ ان پر کوئی خاص علامت ہو جو انہیں عام زمینی پتھروں سے ممتاز کرتی ہو یا ہر ہر پتھر پر اس شخص کا نام کندہ ہو جو اس کا نشانہ بننے والا تھا۔{۱۸۵} آج کل جو میزائل دشمن پر پھینکے جاتے ہیں ان میں اس فرد تک کا تعین کرلیا جاتا ہے جسے نشانہ بنایا جاتا ہے، ڈرون حملے میں بھی اسی سے ملتی جلتی صورت ہوتی ہے، گویا ہر ہر میزائل پر اس شخص کا نام بھی لکھا جاتا ہے جسے ہدف بنایا جاتا ہے۔

﴿وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ﴾ "اور یہ بستیاں مکہ کے ظالموں سے زیادہ دور نہیں۔"

روئے سخن مشرکینِ مکہ کی طرف ہے، اس لیے کہ وہ اپنے تجارتی اسفار کے دوران راستے میں مرقعِ عبرت بنی ان بستیوں پر سے گزرتے اور کھلی آنکھوں سے ان کے صفحۂ ہستی سے ناپید ہونے کا مشاہدہ کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ نے جبرئیلِ امین سے دریافت کیا کہ ظالم لوگوں سے کون مراد ہیں؟ انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا: "آپ کی امت کے ظالم! ہر ظالم ایک پتھر کے نشانے پر ہے جو اس پر کسی بھی وقت گر سکتا ہے۔"{۱۸۶}

حکمت وہدایت:

ا......رات کا سفر باعثِ برکت ہوتا ہے، بغیر تھکاوٹ کے زیادہ فاصلہ طے ہوسکتا ہے۔(۸۱)

{۱۸۴}(قرآنی آیات اور سائنسی حقائق/۱۸۳-از ڈاکٹر نور باقی)

{۱۸۵} وقيل: معلّمة ببياض وحمرة أو بسيما تتميّز به عن حجارة الأرض أو باسم من يرمى بها۔ بيضاوى ۳/ ۲۵۱)

{۱۸۶}(بیضاوی ۳/ ۲۵۱ ...... علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ثعلبی نے بغیر سند کے نقل کیا ہے، مجھے اس کی سند معلوم نہیں...... مظہری ۶/ ۷۵)

شام
قنیطرہ
حولہ
صفد
عکا
حیفا
بحیرۂ روم
عتلیت
طبریہ
جھیل طبریہ
ناصرہ
ازرع
شہبا
سویداء
دریائے یرموک
بیسان
ازرعات
(درعا)
اربد
قیساریہ
جنین
بصریٰ الشام
عجلون
طولکرم
نابلس
عوجا
زرقاء
قصر الحلابات
زرقاء
یافا (تل ابیب)
فلسطین
لد
سلط
عمان
اردن
ازرق
رملہ
اریحا
قصر عمرہ
القدس (یروشلم)
مادبا
غزہ
الخلیل (حبرون)
بحیرۂ لوط
بئر سبع
وادی غزہ
کرک
عوجا
بحیرۂ لوط (بحیرۂ مردار)
سدوم، عامورہ اور ضوغر
شوبک
اردن
صحرائے نقب
ازرح
جفر
پٹرا
معان
عقبہ
ایلہ (ایلات)
سیناء
عرب
بحیرۂ لوط

۲......علانیہ طور پر اللہ اور اس کے رسول کی بغاوت کرنے والوں کی ہلاکت پر افسوس کرنا ناپسندیدہ ہے۔(۸۱)

۳......چار یا پانچ بستیوں (سدوم، عامورا، دادوما، ضعوۃ اور قتم) کو بیک وقت اس طرح زمین پر اٹھا کر پٹخ دینا کہ سوئے ہوئے لوگ بیدار تک نہ ہوں، اللہ کی عظمت وقوت کا کیسا عظیم مظہر ہے؟ (۸۲)

﴿وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهَا حِجَارَةً﴾ سے بعض حضرات نے لواطت کرنے والے کے رجم پر استدلال کیا ہے۔

۴......وہ قومیں اور وہ ملک قائم نہیں رہ سکتے جہاں ظلم کا رواج عام ہو جائے۔(۸۳)

۵......اس واقعہ سے انبیاء کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہوتی ہے، فرشتے انسانی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے مگر اللہ کے نبی انہیں پہچان نہ سکے۔

۶......لواطت ایک لعنتی عمل ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

قربِ قیامت ایسا وقت آئے گا کہ مرد مرد سے شہوت رانی کرے گا اور عورت اپنے جذبات کی تسکین کے لیے عورت کا سہارا لے گی، جب ایسی صورتحال ہو جائے تو پھر لوگوں کو چاہیے کہ قومِ لوط کی طرح پتھروں کی بارش کا انتظار کریں، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ﴾ {۱۸۷}

ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ایک روایت میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے:

"من وجدتموه يعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل و المفعول به." {۱۸۸}

"جس کو قومِ لوط کا سا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل و مفعول دونوں کو قتل کردو۔"

قصہ حضرت شعیب علیہ السلام

﴿۸۴......۹۵﴾

وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ

اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو، بولا اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود

وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىكُمۡ بِخَیۡرٍ وَّاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡكُمۡ

اس کے سوا اور نہ گھٹاؤ ماپ اور تول کو میں دیکھتا ہوں تم کو آسودہ حال اور ڈرتا ہوں تم پر

{۱۸۷} علامہ قرطبی اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں: "لم أجده بهذا اللفظ و (اخرج البزار/۳۴۰۵) بمعناه من حديث أبي هريرة، وليس فيه ذكر الآية، وفيه سليمان بن داوٗد اليمامي متروك۔ (قرطبی ۷۳/۹)

{۱۸۸} (ترمذی ۱، ابواب الحدود/۲۷۰، ابوداؤد ۲، کتاب الحدود/۲۶۵)

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا

عذاب سے ایک گھیر لینے والے دن کے O اور اے قوم! پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے

النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن

اور نہ گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت مچاؤ زمین میں فساد O جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو

كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن

اگر ہو تم ایمان والے اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان O بولے، اے شعیب! کیا تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو یہ سکھایا کہ

نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۖ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ

ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے؟ یا چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں؟ تو ہی بڑا باوقار ہے

الرَّشِيدُ ﴿٨٧﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ

نیک چلن O بولا، اے قوم! دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آگئی اپنے رب کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی

رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا

اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے چھڑاؤں میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے

الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ

اور بن آتا ہے اللہ کی مدد سے اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف

أُنِيبُ ﴿٨٨﴾ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَن يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ

میرا رجوع ہے O اور اے قوم! نہ کمائیو میری ضد کر کے یہ کہ پڑے تم پر جیسا کچھ کہ پڑ چکا

أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ

قومِ نوح پر یا قومِ ہود پر یا قومِ صالح پر اور قومِ لوط تو تم سے کچھ دور ہی نہیں O اور گناہ بخشواؤ اپنے رب سے

تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿٩٠﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ

اور رجوع کرو اس کی طرف البتہ میرا رب ہے مہربان محبت والا O بولے اے شعیب! ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں جو تو کہتا ہے

وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ

اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تُو ہم میں کمزور ہے اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کر ڈالتے اور ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں O بولا

يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي

اے قوم! کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے؟ اور اس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر، تحقیق میرے رب کے قابو میں ہے

بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ

جو کچھ کرتے ہو O اور اے میری قوم! کام کیے جاؤ اپنی جگہ، میں بھی کام کرتا ہوں، آگے معلوم کرلو گے کس پر آتا ہے عذاب

مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَاءَ

رسوا کرنے والا اور کون ہے جھوٹا؟ اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں O اور جب پہنچا

أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا

ہمارا حکم، بچادیا ہم نے شعیب کو اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی مہربانی سے اور آ پکڑا ان ظالموں کو کڑک نے

الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ

پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے O گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے، سن لو! پھٹکار ہے مدین کو

كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو O

تسہیل: اور ہم نے مدین والوں کی طرف ان کے قومی بھائی شعیب کو پیغمبر بنا کر بھیجا، شعیب نے کہا، اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، میں تمہیں خوشحالی کی حالت میں دیکھتا ہوں پھر تمہیں ایسی حرکتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر تم باز نہ آئے تو مجھے تم پر ایسے عذاب کا اندیشہ ہے جو سب پر چھا جائے گا O اور اے میری قوم! ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں ڈنڈی نہ مارا کرو اور زمین میں فساد پھیلانے کے لیے مت پھرا کرو O اگر تمہیں میری بات کا یقین ہے تو جان لو کہ اللہ کا دیا ہوا جو حلال مال بچ جائے وہی تمہارے لیے بہتر ہے، ورنہ میں تم پر کوئی داروغہ تو نہیں جو جبراً اپنی بات منوالوں O قوم مدین نے جواب دیا، اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں اور یہ کہ ہم اپنے مالی معاملات میں من مانی کرنے سے توبہ کرلیں؟ کیا اس شہر میں صرف تمہی نرم دل اور سمجھدار انسان ہو؟ O شعیب نے کہا، اے میری قوم! اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میرے رب نے مجھے روشن دلیل اور اپنے فضل وکرم سے اچھی روزی بھی عطا کی ہو تو کیا پھر بھی تمہیں حق اور سچ کی دعوت نہ دوں؟ اور دیکھو! میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ جن کاموں سے میں تمہیں روکتا ہوں خود ان کے خلاف چلوں، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک مجھ سے ہوسکتا ہے تمہاری اصلاح کرتا رہوں، اصلاح کی توفیق اللہ ہی کے فضل سے حاصل ہوتی ہے، میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف ہر معاملے میں رجوع کرتا ہوں O اور اے

میری قوم! میری ضد میں آ کر کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس کی وجہ سے تم پر ویسی مصیبت آ پڑے جیسی مصیبت قومِ نوح، قومِ ہود یا قومِ صالح پر آ پڑی تھی اور قومِ لوط کا زمانہ بھی تم سے زیادہ دور نہیں O اور اپنے رب سے استغفار کرو پھر اسی کی طرف متوجہ رہو، بے شک میرا رب ازحد مہربان اور بہت محبت کرنے والا ہے O قوم کہنے لگی اے شعیب تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری قوم کے ایک کمزور فرد ہو اور اگر تمہارے خاندان کا پاس لحاظ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور ہماری نظر میں تمہاری کچھ بھی وقعت نہیں O شعیب نے کہا، اے میری قوم! کیا تمہاری نظر میں میرا خاندان اللہ سے بھی زیادہ عزت والا ہے؟ سوچو تو سہی! تم نے اللہ کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے، بے شک میرا رب تمہارے سارے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے O اور میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو میں اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں، تم عنقریب جان لوگے کہ کون ہے جس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے، تم بھی اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو میں بھی انتظار کر رہا ہوں O اور جب ہمارے عذاب کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اپنے فضل و کرم سے شعیب کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ایک خوفناک آواز نے آ لیا، پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے O گویا کہ وہ کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو کہ مدین والوں پر ویسے ہی لعنت ہوئی جیسے قومِ ثمود پر ہوئی تھی O

تفسیر

قرآن مجید میں مدین کا ذکر متعدد بار دو طرح سے آیا ہے، اوّل حضرت شعیب علیہ السلام اور دوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے...... مدین دراصل یہاں کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہے اور غالباً دنیا کی تاریخ میں سب سے قدیم تاجر پیشہ قوم یہی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام مدین ہی کے خاندان سے تھے۔ جغرافیہ دانوں کے مطابق مدین تبوک سے چھ دن کی مسافت پر ایک ساحلی شہر ہے جو مدینہ منورہ کی حکومت کے ماتحت تھا۔

اصطخری نے اپنے مشاہدات کے مطابق لکھا ہے کہ یہاں وہ چشمہ واقع ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔

وسیع آثارِ قدیمہ جنہیں عرب یہاں کے غاروں میں بنی ہوئی قبروں کی وجہ سے ''مغائرِ شعیب'' کہتے ہیں، مقنا کی بندرگاہ سے کوئی سولہ میل کے فاصلے پر ۲۸ درجے ۲۸ دقیقے شمال عرض بلد، البدع کی وادی کے جنوبی حصے میں واقع ہیں۔

اس وادی میں ندیاں، کھجور اور دیگر درخت کثرت سے ہیں، اور یہ تمام علاقہ جو ۲۹ درجے ۲۸ دقیقے اور ۲۷ درجے اور ۴۰ دقیقے میں واقع ہے، ارضِ مدین کہلاتا ہے۔{۱۸۹}

جس طرح عہد نامہ قدیم میں ثمود کا کوئی ذکر نہیں اسی طرح یہ مدین کے تذکرے سے بھی خالی ہے۔

﴿۸۴﴾......حضرت شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے تو قوم کو ایک اللہ کی عبادت کی تلقین فرمائی، اس لیے کہ صرف ایک اللہ کی غیر مشروط بندگی واطاعت ہی دینِ اسلام کی خشتِ اوّل اور اسلامی نظامِ زندگی کی اساس ہے۔

دعوتِ توحید کے بعد آپ نے انہیں معاشی ضابطہ بندی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کی اس خرابی پر متنبہ کیا جو ان کی پہچان بن چکی تھی یعنی ناپ تول میں کمی!

فرمایا کہ تمہیں آسودگی حاصل ہے، آسائش سے زندگی بسر کر رہے ہو، پھر ناپ تول میں کمی جیسی غیر اخلاقی حرکت کا کیا فائدہ؟ میری مانو تو معاشرے کو عدمِ توازن سے بچانے کے لیے اس پست خیالی کو ترک کردو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تم سے آسودگی چھین کر تمہیں اپنی پکڑ میں لے لے۔

خود ہمارے آقا ﷺ نے بھی اپنی امت کو ناپ تول میں کمی کی ہلاکت آفرینی سے اِن الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے:

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ لأصحاب الكيل والميزان: "انكم قد وليتم أمرين هلكت فيه الأمم السالفة قبلكم."{۱۹۰}	"حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ نے تاجروں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "تمہارے ذمہ دو کام (ناپ اور تول) ایسے ہیں، (جن میں ڈنڈی مارنے کی وجہ سے) تم سے پہلے امتیں ہلاک ہوئیں۔"

﴿۸۵﴾......اے برادرانِ قوم! دیکھو وزن اور پیمانہ پورا کرنے کا اہتمام کرو، لوگوں کے حقوق میں کمی نہ کرو بلکہ انہیں دیانتداری سے ادا کرو، ورنہ تمہاری اس لوٹ کھسوٹ اور بد اخلاقی سے معاشرے میں فسادِ عام ہو جائے گا۔

اعتقادی گمراہیوں کی دلدل ہو یا معاشرتی خرابیوں کی مختلف صورتیں، قرآن ہر دو کی اصلاح کا لائحہ عمل دیتا ہے، ایک متوازن معاشرے کی تشکیل کے لیے باہمی لین دین کی صفائی اور لوٹ کھسوٹ، دھوکہ دہی، حرام خوری جیسی منفی ذہنیت سے گریز بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

﴿۸۶﴾......اگر تم کسبِ حلال پر ملنے والے ثواب اور حرام کمائی کے وبال سے واقف ہو تو میری یہ بات سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کہ تھوڑے سے حلال پر قناعت، حرام کے انبار سے کہیں بہتر ہے۔{۱۹۱}

{۱۸۹} (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۲۰/ ۲۶۱-۲۶۲......اہلِ مدین کے بارے میں مزید دیکھیے "تسہیل البیان ۳/ ۱۱۱)

{۱۹۰} (ترمذی ۱، ابواب البیوع/ ۲۳۰)

{۱۹۱} الحلال خيرمما تجمعونه من الحرام۔ (صفوة التفاسير ۲/ ۲۹)

﴿۸۷﴾......خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام کا سمجھانا بجھانا قوم کو اوپرا محسوس ہوا، کہنے لگے، اے شعیب! نماز اور مالی معاملات میں کیا مناسبت؟ کیا آپ کی نماز آپ کو یہی کچھ سکھاتی ہے کہ ہمارے معبودوں کی تردید کرتے پھریں اور ہمارے مالی معاملات میں مداخلت شروع کر دیں؟

حقیقت یہ ہے کہ کامل ایمان اسی آدمی کا ہے جو اپنے شخصی اور اجتماعی معاملات کو عقیدے کے ساتھ منسلک کر دے، اگرچہ یہ بات ہر دور میں مادیت پرست اور ملحد طبقے کو باعثِ تعجب محسوس ہوئی، آپ آج کے دور کو لیجئے رجعت پسندی، بنیاد پرستی اور جمود کا طعنہ کن لوگوں کے حصّہ میں آتا ہے؟ انہی کے نصیبے میں جو ایمان، شخصی طرزِ عمل، مقامی بازار اور انٹرنیشنل مارکیٹ کے مادی و اقتصادی معاملات کو باہم مربوط دیکھنا چاہتے ہیں۔

﴿اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ ''اور یہ کہ ہم اپنے مالی معاملات میں من مانی کرنے سے توبہ کر لیں؟''

اس اندازِ گفتگو سے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتی کہ قومِ شعیب سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حامل تھی، اس لیے کہ سرمایہ دارانہ نظام یہی سکھاتا ہے کہ مالی معاملات میں انسان مکمل طور پر آزاد ہے، اسے حق ہے کہ وہ جیسے اور جہاں سے چاہے کمائے اور جہاں چاہے خرچ کرے۔

جبکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان نہ تو کمانے میں آزاد ہے اور نہ ہی خرچ کرنے میں، جس طرح کسب معاش کی بعض صورتیں قطعاً حرام ہیں یونہی بعض ایسے مواقع ہیں جہاں خرچ کرنا جائز نہیں۔

﴿اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ﴾ ''آپ تو بڑے ہی نیک چلن ہیں۔''

اپنے ہادی و مصلح کے ساتھ قوم کی یہ گفتگو طنز و استہزاء پر مبنی تھی۔{۱۹۲}

﴿۸۸﴾......قوم کے طنز و تعریض کے مقابلے میں حضرت شعیب علیہ السلام نے برادرانہ جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے بڑی ہمدردانہ گفتگو فرمائی، فرمایا:

اے میری قوم! اگر میں تمہیں ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور تمہارے آبائی معتقدات پر تیشہ چلاتا ہوں تو بے بنیاد نہیں بلکہ میرے اس فریضے کا محرک توحید کے مضبوط دلائل ہیں۔

﴿وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا﴾ اور اس (اللہ) نے مجھے نبوت و حکمت {۱۹۳} سے سرفراز فرمایا ہے۔''

﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ﴾ ''میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہیں تو ایک کام سے منع

{۱۹۲} قال ابن عباس...... یقولون ذلك أعداء الله على سبیل الاستهزاء (ابن کثیر ۲/۵۹۴)

{۱۹۳} "رزقا حسناً" هوالنبوة والحكمة (روح المعانی ۷، ۱۲/۱۷۷)

کروں اور خود اس کا ارتکاب شروع کردوں۔“

قوم کے سوئے ہوئے ضمیر پر دستک ہے کہ عقیدہ وعمل کی جس غلاظت میں تم لتھڑے ہوئے ہو، اگر اس میں کچھ فائدہ ہی ہوتا تو میں تمہیں منع کیوں کرتا؟ میں تو چاہتا ہوں تم وہی پاکیزہ منہج اختیار کرو جس کا حکم اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

میری اس فہمائش کا مقصد کوئی دنیوی لالچ نہیں فقط تمہاری اصلاح پیشِ نظر ہے البتہ تمہیں ہدایت دینا میرے بس میں نہیں اللہ کے اختیار میں ہے، اپنے تمام معاملات میں، میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور تمام مشکلات میں اسی کو اپنا مشکل کشا سمجھتا ہوں۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ دعوتِ حق کی زبان میں اب ضرب المثل بن چکی ہے۔{۱۹۴}

﴿۸۹﴾...... حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کی معاندانہ روش دیکھ کر ایک اور اسلوب اختیار فرمایا، امم سابقہ مثلاً قومِ نوح، قومِ ہود، قومِ ثمود اور قومِ لوط پر آنے والے مختلف نوعیتوں کے عذابوں سے انہیں ڈراتے ہوئے فرمایا کہ ان قوموں پر بھی وحی کی تعلیمات کے مقابلے میں تکبر اور سرکشی کا رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ کا عذاب نازل ہوا کہیں تمہارے اوپر بھی اس کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔

﴿وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ﴾ ”اور قومِ لوط کا زمانہ بھی تم سے زیادہ دور نہیں۔“

اس بُعد سے بعدِ زمانی ومکانی ہر ایک مراد لیا جا سکتا ہے۔{۱۹۵}

﴿۹۰﴾...... اور دیکھو! اگر چاہو کہ اللہ کی پکڑ سے محفوظ رہو تو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر اشکِ ندامت بہاؤ اور آئندہ کے لیے یہ عزمِ مصمم کر لو کہ اس کے اوامر کو بجالاؤ گے اور منہیات سے باز رہو گے، کچھ بعید نہیں کہ اللہ تم پر عذاب کی ہولناکی کے بجائے اپنے لطف وکرم کی بارش برسا دے، اس لیے کہ وہ تو بڑا رحم کرنے والا اور بڑی محبت رکھنے والا ہے۔

معلوم ہوا کہ گناہوں پر توبہ واستغفار دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی کا ضامن ہے۔{۱۹۶}

﴿۹۱﴾...... حضرت شعیب علیہ السلام کی ناصحانہ دعوت کا قوم پر چنداں اثر نہ ہوا کسی پائیدار نظریے سے محروم اور حق وصداقت کو بھی مادی مفادات کے ترازو میں تولنے والے یہ سرکش توہین آمیز لہجے میں{۱۹۷} بولے:

{۱۹۴} (موضح القرآن/ ۲۹۹...... ایچ ایم سعید کمپنی)

{۱۹۵} ”وماقوم لوط منکم ببعید“ زمانا ولا مکانا۔ (المراغی ۱۲/ ۷۴)

{۱۹۶} وفی الآیة ارشاد الیٰ ان الندم علی فعل الفساد والظلم بالتوبة واستغفار الرّب تعالیٰ من اسباب خیر الدنیا وخیر الآخرة۔ (المراغی ۱۲/ ۷۵)

{۱۹۷} ای قالوا لنبیّھم شعیب علیٰ وجه الاستھانة (صفوة التفاسیر ۲/ ۳۰)

اے شعیب! آپ کی گفتگو ہمیں بالکل بے معنی لگتی ہے، ہمیں آپ کے نظریات سے بالکل اتفاق نہیں اور اگر آپ کا یہ مختصر سا{۱۹۸} قبیلہ جو ہمارا ہی ہم مسلک ہے{۱۹۹} اس کے تعلقات کا لحاظ نہ ہوتا{۲۰۰} تو تمہیں کب کا سنگسار کر چکے ہوتے اور تم قوت وعزت میں ہم سے کم ہونے کی وجہ سے ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔

بعض تفاسیر میں "ضَعِيفًا" سے جو فقدِ بصر (نابینا ہونے) کا معنیٰ لیا گیا ہے، اہلِ علم نے اس کی سختی سے تردید فرمایا ہے۔{۲۰۱}

﴿۹۲﴾......سیدنا شعیب علیہ السلام ان کے جواب سے سمجھ گئے کہ یہ لوگ ہر چیز کو مادیت اور ظاہری شان وشوکت کے ترازو میں تولنے کے عادی ہیں۔ آپ نے فرمایا، اے میری قوم! کیسی سوچ ہے تمہاری؟ کیا میرا قبیلہ تمہاری نظر میں اللہ کے مقابلے میں زیادہ معزز، زیادہ طاقتور اور زیادہ بااختیار ہے؟ میرے قبیلے کی وجہ سے تم میرا لحاظ کرتے ہو لیکن اللہ کی وجہ سے میرا لحاظ نہیں کرتے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس کے احکام کی اتباع کی جائے جبکہ تم نے اللہ کو اور اس کے احکام کو پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے، نہ تمہارے دلوں میں اس کی عظمت ہے اور نہ ہی تم اس کے بھیجے ہوئے نبی کی مخالفت اور دشمنی کی صورت میں اس کے عذاب سے ڈرتے ہو جبکہ تمہارا کوئی بھی عمل اس کے دائرۂ علمی سے خارج نہیں......سوچو! رعایت کا مستحق کون ہے؟ وہ مدبّرِ کائنات جس کے ادنیٰ اشارے سے یہ ساری کائنات وجود میں آئی......یا......وہ عاجز مخلوق جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے رحم وکرم پر ہے؟

﴿۹۳﴾......حضرت شعیب علیہ السلام نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا کہ ان کی فطرت مسخ ہو چکی اور اب پند ونصیحت کارگر نہیں رہی تو آپ نے فیصلہ کن انداز اختیار فرماتے ہوئے قوم کو دوٹوک بات کہی کہ اگر تم نے میری دعوت کو ٹھکرانے کی ٹھان ہی لی ہے تو تکذیب وعداوت کی اس روش پر قائم رہو،{۲۰۲} اللہ کا عذاب سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر دے گا، سچائی باقی رہے گی اور کذب وافتراء فنا ہو جائے گا۔

﴿۹۴﴾......آخر وقتِ موعود پر اللہ کا عذاب آسمان سے ایک خوفناک چنگھاڑ کی صورت میں آیا اور سب کا کام تمام

{۱۹۸} "الرّهط" العصابة دون العشرة وقيل: يقال إلى الاربعين (المفردات/۲۰۴)
{۱۹۹} انّهم على ملّتنا (تفسير القاسمى ۹/۱۶۵)
{۲۰۰} والظاهران مرادهم لولا مراعاة جانب رهطك (روح المعانى ۱۲،۷/۱۸۵)
{۲۰۱} ومن فساد التفاسير تفسير "الضعيف" بفاقد البصر...... وهو بناء على الأوهام ولم يعرف من الاثر ولا من كتب الاوّلين مافيه انّ شعيباً عليه السلام كان اعمىٰ (التحرير والتنوير ۱۲،۶/۱۴۹)
{۲۰۲} "اعملوا علىٰ مكانتكم"...... اى حالكم الّتى أنتم عليه (التحرير والتنوير ۱۲،۶/۱۵۲)

ہوگیا، سنتِ الٰہیہ کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے ہمراہی مسلمان اللہ کی رحمت وعنایت سے محفوظ رہے، عذابِ الٰہی نے کرۂ ارض سے اہلِ مدین کا نام ونشاں مٹا دیا اور تاریخ کا ایک اور سیاہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے کبھی بھی دو قوموں کو ایک جیسے عذاب سے ہلاک نہیں کیا سوائے قوم ثمود اور اہلِ مدین کے کہ دونوں کو چنگھاڑ کے عذاب سے صفحۂ ہستی سے مٹایا گیا البتہ قومِ ثمود پر چنگھاڑ نیچے سے آئی جبکہ قومِ شعیب پر اوپر سے نازل ہوئی۔{۲۰۳}

﴿۹۵﴾......﴿اَلَا بُعۡدًا لِّمَدۡیَنَ كَمَا بَعِدَتۡ ثَمُوۡدُ﴾ دونوں قوموں کی بستیاں قریب ہونے، دونوں پر ایک جیسا عذاب نازل ہونے اور کفر وسرکشی اور ڈاکہ زنی میں مشابہ ہونے کی وجہ سے یہ جملہ لایا گیا ہے۔{۲۰۴}

حکمت وہدایت:

۱......حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت میں عقیدہ اور اجتماعی زندگی دونوں کی اصلاح پر زور تھا، اصلاحِ عقیدہ کی دعوت میں آپ نے شرک کی تردید فرمائی اور اجتماعی زندگی کے حوالے سے ناپ تول کی درستگی پر زور دیا کیونکہ حقوق العباد میں ڈنڈی مارنے کی بیماری ان کے اندر عام تھی، وہ اپنا حق وصول کرتے تو اصل کے علاوہ زائد کے ہتھیانے کی کوشش کرتے اور جب دوسروں کا حق دیتے تو پورا نہیں دیتے تھے۔ جیسے ناپ تول میں کمی مدین والوں کے لیے حرام تھی، مسلمانوں کے لیے بھی حرام ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری ہے:

﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ۝ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوْ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ ۝﴾{۲۰۵}

''خرابی ہے گھٹانے والوں کے لیے، وہ کہ جب لوگوں سے ناپ لیں تو پورا لیں اور جب دیں تو گھٹا کردیں۔''

۲......حضرت شعیب علیہ السلام نے انداز بدل بدل کر قوم کو حقوق العباد میں کمی بیشی سے باز آجانے کی تاکید فرمائی:

☆ ناپ تول میں کمی زیادتی سے منع فرمایا۔

☆ دوسروں کے حقوق انصاف کے ساتھ پورے ادا کرنے کا حکم دیا۔

{۲۰۳} (قرطبی ۹/۸۰)

{۲۰۴} "الا بعدا لمدین کما بعدت ثمود" شبّههم بهم لان عذابهم ایضًا بالصّیحة، وکانوا قریبا منهم فی المنزل، نظرائهم فی الکفر وقطع الطریق وکانوا اعرابًا مثلهم۔ (تفسیر قاسمی ۹/۱۶۶)

{۲۰۵} (المطففین ۸۳/۱-۳)

☆خرید وفروخت کے علاوہ دوسرے حقوق میں بھی کمی سے منع فرمادیا۔

☆یہ بتایا کہ بندوں کی حق تلفی سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔

☆چونکہ تم خوشحال ہو اس لیے تمہیں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے ویسے بھی شرم آنی چاہیے۔

☆اگر تم نے اس گناہ سے توبہ نہ کی تو سخت عذاب کا اندیشہ ہے۔

☆انصاف کے ساتھ حقوق ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے اسی میں خیر اور برکت ہوگی۔

☆میں تم پر نگہبان نہیں بلکہ ہر حال میں نگرانی کرنے والا اللہ ہے۔

۳......حلال کمائی اگرچہ تھوڑی ہو وہ باعثِ برکت ورحمت ہوتی ہے اور ناجائز مال کے انبار بھی ہوں تب بھی وہ برکت سے خالی اور غضبِ الٰہی کا سبب بنتے ہیں۔(۸۶)

۴......اصلاح میں خلوص کے ساتھ ساتھ توکل وسعی بھی لازم ہیں۔(۸۸){۲۰۶}

۵......اہلِ باطل کی عادت یہ ہے کہ جب دلیل کے میدان میں شکست کھا جاتے ہیں تو اول فول بکنے لگتے ہیں اور تمسخر پر اتر آتے ہیں، مدین والوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا، بتوں کی عبادت کے سلسلے میں تو اپنے باپ دادا کی تقلید سے استدلال کیا اور معاملات میں پائی جانے والی خرابیوں پر تنقید کے جواب میں خود حضرت شعیب علیہ السلام کو اور ان کی نماز کو نشانہ بنایا۔(۸۷)

۶......کسی بھی داعی پر اپنی استطاعت کے مطابق ہی اصلاح واجب ہے، اس سے زیادہ کا وہ مکلّف نہیں ہوتا۔(۸۸)

۷......اللہ کے بندے ظاہری وسائل کے بجائے اللہ ہی پر توکل اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔(۸۸)

۸......سچا مومن اپنی خوشحالی کو قوتِ بازو کا نتیجہ سمجھنے کے بجائے اللہ کا فضل واحسان سمجھتا ہے۔(۸۸)

۹......ثروت وغنا، ولایت کے منافی تو کیا ہوگی، مقامِ نبوت کے منافی بھی ہرگز نہیں، کئی دوسرے انبیاء کی طرح حضرت شعیب علیہ السلام بھی خاصے مالدار تھے۔(۸۸)

۱۰......جسے اللہ تعالیٰ نے روحانی کے ساتھ مادی نعمتیں بھی عطا کی ہوں تو اسے دوسروں سے زیادہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں مستعد ہونا چاہیے۔(۸۸)

۱۱......جس کسی کے ہاں گناہ کا ظاہری داعیہ نہ پایا جاتا ہو اس سے گناہ کا ہونا زیادہ قبیح ہے، مثلاً خوشحالی کے باوجود چوری چکاری، غبن اور فراڈ، کم تولنا اور ملاوٹ کرنا یا بڑھاپے میں زنا اور فقیر کا تکبر کرنا۔(۸۴)

{۲۰۶}(بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد۵/۵۹)

۱۲......اللہ نے انسان کو حلال کی صورت میں جو کچھ دیا ہو اسی پر قناعت کرنی چاہیے اور دوسروں کے مال و دولت پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔(۸۶)

۱۳......حقیقی نماز انسان کو نیک اعمال پر آمادہ کرتی اور برائیوں اور زیادتیوں سے روکتی ہے۔(۸۷)

۱۴......بندے کی جسمانی حرکات ہوں یا مالی معاملات سب اللہ کے حکم کے ماتحت ہیں، جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مالی معاملات میں آزاد ہے، صحیح یا غلط جو کچھ چاہے وہ کرتا رہے، وہ اس شخص جیسا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اپنی جسمانی حرکات پر مکمل اختیار ہے۔

۱۵......جو کوئی خیر خواہی کی بناء پر لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتا ہے وہ دوسروں سے پہلے خود عمل کرتا ہے اور اگر کسی کام سے منع کرتا ہے تو پہلے خود اس کے ارتکاب سے بچتا ہے۔(۸۸)

۱۶......انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد دینی اور دنیاوی معاملات میں صلاح و اصلاح کی ترغیب اور شر اور فساد سے انسانوں کو بچانا ہوتا ہے اور وہ اپنے اس مشکل ترین مشن میں اللہ سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں۔(۸۸)

۱۷......داعیانِ حق میں حسنِ اخلاق، صبر و تحمل اور عفو و درگزر جیسی صفات کا ہونا ضروری ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کو دیکھیے کہ اپنی قوم سے کیسی دل دکھانے والی باتیں سنتے ہیں مگر صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

۱۸......ماضی کے گناہوں سے توبہ اور مستقبل میں بچنے کا عزم عذاب سے حفاظت کا سبب ہے۔(۹۰)

۱۹......گمراہ قومیں داعیانِ حق کو کبھی استہزاء کا نشانہ بناتی ہیں اور کبھی انہیں کمزور جان کر طاقت کے زور پر ان کی آواز دبانے کی کوشش کرتی ہیں۔(۹۱)

۲۰......جب سنگدل انسانوں پر کوئی بات بھی اثر نہ کرے تو اہلِ حق ان سے برأت کا اظہار کر کے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔(۹۳)

۲۱......نیک اور مقرب انسانوں کو بھی دنیا اور آخرت میں جو نجات اور کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ محض اللہ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتی ہے۔(۹۴)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام......فرعون اور اس کے سردار

﴿۹۶......۹۹﴾

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دے کر O فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

پھر وہ چلے حکم پر فرعون کے اور نہیں بات فرعون کی کچھ کام کیO آگے ہوگا اپنی قوم کے قیامت کے دن

فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

پھر پہنچائے گا ان کو آگ پر اور برا گھاٹ ہے جس پر پہنچےO اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہان میں لعنت اور دن قیامت کے

بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

بھی، برا انعام ہے جو ان کو ملاO

تسہیل: اور ہم نے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیاں اور روشن دلیل دے کرO فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر وہ کفر پر اڑے رہے اور انہوں نے فرعون کے حکم کی اتباع کی حالانکہ فرعون کا حکم درست نہ تھاO وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا پھر وہ ان سب کو دوزخ میں جا اتارے گا، بہت ہی بری جگہ ہے جس میں وہ اتارے جائیں گےO اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی لعنت ان کے ساتھ لگی رہے گی، بہت برا انعام ہے جو انہیں دیا گیاO

☆☆☆☆☆

سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تفصیلاً گزر چکا، یہاں جدید تحقیقات کی روشنی میں مختصر کلام پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں محققین و ماہرینِ اثریات کا یہ کہنا ہے کہ آپ کی ولادت مصر کے فرعونی دور کے انیسویں خاندان کے بادشاہ رعمسیس ثانی Ramases-II کے دور میں ہوئی جو سیتی اوّل (Seti-I) کا بیٹا تھا۔{۲۰۷}

فرعون رعمسیس ثانی کی حکومت کا آغاز ۱۳۰۰ ق م سے ہوا، اگرچہ باپ کے بڑھاپے کی وجہ سے عملاً وہ پہلے ہی سے حکمرانی کر رہا تھا، اس کا دورِ حکومت 67 برس پر محیط ہے۔

اس نے لبنان کے حطیوں سے جنگیں کیں اور آخر کاران پر فتح پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا منفتاح برسرِ اقتدار آیا جس کا عہدِ حکومت تقریباً 25 برس رہا، اس نے کچھ فتوحات بھی حاصل کیں لیکن اس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہوگیا۔

عام خیال یہ ہے کہ جس فرعون کے محل میں حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے پرورش پائی، اسی کے ساتھ آپ کا مقابلہ

{۲۰۷} Egypt under the pharoh's ......بار سوم، لندن ۱۹۰۲ء/ص ۳۰۱

بھی ہو لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ جس فرعون کے محل میں آپ علیہ السلام نے پرورش پائی وہ ''رعمسیس ثانی'' تھا اور جس سے آپ کا مقابلہ ہوا وہ ''منفتاح'' تھا۔{۲۰۸}

کوئی بھی ہو قرآن کے وعدہ ''فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ'' پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اس لیے کہ قاہرہ کے عجائب گھر میں دونوں کی ممیاں موجود ہیں۔

اہلِ کتاب کے نزدیک عہدِ موسوی کے فرعون کا نام ''قابوس'' یا ''ولید بن مصعب بن الریان'' تھا۔ اس کی عمر چار سو برس ہوئی جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے 120 سال کی عمر پائی۔{۲۰۹}

حکمت و ہدایت:

۱......جن کے دلوں میں کجی اور تکبر ہو انہیں بڑی سے بڑی نشانی بھی متاثر نہیں کر سکتی۔(۹۶) قومِ فرعون نے متعدد معجزات اور نشانیاں دیکھیں مگر ان کے دل ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔

۲......کفر کے سرغنوں کی حمایت و اتباع دنیا اور آخرت میں تباہی کا سبب ہے۔(۹۷)

۳......دنیا میں گمراہی کے میدان میں قیادت کرنے والے آخرت میں دوزخ کی طرف جانے میں بھی قیادت کریں گے۔(۹۸)

۴......فرعون اور آلِ فرعون پر دنیا میں بھی لعنت ہوئی۔(۹۹) قبروں میں بھی ان پر صبح شام عذاب پیش کیا جاتا ہے۔

کفر کی دنیوی سزا

﴿۱۰۰......۱۰۳﴾

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا

یہ تھوڑے سے حالات ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو، بعض ان میں سے اب تک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی O اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا

اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا

لیکن ظلم کر گئے وہی اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے ان کے ٹھاکر (معبود) جن کو پکارتے تھے سوائے اللہ کے کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم تیرے رب کا

جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ

اور نہیں بڑھایا ان کے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے O اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم

{۲۰۸} (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۹۶۵/۱۸ ...... انسائیکلوپیڈیا امریکانا، ۲۲/۷۰۷)

{۲۰۹} (فتح البیان ۱/۱۰۷ ...... واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے تسہیل البیان ۳/۱۲۷-۱۹۱)

ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ

کرتے ہوتے ہیں، بے شک اس کی پکڑ دردناک ہے شدت کی O اس بات میں نشانی ہے اس کو جو ڈرتا ہے آخرت

ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ۝

کے عذاب سے وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہوں گے سب لوگ اور وہ دن ہے سب کے پیش ہونے کا O

ربط: ماقبل سات قصے بیان کرنے کے بعد اب بتایا جا رہا ہے کہ مقصود ان کے ذکر سے عبرت وموعظت ہے۔

تسہیل: اے پیغمبر! یہ ان مشہور بستیوں کے حالات کی ایک جھلک ہے جو ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں، ان میں سے بعض بستیاں تو اب بھی باقی ہیں اور بعض کا بالکل خاتمہ ہو گیا O ان میں سے کسی پر بھی ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، جب تمہارے رب کا عذاب آ گیا تو ان کے وہ معبود ان کے کسی کام نہ آ سکے جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے، وہ انہیں فائدہ تو کیا پہنچاتے الٹا ان کی بربادی ہی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے O اے میرے نبی! تیرا رب جب ظالموں کی کسی بستی کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہی عبرتناک ہوتی ہے، یقیناً اس کی پکڑ دردناک اور شدید ہوتی ہے O اس پکڑ دھکڑ میں اس شخص کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، وہ ایسا دن ہوگا جس میں سارے انسان جمع کیے جائیں گے اور یہی دن ہوگا جس میں سب کی پیشی ہوگی O

تفسیر

﴿۱۰۰﴾......سابقہ اقوام کی سرگزشت جو ہم نے آپ پر بیان کی {۲۱۰} ان میں سے بعض قوموں کے آثار آج تک موجود ہیں اور بعض پر قہرِ الٰہی اس شدت سے ہوا کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا، مثلاً ''احقاف'' کے علاقہ میں عادیوں اور ''حجر'' کے مقام پر ثمودیوں کے آثار آج تک دیکھنے والوں کو درسِ عبرت دے رہے ہیں جبکہ قومِ نوح اور قومِ لوط یوں ملیامیٹ ہوئیں کہ اپنے آثار تک کھو بیٹھیں۔

﴿۱۰۱﴾......کسی کے دل میں یہ بات آ سکتی تھی کہ اس قدر شدید اور ہولناک تباہی کیا بندوں پر ظلم کے مترادف نہیں؟ تو فرمایا کہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا، اس کا اعلان ہے:

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ﴾ {۲۱۱} ''اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟''

{۲۱۰} ''ذلك'' اشارة الىٰ ماقصّ من انباء الأمم (روح المعانی ۷، ۱۲/۲۰۳)

{۲۱۱} (النساء ۴/۱۴۷)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾{۲۱۲} ''اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

لیکن جب کوئی فرد یا قوم ظلم میں حد سے تجاوز کر جائے تو اسے سزا دینا اور مظلوموں کو اس کے ظلم سے نجات دینا بھی اس کے عدل کا تقاضا ہوتا ہے اور یہ سزا ظلم وعدوان ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، بے قصور کسی پر گرفت نہیں ہوتی جو کسی کے دل میں ذاتِ حق کے بارے میں ظلم کا خیال آئے۔

جن خود ساختہ معبودوں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ نفع وضرر دے سکتے اور اللہ سے اپنی بات منوا سکتے ہیں، مشکل وقت میں ان کی مدد تو کیا کرتے، الٹا:

﴿وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ﴾ ''انہوں نے تباہی کے سوا انہیں کچھ نہ دیا۔''

ظاہر ہے کہ شرک اور ظلم ہی ان کی بربادی کی بنیادی وجہ تھا، نہ یہ غیر اللہ کی پرستش کرتے نہ اس روزِ بد کا سامنا کرتے۔

﴿۱۰۲﴾......﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ﴾ ''اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ کسی ظالم بستی والوں{۲۱۳} کو پکڑتا ہے۔''

آخرت کی دائمی رسوائی سے قبل ظالموں کو دنیا میں بھی علامتی سزا دی جاتی ہے، اور یہ سزا سابقہ قوموں کے ساتھ ہی خاص نہ تھی بلکہ اب بھی اگر کوئی ان کے نقشِ قدم پر چلے گا تو عذاب سے بچ نہیں سکے گا۔{۲۱۴}

﴿إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ جس طرح اللہ مجرمین کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے یونہی جب انہیں پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ بھی بڑی شدید ہوتی ہے، ایسی شدید کہ صدیوں تک اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

﴿۱۰۳﴾......گزشتہ اقوام کی یہ ہلاکت وبربادی ان لوگوں کے لیے مرقعِ عبرت ہے{۲۱۵} جو قیامت کے دن کا خوف رکھتے ہیں جو حاکمِ حقیقی کی عدالت میں حاضری کا سب سے بڑا دن ہوگا اور اولین وآخرین سب جمع ہوں گے۔

﴿مَّشْهُودٌ﴾ اس دن شہادت دینے والے شہادت دیں گے{۲۱۶} یا یہ کہ اس دن زمین وآسمان کی تمام

{۲۱۲} (حم السجدة ۴۶/۴۱)

{۲۱۳} "وهي ظالمة" أي أهلها ظالمون (قرطبي ۸۲/۹)

{۲۱۴} "وكذلك اخذ ربك......" فبيّن انّ كل من شارك اولئك المتقدمين في فعل ما لا ينبغي، فلا بدّ ان يشاركهم في ذلك الأخذ الاليم الشديد (كبير ۳۹۷/۱۸،۶)

{۲۱۵} "انّ في ذلك لآية" اى لعبرة وموعظة (قرطبي ۸۲/۹)

{۲۱۶} (مظهري ۸۸/۶)

مخلوقات حاضر ہوں گی کوئی غائب نہ ہوگا۔{۲۱۷}

حکمت وہدایت:

۱......قرآنی قصے صرف سماعتوں کی لذت کے لیے بیان نہیں ہوئے بلکہ عبرت ونصیحت کے لیے لائے گئے ہیں تاکہ پہلی امتوں کی ہلاکت کو سامنے رکھتے ہوئے اُن جیسے گناہوں سے باز رہا جائے۔

۲......انبیائے سابقین کے قصص ٹھیک ٹھیک بیان کرنا ہمارے آقا ﷺ کی نبوت ورسالت کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔(۱۰۰)

۳......کفروشرک کے مرتکب افراد کو ہلاک کرنا ظلم نہیں تقاضائے عدل ہے، اس لیے کہ ان کی ہلاکت کا سبب ان کا اپنا ظلم ہی ہوتا ہے۔(۱۰۱)

۴......جب اللہ مجرموں کو پکڑے گا تو اس وقت ان کے معبودانِ باطلہ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔(۱۰۱)

۵......ظلم انتہائی قبیح عمل ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے افراد ہمیشہ بُرے انجام سے دوچار ہوئے ہیں، اس لیے ظالموں کو ظلم سے توبہ کرتے ہوئے اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔(۱۰۲)

۶......ایمان بالآخرۃ مؤمنین کا ایک امتیازی وصف ہے۔(۱۰۳)

۷...... "ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ" سے علماء نے اثباتِ حشر پر استدلال کیا ہے۔(۱۰۳) اس دن تمام نیکوکاروں اور گناہگاروں کو جمع کر کے عدل کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔

سعداء، اشقیاء اور ان کا انجام

﴿۱۰۴......۱۰۹﴾

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ

اور اس کو ہم دیر جو کرتے ہیں سو ایک وعدہ کے لیے جو مقرر ہے ۝ جس دن وہ آئے گا بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اس کے حکم سے، سو ان میں

شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾

بعض بدبخت ہیں اور بعضے نیک بخت ۝ سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا ۝

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا

ہمیشہ رہیں اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب کر ڈالتا ہے

{۲۱۷} يشهده أهل السماء والأرض (تنوير المقباس من تفسير ابن عباس/۲۴۳)

یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

جو چاہے ○ اور جو لوگ نیک بخت ہیں سو جنت میں ہیں، ہمیشہ رہیں اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا

مگر جو چاہے تیرا رب بخشش ہے بے انتہا ○ سو تو نہ رہ دھوکے میں ان چیزوں سے جن کو پوجتے ہیں یہ لوگ، کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی

یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

جیسا کہ پوجتے تھے ان کے باپ دادے اس سے پہلے اور ہم دینے والے ہیں ان کو ان کا حصہ یعنی عذاب سے بلا نقصان ○

ربط: ظالم قوموں اور ان کا انجامِ بد ذکر کرنے کے بعد اب کفر وفسق سے ڈرایا جا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت کی ترغیب دی جا رہی ہے تاکہ انسان ہمیشہ کے خسارے سے بچ جائے اور دائمی مسرتوں کا حقدار بن جائے۔

تسہیل: اس دن کو لانے میں ہم صرف اس لیے تاخیر کر رہے ہیں کیونکہ اس کا وقت متعین ہو چکا ہے ○ جس وقت وہ دن آ جائے گا، اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بھی شخص بات نہیں کر سکے گا، پھر ان میں سے کسی کا شمار بدبختوں میں ہوگا اور کسی کا نیک بختوں میں ○ ان میں سے جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے، وہاں انہیں چیخنا اور دھاڑنا ہوگا ○ اس میں وہ ہمیشہ کے لیے پڑے رہیں گے جب تک آسمان اور زمین باقی ہیں، ہاں اگر تیرا رب کسی کو نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے کیونکہ تیرا رب جس کام کا ارادہ کر لے اسے عملی جامہ پہنا سکتا ہے ○ باقی رہے وہ لوگ جو نیک بخت ہیں، ان کی جنت میں سکونت ہمیشہ کے لیے ہوگی جب تک آسمان اور زمین باقی ہیں، البتہ اگر تیرا رب کسی کو جنت سے نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ جنت میں داخلہ ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی ○ تو اے مخاطب! یہ مشرک جن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں تم ان کے باطل ہونے کے بارے میں ذرا بھی شک نہ کرنا، کسی دلیل کے بغیر یہ ویسے ہی عبادت کرتے ہیں جیسے ان کے باپ دادا کرتے تھے اور ہم قیامت کے دن کسی کمی کے بغیر ان کے عمل کی پوری پوری جزا انہیں دے دیں گے ○

تفسیر

﴿۱۰۴﴾......قیامت کا آنا یقینی ہے، اس کے وقوع کی تاریخ بھی متعین ہو چکی مگر انسان کو اس کا علم نہیں، جب وہ تاریخ آ جائے گی، قیامت برپا ہو جائے گی۔

﴿۱۰۵﴾......اس وقت ایسا ہولناک منظر ہوگا کہ کوئی لب کشائی کی جرأت نہ کر سکے گا، اگر کوئی بات کرے گا تو اللہ کی اجازت سے کرے گا مگر اجازت طلب کرنا بھی کارے دارد ہوگا۔

دنیا میں شہرت وشہوت، جاہ ومنصب، دولت وطاقت، جوانی اور قوت، اولاد اور قبیلے کے غرور میں سرشار بڑے بڑے متکبر سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور اس قدر خوفناک منظر ہوگا کہ انبیاء ورسل بھی ''ربِ سلّم ربِ سلّم'' (اے اللہ! بچالے، اے اللہ! بچالے) پکار رہے ہوں گے، انسان دو گروہوں میں تقسیم ہوں گے، ایک وہ جو ذلت و رسوائی کا شکار ہوں گے اور دوسرے وہ جو دائمی عزّت کے مستحق ٹھہریں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک سعادت وشقاوت کا معیار یہ ہے کہ:

''حظیرۃ القدس میں تمام انسانیت کے لیے انسانِ اکبر کا ایک نمونہ موجود ہے، اسے روحِ اعظم بھی کہتے ہیں۔ جو انسان اس نمونے کے جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی سعید اور جو جتنا دور ہوگا اتنا ہی شقی ہوگا۔'' {۲۱۸}

یعنی نبی اکرم ﷺ کے اسوہ کو اپنانا سعادت اور اس سے اعراض کرنا شقاوت کی دلیل ہے۔

﴿۱۰۶﴾......جن بدبختوں کے لیے دوزخ کا فیصلہ ہوگا وہ حسرت ویاس اور شدتِ غم کی وجہ سے گدھوں کی طرح چنگھاڑیں گے۔

﴿زَفِيْرٌ﴾ گدھے کے ہانکنے کی ابتدائی آواز کو ''زَفِيْرٌ'' اور آخری آواز کو ''شَهِيْقٌ'' کہتے ہیں۔ {۲۱۹}

﴿۱۰۷﴾...... ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ کافروں کا مقدر جہنّم کا دائمی عذاب ہے۔

﴿مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ عربی زبان میں یہ محاورہ اور اس سے ملتے جلتے کئی محاورے دوام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ {۲۲۰}

جیسے جنتی ہمیشہ جنت میں رہیں گے یونہی دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لیکن ان کا جنت اور دوزخ میں ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوگا، ظاہر ہے دنیا اور آخرت کا کوئی بھی معاملہ اللہ کی مشیت سے خارج نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی اس کی مشیت سے ہے اور جو کچھ ہوگا وہ بھی اس کی مشیت سے ہوگا۔

﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ خلود اور دوام سے جو استثناء ہے، وہ یہ بتانے کے لیے نہیں ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب دوزخی، دوزخ سے اور جنتی، جنت سے نکل جائیں گے بلکہ دوام کو مشیت سے مقید کرنے کے لیے ہے یعنی اگر اللہ چاہے تو دوام کو موقوف کرسکتا ہے مگر ایسا ہوگا نہیں کیونکہ وہ دوام کا وعدہ کرچکا ہے۔ {۲۲۱}

{۲۱۸} (بحوالہ معالم العرفان ۵۳۶/۹......از حضرت سواتی رحمہ اللہ)

{۲۱۹} ''زفیر'' صوت کزفیر الحمار فی صدرہ وھو اوّل ماینھق...... ''شھیق'' کشھیق الحمار فی حلقه وھو آخر ما یفرغ من نھیقه۔ (تفسیر ابن عباس/۲۴۳)

{۲۲۰} ''مادامت السمٰوٰت والارض''...... ھذا عبارة عن التابید ونفی الانقطاع علی منھاج قول العرب (روح المعانی ۷،۲۱۱/۱۲)

{۲۲۱} ''الّا ماشاء ربّك''......فالمعنی انه لوشاء أن یخرجھم لأخرجھم ولكنه قد أعلمھم أنھم خالدون فیھا (قرطبی ۸۶/۹)

آیت میں جو "السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" (آسمانوں اور زمین) کا ذکر ہے۔

تو بعض حضرات اس سے دنیا کا آسمان اور زمین مراد لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کفار اور مشرکین اتنا عرصہ دوزخ میں رہیں گے جتنا عرصہ دنیا کے ارض و سماء باقی رہے، اور اس سے زائد جو ان کی مدتِ قیام ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔{۲۲۲} جبکہ دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے آخرت کے ارض و سماء مراد ہیں جن کے لیے زوال اور فنا نہیں، جیسے آخرت کی زمین اور آسمان ہمیشہ باقی رہیں گے یونہی دوزخی، دوزخ میں اور جنتی، جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

امام زمخشری کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں دوام سے جو استثناء ہے وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور ایسا وقفہ آئے گا جب کچھ دیر کے لیے دوزخیوں کو دوزخ سے نکالا جائے گا اور ایسا اس وقت ہوگا جب انہیں آگ کے بجائے شدید سردی جیسے دوسرے عذابوں سے دوچار ہونا پڑے گا، یونہی اہلِ جنت کو جنت سے بھی بڑھ کر اللہ کی رضا سے نوازا جائے گا۔{۲۲۳}

﴿اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ "تیرا رب جس کام کا ارادہ کرلے اسے عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔"

اشارہ ہے اس طرف کہ ایسا نہیں کہ یہ خلود اللہ پر واجب ہے اور وہ اس کے خلاف نہیں کرسکتا{۲۲۴} وہ تو مالک و مختار ہے، جو چاہے کرے، اسے کوئی نہیں پوچھ سکتا:

﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾{۲۲۵} "وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی جوابدہی نہیں کی جاسکتی اور مخلوق سے پرسش ضرور ہوگی۔"

﴿۱۰۸﴾......اہلِ دوزخ کے مقابلے میں سعید روحیں آخرت کی دائمی اور لازوال نعمتوں سے نوازی جائیں گی، کلفتیں ختم اور راحتیں شروع ہوں گی اور راحتیں بھی کیسی؟ ہمیشگی کی اور انسانی ادراک سے بالاتر!

﴿عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ "جنت میں داخلہ ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔"

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے ابنِ زید کے حوالے سے لکھا ہے کہ جنتیوں کے لیے تو اللہ نے اپنی ابدی عطاؤں کا ذکر کیا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں نہیں بتایا کہ دوزخیوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ ان کا عذاب بھی کبھی ختم ہوجائے گا یا لازوال ہوگا؟ بلکہ ان کے بارے میں فرمایا:

{۲۲۲} (موضح القرآن / ۳۰۲)
{۲۲۳} (کشاف ۲/ ۱۱۶)
{۲۲۴} ذکر بعض الأفاضل ان فائدته دفع توهم كون الخلود امرًا واجبًا عليه تعالىٰ لايمكن له سبحانه نقضه كما ذهب اليه المعتزلة۔ (روح المعانی ۷، ۱۲/ ۲۱۷)
{۲۲۵} (الانبياء ۲۱/ ۲۳)

﴿إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ {۲۲۶}

تعجب ہے کہ اتنی کمزور بات کیسے فرمادی گئی، جبکہ کفار کے لیے متعدد آیات میں دائمی عذاب کا ذکر ہے، سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ﴾ {۲۲۷}

سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا﴾ {۲۲۸}

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ﴾ {۲۲۹}

اور خود یہاں جو فرمایا جارہا ہے اسے ایک بار پھر پڑھ لیا جائے:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

ان صریح نصوص اور اجماعِ امت {۲۳۰} کے بعد بھی بھلا یہ کہنے کی حاجت باقی رہتی ہے کہ کافر دائمی عذاب کا مستحق ہے یا نہیں؟

﴿۱۰۹﴾ ...... ﴿فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ﴾ ''اے مخاطب! یہ مشرک جن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کے باطل ہونے کے بارے میں ذرا بھی شک نہ کرنا۔''

یہ خطاب تو نبی اکرم ﷺ سے ہے مگر روئے سخن قرآن کے ہر سامع اور قاری کی طرف ہے کہ جب تم اللہ کی سنت اور دستور جانتے ہو تو مشرکین کی عبادت اور ان کے معبودوں کے انجام بارے کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہو جاؤ، ان کے معبود بھی باطل اور ان کی عبادت بھی فضول اور ضائع! اور ان پر عذاب کا آنا قطعی اور یقینی ہے۔

﴿وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ﴾ باقی رہے ان کے نیک اعمال مثلاً صلہ رحمی، احسان، ایثار وغیرہ تو ہم ان کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں صحت، وسعتِ رزق اور اولاد وغیرہ کی صورت میں دے دیں گے۔

{۲۲۶} (مظہری ۹۶/۶)
{۲۲۷} (البقرۃ ۱۶۷/۲)
{۲۲۸} (المائدۃ ۳۷/۵)
{۲۲۹} (النساء ۴۸/۴)
{۲۳۰} وأما الجمهور الأعظم من الأمة فقد اتفقوا على ان عذاب الكافر دائم (کبیر ۴۰۱/۱۸،۶)

حکمت وہدایت:

۱......وقوعِ قیامت یقینی اور قطعی ہے۔(۱۰۴)اس کی آمد میں تاخیر اللہ کی تکوینی حکمت کی وجہ سے ہورہی ہے۔

۲......قیامت کے دن کسی کو اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت وغیرہ کی بابت کلام کی جسارت نہ ہوگی۔(۱۰۵)وہ سب لوگ غلطی پر ہیں جو اللہ کے نبیوں، ولیوں اور اپنے پیروں اور مشائخ کے بارے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سفارش سے اللہ کو فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔

۳......قیامت کے دن انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہوں گے، کچھ شقی اور بدبخت ہوں گے اور کچھ سعید اور نیک بخت!(۱۰۵)

۴......مومن ہمیشہ کے لیے جنّت میں رہیں گے اور کفار ہمیشہ کے لیے جہنم کی ہولناکیوں میں جھونک دیے جائیں گے۔(۱۰۶-۱۰۸)

۵......آباء واجداد کی تقلید کے علاوہ مشرکین کے پاس بت پرستی پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں۔

حکمِ استقامت

﴿۱۱۰......۱۱۵﴾

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی اور اگر نہ ہوتا ایک لفظ کہ پہلے فرما چکا تھا تیرا رب تو فیصلہ ہو

بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ

جاتا ان میں اور ان کو اس میں شبہ ہے کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا ۝ اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا دے گا رب تیرا ان کو

اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ

ان کے اعمال، اس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ۝ سو تو سیدھا چلا جا جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ

اور حد سے نہ بڑھو بے شک وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۝ اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی آگ اور

دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا

کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے ۝ اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں

مِّنَ الَّيۡلِ‌ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ‌ؕ ذٰ لِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ‌ ۚ‏﴿۱۱۴﴾ وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ

میں رات کے، البتہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو یہ یادگاری ہے یاد رکھنے والوں کو O اور صبر کر البتہ

اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ‏ ﴿۱۱۵﴾

اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا O

ربط: وقوعِ عذاب...... اسبابِ ہلاکت، تاخیرِ عذاب کی حکمت، تسلی رسول اور امتثالِ اوامر کی ترغیب، یہ وہ مضامین ہیں جو اس سے پہلے گزر چکے، اب یہاں سے آخر سورت تک انہی مضامین کا اعادہ ہے۔

تسہیل: اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی لیکن اس میں بھی قرآن کی طرح اختلاف کیا گیا اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تمہارے رب کی طرف سے پہلے سے طے ہو چکی ہے تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور یہ لوگ اس فیصلہ کن چیز کے بارے میں ایسے شک میں ہیں جس نے انہیں تردّد میں ڈال رکھا ہے O سارے انسانوں کے لیے قانون یہی ہے کہ تیرا رب ان کے اعمال کا بدلہ انہیں پورا پورا دے گا، بلاشبہ وہ ان کے سارے اعمال سے باخبر ہے O اے میرے حبیب! جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر آپ خود بھی اور وہ لوگ بھی ثابت قدم رہیں جو توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں اور دین کے دائرے سے باہر نہ نکلو، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے O اے مسلمانو! ظالموں کی طرف میلان مت رکھو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھو سکتی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست نہیں، پھر تمہیں کہیں سے بھی مدد حاصل نہیں ہو سکے گی O اے میرے حبیب! دن کے دونوں سروں پر یعنی صبح وشام اور رات کے کچھ حصّے میں نماز پڑھا کریں، اس میں شک نہیں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ان لوگوں کے لیے ایک جامع نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرتے ہیں O اور مخالف حالات پر صبر کیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱۰﴾ ...... ﴿وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ ...... الخ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔'' ہم نے اپنے نبی موسیٰ کو تورات اس مقصد کے لیے دی تھی تاکہ ان کی قوم اس سے ہدایت حاصل کرے، کلمۂ ایمان انہیں ایک جماعت بنا دے اور وہ سب ایک ہی راستے پر چلیں مگر ایسا نہ ہو سکا، ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا، چودھراہٹیں اور مادی مفادات آڑے آ گئے اور ان میں سے جو بدنصیب تھے وہ سچائی کے قبول کرنے سے محروم رہے، لہٰذا اے محمد! آپ بھی قوم کے انکار اور تکذیب سے پریشان نہ ہوں، یہ بھی وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ﴾ اگر اللہ نے مہلت دینے اور معیّن وقت تک عذاب موخر کرنے کا پہلے سے فیصلہ نہ کیا ہوتا تو اب تک ان کا قصہ تمام ہو چکا ہوتا۔

﴿وَاِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ﴾ ''یہ لوگ شک میں ہیں'' ان لوگوں سے کون مراد ہیں؟ یہ بھی کہا گیا کہ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں، یہ بھی کہا گیا کہ مشرکینِ مکہ مراد ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ دونوں ہی مراد ہیں۔

﴿۱۱۱﴾...... ﴿وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ ......الخ﴾ ''تیرا رب ان کے اعمال کا بدلہ انہیں پورا پورا بدلہ دے گا'' شاید آج کے دور میں پوری طرح یہ بات سمجھ نہ آسکے کہ اس قسم کی آیات نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے زخمی دلوں کے لیے کیسے سکون آور مرہم کا کام دیتی ہوں گی۔ صورت یہ تھی کہ ایک طرف وہ مخالفین تھے جو مادی اور افرادی اعتبار سے مسلمانوں پر حاوی تھے دوسری طرف مسلمان تھے جن کی تعداد بھی کم تھی اور وسائل بھی نہیں تھے البتہ اللہ پر اور اس کے وعدوں پر انہیں کامل اعتماد تھا، ان حالات میں جب انہیں بارگاہِ الٰہی سے یہ خوشخبری سنائی جاتی کہ دشمن کے مقابلے میں تم تنہا نہیں ہو تمہارا رب تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے دشمن کی کرتوتوں اور تدبیروں سے باخبر ہے اور وہ انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا تو سخت خوف و ہراس کی فضا میں بھی انہیں قلبی اطمینان نصیب ہو جاتا تھا۔

﴿۱۱۲﴾...... ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ......الخ﴾

استقامت:

اس آیتِ کریمہ میں حضورِ اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے، دائیں بائیں ہوئے بغیر صراطِ مستقیم پر چلتے رہنے کو استقامت کہتے ہیں، اس میں ساری ظاہری اور باطنی اطاعات کرنا اور سارے گناہوں سے بچنا آ جاتا ہے۔{۲۳۱}

اسی سے ملتی جلتی تعریف حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے بھی کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے اللہ کے حکم کو مضبوطی سے پکڑنے کو استقامت کہا جاتا ہے۔''{۲۳۲}

استقامت ایسا جامع وصف ہے جو دین کے سارے شعبوں کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے، اس کا تعلق اقوال اور افعال سے بھی ہے اور احوال اور نیات کے ساتھ بھی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ اصل استقامت، عقیدۂ توحید پر دل کی استقامت ہے، چونکہ دل سارے اعضاء کا بادشاہ ہے اس لیے اگر دل اللہ کی محبت و معرفت، خشیت اور عظمت پر جما

{۲۳۱}(جامع العلوم والحکم/۱۹۳)
{۲۳۲}(فتح الباری ۱۳/۲۵۷)

رہے، امیدیں بھی اسی سے رکھے اور ڈرے بھی اسی سے تو سارے اعضاء بھی عبادت اور اطاعت میں لگے رہتے ہیں۔

اہلِ علم کہا کرتے ہیں:

﴿الاستقامة فوق الكرامة﴾ ''استقامت کرامت سے بڑی چیز ہے۔''

پرندوں کی طرح فضا میں اڑنا، مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا اور پتنگوں کی طرح آگ میں کود جانا آسان ہے مگر انسانوں کی طرح زمین پر رہنا اور کسی بھی شعبے میں حکمِ الٰہی سے ذرہ برابر انحراف نہ کرنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے آقا ﷺ اپنے صحابہ کو استقامت کی تلقین فرمایا کرتے تھے، حضرت سفیان بن عبداللہ الثقفی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر عرض کیا، یارسول اللہ! مجھے اسلام میں ایسی نصیحت فرمایئے کہ مجھے آپ کے بعد کسی دوسرے سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے، آپ نے فرمایا:

﴿قل آمنت بالله ثمّ استقم﴾ {۲۳۳} ''کہہ دو، میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر جم جاؤ۔''

علماء نے اس کلمہ کو ''جوامع الکلم'' میں سے شمار کیا ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''زندگی کی آخری سانس تک اللہ کی توحید اور عبادت وطاعت پر جمے رہو۔'' بتایئے! قرآن اور حدیث کی ساری تعلیمات کا خلاصہ یہی نہیں تو اور کیا ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ سرورِ دوعالم ﷺ نے فرمایا:

﴿شيّبتني هود واخواتها﴾ {۲۳۴} ''مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔''

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ چونکہ سورۂ ہود اور اس سے ملتی جلتی سورتوں میں پہلی امتوں پر آنے والے عذاب کا ذکر ہے اور اپنی امت پر شفیق اور مہربان ہونے کی وجہ سے چونکہ آپ کو یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں میری امّت پر بھی ویسا عذاب نازل نہ ہو جائے جیسا پہلی امتوں پر نازل ہوا، تو اس فکر اور غم سے آپ پر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہو گئے {۲۳۵}

لیکن دوسرے علماء کی رائے کچھ اور ہے، امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابوعلی السّری کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہیں خواب میں سرورِ دوعالم ﷺ کی زیارت ہوئی تو انہوں نے سوال کیا کہ ''شیّبتنی ہود'' یہ آپ ہی کا ارشادِ گرامی ہے؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے پوچھا ''کیا سابقہ قوموں کی ہلاکت کے واقعات آپ کے بڑھاپے کا سبب بنے؟'' آپ نے فرمایا نہیں! بلکہ یہ آیت میرے بڑھاپے کا سبب بنی ''فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ'' {۲۳۶}

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

{۲۳۳} (صحیح مسلم ۱، کتاب الایمان/۴۷...... دار المعرفة، بیروت)
{۲۳۴} (ترمذی ۲، ابواب التفسیر/۲۶۵)...... قال الترمذی رحمه الله هذا حديث حسن غريب)
{۲۳۵} (المحرر الوجيز لابن عطيه ۷/۴۳۱)
{۲۳۶} (قرطبی ۹/۹۲)

"ما نزلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم آیة أشدّ ولا أشق من هذه الآية"{۲۳۷}

''اس آیت سے زیادہ سخت آیت حضورِ اکرم ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔''

اگر کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ استقامت کا حکم دینے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پہلے استقامت پر نہ تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی عمل کا حکم ہمیشہ معدوم کو وجود دینے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ دوام اور استمرار کے لیے بھی ہوتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے، نبی کریم ﷺ اس آیت کے نزول سے پہلے بھی استقامت پر تھے، اللہ نے آپ کو ہمیشہ استقامت پر جمے رہنے کی تلقین فرمائی۔

﴿وَلَا تَطْغَوْا﴾ ''اور دین کے دائرے سے باہر نہ نکلو۔'' استقامت کا حکم دینے کے بعد اس کی ضد سے ممانعت ہے، دین کے دائرے میں رہنا استقامت ہے اور اس دائرے سے باہر نکلنا طغیان اور حدود اللہ سے تجاوز ہے، دین کے بارے میں غلو کرنے والے بھی استقامت کے دائرے سے نکل جاتے ہیں، اس لیے ہمارے آقا ﷺ نے میانہ روی کی تاکید فرمائی ہے، آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿الدّين يسر ولن يشادّ الدين أحد إلاّ غلبه فسدّدوا وقاربوا.﴾{۲۳۸}

''دین آسانی کا نام ہے، جو شخص تشدّد اختیار کرے گا، دین اس پر غالب آجائے گا، اس لیے میانہ روی اختیار کرو اور قریب قریب رہو۔''

﴿إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ ''تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔''

چونکہ اللہ تمہارے ہر ہر عمل کو دیکھتا ہے، اس لیے تم طغیان اور غلو سے بچتے ہوئے استقامت اور اعتدال والی زندگی گزارو۔

﴿۱۱۳﴾...... ﴿وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ ''اور اے مسلمانو! ظالموں کی طرف میلان مت رکھو۔''

یہ قرآن کا ایک انداز ہے کہ وہ بعض اوقات کسی عمل کی مذمت اور قباحت بیان کرنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع کر دیتا ہے، جب اس کے قریب جانا بھی گناہ ہے تو اس عمل کا ارتکاب کتنا بڑا گناہ ہوگا؟ مثلاً سورۂ اسراء میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ﴾{۲۳۹} ''زنا کے قریب نہ جاؤ۔''

{۲۳۷} (غرائب القرآن للنیسابوری/۶۹)
{۲۳۸} (بخاری ۱، کتاب الایمان/۱۰)
{۲۳۹} (الاسراء ۱۷/۳۲)

اسی طرح یہاں بھی مسلمانوں کو ظالموں کی طرف میلان رکھنے سے منع کیا گیا ہے کہ تمہارا یہ میلان بھی ظلم شمار ہوگا اور تمہیں دوزخ کا ایندھن بنانے کا ذریعہ بنے گا، واضح رہے کہ ظالموں سے محبت، ان سے دوستی، ان کے ظلم پر رضامندی، ان پر اعتماد اور ان کے سلسلے میں مداہنت یہ سب ان کی طرف میلان کی ایسی صورتیں ہیں جن پر شدید عذاب کی وعید آئی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہنم میں ایک وادی ہے جو ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو مداہن ہوں اور ظالم سے میل جول رکھتے ہوں۔ {۲۴۰}

بعض علماء سے سوال کیا گیا کہ:

''اگر کوئی ظالم شخص پیاس کی حالت میں مر رہا ہو تو کیا اسے پانی پیش کیا جائے؟''

جواب ملا: ''نہیں''

سائل نے کہا: ''اگر وہ اسی پیاس کی حالت میں مر گیا تو......؟''

فرمایا: ''مرنے دو، اس کی موت ہی مظلوم لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلائے گی۔'' {۲۴۱}

علامہ صابونی یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اتنا سخت حکم اس ظالم کے لیے ہے جس کا ظلم انتہا کو پہنچ چکا ہو، وہ قتل و غارت گری کا خوگر بن جائے اور اولیاء و صلحاء بھی اس کی بے رحم تلوار سے محفوظ نہ رہیں۔

﴿وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ﴾ اگر ظالموں کی طرف میلان کی وجہ سے تم اللہ کی پکڑ میں آ گئے تو تمہاری حمایت اور مدد میں کوئی بھی کھڑا نہ ہوگا حتیٰ کہ خود ظالم بھی تمہاری کسی قسم کی مدد نہیں کر سکے گا۔

﴿۱۱۴﴾......آیتِ کریمہ میں غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں نمازِ پنجگانہ کا حکم دیا ہے، اس لیے کہ "طَرَفَيِ النَّهَارِ" (دن کے دونوں سروں میں فجر، ظہر اور عصر تین نمازیں آ گئیں اور "زُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ" (رات کے کچھ حصے) میں مغرب اور عشاء آ گئیں۔ {۲۴۲}

﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (اس میں شک نہیں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔) کہا جا سکتا ہے کہ اس جملے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے نماز کا فائدہ ذکر فرمایا ہے، نماز بہت بڑا نیک عمل ہے، نماز نفس کی پاکیزگی اور رب

{۲۴۰} (غرائب القرآن للنیسابوری ۱۲/۶۹)

{۲۴۱} (قبس من نور القرآن الکریم ۹۲/۵)

{۲۴۲} "طرفی النھار وزلفا من اللیل" قال مجاھد و محمد بن کعب القرظی: الطرف الأول الصبح والثانی الظھر والعصر...... والمراد بصلاۃ الزلف عند الأکثر صلاۃ المغرب والعشاء۔ (روح المعانی ۲۳۴/۱۲،۷)

کی رضا کا ذریعہ ہے، یہ بندے کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، اگر تمام شرائط اور ارکان کا لحاظ رکھتے ہوئے نماز ادا کی جائے تو یہ برائیوں کو دور کردیتی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

﴿مامن مسلم یذنب ذنبا فیتوضّأ ویصلّی رکعتین إلاّغفرله﴾{۲۴۳}

''اگر کسی مسلمان سے (صغیرہ) گناہ سرزد ہوجائے، پھر وہ وضو کرکے دو رکعتیں پڑھ لے تو اس کا گناہ معاف ہوجاتا ہے۔''

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ سب کے سامنے ویسے وضو کیا جیسے رسول اللہ ﷺ وضو فرمایا کرتے تھے، اس کے بعد فرمایا کہ میں نے یونہی رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تھا اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

''جو شخص میری طرح وضو کرنے کے بعد دو رکعات اس طرح پڑھے کہ اس کے دل میں کوئی وسوسہ نہ آئے تو اس کے سابقہ گناہ معاف کردیے جائیں گے۔''{۲۴۴}

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیتِ کریمہ کا جو شانِ نزول بیان کیا ہے وہ بھی دیکھ لینا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں:

''أنّ رجلاً أصاب من امرأة قبلة فأتی رسول اللہ ﷺ فذکر له ذلک فأنزلت إلیه ''أقم الصّلوٰة......الخ'' قال الرجل: ''ألِی ھذہ؟'' قال: ''لمن عمل بھا من أمّتی''{۲۴۵}

''ایک شخص نے کسی غیر محرم عورت سے بوس وکنار کرلیا اور نبی اکرم ﷺ سے اپنے اس فعل کا حکم اور اس سے پاکی کی صورت پوچھی تو آپ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس شخص نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ حکم صرف میرے لیے ہے؟ آپ نے فرمایا، نہیں! میری امت کے ہر گناہگار کے لیے ہے۔''

نیکیوں سے گناہوں کے معاف ہونے کے بارے میں جتنی بھی روایات اور آیات ذکر کی جاتی ہیں، علماء نے ان سے صغیرہ گناہ مراد لیے ہیں، ہمارے قریب کے زمانے کے مشہور مفسّر حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''سیئات'' سے مصیبتیں اور پریشانیاں مراد ہیں جو کہ نیک اعمال کی بدولت دور ہوجاتی ہیں، اس صورت میں

{۲۴۳}(مسند احمد ۱/۲،۱۰ ...... ترمذی ۲، ابواب التفسیر/۱۲۵ ......بتغیّر)
{۲۴۴}(بخاری ۱، کتاب الوضوء/۲۸ ..... مسلم ۱، کتاب الطھارة/۱۲۰)
{۲۴۵}(بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۷۸)

صغیرہ کی تاویل بھی نہیں کرنی پڑے گی۔{۲۴۶}

﴿ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ یہ امور (یعنی استقامت، غلو سے پرہیز، ظالموں سے قلبی مودت کا نہ رکھنا اور نماز کا قائم کرنا) یا قرآن{۲۴۷} نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

﴿۱۱۵﴾...... ﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ''اور صبر کیجیے، یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

بتادیا کہ مصائب پر صبر سمیت دیگر مشکل احکام کا سامنا دنیا میں ضرور کرنا پڑے گا، نفس پر یہ شاق بھی گزریں گے لیکن ان کا اجر ثابت شدہ ہے جو ہر حال میں مل کر رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیے گئے اجر وثواب کے یہی وعدے ایک مومن کے لیے ایسا روحانی زادِ سفر ہیں جو اسے اللہ کی راہ میں بڑی سے بڑی مشقت اور اذیت برداشت کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

حکمت و ہدایت:

۱......دنیا میں آنے والے ہر نبی کی دعوت کے بعد دو گروہ سامنے آئے، ایک وہ، جنہوں نے دل وجان سے اس ایمانی دعوت کو قبول کیا اور دوسرے وہ جنہوں نے کفر وتکذیب کا راستہ اختیار کیا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو اللہ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کا منکر تھا اور ہمارے آقا ﷺ کے زمانہ کے کفار کا رویہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔

۲......نبی اکرم ﷺ کو تسلی ہے اور کفار کی ضد وہٹ دھرمی کی وجہ سے آپ کے معصوم دل میں جو قلق پیدا ہوتا تھا، اس کا ازالہ ہے۔(۱۱۰)

۳......تمام انبیاء کے ساتھ انسانوں کا معاملہ ایک جیسا رہا ہے، بعض نے ان کی دعوت قبول کی اور بعض نے انکار کردیا۔(۱۱۰)

۴......دنیا چونکہ دار الجزاء نہیں اس لیے یہاں کفار ومشرکین کو ڈھیل دی جاتی ہے، یہی تاخیرِ عذاب کی حکمت ہے۔(۱۱۰)

۴......فطرت میں کج روی ہو تو انسان کلام اللہ میں بھی شک اور تردّد کا شکار رہتا ہے۔(۱۱۰)

۵......اُخروی جزا (اچھی ہو یا بری) ضرور مل کر رہے گی، اس سے کسی صورت بھی مفر نہیں۔(۱۱۱)

۶......جسے استقامت نصیب ہوگئی اسے ولایت حاصل ہوگئی، اللہ نے قرآنِ کریم میں جو بشارتیں اولیاء کے لیے بیان فرمائی ہیں وہی بشارتیں اصحابِ استقامت کے لیے بھی بیان فرمائی ہیں، تقابل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس کی

{۲۴۶} (جواہر القرآن ۲/۵۱۵)

{۲۴۷} ''ذلك''...... اشارة إلى قوله تعالى: ''فاستقم'' وما بعده، وقيل: إلى القرآن۔(ابی سعود ۳/۳۵۷)

آیت ۶۲ اور ۶۳ اور پھر حٰم السجدۃ کی آیت ۳۰۔

۷..... استقامت کا مطلب حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ادا کرنا ہے، نیز جس طرح نبی اور امتی کے مرتبہ میں فرق ہے یونہی ان کے درجۂ استقامت میں بھی فرق ہوتا ہے۔{۲۴۸}

۸..... دین میں غلو کا انجام ہلاکت ہے۔(۱۱۲)

۹..... ظالموں کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق اور دوستی اللہ کے غضب کا سبب ہے۔(۱۱۳)

۱۰..... تمام شرائط اور اوصاف کا لحاظ کرتے ہوئے نماز کا ادا کرنا انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے۔

۱۱..... حسنات کی برکت سے صغیرہ گناہ توبہ کے بغیر ہی معاف کر دیئے جاتے ہیں۔(۱۱۴)

۱۲..... ملکۂ طاعت کے غلبہ کی وجہ سے معصیت کا مادہ مضمحل ہو جاتا ہے۔{۲۴۹}(۱۱۴)

۱۳..... قرآن سے ہدایت و نصیحت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دل میں انابت ہو۔(۱۱۴)

۱۴..... صبر مؤمنین کے اوصاف میں سے ایک خاص وصف ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔(۱۱۵)

امم سابقہ کی ہلاکت کا سبب

﴿۱۱۶......۱۱۹﴾

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثرِ خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے

اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا

ملک میں؟ مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچالیا ان میں سے اور چلے وہ لوگ جو ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور

مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ

تھے گناہ گار O اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے بستیوں کو زبردستی سے اور لوگ وہاں کے نیک ہوں O اور اگر

شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۗ

چاہتا تیرا رب کر ڈالتا لوگوں کو ایک راستہ پر اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں O مگر جن پر رحم کیا تیرے رب نے

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا ہے اور پوری ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے O

{۲۴۸} (بیان القرآن حصہ اول، ۵/۶۵)

{۲۴۹} (حوالہ مذکورہ)

ربط : پہلی قوموں پر اللہ کا جو عذاب نازل ہوا، اسے بیان کرنے کے بعد یہاں عذاب کے دوسبب بیان کیے جار ہے ہیں، ایک تو یہ کہ ان میں ایسے لوگ نہ تھے جو انہیں زمین میں فساد پھیلانے سے منع کرتے، دوسرا یہ کہ ظالم لوگ عیش و عشرت میں مگن ہو گئے تھے۔

تسہیل: ایسا کیوں نہ ہوا کہ جو قومیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں کچھ ایسے سمجھ دار لوگ ہوتے جو انہیں ملک میں فتنہ اور فساد پھیلانے سے منع کرتے؟ سوائے ان چند لوگوں کے جنہیں ہم نے عذاب سے بچالیا تھا اور ظالم لوگ اسی عیش و عشرت میں مگن رہے جو انہیں حاصل تھی اور وہ عادی مجرم تھے O اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو کفر کی وجہ سے ہلاک کر دے جبکہ وہاں کے باشندے کارِ اصلاح میں لگے ہوں O اور اگر تیرا رب چاہتا تو سارے انسانوں کو ایک ہی طریقے پر کر دیتا مگر ایسا کرنا حکمت کے خلاف تھا اس لیے آج بھی ان میں اختلاف ہے اور آئندہ بھی اختلاف کرتے رہیں گے O بجز ان لوگوں کے جن پر تیرا رب رحم کرے اور اسی لیے انہیں پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا O

تفسیر

﴿۱۱۶﴾...... اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قوموں کی نجات اور تباہی کے لیے اپنا دستور بتایا ہے، وہ یہ کہ اگر کسی قوم میں ظلم اور فساد کا چلن ہو جائے، عیش و عشرت ان کی پہچان بن جائے، انسان اپنے جیسے انسانوں کو غلام بنانے پر تل جائے اور اللہ کے حکم ٹوٹنے لگیں لیکن اللہ کے کچھ نیک بندے ایسے موجود ہوں جو اصلاحِ احوال کی کوشش میں لگے ہوں، برائی سے منع کرتے ہوں اور اپنی استطاعت کے مطابق ظالموں کا ہاتھ روکتے رہیں تو ایسی قوم ہلاکت سے بچ جاتی ہے لیکن جس قوم میں فتنہ و فساد عام ہو جائے مگر روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ ہو، عملی طور پر ظلم سے بچے ہوئے لوگ یا تو ظالموں سے سمجھوتہ کر لیں یا خاموشی اختیار کر لیں تو ایسی قوم کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

﴿۱۱۷﴾...... جو لوگ اصلاح کرنے والے ہوں، ان پر عذاب نازل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے ان پر ظلم کیا حالانکہ اللہ ظلم سے پاک ہے وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو قوم اپنے اجتماعی معاملات میں عدل و اصلاح کے اصولوں پر کار بند ہو اسے محض کفر و شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کیا جاتا۔ عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب حقوق العباد تلف ہونے لگیں اور ظلم کا دور دورہ ہو جائے، جیسا کہ قومِ مدین، قومِ ھود، قومِ فرعون اور ... میوں میں ہوا۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"ان الناس إذا رأوا المنكر فلم يغيّروه اوشك ان يعمّهم الله بعقاب منه." {۲۵۰}

"لوگ جب برائی دیکھنے کے باوجود بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کریں گے تو عمومی عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے۔"

﴿۱۱۸﴾......فطرتِ سلیمہ تو ہر انسان سے توحید کا مطالبہ کرتی اور شرک سے باز رہنے کی اپیل کرتی ہے، اگر مشیتِ الٰہی ہوتی تو اقوامِ عالم نقطۂ توحید پر متفق ہوتیں اور "اختلاف" نامی چیز سے انسانی سماعتیں نا آشنا ہوتیں، لیکن اگر ایسا ہوتا تو ایمان اختیاری نہ رہتا بلکہ جبری بن جاتا، جبکہ اللہ نے جزاء وسزا کو اختیاری ایمان پر مرتب فرمایا ہے، یعنی ہدایت وضلالت اوران کے نفع وضرر کو واضح فرما کر انسان کو اختیار دے دیا کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کر کے کسی ایک راستے کا انتخاب کرلے، اس اختیار کے استعمال میں انسان غلطی کرتا ہے اس لیے اختلاف ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

﴿۱۱۹﴾...... ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ﴾ "بجز ان لوگوں کے جن پر تیرا رب رحم کرے۔"

یعنی جس شخص پر اللہ نظرِ کرم فرمائے گا وہ حق سے اختلاف نہیں کرے گا۔

﴿وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ اپنی رحمت کے اظہار کے لیے اللہ نے نیک بختوں کو منتخب فرمایا اور اختلاف کے لیے اہلِ اختلاف کو پیدا کیا۔{۲۵۱}

اس قول کے مطابق "وَلِذٰلِكَ" میں جو لام ہے یہ تعلیل کے لیے ہے یعنی اختلاف اور رحمت مخلوق کو پیدا کرنے کی علت ہے جبکہ اہلِ سنت کی مشہور رائے یہ ہے کہ یہ لام، تعلیل کے لیے نہیں بلکہ "عاقبت" کے لیے ہے، مطلب یہ کہ انہیں اللہ نے جو پیدا کیا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ آپس میں اختلاف کرنے لگیں گے، یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۂ قصص میں ارشادِ باری ہے:

﴿فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا﴾ {۲۵۲}

"فرعون کے گھر والوں نے موسیٰ کو اٹھا لیا تا کہ وہ ان کا دشمن اور باعثِ غم بن جائے۔"

حالانکہ یقینی بات ہے کہ حضرت موسیٰ کو اٹھانے والوں کے پیشِ نظر یہ مقصد ہرگز نہ تھا البتہ اس کا انجام یہی نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہوئے۔

{۲۵۰} (جامع الأصول ۱/۳۳۱)

{۲۵۱} ولذلك خلقهم" للرحمة أهل الرحمة وللأختلاف خلق أهل الاختلاف (تنوير المقباس/۲۴۴)

{۲۵۲} (القصص ۲۸/۸)

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ اللہ کے علمِ قدیم اور تقدیر میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ جنوں اور انسانوں میں سے بعض جنت کے مستحق ہوں گے اور بعض جہنم کے، اور یہ کہ جہنم کو ایسے لوگوں سے بھر دیا جائے گا جو آسمانی تعلیمات سے رہنمائی حاصل نہیں کریں گے، یہ مضمون ایک حدیث میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان ہوا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جنت اور دوزخ کے درمیان مباحثہ ہوا، جنت نے کہا، میرا کیا ہے؟ میرے دامن میں تو صرف کمزوروں اور پسماندہ لوگوں کو جگہ دی جائے گی، دوزخ نے کہا، میرے ہاں بڑے بڑے متکبر، جابر اور سرکش آئیں گے، اللہ عزّ وجلّ نے جنت سے فرمایا، تو میری رحمت ہے، میں تیرے ذریعے جس پر چاہوں گا رحم کروں گا، اور دوزخ سے فرمایا، تو میرا عذاب ہے، میں تیرے ذریعے جسے چاہوں گا سزا دوں گا اور تم میں سے ہر ایک کو بھر دیا جائے گا، جنت میں زائد جگہ بچ جائے گی حتیٰ کہ اللہ اس کے لیے نئی مخلوق پیدا فرمائے گا جسے اس زائد جگہ میں بسایا جائے گا مگر دوزخ مسلسل کہتی رہے گی، کوئی اور بھی ہے؟ کوئی اور بھی ہے؟ حتیٰ کہ اللہ رب العزّت اپنا قدم اس میں رکھ دیں گے تو وہ کہے گی، بس، بس!'' {۲۵۳}

حکمت و ہدایت:

۱......امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے اور جب تک یہ فریضہ سرانجام دیا جاتا رہے گا، دنیا کلی ہلاکت سے محفوظ رہے گی۔ (۱۱۶)

۲......آسودگی اور فارغ البالی عموماً فسق وعصیان کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ (۱۱۶)

۳......اہلِ کفر کی ہلاکت یقینی ہے تو اہلِ حق کی نجات مسلّم ہے۔ (۱۱۷)

۴......صرف کفر کسی قوم کی ہلاکت کا سبب نہیں بنتا جب تک کہ مالی ومعاشرتی خرابیاں بھی اس معاشرے میں جڑ نہ پکڑ لیں، جیسے قومِ شعیب جو ناپ تول میں کمی کرتی تھی اور قومِ لوط جو اغلام بازی میں مبتلا تھے۔ (۱۱۷)

۵......اگر اللہ چاہتا تو اسے یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ تمام انسانوں کو ہدایت یا گمراہی میں سے کسی ایک پر جمع فرما دیتا لیکن تکوینی حکمت اس کی مقتضی نہیں تھی اس لیے بنیادی عقائد میں ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے اور قیامت تک رہے گا۔ (۱۱۸)

۶......یوں تو کفر وشرک دنیا وآخرت میں عذابِ شدید کا سبب ہیں لیکن دنیوی عذاب میں کفر وشرک سے زیادہ دیگر گناہوں اور جرائم کا دخل ہے البتہ اس میں شک نہیں کہ آخرت میں جس قدر شدید عذاب شرک پر ہوگا کسی اور گناہ پر نہیں ہوگا۔

۷......''مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ'' ان الفاظ سے اہلسنت والجماعت اپنے اس دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں کہ ہدایت اور ایمان

{۲۵۳} (بخاری ۲، کتاب الرد علی الجهمية وغيرهم التوحيد/ ۱۱۱:)

اللہ کی تخلیق اور عطا کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے اس لیے کہ قدرت اور عقل، رسولوں کی بعثت اور کتابوں کا نزول یہ سب چیزیں تو کفار کے حق میں بھی حاصل ہیں لہٰذا ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ اس رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں میں ہدایت اور معرفت پیدا فرمادیتے ہیں۔(۱۱۹)

۸......تخلیقِ کائنات کے دو مقصد ہیں:

☆......تشریعی: اور وہ عبادت ہے۔

☆......تکوینی: اپنے کسب و اختیار سے حق و باطل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے والے دو گروہوں کی موجودگی اور پھر اہلِ حق کا اللہ کی رحمت اور اہلِ باطل کا اللہ کے غضب کا مظہر بننا۔{۲۵۴}(۱۱۹)

۹......قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ازل سے جنت کو اہلِ جنت اور دوزخ کو اہلِ دوزخ سے بھرنا طے کر رکھا تھا۔(۱۱۹) اور حدیث میں بھی اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جنت و جہنم کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا:

"لکلّ واحد منهما ملؤها"{۲۵۵} "ان دونوں (جنت اور دوزخ) میں سے ہر ایک کے لیے بھرنا ہے۔"

بیانِ قصص کی حکمت

﴿۱۲۰......۱۲۳﴾

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِى هَٰذِهِ الْحَقُّ

اور سب چیز بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو اور آئی تیرے پاس اس سورت میں تحقیق

وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا

بات اور نصیحت اور یادداشت ایمان والوں کو O اور کہہ دے ان کو جو ایمان نہیں لاتے کام کیے جاؤ اپنی جگہ پر ہم بھی

عَٰمِلُونَ ﴿١٢١﴾ وَانتَظِرُوٓا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿١٢٢﴾ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ

کام کرتے ہیں O اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں O اور اللہ کے پاس چھپی ہے بات آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف رجوع ہے

الْأَمْرُ كُلُّهُۥ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٢٣﴾

سب کام کا، سو اسی کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ اور تیرا رب بے خبر نہیں جو کام تم کرتے ہو O

{۲۵۴} (تفسیر عثمانی/۳۰۴)

{۲۵۵} (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۷۱۹)

تسہیل: اور رسولوں کے قصوں میں سے یہ قصے ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں اور ان قصوں کے ضمن میں آپ تک حق بات بھی پہنچ گئی اور ایمان والوں کو نصیحت اور یاد دہانی بھی حاصل ہو گئی O اے میرے پیغمبر! جو لوگ ایمان نہیں لاتے آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تم اپنی جگہ عمل کرو، ہم اپنی جگہ عمل کر رہے ہیں O تم اپنے اعمال کے نتیجے کا انتظار کرو ہم اپنے اعمال کے نتیجے کا انتظار کرتے ہیں O اور آسمانوں اور زمین میں غیب کی جتنی بھی باتیں ہیں ان کا علم صرف اللہ کو ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، تم اسی کی عبادت اور اسی پر توکل کرو اور تم جو کچھ کرتے ہو تمہارا رب اس سے بے خبر نہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۲۰﴾...... ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ﴾ (میرے محبوب!) سابقہ انبیاء کے قصص آپ کے ثبات واستقلال کے لیے ہیں تاکہ آپ پوری دلجمعی اور اطمینان سے اپنے مشن کو ترقی دیتے رہیں، مخالفین ومعاندین کے رویہ سے قلبی اضطراب میں مبتلا نہ ہوں اور مایوسی کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیں۔

اور ہم نے آپ کے لیے اس سورت میں {۲۵۶} تین امور ذکر کیے ہیں:

﴿الحق﴾ یعنی توحید و رسالت کے دلائل۔

﴿موعظۃ﴾ سابقہ نافرمان امتوں کے انجام سے عبرت آموزی۔

﴿ذکری﴾ اعمالِ صالحہ اور آخرت کی ترغیب اور فانی دنیا کی بے رغبتی۔ {۲۵۷}

﴿۱۲۱-۱۲۲﴾...... توحید و رسالت کے کھلے دلائل اور روزِ روشن کی طرح حق کے واضح ہونے کے باوجود اگر کفار اپنے کفر و شرک پر اڑے رہیں تو آپ فرما دیجیے کہ تم اپنے حال پر رہو ہم اپنے حال پر رہیں گے اور مجھے نقصان پہنچانے کے لیے تم جو تدبیر کر سکتے ہو کر گزرو، ہم نہ اپنی دعوت چھوڑیں گے نہ عبادت واطاعت۔

اپنے دلوں میں ہمارے لیے جو انجام سوچے بیٹھو ہو تم اس کا انتظار کرو ہم اللہ کے حکم کے مطابق تمہارے انجام کا انتظار کر رہے ہیں۔

﴿۱۲۳﴾...... ﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ زمین وآسمان کے مخفی امور جانتا ہے اور وہ تمام امور کا مرجع بھی ہے، آپ کے اور آپ کے اصحاب کے اعمال بھی اس کے سامنے ہیں اور مشرکین کے کرتوتوں سے بھی وہ باخبر

{۲۵۶} "جاءك في هذه" السورة (تنویر المقباس/۲۴۵)

{۲۵۷} (کبیر ۱۸،۶/ ۳۱۳)

ہے لہٰذا ہر ایک اپنے عمل کے مطابق جزا بھی پالے گا، آپ ان کے کفر وعصیاں پر دلگیر ہونے کے بجائے پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی عبادت میں لگے رہیں اور تمام معاملات میں اسی پر توکل اور اعتماد کریں، جو اللہ پر توکل کرے اللہ اسے کافی ہو جاتا ہے۔

کعب احبار سے منقول ہے کہ جس آیت پر سورۂ ہود کا اختتام ہو رہا ہے اسی پر تورات کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔{۲۵۸}

بہرحال سورۂ ہود کے شروع میں توحید و رسالت اور اختتام پر تمسک بالدین کا حکم ارشاد فرما کر بڑے منظم اور خوبصورت انداز میں اس کے مضامین کو سمیٹ دیا گیا۔

حکمت و ہدایت:

۱.....قرآن مجید میں مذکور قصصِ انبیاء کے فوائد میں سے چند نمایاں فوائد یہ ہیں:

☆ نبی کریم ﷺ کو تسلی۔

☆ کفار کا انجام ذکر کر کے مومنین کے لیے عبرت آموزی اور ان کے سامنے حق ویقین کا راستہ واضح کرنا۔

☆ فریضۂ رسالت پر ثابت قدمی اور مصائب و آلام پر صبر کی تلقین۔

☆ کفار کو ان کے اعمالِ بد اور انجامِ بد سے ڈرانا اور انہیں اس بات پر متنبہ کرنا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں جو کچھ کرنا چاہیں کر لیں، انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔(۱۲۰)

۲.....غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، کوئی نبی، ولی، قطب، ابدال عالم الغیب نہیں ہو سکتا۔(۱۲۳)

۳.....آخرت میں تمام مخلوقات کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی اور اس کے حکم کے بغیر کسی کا حکم نہیں چل سکے گا۔(۱۳)

۴.....انسان کا ہر ہر عمل اللہ کے علم میں ہے، اس سے کچھ بھی مخفی نہیں، لہٰذا وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا، نیکوکاروں کو ثواب سے محروم نہیں کرے گا اور منکرین کو ان کے انجام سے دوچار کیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔(۱۲۳)

۵.....عبادت بھی صرف اللہ ہی کی کرنی چاہیے اور کامل بھروسہ بھی اسی کی ذات پر ہونا چاہیے۔(۱۲۳)

☆☆☆☆☆

{۲۵۸} قال كعب الأحبار خاتمة التوراة خاتمة "هود" من قوله: ولله غيب السموٰت والارض......الخ- (قرطبی ۱۰۱/۹)

سُورَةُ يُوسُف
مَكِّيَّةٌ

﴿سورۂ یوسف کے اہم مضامین﴾

سورۂ یوسف مکّی ہے، اس میں ۱۱۱ آیات اور ۱۲ رکوع ہیں، چونکہ اس سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اس لیے اسے سورۂ یوسف کا نام دیا گیا۔

قرآنِ کریم میں دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات میں تکرار پایا جاتا ہے، لیکن یہ تکرار کھٹکتا نہیں ہے، ہر جگہ نئے الفاظ، نئی تعبیر، کوئی نہ کوئی نیا سبق، نئی عبرت اور نئی نصیحت پائی جاتی ہے۔

یہ واقعات چھوٹے چھوٹے خوبصورت ٹکڑوں کی صورت میں پورے قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں، ان ٹکڑوں کو جوڑنے سے پورا واقعہ سمجھ میں آتا ہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں تکرار نہیں، یہ واقعہ اول سے آخر تک پورے کا پورا سورۂ یوسف ہی میں مذکور ہے، دوسری سورتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کا نام تو آیا ہے لیکن ان کے واقعہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی کسی دوسری سورت میں مذکور نہیں ہے، اہلِ علم نے کہا ہے کہ مخالفین نہ تو قرآن کے ''مکرر'' قصوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ''غیر مکرر'' قصوں کا، حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو خود قرآن نے ''احسن القصص'' قرار دیا ہے کیونکہ اس قصّے میں جتنی عبرتیں اور نصیحتیں پائی جاتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسرے قصّے میں پائی جاتی ہوں، جامعیت کے اعتبار سے دیکھیں تو اس میں دین بھی ہے دنیا بھی، توحید وفقہ بھی ہے اور سیرت وسوانح بھی، خوابوں کی تعبیر بھی ہے اور سیاست وحکومت کے رموز بھی، انسانی نفسیات بھی ہیں اور معاشی خوشحالی کی تدبیریں بھی، حسن وعشق کی حشر سامانی بھی ہے اور زہد وتقویٰ کی دستگیری بھی، اس میں انبیاء اور صالحین کا تذکرہ بھی ہے اور ملائکہ اور شیاطین کا بھی، نبیوں اور ولیوں کا بھی تو چوپاؤں اور پرندوں کا بھی، بادشاہوں، تاجروں، عالموں اور جاہلوں کے حالات بھی ہیں تو راہِ راست سے ہٹ جانے والی عورتوں کی حیلہ سازی، مکاری اور حیا باختگی بھی، پھر اس قصہ میں مد بھی ہے جزر بھی، گمنامی بھی ہے اور شہرت بھی، غربت بھی ہے اور ثروت بھی، عزت بھی ہے اور ذلت بھی، صبر وثبات بھی ہے اور بندگی شہوت بھی۔

ایک بڑی خوبی جو اس قصہ میں پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس قصے کے ضمن میں حضورِ اکرم ﷺ اور ان کے مخالفین کے حال اور مستقبل کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے، یوسف علیہ السلام کی طرح ہمارے آقا ﷺ کے ساتھ بھی قریشی بھائیوں نے حسد کیا، قتل کے مشورے کیے، آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا، تین دن تک غارِ ثور میں روپوش ہونا پڑا، وہاں سے مدینہ ہجرت فرما گئے، وہاں بتدریج آپ کو عروج حاصل ہوا یہاں تک کہ آپ پہلی اسلامی مملکت کے سربراہ بن گئے، مکہ فتح ہوا تو قریشی بھائی نادم وشرمندہ ہوئے، انہیں آپ کے سامنے سرافگندہ ہونا پڑا، اسے حسنِ اتفاق کہیے یا عمداور

قصد کہ اس موقع پر آپ نے فرمایا:

''میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی، جاؤ تم آزاد ہو، تم پر کوئی الزام نہیں۔''

سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ اس قدر مشہور ہے کہ حقیقی مسلمان گھرانوں کے بچوں تک کو ازبر ہے، اس لیے اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ اجمالی طور پر ہم اسے بیان کر کے ان بصائر وعبر کو بیان کرنے پر خصوصی توجہ دیں گے جو اس قصہ سے ہم کو حاصل ہوتی ہیں، چونکہ سورۂ یوسف بارھویں اور تیرھویں دونوں پاروں میں آئی ہے اور یہ قصہ تسلسل کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس لیے ہم اس تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے پہلے پورے قصّے کا خلاصہ بیان کرتے ہیں اور پھر عبرتوں اور نصیحتوں کو بیان کریں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام ان میں سے غیر معمولی طور پر حسین تھے، ان کی سیرت اور صورت دونوں کے حسن کی وجہ سے والدِ گرامی قدر ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے، محبت کی ایک وجہ آپ کا اور آپ کے بھائی بنیامین کا سب سے چھوٹا ہونا بھی تھا جبکہ دونوں کی والدہ بھی انتقال کر چکی تھیں، چھوٹے بچے سے محبت انسان کی فطرت ہے، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ سے سوال کیا گیا کہ آپ کو اپنے بچوں میں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟ انہوں نے جواب دیا:

''چھوٹے سے جب تک کہ وہ بڑا نہ ہو جائے، غائب سے جب تک کہ وہ واپس نہ آ جائے اور بیمار سے جب تک کہ وہ تندرست نہ ہو جائے۔''

سیدنا یوسف علیہ السلام سے والد کی اس محبت کی وجہ سے بھائی حسد میں مبتلا ہو گئے، وہ اپنے والد کو تفریح کا کہہ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے اور آپ کو کنویں میں گرا دیا، وہاں سے ایک قافلہ گزرا، انہوں نے پانی نکالنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا تو اندر سے آپ نکل آئے، قافلہ والوں نے مصر جا کر بیچ دیا، عزیزِ مصر نے خرید کر اپنے گھر میں رکھ لیا، جوان ہوئے تو اس کی بیوی آپ پر فریفتہ ہوگئی، اس نے بُرائی کی دعوت دی، آپ نے اس کی دعوت ٹھکرا دی، عزیزِ مصر نے بدنامی سے بچنے کے لیے آپ کو جیل میں ڈلوا دیا، قید خانے میں بھی آپ نے دعوتِ توحید کا سلسلہ جاری رکھا جس کی وجہ سے قیدی آپ کی عزت کرتے تھے، بادشاہِ وقت کے خواب کی صحیح تدبیر بتانے کی وجہ سے آپ اس کی نظروں میں بچ گئے، اس نے آپ کو خزانے، تجارت اور مملکت کا خود مختار وزیر بنا دیا، مصر اور گرد و پیش میں قحط کی وجہ سے آپ کے بھائی غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آئے، ایک دو ملاقاتوں کے بعد آپ نے انہیں بتا دیا

کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں، پھر آپ کے والدین بھی مصر آ گئے اور سب یہیں آ کر آباد ہو گئے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ اجمالی طور پر عرض کیا جا چکا ہے، اب اس قصہ سے جو نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں وہ عرض کی جاتی ہیں، لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان عبرتوں اور نصیحتوں کا تعلق اس قصہ کے صرف اس حصہ سے نہیں ہے جو تیرھویں پارہ میں آیا ہے بلکہ مجموعی طور پر پورے واقعے سے جو بصائر وعبر حاصل ہوتے ہیں وہ ذیل میں بالترتیب لکھے جا رہے ہیں:

﴿۱﴾......بعض اوقات مصیبت، نعمت اور راحت تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کی ابتداء تو المناک پریشانیوں سے ہوئی، انہیں کنویں میں بے یار و مددگار ڈال دیا گیا، مصر میں غلاموں کی منڈی میں ان کی خرید و فروخت ہوئی، عورتوں کے فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، کئی سال تک جیل کی کال کوٹھڑی میں بند رہے، لیکن انجام یہ ہوا کہ وہ مصر کے حکمراں بنے اور انہیں دینی اور دنیاوی عزت نصیب ہوئی۔

﴿۲﴾......حسد انتہائی خوفناک بیماری ہے، سگے بھائیوں میں بھی یہ بیماری پیدا ہو جائے تو افسوسناک واقعات جنم لیتے ہیں۔

﴿۳﴾......اچھے اخلاق، اعلیٰ اوصاف اور بہتر تربیت بہرحال اپنا رنگ دکھا کر رہتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی تربیت ایک عظیم باپ کے ہاتھوں خاندانِ نبوت میں ہوئی تھی اور آباء و اجداد کی اخلاقی میراث میں سے بھی آپ نے وافر حصہ پایا تھا، مثالی تربیت اور اخلاقی کمال ہی کی وجہ سے آپ مصائب و شدائد کے سامنے بڑی پامردی سے کھڑے رہے، جس کی وجہ سے کلفت کے بعد راحت کا اور ظاہری ذلت کے بعد حقیقی عزت کا دور آ کر رہا۔

﴿۴﴾......عفت و امانت اور استقامت ساری بھلائیوں کا سرچشمہ ہے، مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی، یونہی دین پر جمے رہنے والوں کو ایک نہ ایک دن عزت اور احترام حاصل ہو کر رہتا ہے اور حقیقت اور حق کو جتنا بھی چھپایا جائے، بالآخر وہ ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔

﴿۵﴾......مرد اور عورت کا اختلاط اور خلوت میں میل جول فتنہ کا باعث ہوتا ہے، نہ زلیخا کو خلوت میسر آتی اور نہ ہی وہ برائی کی منصوبہ بندی کرتی، اسی لیے اسلام نے مرد و زن کے خلوت میں ملنے کو حرام قرار دیا ہے، ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے کہ: ''جب مرد اور عورت تنہائی میں ملتے ہیں تو ان کے ساتھ تیسرا فرد شیطان ہوتا ہے۔''

﴿۶﴾......ذاتِ باری پر ایمان اور عقیدہ کی پختگی سے مصائب کا برداشت کرنا اور اخلاقی نجاستوں سے دامن کا بچانا آسان ہو جاتا ہے۔

﴿۷﴾......مؤمن کو چاہیے کہ وہ ہر تنگی اور پریشانی کے وقت صرف اللہ کی طرف رجوع کرے۔ جب عزیز مصر کی بیوی

نے بُرائی کا ارتکاب نہ کرنے کی صورت میں جیل کی دھمکی دی تھی تو آپ نے معصیت پر مصیبت کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے رب کو پکارا تھا:

''اے میرے رب! جیل مجھے اس بُرائی سے زیادہ محبوب ہے جس کی دعوت زنانِ مصر مجھے دیتی ہیں۔''

بعض اللہ والوں کے بارے میں آتا ہے کہ جب کسی مصیبت اور بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان سے تعزیت کی گئی تو انہوں نے جواب دیا:

''الحمدللہ ! بمصیبتے گرفتارم نه بمعصیتے'' (اللہ کا شکر ہے مصیبت میں مبتلا ہوں، معصیت میں نہیں۔)

﴿۸﴾...... سچا داعی، انتہائی مشکل اور پریشان کن حالات میں بھی دعوت کے فریضہ سے غافل نہیں ہوتا، سیدنا یوسف علیہ السلام جیل میں بھی دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، جو لوگ آپ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آئے، ان کو بھی آپ نے پہلے توحید کی دعوت دی اس کے بعد خواب کی تعبیر بتلائی اور کہا جاتا ہے کہ جیل کے قیدیوں نے آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان قبول کر لیا تھا، خود مصر کا بادشاہ بھی اسلام لے آیا تھا۔

﴿۹﴾...... ہر مسلمان کو عموماً اور داعی اور پیشوا کو خصوصاً اپنے دامن کی صفائی کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی سال بعد جب رہائی نصیب ہوئی تو آپ نے اس وقت تک جیل سے باہر قدم رکھنے سے انکار کر دیا جب تک کہ آپ کی برأت اور طہارت کا اعلان اور اعتراف نہ کر لیا جائے، تاکہ کل کو آپ کو یہ طعنہ نہ دیا جائے کہ معاذ اللہ! تھے تو مجرم مگر رحم اور ترس کھاتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔

﴿۱۰﴾...... اس واقعہ سے صبر کی فضیلت اور اس کے بہترین نتائج کا بھی یقین آ جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں کی تاریکی سے جیل کی تنہائی تک اور عزیزِ مصر کے گھر سے بھائیوں کو معاف کرنے تک ہر جگہ مضبوطی کے ساتھ صبر کا دامن تھامے رکھا، اس صبر کے جو نتائج سامنے آئے وہ کسی سے مخفی نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ صبر، راحتوں اور نعمتوں کے دروازے کی چابی، نصف ایمان اور اللہ کی نصرت اور رحمت کو متوجہ کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

﴿۱۱﴾...... اس قصہ کے مطالعہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت اور طہارت کی کئی شہادتیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی شہادت رب العالمین کی ہے۔

دوسری شہادت شیطان کی ہے کیونکہ شیطان نے باری تعالیٰ کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا:

''تیری عزت کی قسم! میں سب (انسانوں) کو گمراہ کر دوں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے مخلص ہیں۔'' {۱}

اور اس میں شک ہی کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مخلص اور منتخب تھے لہٰذا انہیں راہِ راست سے ہٹانا خود

شیطان کے بقول ممکن ہی نہ تھا۔

تیسری شہادت خود حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے، ابھی گزرا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا:

''اے میرے رب! مجھے جیل زیادہ محبوب ہے اس برائی سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں۔''

چوتھی شہادت عزیزِ مصر کی بیوی کی ہے، جب اس نے واضح طور پر کہا تھا:

''اب حق واضح ہو گیا، میں نے اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی اور یہ سچوں میں سے ہے۔''

پانچویں شہادت عزیزِ مصر کے خاندان کے اس فرد کی ہے جس نے کہا تھا:

''اگر قمیص آگے سے پھٹی ہے تو یہ سچی ہے اور یوسف (معاذ اللہ) جھوٹوں میں سے ہے اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا جھوٹی ہے اور یوسف سچوں میں سے ہے۔'' جب دیکھا گیا تو آپ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔

چھٹی شہادت ان زنانِ مصر کی ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، انہوں نے آپ کے کردار کی صفائی کی گواہی دیتے ہوئے کہا تھا:

''ہمیں یوسف کے بارے میں کسی برائی کا علم نہیں ہے۔''

ان تمام شہادتوں سے قطعی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی ثابت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی سیاہ دل آپ کی طرف برائی کی نسبت کرتا ہے تو اس سے بڑا جاہل اور غبی کوئی نہیں۔

﴿۱۲﴾...... بارہویں نصیحت اس قصہ سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ اللہ کسی کو تکلیف میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کرلے تو اس کی تقدیر اور فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اگر کسی کے ساتھ خیر اور عزت کا فیصلہ کرلے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

سورۂ یوسف کا اختتام اس آیت پر ہوا ہے:

''ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے، یہ (قرآن) ایسی بات نہیں جسے خود بنا لیا جائے بلکہ یہ ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے (نازل) ہوئی ہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

گویا اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ جو اللہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر تخت پر بٹھا سکتا ہے، وہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ محمد ﷺ کو بھی عزت عطا کرے اور ان کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کردے۔

☆☆☆☆☆

اللہ کا احسانِ عظیم

﴿۱......۳﴾

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ② نَحْنُ

الرٰ یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی O ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھ لو O ہم

نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ

بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان، اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن، اور تو تھا اس سے پہلے

قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③

البتہ بے خبروں میں O

ربط: سورۂ یوسف اور سورۂ ھود کے درمیان کئی اعتبار سے مناسبت پائی جاتی ہے۔

الف......سورۂ یوسف، سورۂ ھود کے بعد نازل ہوئی۔

ب......دونوں سورتوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کے قصے بیان کیے گئے ہیں، ان قصوں اور دوسرے مضامین سے جو مشترک حقیقت ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے حق و باطل کے درمیان جس کشمکش کا آغاز ہوا ہے، اس کا آخری نتیجہ اہلِ حق کی کامیابی اور اہلِ باطل کی ناکامی کی صورت میں نکلے گا، اس حقیقت کے بیان میں جہاں قریش کے لیے انذار ہے تو وہیں مسلمانوں کے لیے بشارت بھی ہے۔

ج......سورۂ یونس، سورۂ ھود اور سورۂ یوسف تینوں کا آغاز ''الٓرٰ'' سے ہوا ہے، البتہ سورۂ یونس میں کتاب کی صفت ''الحکیم'' لائی گئی (یعنی حکمت والی کتاب) سورۂ ھود میں اس کی صفت ''احکمت'' لائی گئی (یعنی ایسی کتاب جس کی آیات محکم ہیں) اور سورۂ یوسف میں اس کی صفت ''المبین'' لائی گئی (یعنی ایسی کتاب جو واضح ہے) اس میں حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ سورۂ یونس اور ھود میں اصولِ دین سے بحث کی گئی ہے جن میں حکمت بھی پائی جاتی ہے اور وہ محکم بھی ہیں، اس لیے کتاب کو حکمت اور اِحکام سے موصوف کرنا زیادہ مناسب تھا جبکہ سورۂ یوسف میں ایسے مختلف واقعات بیان کیے گئے ہیں جو اللہ کے نبی کو قدم قدم پر پیش آئے اس لیے کتاب کو صفتِ بیان سے موصوف کیا گیا۔

د......متعدد حکمتوں اور مقاصد کی بناء پر ہر نبی کا قصہ مختلف سورتوں میں اجزاء کی صورت میں مکرر بیان ہوا ہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ صرف سورۂ یوسف میں بیان کیا گیا ہے، کسی دوسری سورت میں اس کا کوئی جزء نہیں آیا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کے دونوں انداز حدِ بلاغت تک پہنچے ہوئے ہیں، مخالفین نہ تو ان قصوں کی نظیر لاسکتے ہیں جو مکرر آئے ہیں اور نہ اس حصے کی نظیر لاسکتے ہیں جو غیر مکرر آیا ہے۔{۱}

تسہیل: الف، لام، را...... یہ واضح کتاب کی آیات ہیں O ہم نے عربی زبان میں قرآن نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ لو O اے ہمارے پیغمبر! ہم اس وحی کی بدولت آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں جس کے ذریعے ہم نے یہ قرآن نازل کیا ہے، یقیناً اس کے نزول سے پہلے آپ اس قصہ سے بے خبر تھے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾......یہ واضح کتاب کی آیات ہیں، ایسی کتاب، جس کا معجزہ اور برحق ہونا بالکل واضح ہے، جو دین کے حقائق اور دنیا کی مصلحتیں ظاہر کرنے والی ہے، یہ حق اور باطل، حلال اور حرام میں امتیاز کرتی ہے، اس کتاب کی صداقت کے لیے خارجی دلائل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی حقانیت کے دلائل خود اس کے اندر موجود ہیں۔

﴿۲﴾......یہ کتاب ''قرآن'' ہے، قرآن کا معنی ہے: ''پڑھنا''

اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا پڑھنا بھی عبادت ہے، سرورِ دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''حسد'' (رشک) صرف دو شخصوں پر ہونا چاہیے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن عطا فرمایا ہو اور وہ شب و روز اس کی تلاوت میں مصروف رہتا ہو، دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو اور وہ دن رات اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔''{۲}

﴿عَرَبِیًّا﴾ یہ کتاب عربی زبان میں ہے، قرآن صرف اسے کہا جائے گا جو عربی میں ہو اور وہی الفاظ ہوں جو آسمان سے نازل ہوئے، کسی دوسری زبان میں اس کے ترجمہ اور مفہوم پر ''قرآن'' کا اطلاق نہیں ہوسکتا، اختصار کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن نظم اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، صرف نظم اور الفاظ کو قرآن نہیں کہا جاسکتا۔

{۱} فلم یقدر مخالف علی معارضۃ ماتکرّر ولا علی معارضۃ غیر المتکرّر (قرطبی ۹/۱۰۱)

{۲} (بخاری ۲، فضائل القرآن/۷۵۱، مسلم ۱، کتاب فضائل القرآن/۲۷۲)

عربی زبان نہ صرف فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے مالدار زبان ہے بلکہ ذخیرۂ الفاظ کی وسعت اور معانی کی ادائیگی کی سہولت کے اعتبار سے بھی اس کا کوئی ثانی نہیں۔

قرآن کا عربی زبان میں ہونا اہلِ عرب کے لیے ایک اعزاز بھی تھا اور ان پر ایک حجت بھی تھا، جن لوگوں نے اپنی مادری زبان میں ہونے کے باوجود اللہ کی کتاب سے فائدہ نہ اٹھایا، ان سے بڑا بدنصیب کون ہوسکتا ہے۔

﴿۳﴾......اسی قرآن میں بذریعہ وحی وہ قصہ بھی بیان ہوا ہے جو اللہ کی نظر میں ''احسن القصص'' (قصّوں میں سے بہترین) ہے، اس قصہ کے بہترین ہونے کے بارے میں ہم خلاصۂ سورت میں بقدرِ ضرورت بحث کرچکے ہیں، مختصر یہ کہ یہ قصہ دین اور دنیا، فرد اور جماعت، اولاد اور والدین، نسوانی اور شہوانی جذبات، اقتصادی اور سیاسی مسائل، عقائد اور اعلیٰ اخلاق جیسے متنوع مضامین پر مشتمل ہے اور اس کے آئینے میں نہ صرف قریش اور رحمۃ للعلمین ﷺ کا مستقبل دکھا دیا گیا ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے بتا دیا گیا کہ وقتی ہنگاموں اور عارضی مدوجزر سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، بالآخر عزت اور سرفرازی کے حقدار وہی ہوتے ہیں جو اعلیٰ کردار اور اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱......قرآن اپنی ذات کے اعتبار سے بھی واضح ہے اور حلال وحرام حق وباطل، حدود اور احکام، مسائل اور اخلاق جیسے مضامین بیان کرنے کے اعتبار سے بھی واضح ہے۔(۱)

۲......قرآن کا عربی زبان میں ہونا عالمِ انسانی پر عموماً اور عالمِ عرب پر خصوصاً بہت بڑا احسان ہے، انسانوں میں سے سب سے زیادہ عربوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لائیں اور اسے سمجھیں۔(۲)

۳......عربی، مسلمانوں کی محبوب زبان ہے، اس لیے کہ قرآن عربی میں ہے، حضورِ اکرم ﷺ کی زبان عربی تھی اور اہلِ جنت کی زبان بھی عربی ہوگی۔(۳)

۴......قرآنِ کریم سے براہِ راست استفادہ کے لیے عربی زبان سیکھنا ضروری ہے۔(۳)

۵......قرآن کو سمجھنا اس کے مقاصدِ نزول میں سے بھی ہے اور اس کے حقوق میں سے ایک حق بھی ہے۔(۳) اس مقصد اور حق کو کہیں ''تعقلون'' کہیں ''تتفکرون'' اور کہیں ''یتدبّرون'' سے بیان کیا گیا ہے۔

۶......حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ حسنِ بیان، شوکتِ الفاظ اور کمالِ فصاحت کے اعتبار سے بھی بہترین ہے اور انسانی نفسیات، بصائر وعبر اور ہدایات کے اعتبار سے بھی بہترین ہے۔

خواب اور تعبیر

﴿۴......۶﴾

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ! میں نے دیکھا خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا

رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿۴﴾ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ

میں نے ان کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے O کہا اے بیٹے! مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے پھر وہ

كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۵﴾ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ

بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب، البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن O اور اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو تیرا رب

مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ

اور سکھلائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا اور پورا کرے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھر پر جیسا پورا کیا ہے تیرے دو

مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۶﴾

باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم اور اسحاق پر البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا O

تسہیل: یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں، سورج اور چاند کو دیکھا کہ وہ میرے سامنے سجدہ کررہے ہیں O والد نے جواب دیا کہ اے میرے پیارے بیٹے! یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے O جیسے یہ مبارک خواب تمہیں دکھایا گیا ہے یونہی تمہارا رب کسی بڑے منصب کے لیے تمہارا انتخاب کرے گا اور تمہیں باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تم پر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت تام کرے گا جیسے اس سے پہلے تمہارے اجداد ابراہیم اور اسحاق پر اس نے اپنی نعمت تام کی تھی، بے شک تمہارا رب بڑا ہی علیم وحکیم ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۴﴾......حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد گرامی کے سامنے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے گیارہ ستاروں، سورج اور چاند کو اپنے سامنے جھکتے اور تواضع اختیار کرتے دیکھا ہے۔{۳}

{۳} المراد بالسجود نفس السجود او التواضع ......قلنا: کلاھما محتمل (کبیر ۶، الجزء الثامن عشر/ ۴۱۹)

حضرت یوسف علیہ السلام غیر معمولی طور پر سلیم الفطرت، سنجیدہ، باوقار اور سمجھدار تھے، وہ خود بھی جان گئے تھے کہ یہ کوئی عام خواب نہیں اس لیے انہوں نے اس کا ذکر اِدھر اُدھر کرنے کے بجائے صرف اپنے عظیم المرتبت والد کے سامنے کیا، ہمارے آقا علیہ السلام کا ارشاد بھی یہی ہے کہ خواب صرف اسی کے سامنے بیان کیا کرو جو عقلمند ہو یا تم سے محبت کرنے والا ہو۔{۴}

﴿رَأَيْتُهُمْ﴾ چونکہ اس خواب سے آپ کی بڑائی ظاہر ہوتی تھی، اس لیے اسلوبِ کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خواب بیان کرتے کرتے ذرا دیر کے لیے ٹھہر گئے اور جب ان سے اس رؤیت کی کیفیت کا سوال کیا گیا تو فرمایا "رَأَيْتُهُمْ لِي سٰجِدِيْنَ" یہ نکتہ 'رأیت' کے تکرار سے سمجھ آتا ہے۔{۵}

یہاں یہ اشکال اوّل تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے سامنے سجدہ کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ کیونکہ یہ قصہ خواب کا تھا بیداری کا نہیں اور خواب پر بیداری کے احکام جاری نہیں ہو سکتے، اور اگر بالفرض کسی کے دل میں یہ اشکال آ ہی جائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ سجدہ صرف زمین پر پیشانی رکھنے کے معنی میں نہیں آتا، تواضع اور عاجزی کے معنی میں بھی آتا ہے۔

خوابوں کی حقیقت:

﴿۵﴾......خواب ہی واضح نہ تھا اپنے بیٹوں کے جذبات اور خیالات بھی حضرت یعقوب علیہ السلام پر واضح تھے، وہ جانتے تھے کہ یوسف کی غیر معمولی صلاحیتوں اور ظاہری اور باطنی حسن کی وجہ سے اسے والدین کی جو خصوصی توجہ اور محبت حاصل ہے، وہ اس کے بھائیوں کے دل میں کھٹکتی ہے اور انہیں اس امر کا اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں حسد میں مبتلا ہو کر وہ کوئی ناروا حرکت نہ کر بیٹھیں، اسی لیے انہوں نے یوسف کو سختی سے منع کر دیا کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آ جائیں، ان گیارہ بھائیوں میں آپ کا حقیقی بھائی بن یامین بھی تھا، اس کی طرف سے اگرچہ برائی کا اندیشہ نہ تھا لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ بھولپن سے اس خواب کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر دے اس لیے اس کے سامنے بھی ذکر کی اجازت نہیں دی۔

قرآن نے اپنے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے تعلقات کی کشیدگی کی کوئی وجہ نہیں بتائی لیکن بائبل کہتی ہے کہ اس کی ایک وجہ یوسف علیہ السلام کا خود شرارتوں سے الگ رہتے ہوئے اپنے بھائیوں کی

{۴} لاتحدث بھا إلّا لبیبا أو حبیبا (ترمذی ۲، ابواب الرؤیا/۵۳) لاتقصھا إلّا علی واد أوذی رأی (ابوداؤد ۲، کتاب الادب /۳۳۷)

{۵} (کبیر ۱۸،۶/۴۱۸-۴۱۹)

شرارتوں کے بارے والد کو اطلاع دیناتھا۔

’’یوسف نے ان کے باپ کے پاس ان کے بارے میں قبیح افواہ پہنچادی۔‘‘{۶}

ہمارے آقا ﷺ نے خواب بیان کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں جو اصولی رہنمائی فرمائی ہے، وہ یہ ہے:

’’جب تم میں سے کوئی پسندیدہ خواب دیکھے تو بیان کردے اور جب کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو کروٹ بدل کر بائیں جانب تین بار تھوک دے اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور اسے کسی کے سامنے بیان نہ کرے تو یہ خواب اسے کچھ بھی نقصان نہیں دے گا۔‘‘{۷}

اس رہنمائی میں ان وہمی لوگوں کا بھی علاج ہے جو خوابوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور پریشان کن خواب دیکھنے کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور یقین کرلیتے ہیں کہ جو حادثہ اور سانحہ خواب میں دیکھا ہے وہ وقوع پذیر ہو کر رہے گا۔

اصل یہ ہے کہ خواب مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ان میں شیطانی وساوس کا بھی عمل دخل ہوتا ہے اور پریشان خیالی، دماغی سیر، عالمِ بیداری کی تمناؤں اور روح کے مشاہدات کا اثر بھی ہوتا ہے، بعض خواب اللہ کی طرف سے تنبیہ اور بعض بشارت کی صورت میں ہوتے ہیں، انسان کے گردوپیش، اس کی مصروفیات بلکہ موسموں اور غذاؤں تک کا خوابوں پر اثر پڑتا ہے، اس لیے نہ تو خوابوں کو کلی طور پر فضول سمجھنا چاہیے اور نہ ہی انہیں قطعیت کا مقام دینا چاہیے، بالخصوص شرعی مسائل میں خوابوں کی کوئی حیثیت نہیں، خواب دیکھنے والا کتنا ہی صالح اور عابد و زاہد کیوں نہ ہو، نہ تو اس کے خواب سے کوئی چیز فرض یا واجب یا سنت اور مستحب ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی حلال حرام ہوسکتا ہے، خوابوں میں تعبیر کی بہت زیادہ اہمیت ہے، ہر کوئی تعبیر بتانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اکثر لوگ اس بارے میں اٹکل سے کام لیتے ہیں، ان سے جب تعبیر پوچھی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے خاموشی اختیار کی تو عوام ہمیں جاہل سمجھیں گے چنانچہ وہ جواب میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیتے ہیں، بے شمار لوگوں کی دکانیں خوابوں ہی کے دم قدم سے آباد ہیں، یہ جملہ جو ابھی ابھی زبانِ قلم سے نکل گیا ہے، اس کی تشریح میں کئی صفحات سیاہ کیے جاسکتے ہیں مگر مقام اس طوالت کی اجازت نہیں دیتا، تاہم چند احادیث اور معروضات ’’حکمت وہدایت‘‘ میں پیش کریں گے۔

﴿۶﴾......اے میرے بیٹے! جیسے اللہ تعالیٰ نے یہ مبارک خواب دکھانے کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے، یونہی اپنے پیام کی دعوت اور نبوت کے لیے بھی تمہارا انتخاب کرے گا۔

{۶} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۷:۲/ص ۴۵)

{۷} (بخاری ۲، کتاب التعبیر/۱۰۴۳، مسلم ۲، کتاب الرؤیا/۲۴۱)

تاویلِ احادیث:

﴿وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾ ''اور تمہیں احادیث کی تاویل کا علم دے گا''

خوابوں کی ٹھیک ٹھیک تعبیر، ہر بات کا موقع ومحل سمجھنا، معاملات کے نتائج فوراً پرکھ لینا، اللہ کے کلام، انبیاء کے ارشادات اور اقوامِ عالم کے قصّوں کی تہہ تک پہنچ جانا، یہ سب کچھ ''تاویلِ احادیث'' میں آ جاتا ہے {۸} اگرچہ اکثر مفسرین نے اس کا معنیٰ ''خوابوں کی تعبیر'' کیا ہے {۹} لیکن بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ نبی کے لیے تعبیرِ خواب کا ملکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ اسے اللہ سبحانہ کا خاص عطیہ قرار دیا جاتا، یہ ملکہ تو بعض غیر انبیاء کو بھی حاصل ہوتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کو باری تعالیٰ نے ایسی بصیرت ومہارت، ایسی حکمت ودانائی، ایسی پختگی اور دیدہ وری عطا فرمائی تھی کہ وہ بہت جلد ہر بات کے مطلب، ہر واقعہ کے نتیجہ، ہر بھید کی حقیقت اور ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، اور اسی کا دوسرا عنوان ''تاویلِ احادیث'' ہے۔

اندازہ کیجیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتدائی زندگی صحرا میں بسر ہوئی، انسان اپنے خارجی ماحول سے ضرور متأثر ہوتا ہے، نہ انہیں تعلیم کے مواقع میسّر آئے اور نہ ہی بادشاہوں، سیاستدانوں اور اقتصادی ماہرین سے ان کی کبھی ملاقات ہوئی، لیکن جب نوشتۂ تقدیر کے نتیجے میں وہ مصر جیسی متمدّن سرزمین میں جا پہنچے اور کئی سال جیل کی تنہائیوں میں بسر کرنے کے بعد انہوں نے خود عزیزِ مصر کی درخواست پر شاہی محلات میں قدم رکھا، تو پورے اعتماد سے فرمایا:

﴿اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ ''مصر کے خزانے میرے حوالے کر دیجیے، میں دیانتدار اور محافظ بھی ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں۔''

بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ دعویٰ مبنی بر حقیقت تھا۔

سوچیے! یہ واقفیت اور ملکہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا؟ کسی یونیورسٹی میں؟ کسی بادشاہ کے دربار میں؟ نہیں بلکہ یہ وہی ''علمِ تاویل الاحادیث'' تھا جو فیاضِ حقیقی نے آپ کو عطا کیا تھا۔

﴿وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ﴾ اے میرے بیٹے! اللہ تمہیں اور آلِ یعقوب کو اسی طرح دین وشریعت کی نعمت عطا فرمائے گا جیسے اس نے تمہارے اجداد یعنی ابراہیم اور اسحٰق علیہما السلام کو یہ نعمت عطا فرمائی تھی، دنیاوی اقتدار، مادی خوشحالی، اولاد کی

{۸} یراد بتاویل الأحادیث معانی کتب اللہ وسنن الانبیاء وماغمض واشتبه علی الناس من أغراضها ومقاصدها (کشاف ۲/۴۱۹)

{۹} المراد منه تعبیر الرؤیا (کبیر ۶، الجزء الثامن عشر/۴۲۰) "ویعلّمك من تاویل الأحادیث" تاویل الرؤیا وتعبیرها (تفسیر المراغی ۱۲/۱۱۵)

کثرت، خاندان کی وسعت اور عزت وشہرت، یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں لیکن کوئی نعمت کامل نہیں ہوسکتی جب تک دین وشریعت کی نعمت حاصل نہ ہو۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ﴾ تیرا رب ہی جانتا ہے کہ کون نعمت کا مستحق ہے اور کس کے اندر اسے قبول کرنے کی استعداد ہے، پھر وہ اپنی حکمت سے اسے یہ نعمت عطا کرتا ہے۔

حکمت وہدایت:

انبیاء کے خواب:

ا......عام انسانوں کے خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور جھوٹے بھی، حدیثِ نفس بھی ہوتے ہیں اور شیطانی وساوس بھی، دماغی سیر بھی ہوتے ہیں اور روحانی مشاہدہ بھی، لیکن انبیاء کے خواب بہر حال سچے ہوتے ہیں، یہ تو ممکن ہے کہ ان کی تعبیر فوراً سامنے نہ آئے مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ جھوٹے ثابت ہوں، بعض حکماء کا قول ہے کہ ردّی قسم کے خوابوں کی تعبیر بہت جلد وقوع پذیر ہو جاتی ہے جبکہ اچھے خوابوں کی تعبیر دیر بعد سامنے آتی ہے۔

ہمارے آقا ﷺ نے صلحاء کے خواب کو نبوت کا جزء قرار دیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نبوت میں سے صرف مبشّرات باقی رہ گئے ہیں یعنی وہ نیک اور سچے خواب جو ایک مسلمان خود دیکھتا ہے یا اس کے بارے میں کوئی اور دیکھتا ہے۔'' {۱۰}

مسلم اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

''تم میں سب سے سچا خواب اسی کا ہوگا جو سب سے زیادہ سچ بولنے والا ہوگا۔'' {۱۱}

صلحاء کے خواب کو نبوت کا جزء اس لیے قرار دیا گیا ہے کیونکہ نبوت کی ابتداء سچے خوابوں سے اور انتہاء وحیِ الٰہی پر ہوتی ہے، خواب دیکھنے والے کو بعض اوقات غیبی خبروں کی اطلاع کر دی جاتی ہے اور یہ نبوت کا خاصہ ہے، خود رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے سچے خواب دیکھا کرتے تھے، چھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد وحی آئی، یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اگرچہ خواب نبوت کا جزء ہیں مگر خواب دیکھنے والے کو شریکِ نبوت یا چھوٹا نبی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ حدیث میں اگر سچے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ بتایا گیا ہے تو بعض اعلیٰ اخلاق کو پچیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

{۱۰} (ابن ماجه، كتاب النكاح/۲۷۸)

{۱۱} (مسلم ۲، كتاب الرؤيا/ ۲۴۱، ابوداؤد ۲، كتاب الادب/ ۳۳۶ الا "أصدقهم" بدل "اصدقكم")

﴿القصد والتؤدة وحسن السمت جزء من خمسة وعشرين جزءً من النبوة﴾{۱۲} ”میانہ روی، بردباری، متانت اور اچھی روش نبوت کا پچیسواں جزء ہے۔“

عربی زبان میں خواب کے لیے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، حلم اور رؤیا، اردو میں دونوں کا معنی خواب ہے، جبکہ حدیث میں دونوں میں فرق کیا گیا ہے، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿الرؤيا الصالحة من الله والحلم من الشيطٰن﴾{۱۳} ”اچھا خواب اللہ کی طرف سے جبکہ برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔“

عام طور پر اچھے اور سچے خواب وہی دیکھتے ہیں جن کا دل و دماغ ایمان کے نور سے منور ہوتا ہے، بعض اوقات کافر اور فاسق و فاجر انسان کا خواب بھی سچا ثابت ہو جاتا ہے لیکن ہم اسے نبوت کا جزء نہیں کہیں گے کیونکہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ جس کسی کی مستقبل کے بارے میں پیشگوئی سچی ثابت ہو جائے اس کی خبر کو نبوت کا حصہ تسلیم کر لیا جائے، بے شمار کاہنوں، نجومیوں، دست شناسوں اور انسانیت کے دشمنوں کی بعض خبریں سچی ثابت ہو جاتی ہیں یہی حال ان کے خوابوں کا بھی ہے، تو کیا ان سب کی اناپ شناپ کو نبوت کا حصہ مان لیا جائے گا؟ ہرگز نہیں!

۲......خواب صرف ایسے شخص کے سامنے بیان کرنا چاہیے جو صاحبِ علم، خیر خواہ، محبت کرنے والا اور تعبیر میں شُد بُد رکھتا ہو، جاہل اور بدخواہ ممکن ہے کوئی ایسی تعبیر بتا دے جو انسان کو وہمی بنا دے اور اس سے کوئی ایسی حرکت کروا دے جو پچھتاوے کا سبب بن جائے، آقا ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

”جب تک خواب دیکھنے والا اسے کسی کے سامنے بیان نہ کر دے، اس کی حیثیت ایسی ہوتی ہے گویا وہ پرندے کے پاؤں کے ساتھ معلّق ہے، جب وہ اسے بیان کر دے گا تو وہ واقع ہو جائے گا لہٰذا خواب صرف ایسے شخص کے سامنے بیان کرو جو عاقل، خیر خواہ اور تمہارا محبّ ہو۔“(۵){۱۴}

۳......جہاں تک ممکن ہو کسی ایسے انسان کے سامنے نعمت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے جس کی طرف سے حسد اور مخالفانہ چال چلنے کا خطرہ ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”اپنی ضروریات اور مقاصد کو تکمیل تک پہنچانے میں اخفاء سے مدد لو کیونکہ ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا ہی جاتا ہے۔“(۵){۱۵}

{۱۲}(الموطا/۹۵۴ بحوالہ نضرة النعيم ۵/۱۵۹۲)
{۱۳}(بخاری ۲، کتاب التعبير/۱۰۳۵)
{۱۴}(ترمذی ۲، ابواب الرؤیا/۵۳، ابوداؤد ۲، کتاب الادب/۳۳۷)
{۱۵}(طبرانی وبیہقی بحوالہ منیر ۱۲/۲۰۹)

۴......کسی کے شر سے بچانے کے لیے اپنے مسلمان بھائی اور عزیز کو اس کے بارے میں خبردار کرنا غیبت میں داخل نہیں ہے۔(۵)

۵......والد اپنی اولاد کی مادی اور روحانی ترقی سے خوش ہوتا ہے اور اس کی تمنا ہوتی ہے کہ میری اولاد کو اللہ مجھ سے بھی زیادہ نواز دے، جبکہ بھائیوں کے جذبات اپنے بھائی کے بارے میں ایسے نہیں ہوتے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سن کر جان لیا تھا کہ یوسف کو ایسی عزت اور مقام ملے گا جو مجھے بھی نہ مل سکا اور یہ جان کر انہیں خوشی ہوئی تھی۔(۵)

۶......برادرانِ یوسف کے بارے میں بحث ہوئی ہے کہ وہ انبیاء تھے یا نہیں، بظاہر اس قصّے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انبیاء نہیں تھے کیونکہ انبیاء نہ کسی سے حسد کرتے ہیں، نہ اپنے والدین کی نافرمانی کرتے ہیں، نہ ہی کسی مومن کے قتل کے لیے مشورہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں جبکہ برادرانِ یوسف نے یہ سب کچھ کیا۔

۷......اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت دین وشریعت کی نعمت ہے، اس کے مقابلے میں سب نعمتیں ناقص ہیں اور اس نعمت کا کمال اور آخری درجہ نبوت ہے۔(۶)

۸......خواب سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تین درجات کی بشارت سنائی، اجتباء، تاویلِ احادیث اور اتمامِ نعمت یعنی اللہ کی جانب سے انتخاب، حقائق تک رسائی اور نبوت۔(۶)

۹......معاملات، مسائل، واقعات، اختلافات، شخصیات، نظریات اور باتوں کی حقیقت تک رسائی اللہ کی خاص دین ہے، اللہ سے اس کی دعا مانگنی چاہیے۔

برادرانِ یوسف کی مشاورت

﴿۷......۱۰﴾

لَقَدْ كَانَ فِىْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۞ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى

البتہ ہیں یوسف کے قصے میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کے لیے ۝ جب کہنے لگے البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے

اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۞ اۨقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ

ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم ان سے قوت والے لوگ ہیں، البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے ۝ مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے

اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۞ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ

تم پر توجہ تمہارے باپ کی اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ ۝ بولا ایک بولنے والا ان میں مت مار ڈالو

لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ⑩

یوسف کو اور ڈال دو اس کو گم نام کنوئیں میں کہ اٹھالے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے O

تسہیل: بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصّے میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی عبرتیں ہیں O جب انہوں نے آپس میں کہا کہ ہمارے والد کو یوسف اور اس کے بھائی سے ہم سے زیادہ پیار ہے حالانکہ ہم پوری جماعت ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے والد کھلی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں O اس کا حل یہ ہے کہ یوسف کو قتل کر دو یا اسے کہیں دور پھینک آؤ، جب وہ نہیں رہے گا تو تمہارے والد کی ساری توجہ تمہاری ہی طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم نیک بن جانا O ان میں سے ایک کہنے والے نے مشورہ دیا کہ یوسف کو قتل تو نہ کرو، البتہ اگر تم کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ کر ہی چکے ہو تو اسے کسی کنویں کی تہہ میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا مسافر اسے نکال لے جائے گا O

تفسیر

﴿۷﴾......قرآنِ کریم کے اوصاف اور حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب بیان کرنے کے بعد ''احسن القصص'' کا آغاز ہو رہا ہے، ابتداء ہی میں بتا دیا گیا کہ جو لوگ اس قصّہ کے بارے میں سوال کر رہے تھے ان کے لیے اس میں بہت سی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں، یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری تھی تاکہ تقدیر کے عجائب اور انسانی فطرت کے مخفی گوشوں کو ظاہر کرنے والے اس قصّے کو سننے والے ایک دلچسپ کہانی یا افسانے کے طور پر نہ سنیں بلکہ ان کی توجہ ان مواعظ اور نشانیوں کی طرف مبذول رہے جو اس کے دامن میں پوشیدہ ہیں، اس سورت کے مضامین سے صرف ان لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے مدوجزر کے بارے میں جاننا چاہتے تھے بلکہ یہ سورت ان لوگوں کے سوالات کے جواب بھی دیتی ہے جو مکّہ میں حق اور باطل کے درمیان برپا کشمکش کے نتائج کے بارے میں تذبذب کا شکار تھے، مکّہ اور گردوپیش میں جو حالات تھے ان کے پیشِ نظر بظاہر یہ ناممکن دکھائی دیتا تھا کہ باطل کے علمبردار سرداروں کو ایک نہ ایک دن حق کے پرچم بردار کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا مگر اس سورت نے بتا دیا کہ ایسا ہونا یقینی ہے، بعد کے حالات نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

یعقوب علیہ السلام کی محبت:

﴿۸﴾......گیارہ بھائیوں میں سے ایک یعنی بن یامین یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے باقی دس علاتی بھائی تھے یعنی والد تو سب کا ایک تھا مگر والدہ ان دونوں کی الگ تھی اور وہ انتقال کر چکی تھیں، یہ دونوں اپنے علاتی بھائیوں سے

چھوٹے تھے، ان دو وجوہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام دونوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی والدہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ آپ کو اپنے بچوں میں سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا:

''سب سے چھوٹا جب تک بڑا نہ ہو جائے، بیمار جب تک شفایاب نہ ہو جائے اور غائب جب تک میری نظروں کے سامنے نہ آ جائے۔'' {۱۶}

حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت فطرت اور انسانیت کا تقاضا تھی، پھر یوسف علیہ السلام کو اللہ نے سیرت اور صورت کا جو حسن اور ظاہری اور باطنی کمالات عطا کیے تھے انہیں دیکھ کر اجنبی کا دل بھی موم ہو جاتا تھا جبکہ یعقوب علیہ السلام تو حقیقی والد تھے، وہ کیوں نہ متاثر ہوتے، بھائیوں کے دل میں یہ محبت کھٹکنے لگی، وہ کہتے تھے کہ اس صحرائی اور قبائلی زندگی میں کام آنے والے تو ہم ہیں، ہمارا ایک طاقتور جتھا ہے جو بوقتِ ضرورت کام آ سکتا ہے، یہ دونوں چھوٹے بچے کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن ہمارے باپ کا حال یہ ہے کہ اسے یوسف اور اس کے بھائی بن یامین سے زیادہ محبت ہے۔

ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت قلبی میلان تک محدود ہوگی، باقی رہے خورد و نوش اور کپڑے لتّے کے معاملات تو ان میں آپ اپنی ساری اولاد کے درمیان مساوات ملحوظ رکھتے ہوں گے کیونکہ اولاد کے درمیان عدل کرنا واجب ہے، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿فاتقوا الله، واعدلوا بین اولادکم﴾ {۱۷} ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔''

اللہ کے نبی کی شان سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ اولاد میں سے کسی کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب کرے۔

برادرانِ یوسف کا فیصلہ:

﴿۹﴾...... مشاورت کے بعد بھائی اس نتیجے پر پہنچے کہ یوسف کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ ہمیں والدِ بزرگوار کی خصوصی محبت اور توجہ حاصل ہو لہٰذا یوسف کے قصے کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے، یا تو اسے قتل کر دو یا کسی دور دراز جگہ میں پھینک دو جہاں سے یہ واپس نہ آ سکیں، جب وہ نہ رہیں گے تو والدین کی ساری توجہات اور شفقتوں کے تنہا ہم ہی حقدار رہ جائیں گے۔

{۱۶} (روح المعانی ۱۲،۷/۲۸۵)

{۱۷} (بخاری ۱، کتاب الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا/۳۵۲، مسلم ۲، کتاب الھبات/۳۷، الّا "فی" بدل "بین")

﴿قَوْمًا صٰلِحِيْنَ﴾ چونکہ مسلمان تھے اس لیے ضمیر نے چٹکی لی، ارے سوچو تو سہی کیا کرنے جارہے ہو؟ جو تدبیر انہوں نے سوچی تھی اس میں صرف ایک گناہ کا ارتکاب نہ تھا بلکہ یہ تدبیر قطع رحمی، والدین کی نافرمانی، چھوٹے بھائی پر ظلم، بوڑھے والدین اور اولاد کے درمیان جدائی جیسے کئی گناہوں کا مجموعہ تھی انہوں نے یہ کہہ کر ضمیر کو تسلی دی کہ ہم جرم کر لینے کے بعد توبہ کر کے نیک بن جائیں گے، یہی نفسیات ہوتی ہے ان لوگوں کی جو برائیوں کے ارتکاب کے ساتھ اللہ کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

بعض مفسرین نے اس جملے کے معنی یہ کیے ہیں کہ: "یوسف کے بعد ہمارے سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے کیونکہ پدرِ بزرگوار کا دستِ شفقت یوسف سے مایوس ہو کر ہمارے ہی سروں پر سایہ فگن ہوگا۔" {۱۸}

﴿۱۰﴾...... بڑا بھائی جس کا نام یہوذا تھا، اس نے مشورہ دیا کہ قتل نہ کرنا کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے، قتل کے بجائے یوسف کو آبادی سے دور کسی گمنام کنویں میں ڈال دو، کوئی راہ چلتا مسافر یا قافلہ اسے کنویں سے نکال کر لے جائے گا، اس صورت میں ہمارا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور خونِ ناحق سے ہاتھ رنگین بھی نہیں کرنے پڑیں گے، گویا سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

تورات میں مشورہ دینے والے بھائی کا نام روبین آیا ہے۔ {۱۹}

حکمت و ہدایت:

۱...... قرآن قصوں کہانیوں کی کتاب نہیں، یہ کتابِ ہدایت ہے، اس کے قصص میں بھی بے شمار ہدایات اور اسباق پوشیدہ ہیں۔ (۷)

۲...... حسد بدترین بیماری ہے، اچھے اچھے لوگوں کو راہِ اعتدال سے ہٹا کر افراط و تفریط میں مبتلا کر دیتی ہے حتیٰ کہ حاسد کے لیے قتل جیسے گناہ کا ارتکاب بھی آسان ہو جاتا ہے۔ (۸)

۳...... اولاد میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینا بغض و حسد پیدا کرتا ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام عام معاملات میں نہیں صرف محبت میں دو چھوٹے بیٹوں کو ترجیح دیتے تھے اور یہ کوئی گناہ نہیں اس لیے کہ قلبی محبت کی کمی بیشی پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ (۸)

۴...... شیطان بعض اوقات انسان کو توبہ کی امید دلا کر گناہ پر آمادہ کر لیتا ہے حالانکہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ توبہ کی توفیق ملنے تک زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ (۸)

{۱۸} (تفسیر عثمانی/۳۰۶۔ دار التصنیف)

{۱۹} "تب روبن سن کر اس کو ان کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے بولا کہ ہم اسے قتل نہ کریں۔" (عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۷: ۲۱/ص ۴۶)

لقطہ کا شرعی حکم:

۵......ان آیات کے ضمن میں علماء نے ”لقطہ“ کے مسائل بھی بیان کیے ہیں، لقطہ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کو راستے میں گری پڑی مل جائے، جیسے یہوذا نے مشورہ دیا تھا کہ اسے کنویں میں ڈال دو کوئی مسافر اسے اٹھالے گا، تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ یوسف کو لقطہ سمجھ کر اٹھالے گا، اصطلاح کے اعتبار سے اس قسم کے لاوارث بچے کو لقیط اور عام اشیاء کو ”لقطہ“ کہا جاتا ہے۔

لقطہ کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر وہ بالکل ہی معمولی یا جلد خراب ہونے والی چیز ہو تو اسے اٹھانے اور استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں مثلاً کسی پھل یا کھجور کا ایک آدھ دانہ، اور اگر اس کی قیمت دس درھم یا اس سے زائد ہو تو اس کے اٹھانے والے پر لازم ہے کہ کامل ایک سال تک اس کا اعلان کرے، اگر اس کا مالک آجائے تو اس کے حوالے کر دے اور اگر ایک سال اعلان کے بعد اٹھانے والے نے اسے استعمال کر لیا یا صدقہ کر دیا تو مالک کو اختیار ہے، چاہے تو اس کی قیمت اٹھانے والے سے وصول کر لے یا اسے معاف کر دے۔

واضح رہے کہ دس درھم کا وزن دو تولے ساڑھے سات ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے تو آج کے حساب سے اس کی قیمت معلوم کر لینی چاہیے۔

مقررہ مدّت تک اعلان کرنے کے بعد کیا اٹھانے والا اس گمشدہ چیز کا مالک ہوسکتا ہے؟ احناف کہتے ہیں کہ اگر وہ مالدار ہے تو نہ وہ مالک بن سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی طرح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے بلکہ اسے چاہیے کہ وہ فقراء اور مساکین میں بطور صدقہ تقسیم کر دے البتہ اگر وہ خود غریب ہو تو صدقے کے طور پر اسے اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے، احناف کے علاوہ دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ”لقطہ“ اٹھانے والا امیر ہو یا غریب وہ لقطہ کا مالک بن جاتا ہے لیکن اگر مستقبل میں کبھی بھی اس کا اصل مالک آگیا تو اسے اس کی قیمت دینی پڑے گی۔ {۲۰}

برادرانِ یوسف کی سازش

﴿۱۱......۱۸﴾

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝۱۱ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ

بولے اے باپ! کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر؟ اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں O بھیج اس کو ہمارے ساتھ کل کو

{۲۰} (دیکھیے الهدایة شرح بدایة المبتدی، کتاب اللقطة، جلد ۴/۳۶۶-۳۷۲)

وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ إِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ أَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَأَخَافُ أَنْ يَّأْكُلَهُ

خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں ○ بولا مجھ کو غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں اس سے

الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ

کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور تم اس سے بے خبر رہو ○ بولے اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا اور ہم ایک جماعت ہیں قوت ور تو تو ہم

إِنَّآ إِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَأَجْمَعُوْٓا أَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ

نے سب کچھ گنوا دیا ○ پھر جب لے کر چلے اس کو اور متفق ہوئے کہ ڈالیں اس کو گمنام کنوئیں میں اور ہم نے

وَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ أَبَاهُمْ

اشارہ کر دیا اس کو کہ تُو جتائے گا ان کو ان کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے ○ اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا

عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓأَبَانَآ إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا

پڑے روتے ہوئے ○ کہنے لگے اے باپ! ہم لگے دوڑ نے آگے نکلنے کو اور چھوڑا یوسف کو اپنے اسباب کے پاس پھر اس کو

فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ

کھا گیا بھیڑیا اور تو باور نہ کرے گا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم سچے ہوں ○ اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ، بولا یہ

بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ

ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر

عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

جو تم ظاہر کرتے ہو ○

تسہیل: باہم مشورہ کے بعد سارے بھائی اپنے والد کے پاس آئے اور ان سے کہنے لگے، ابا جان! کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے اور اسے اکیلے ہمارے ساتھ کہیں جانے نہیں دیتے؟ حالانکہ ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں ○ کل ہمارا تفریح کے لیے جنگل جانے کا پروگرام ہے، آپ یوسف کو بھی ہمارے ساتھ جانے دیں تاکہ یہ وہاں کھا پی کر اور کھیل کود کر خوش ہو اور ہم اس کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لیتے ہیں ○ یعقوب علیہ السلام نے کہا، تمہارے لے جانے کے بعد مجھے اس کی جدائی کا غم پریشان کرتا رہے گا اور یہ اندیشہ ستاتا رہے گا کہ کہیں تمہاری غفلت میں اسے کوئی بھیڑیا نہ کھا جائے ○ انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارے جیسے طاقتور جتھے کی موجودگی میں اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے تو ہمارے جیسا نکما اور نامراد کون ہوگا ○ پھر جب یعقوب علیہ السلام کی اجازت کے بعد وہ یوسف کو جنگل میں لے گئے اور انہوں نے متفقہ فیصلے کے بعد اسے کنویں میں ڈال ہی دیا تو ہم نے یوسف پر وحی بھیجی

کہ مایوس اور پریشان نہ ہونا، ایک وقت ایسا آئے گا جب تم انہیں ان کی کارستانی کے بارے میں بتاؤ گے اور انہیں تو خبر ہی نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے O یہ حرکت کرنے کے بعد وہ رات کے وقت اپنے والد کے پاس روتے ہوئے آئے O اور بولے، ابا جان! ہم دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسف کو اپنے سامان کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا، ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا اگرچہ ہم سچے ہوں O اور وہ یوسف کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے، یعقوب علیہ السلام نے یہ داستان سن کر کہا، اس میں حقیقت کچھ نہیں، یہ سب تمہاری من گھڑت کہانی ہے، اب صبر ہی بہتر ہے اور تم جو کچھ بیان کر رہے ہو میں اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱﴾...... برادرانِ یوسف آپس میں مشورہ کرنے کے بعد اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زور دار انداز میں یوسف کے لیے اپنی محبت اور خیر خواہی کا اظہار کیا۔

﴿۱۲﴾...... پھر ان کے سامنے یوسف کی پکنک کا پروگرام پیش کیا کہ کل اسے جنگل میں ہمارے ساتھ بھیج دیجیے، وہاں یہ پھل بھی کھائے گا اور کھیل کود سے اس کی جسمانی ورزش بھی ہوگی۔ خود تو وہ مویشی چرانے کے لیے جاتے ہی تھے اب یوسف کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے، بدویانہ زندگی میں جی بہلانے کے مختلف طریقوں میں پکنک کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے، شعرائے جاہلیت کے قصائد میں اس کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، تمدنی ترقیات اور شہری سہولیات کی فراوانی کے باوجود آج بھی عربوں میں صحراؤں اور پہاڑوں میں خیمہ زن ہو کر پکنک کا خاصا رواج ہے۔

تورات کہتی ہے کہ برادرانِ یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے ''شِکّم'' کی طرف گئے ہوئے تھے، ان کے پیچھے خود یعقوب علیہ السلام نے یوسف کو روانہ کیا تھا۔ {۲۱} مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے حسد کا حال جانتے ہوئے یوسف کو اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں روانہ کریں، اس حوالے سے قرآن ہی کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا منصوبہ بھائیوں نے خود ہی بنایا تھا بلکہ ان کے اندازِ کلام سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ وہ پہلے بھی اس قسم کی کوشش کر چکے تھے، کیونکہ انہوں نے شکوہ کے انداز میں اپنے والد سے کہا تھا کہ ''کیا وجہ ہے آپ

{۲۱} ''اور اس کے بھائی اپنے باپ کے گلے چرانے کے لیے سِکّم کو گئے، تب اسرائیل نے یوسف سے کہا...... آ میں تجھے ان کے پاس بھیجوں۔''
(عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۷: ۱۲-۱۳/۴۵)

یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے؟'' یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور پیش آیا ہوگا جس سے انہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہمیں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا اندیشہ:

﴿۱۳﴾...... باپ نے کہا، تمہارے لے جانے کی صورت میں ایک تو مجھے اس کی جدائی کا غم ہوگا، دوسرے یہ اندیشہ پریشان کرتا رہے گا کہ اسے کوئی بھیڑیا نہ کھا جائے، اس لیے کہ جنگل میں بھیڑیے کثرت سے ہیں، انبیاء اپنی خصوصیات اور کمالات کے باوجود انسان ہی ہوتے ہیں اور وہ عوارض اور حالات جو انسانوں پر آتے ہیں وہ ان پر بھی آتے ہیں، حزن اور خوف، غصہ اور محبت، بیماری اور بھوک، تھکاوٹ اور نیند یہ سب طبعی عوارض ہیں، نہ یہ نبوت کے منافی ہیں نہ ولایت کے، اس لیے کسی کے ذہن میں یہ اشکال نہیں آنا چاہیے کہ شرفِ نبوت سے سرفراز ہونے کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ غم اور اندیشہ کیوں کر لاحق ہوا؟

یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لڑکوں نے باپ کے منہ سے بات پکڑ لی، جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہی واقعہ بنا کر لے آئے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لڑکوں نے کل جو افسانہ تراشنا تھا اللہ نے آج ہی اپنے پیغمبر کی زبان سے اس کی طرف اشارہ کروادیا۔

﴿۱۴﴾......لڑکوں نے کہا، ''اگر ہمارے جیسی جماعت کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے تو سمجھو کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ دس گیارہ تنومند بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے ایک کمزور بچہ بھیڑیے کے منہ میں پہنچ جائے، ایسا ہو تو کہنا چاہیے کہ ہم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ {۲۲}

﴿۱۵﴾...... بسا اوقات قرآن ایسی جزئیات ذکر نہیں کرتا جن کا ادراک سیاق وسباق میں غور کرنے سے خود بخود ہوجائے، جیسے یہاں قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ بیٹوں کی پُرفریب یقین دہانی کے جواب میں باپ نے کیا کہا، مگر اسلوب بتا رہا ہے کہ ان کی یقین دہانی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بادل نخواستہ ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی کو جنگل میں لے جا کر ایک ویران کنویں میں ڈال دیا اور یوں اپنے خیال میں ہمیشہ کے لیے اس سے جان چھڑالی۔

﴿وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ﴾ وہ اللہ جو مخلوق کے ہر حال سے باخبر ہے، جس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے اور جو تنگی کے بعد آسانی پیدا کرتا ہے، اس نے یوسف کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ حالات ایک سے نہیں رہیں گے، گمنامی کے

{۲۲} (تفسیر عثمانی/۳۰۷۔ دار التصنیف)

اندھیروں میں ضائع ہوجانا تمہارا مقدر نہیں، تمہیں وہ منصب عطا کیا جائے گا جہاں فائز ہونے کے بعد تم اپنے بھائیوں کو ان کی کارستانیوں کی بابت بتاؤ گے۔

﴿وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ یہ معنی بھی کر سکتے ہیں کہ وہ پہچان ہی نہ سکیں گے کہ تم یوسف ہو، کیونکہ وہ تو اپنے خیال میں یوسف کا قصہ تمام کر چکے، اور یہ معنی بھی صحیح ہے کہ آج انہیں خبر ہی نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ یہ اپنی تدبیریں کر رہے ہیں اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا ہے۔

جھوٹے آنسو:

﴿۱۶﴾...... برادرانِ یوسف رات گئے روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے، یا تو مسافت زیادہ ہوگی جس کی وجہ سے دیر ہوگئی یا جان بوجھ کر اندھیرا چھا جانے کے بعد گھر میں داخل ہوئے کہ دن کے اجالے میں باپ کو منہ دکھانا مشکل تھا۔

امام اعمشؒ نے خوب فرمایا کہ برادرانِ یوسف کا گریہ وپکار سننے کے بعد ہم کسی شخص کو محض چشمِ اشکبار سے سچا نہیں کہہ سکتے۔

﴿۱۷﴾......انسان کی طبیعت ہے کہ ایک جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے کئی جرائم کرتا ہے، اسی کو کہتے ہیں کہ ایک گناہ انسان کو دوسرے گناہ تک لے جاتا ہے، باپ اور اس کے محبوب بیٹے کے درمیان جدائی کے لیے جو کچھ برادرانِ یوسف کر آئے تھے، اس پر پردہ ڈالنے کے لیے انہوں نے ایک فرضی کہانی گھڑ لی، اپنے والد کی زبان سے بھیڑیے کے کھا جانے کا اندیشہ تو وہ سن ہی چکے تھے، انہوں نے اسی کو اپنی کہانی کی بنیاد بنا لیا، مگر چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق انہوں نے خود ہی محسوس کر لیا کہ ہماری بات میں وزن نہیں، اس لیے کہانی سنانے کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا اگرچہ ہم سچے ہیں۔

مقامِ نبوت کا احترام:

﴿۱۸﴾......کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کسی جانور کا خون یوسف علیہ السلام کی قمیص پر لگا کر لے آئے، بعض روایات میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے قمیص دیکھ کر استہزاء کے طور پر فرمایا:

﴿ما احلمک یاذئب تاکل ابنی ولاتشق قمیصه﴾{۲۳} "او بھیڑیے! تو کتنا ماہر اور عقلمند تھا، میرے بیٹے کو تو کھا گیا مگر اس کی قمیص کو پھٹنے نہ دیا۔"

{۲۳} (منیر ۱۲/۲۲۳، کبیر ۶، الجزء الثامن عشر/۴۳۱...... کبیر میں الفاظ ذرا مختلف ہیں مفہوم یہی ہے۔م۔ا۔ش)

تورات میں ہے:

’’پھر انہوں نے یوسف کی قبا کو لیا اور ایک بکری کا بچہ مارا اور اسے اس کے لہو میں تر کیا اور انہوں نے اس بوقلموں قبا کو بھیجا اور اپنے باپ کے پاس لے آئے اور کہا کہ ہم نے اسے پایا، آپ اسے پہچانیے کہ یہ آپ کے بیٹے کی قبا ہے کہ نہیں اور اس نے اسے پہچانا اور کہا کہ یہ تو میرے بیٹے کی قبا ہے، کوئی بُرا درندہ اسے کھا گیا، یوسف بے شک پھاڑا گیا۔‘‘ {۲۴}

تورات کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ نے بیٹوں کے اس افسانے کو تسلیم کر لیا مگر قرآن اس کی تردید کرتا ہے، شاید قرآن نے خون اور قمیص کا ذکر اسی لیے کیا ہے تا کہ اس افسانے کا کھوکھلا ہونا ثابت کر دے جسے سن کر ایک عام آدمی بھی اس کے من گھڑت ہونے کو جان لیتا ہے چہ جائیکہ اللہ کا نبی جو کہ ذہانت وفراست میں عام انسانوں سے بہت آگے ہوتا ہے۔

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا﴾ حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص دیکھ کر اور کہانی سن کر فرمایا: ’’یہ تمہاری من گھڑت کہانی ہے۔‘‘ حقیقت جان لینے کے باوجود میں صبر کروں گا، نہ تو ہائے واویلا کروں گا اور نہ تم سے انتقام لوں گا، ایک طرف قرآن ہے جو یعقوب علیہ السلام کو صبر واستقامت کے ایک مثالی پیکر کے طور پر پیش کرتا ہے، دوسری طرف تورات اور تلمود ہے جو انہیں اس موقع پر وہ کچھ کرتے دکھاتی ہے جو شاید غیر نبی مگر صابر وشاکر اور نیک انسان بھی نہ کرے۔

’’تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔‘‘ {۲۵}

کون کہتا ہے قرآن کے مضامین بائبل سے چرائے گئے ہیں؟ کتنے ہی داغ دھبے ہیں جو بائبل نے انبیاء کے پاک صاف دامن پر لگائے تھے اور قرآن نے بڑی مہارت سے انہیں صاف کر دیا، آپ ذرا ’’سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا‘‘ پر غور کیجیے، ہم نے اگرچہ بامحاورہ ترجمہ کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ ’’یہ تمہاری من گھڑت کہانی ہے‘‘ وگرنہ اس جملے کا لفظی ترجمہ یہ ہے ’’تمہارے لیے تمہارے جی نے ایک بات بنا دی ہے‘‘ یعنی تم نفس کے دام میں پھنس گئے ہو اور اس نے ایک من گھڑت بات کو تمہارے سامنے خوشنما بنا کر پیش کر دیا ہے، صاف صاف یہ نہیں کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، نفرت کے بجائے ہمدردی کا اظہار ہے کہ نفس کے بہکاوے میں آجانے کی وجہ سے تم قابلِ رحم ہو۔

{۲۴} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۷: ۳۱-۳۳/ص ۴۶)

{۲۵} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۷: ۳۱-۳۴/ص ۴۶)

غور فرمایئے! قرآن اللہ کے نبی کو کتنے اونچے مقام پر فائز دکھاتا ہے، جو کھلی زیادتی کرنے والوں کے سامنے ان کی زیادتی کی نشاندہی کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو ان کے جرم کو نہیں بلکہ عذر کو نمایاں کرتے ہیں۔

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ اس کا معنیٰ دو طرح سے کیا گیا ہے، ایک تو یہ کہ میرے لیے صبر کرنا ہی بہتر ہے، دوسرا یہ کہ صبرِ جمیل افضل ہے غیرِ صبر سے، صبرِ جمیل اس صبر کو کہا جاتا ہے جس میں نہ شکوہ اور ہائے واویلا ہو اور نہ ہی جذبۂ انتقام اور مالکِ حقیقی پر اعتراض ہو بلکہ اللہ کے فیصلے اور اس کی تقدیر پر رضا کا جذبہ دل میں پایا جاتا ہو{۲۶} اور یہ یقین ہو کہ اس حادثہ میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی۔

حکمت وہدایت:

۱......دشمنی کی حالت میں باتیں دل سے گھڑ لینا، سخن سازی کی مشق کر لینا، بناوٹی زندگی اختیار کر لینا، فطرتِ بشری کے لحاظ سے ذرا بھی مستبعد نہیں۔(۱۱)

۲......مومن بھولا بھالا اور کریم ہوتا ہے، جیسے وہ خود جھوٹ اور فریب سے بچتا ہے دوسروں کے بارے میں بھی یہی گمان رکھتا ہے، چنانچہ وہ ایسے لوگوں کی بات پر یقین کر لیتا ہے جو اس کے سامنے قسم کھا کر کوئی دعویٰ کریں۔(۱۱)

۳......پکنک، تفریح اور کھیل کود میں اگر کوئی جزء معصیت کا نہ ہو تو جائز ہے{۲۷} محبت کرنے والے والدین اپنی اولاد کو اس کے مواقع فراہم کرتے رہتے ہیں۔(۱۲)

۴......خوف اور حزن طبعی امور میں سے ہیں، نہ مقامِ ولایت کے منافی ہیں نہ مقامِ نبوت کے، سرورِ دو عالم ﷺ نے اپنے لختِ جگر کی موت پر فرمایا تھا:

"انا بفراقک یا ابراهیم لمحزون" {۲۸} "اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر غمگین ہیں۔"(۱۳)

۵......انسانوں کو بھیڑیوں کے کھا جانے کے خطرناک واقعات جنگلات میں پیش آتے رہتے ہیں۔(۱۳) لہٰذا چھوٹے بچوں کو کسی با اعتماد اور باہمت سرپرست کے بغیر جنگل میں نہیں بھیجنا چاہیے۔

۶......ایسے مومن سے بھی کبیرہ گناہ ہو سکتا ہے جسے مستقبل میں اعلیٰ مقام ملنے والا ہو، برادرانِ یوسف نے بھی ارتکابِ جرم کے بعد توبہ کر لی تھی۔(۱۵) اور پھر مقامِ ولایت تک پہنچ گئے تھے۔

{۲۶} ومعناه الذی لاشکوی فیه الی الخلق (کشاف ۲/۴۲۶) وقال مجاهد: فصبر جمیل، ای من غیر جزع (کبیر ۶، الجزء الثامن عشر/۴۳۱)

{۲۷} (ماجدی ۲/۵۸۳)

{۲۸} (بخاری ۱، کتاب الجنائز/۱۷۴)

۷......اللہ کی رحمت اپنے نیکوکار بندوں کے بہت قریب ہوتی ہے، وہ انہیں بے یارومددگار نہیں چھوڑتا، سخت آزمائشوں میں انہیں ثابت قدمی عطا فرماتا ہے۔(۱۵)

۸......ظالم رات کے اندھیرے میں مظلوم کا سامنا کرنے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔(۱۶) عربی محاورہ ہے "العین تستحیی من العین" (آنکھ، آنکھ سے شرماتی ہے۔)

۹......ہر آنکھ سے بہنے والے آنسو سچائی کی دلیل نہیں ہوتے۔(۱۶)

۱۰......تلوارزنی، نیزہ بازی، گھڑ دوڑ اور پیدل چلنے کے مقابلے میں حصّہ لینا جائز ہے بشرطیکہ اس میں کوئی ناجائز امر نہ ہو، مثلاً جوا، مخلوط ریس اور عریانیت وغیرہ۔(۱۷)

ہمارے آقا علیہ السلام نے پیدل بھی اور سواری پر سوار ہو کر بھی مقابلے میں حصّہ لیا تھا۔ دو مواقع پر تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی دوڑ لگائی تھی۔{۲۹}

۱۱......علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کا ذکر تین وجہ سے آیا ہے، ایک تو اس لیے کہ اس پر جھوٹا خون لگایا گیا، دوسرے اس لیے کہ عزیزِ مصر کی بیوی نے اسے پیچھے سے پھاڑ دیا تھا، تیسرے اس لیے کہ اسے حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا گیا تو ان کی بینائی واپس آ گئی۔

۱۲......فقہاء قمیص کے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فقہی مسائل میں مثلاً قاتل کی تلاش اور قسامت کے لیے قرائن پر اعتماد کرنا جائز ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص کے آلودہ ہونے کے باوجود اس کے پھٹنے سے محفوظ رہنے سے اپنے بیٹوں کی دروغ گوئی پر استدلال کیا تھا۔

۱۳......ظلم، جھوٹ اور مصیبت کے مقابلے میں صبر کرنے سے تنگی کے بعد آسانی اور غم کے بعد خوشی میسّر آتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خرید وفروخت

۱۹......۲۲

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَٰبُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَٰمٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ

اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا، اس نے لٹکایا اپنا ڈول، کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا اور چھپالیا

بِضَٰعَةً ۚ وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَٰهِمَ مَعْدُودَةٍ

اس کو تجارت کا مال سمجھ کر اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ○ اور بیچ آئے اس کو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی

{۲۹} (ابوداؤد ۲، کتاب الجہاد/۳۵۵)

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي

چونیاں، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار○ اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے

مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ

رکھ اس کو شاید ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اس کو بیٹا اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو اس ملک میں

وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں کچھ ٹھکانے پر بٹھانا باتوں کا اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ

لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٢﴾

نہیں جانتے○ اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو○

تسہیل: ایک قافلہ وہاں سے گزرا، انہوں نے پانی کے لیے اپنا سقہ بھیجا، اس نے کنویں میں ڈول ڈال کر باہر نکالا تو دیکھتے ہی پکار اٹھا، ارے قافلے والو! خوشخبری ہو یہ تو ایک لڑکا ہے، انہوں نے اسے سامانِ تجارت سمجھ کر محفوظ کر لیا، جو کچھ وہ کر رہے تھے اللہ اس سے پوری طرح باخبر تھا○ اہلِ کارواں نے یوسف کو بازارِ مصر میں حقیری قیمت یعنی چند دراھم کے عوض فروحت کر دیا، اصل بات یہ ہے کہ ان کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہی نہ تھی○ اہلِ مصر میں سے جس نے یوسف کو خریدا، اس نے اپنی بیوی کو تاکید کی کہ اسے عزّت و راحت کے ساتھ رکھنا، ممکن ہے کہ گھریلو کام کاج کے سلسلہ میں ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنائیں اور یوں ہم نے یوسف کو سرزمینِ مصر میں ٹھکانہ دے دیا، مقصد یہ تھا کہ ہم اسے منتخب کر لیں اور اسے باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھا دیں اور اللہ اپنا حکم نافذ کرنے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے○ اور جب یوسف اپنی جسمانی اور عقلی پختگی کی عمر کو پہنچ گیا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کر دیا اور ہم نیکوکاروں کو یونہی جزا دیا کرتے ہیں○

تفسیر
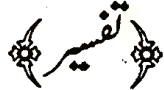
﴿۱۹﴾......حجاز کے اسماعیلی تاجروں {۳۰} کا ایک قافلہ مدین سے مصر کی طرف جا رہا تھا، انہوں نے اپنے سقّہ کو آگے بھیج دیا تا کہ وہ ان کے لیے پانی تلاش کرے اور یہ اس کے قریب پڑاؤ ڈال سکیں، اس نے کنویں میں ڈول ڈالا تو یوسف علیہ السلام رسّی پکڑ کر ڈول میں بیٹھ گئے، ڈول باہر آیا تو کھینچنے والا خوشی اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بے ساختہ پکار اٹھا: ''ارے قافلے والو! خوشخبری ہو، یہ تو ایک لڑکا ہے'' بے آباد کنویں سے بچے کا نکلنا باعثِ تعجب تھا

{۳۰} روی أنهم من العرب الاسماعیلیین (منیر ۱۲/۲۳۰)

ہی، حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن نے بھی سقہ کو دیوانہ سا کر دیا۔

﴿وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً﴾ قافلے والوں کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کا کوئی والی وارث نہ نکل آئے اور یوں ہم مفت میں حاصل ہونے والی متاع سے محروم ہو جائیں، اس لیے انہوں نے اس واقعہ کو راز میں رکھنے کی کوشش کی اور اس ''متاع'' کی حفاظت کا بھی بڑا اہتمام کیا۔

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾ تاجروں کی اپنی اسکیم تھی اور اللہ کی اپنی اسکیم تھی، تاجر خوش تھے کہ بازارِ مصر میں ایک غلام بیچ کر دو پیسے کما لیں گے اور اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ بالآخر اس غلام کو مصر کا حکمران بنا دیا جائے، اللہ کو تاجروں کی اسکیم کی خبر تھی مگر تاجر اللہ کی اسکیم سے بے خبر تھے۔

﴿۲۰﴾...... تاجروں نے مصر پہنچتے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو گنتی کے چند دراھم کے عوض فروخت کر دیا{۳۱} انسان نے جس چیز کے حصول میں کوئی مشقت اٹھائی ہو، اس کی قدر و قیمت اس کے دل میں ہوتی ہے مگر اس غلام کی حیثیت ان کی نظر میں گری پڑی چیز سے زیادہ نہ تھی، پھر غلام بھی ایسا جو بظاہر بھگوڑا تھا، اندیشہ تھا کہ اس کے مالک اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک نہ پہنچ جائیں، اہلِ کارواں کو کیا خبر تھی کہ جس لڑکے کو وہ حقیری قیمت کے بدلے بازارِ مصر میں فروخت کر رہے ہیں، وہ خانوادۂ نبوت کا چشم و چراغ، مستقبل میں اللہ کا نبی اور مصر کا حکمران بننے والا ہے۔

بعض حضرات نے ''وَشَرَوْهُ'' سے مراد برادرانِ یوسف{۳۲} لیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اِدھر اُدھر کہیں چھپے بیٹھے تھے، جونہی قافلے والوں نے یوسف کو کنویں سے نکالا، فوراً وہاں پہنچے اور ظاہر کیا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے، چونکہ اسے بھاگنے کی عادت ہے اس لیے اب ہم اسے فروخت کر دینا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے یوسف کو اونے پونے میں انہی اسماعیلی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا، بائبل کا بیان بھی یہی ہے{۳۳} مگر ہماری نظر میں پہلی توجیہ زیادہ راجح ہے۔

عزیزِ مصر کی فراست:

﴿۲۱﴾...... وہ بردہ فروشی کا زمانہ تھا، دوسرے شہروں اور ملکوں کی طرح مصر میں بھی غلاموں کی منڈی لگتی تھی، خانوادۂ یعقوبی کے اس روشن چراغ کو بھی اسی منڈی میں فروخت کے لیے پیش کیا گیا، مصری حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار کا

{۳۱} أی وباعه السيارة فی مصر بثمن قليل ناقص (المراغی ۱۲/۱۲۲)

{۳۲} الضمير المرفوع إمّا للأخوة (روح المعانی ۷، ۱۲/۳۰۷) الضمير فی قوله "وكانوا فيه من الزاهدين" عائد الى الاخوة فكذا فی قوله "وشروه" يجب ان يكون عائدًا الى الاخوة (كبير ۶، الجزء الثامن عشر/۴۳۳ وما بعدها)

{۳۳} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۷:۲۸/ص ۴۶)

وہاں سے گزر ہوا، قرآن نے اسے ''عزیز'' کہہ کر پکارا ہے جس کا معنیٰ ہے ''ایسا با اقتدار شخص جس کا کوئی مدِ مقابل نہ ہو'' بائبل میں اس کا نام ''پوطیفرع'' مذکور ہے {۳۴} اور یہ کہ وہ فرعون کا ایک امیر اور فوج کا سردار تھا۔

عزیزِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی جان لیا کہ یہ غلام نہیں بلکہ کسی بڑے خاندان کے فرزند ہیں، آپ کا چہرہ بشرہ اور نشست و برخاست بھی آپ کی طبعی شرافت اور حسب ونسب کی بلندی کی گواہی دے رہی تھی، اس لیے اس نے اپنی بیوی کو ہدایت کی کہ اس کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرنا جو مصر میں غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے بلکہ اس کی عزت وآبرو اور جذبات واحساسات کا خوب خیال رکھنا، شاید بڑا ہو کر یہ ہمارے کام آئے یا جب ہماری اولاد نہیں ہے تو ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنالیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین بندوں نے بڑی فراست اور دوراندیشی کا ثبوت دیا، جن میں ایک تو عزیزِ مصر تھا جس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ''یوسف کو عزت وراحت کے ساتھ رکھنا'' دوسری حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی، جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے درخواست کی تھی ''اسے ملازم رکھ لیجیے کیونکہ اچھا ملازم وہی ہوتا ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو'' {۳۵} تیسرے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا تھا۔ {۳۶}

﴿وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ﴾ جیسے ہم نے یوسف کو قتل ہونے اور کنویں کی تاریکی سے بچالیا یونہی ہم نے انہیں مصر جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں ایک ایسے گھرانے میں باعزت ٹھکانہ عطا فرما دیا جہاں رہ کر وہ بہتر انداز میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو نشوونما دے سکتے تھے، دوسری مصلحت اس میں یہ بھی تھی کہ ہم یوسف کو باتوں کی حقیقت اور خوابوں کی تعبیر میں مہارت عطا کردینا چاہتے تھے تاکہ اس کے لیے مصر کی بادشاہی کی راہ ہموار ہوجائے۔

﴿وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ﴾ اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اور ہر واقعہ اور سانحہ گواہی دیتا ہے کہ بہرصورت امرِ الٰہی غالب آکر رہتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے بھی یہی ثابت ہورہا ہے، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بعض حکماء کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا کہ بھائیوں کے سامنے خواب بیان نہ کرنا،

{۳۴} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۳۹: ۱/ص ۴۸)

{۳۵} بابت استاجرہ انّ خیر من استاجرت القوی الأمین (القصص ۲۸/۲۶)

{۳۶} (روح المعانی ۷، ۱۲/۲۱۱ وما بعدھا...... علامہ ابن عربی رحمہ اللہ نے اس قول کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے قرطبی ۹/۱۳۸)

امرِ الٰہی غالب رہا اور یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کر دیا، بھائیوں نے چاہا کہ اپنے معصوم بھائی کو قتل کر دیں، امرِ الٰہی غالب رہا اور یوسف زندہ وسلامت رہے، بیٹوں نے مصنوعی آہ وبکا سے باپ کو دھوکا دینا چاہا، امرِ الٰہی غالب رہا اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے دھوکہ میں نہ آئے۔'' {۳۷}

چونکہ انسان کا علم اور مشاہدہ محدود ہے، اس لیے وہ اللہ کے فیصلوں کی حکمت اور انجام سے بے خبر رہتا ہے، اس کی نظر صرف ظاہر میں الجھی رہتی ہے جبکہ اللہ نے باطن میں کئی راز پوشیدہ رکھے ہوتے ہیں جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿۲۲﴾...... ''جب یوسف اپنی جسمانی اور عقلی پختگی کی عمر کو پہنچ گیا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کر دیا'' تیس سے چالیس سال کے درمیانی عرصہ پر پختگی (اشد) کا اطلاق ہوتا ہے، اس لیے کسی نے پچیس اور کسی نے تینتیس سال کی عمر کو پختگی کی عمر قرار دیا ہے {۳۸} لیکن زیادہ تر حضرات چالیس سال کی عمر مراد لیتے ہیں {۳۹} اور یہی نبوت کی عمر بتائی گئی ہے۔

﴿حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ لغت میں ''حکم'' کا لفظ فیصلہ، حکمت، حکومت اور حق وباطل میں تمیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے {۴۰} انبیائے کرام علیہم السلام کے حوالے سے جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے عام طور پر حکمت کا معنی مراد لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو علمِ نبوت کے ساتھ قوتِ فیصلہ اور حق وباطل میں تمیز کی صلاحیت بھی عطا فرماتے ہیں۔

﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ یوسف علیہ السلام ابتداء ہی سے نیکوکار تھے، سیرت وکردار میں ممتاز اور دیانت و امانت، عفت وپاکدامنی جیسی صفات سے متصف، بچپن بھی بے داغ اور جوانی بھی پاک صاف، تاکہ نبوت ملنے کے بعد کسی کو ان کے ماضی پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکے، اللہ تعالیٰ نے انہیں نیکوکاری کی جزا علم وحکمت کی صورت میں عطا فرمائی، ہر نیکوکار کو اللہ یونہی جزا دیا کرتے ہیں یعنی اس کی حیثیت اور استعداد اور اپنی مشیت کے مطابق اسے علم و حکمت سے نواز دیتے ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر نیکوکار کو منصبِ نبوت عطا کر دیا جاتا ہے یا یہ کہ عبادت و ریاضت، زہد وتقویٰ، ذکاوت وذہانت اور حسنِ عمل کے ذریعے یہ عظیم منصب ہر کوئی حاصل کر سکتا ہے، نبوت تو سراسر

{۳۷} (قرطبی ۹/۱۳۸ وما بعدها)

{۳۸} "ولما بلغ أشده" قدر الأطباء هذه السن بخمس وعشرين سنة...... قال ابن عباس: انها ثلاث وثلاثون سنة (المراغی ۱۲/۱۲۷)

{۳۹} وتمامه اربعون...... وقال الحسن: أربعون (روح المعانی ۷/۱۲/۳۱۴)

{۴۰} (مفردات/۱۲۶-۱۲۷)

اللہ کا ذاتی انتخاب ہوتا ہے، اس میں انسان کی اپنی محنت اور عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ الگ بات ہے کہ اللہ کا نبی نبوت ملنے سے پہلے بھی صورت وسیرت اور کردار وعمل میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوتا ہے۔

حکمت وہدایت:

۱...... جسے اللہ بچانا چاہے اسے کوئی ہلاک نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور ارادہ سے ایسی تدبیر کرتا ہے جہاں تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی۔(۱۹)

۲...... خوش کن معاملہ دیکھ کر اظہارِ مسرت اور اس کا اعلان جائز ہے۔(۱۹)

۳...... دین اور دنیا کے معاملات میں احتیاط کرنا جائز ہے۔(۱۹)

۴...... انسان کو جو چیز محنت اور معاوضہ کے بغیر حاصل ہوجائے، اس کے دل میں اس کی قدر نہیں ہوتی۔(۲۰)

۵...... قیمتی چیز، حقیر قیمت کے بدلے خریدی جاسکتی ہے۔(۲۰)

۶...... آزاد انسان کی خرید وفروخت حرام ہے اور اگر اس کا سودا کیا جارہا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ فروخت ہونے سے انکار کردے، لیکن کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے مصلحتاً خاموشی بھی اختیار کی جاسکتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے سکوت کو ہم اسی پر محمول کریں گے، پھر بڑی بات یہ کہ اس وقت وہ پیغمبر تو خیر تھے ہی نہیں، نوعمر بھی تھے، علاوہ ازیں حالت بھی خوف اور ہیبت کی تھی...... اس واقعہ سے یہ مسئلہ اخذ کیا گیا ہے کہ ضرر کے خوف سے کسی برائی پر سکوت اختیار کرنا منافیِ کمال نہیں (۲۰){۴۱}

۷...... بعض انسانوں کو اللہ تعالیٰ ایسی فراست وبصیرت عطا فرماتا ہے کہ وہ چہرہ دیکھ کر ہی مخفی صلاحیتوں اور نسبی اور ذاتی شرافت کا اندازہ لگالیتے ہیں جیسے عزیزِ مصر نے اندازہ لگالیا۔(۲۱)

۸...... قدرت اور علم ایسی نعمتیں ہیں جن سے انسان کو کمال حاصل ہوتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کو دونوں حاصل ہوئیں، مصر جیسے متمدن ملک میں باعزت ٹھکانہ بھی مل گیا اور ''تاویل الاحادیث'' یعنی حقائق تک رسائی کا علم بھی اللہ نے عطا فرمادیا۔(۲۱)

۹...... اسلام میں منہ بولے بیٹے کا اب کوئی تصور نہیں، کسی کو بیٹا بنانے سے اس کے لیے بیٹے والے احکام ثابت نہیں ہوتے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کے ابتدائی زمانے میں بیٹا بنایا تھا۔

۱۰...... خوابوں کی تعبیر اور حقائق تک رسائی کا علم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

{۴۱} (بیان القرآن حصہ اول، جلد۵/۷۱)

۱۱......حسنِ جزا مشروط ہے حسنِ نیت اور حسنِ عمل سے یعنی اچھی جزا کا حقدار وہ ہوتا ہے، جس کی نیت بھی اچھی ہو اور عمل بھی اچھا ہو۔(۲۲)

ایک اور آزمائش

۲۳......۲۹

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ

پھسلایا اس کو اس کی عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا جی تھامنے سے اور بند کر دیے دروازے اور بولی شتابی کر، کہا خدا کی

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ

پناہ! عزیز مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو، بے شک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں O اور البتہ عورت نے فکر کیا

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ

اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا، اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی یوں ہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی

مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا

البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں O اور دونوں دوڑے دروازے کو اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور دونوں مل گئے

لَدَا الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس، بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی مگر یہی کہ قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک O

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ

یوسف بولا، اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو اور گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے اگر

قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۲۶﴾ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ

ہے کرتہ اس کا پھٹا آگے سے تو عورت سچی ہے اور وہ ہے جھوٹا O اور اگر ہے کرتا اس کا پھٹا پیچھے سے

وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ

تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے O پھر جب دیکھا عزیز نے کرتا اس کا پھٹا ہوا پیچھے سے، کہا بے شک

إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ﴿۲۸﴾ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ

یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا البتہ تمہارا فریب بڑا ہے O یوسف! جانے دے اس ذکر کو اور عورت! تو بخشوا اپنا گناہ

مِنَ الْخَاطِئِينَ ﴿۲۹﴾

بے شک تو ہی گناہ گار تھی O

تسہیل: جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ ان پر فریفتہ ہوکر انہیں ورغلانے لگی، ایک دن اس نے گھر کے دروازے بند کر لیے اور کہنے لگی، یوسف! بس آ جاؤ، یوسف نے کہا معاذ اللہ! میں یہ ظلم کیسے کر سکتا ہوں جبکہ تمہارا شوہر میرا آقا ہے، اس نے مجھے عزت اور راحت سے رکھا ہے، بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پا سکتے O اس عورت نے تو برائی کا ارادہ کر ہی لیا تھا، یوسف بھی ارادہ کر لیتے اگر انہوں نے اپنے رب کی واضح دلیل نہ دیکھ لی ہوتی، اس طرح ہم نے یوسف کو بچا لیا تا کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں، وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھا O اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے اور اس نے یوسف کا کرتا پیچھے سے پھاڑ دیا، اچانک انہوں نے دیکھا کہ اس عورت کا شوہر دروازے کے پاس کھڑا ہے، وہ بول اٹھی کہ وہ شخص جو تمہاری اہلیہ کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ یا تو اسے جیل میں ڈال دیا جائے یا کوئی دوسری دردناک سزا دی جائے O یوسف نے کہا، میں نے برائی نہیں کی بلکہ اسی نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی تھی، اس موقع پر اسی عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر یوسف کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو وہ جھوٹی اور یہ سچا ہے O جب اس کے شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو اس نے کہا، یہ تم عورتوں کا فریب ہے، بے شک تمہارا فریب بڑا غضب کا ہوتا ہے O پھر اس نے یوسف سے کہا جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ اور اپنی بیوی سے کہا اپنے گناہ کی معافی مانگو، بے شک تم ہی خطاوار ہو O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۳﴾...... عزیزِ مصر کی بیوی حضرت یوسف پر فریفتہ ہوگئی، آپ کے بے مثال حسن و جمال نے اسے دیوانہ سا کر دیا، یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے چھوٹی موٹی حرکتیں تو معلوم اس نے کتنی کی ہوں گی، ایک دن وہ شرم و حیا کی ساری حدیں عبور کر گئی، اس نے گھر کے دروازے بند کر لیے اور یعقوب علیہ السلام کے لختِ جگر کو کھلے لفظوں میں دعوتِ گناہ دے ڈالی...... ایک اچٹتی سی نظر ترغیب اور کشش کے ان اسباب پر ڈال لیجیے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں جمع ہو گئے تھے، دعوت دینے والی عورت وہ ہے جس کے گھر میں آپ کا قیام ہے، میل ملاپ، باہم گفتگو اور خلوت کے مواقع بھی بار بار میسّر آ رہے تھے، شوہر کی تاکید اپنی جگہ مگر وہ جو اپنا دل حسن کی تجلی کے سامنے ہار ہو چکی تھی، کون جانے وہ کتنی سہولتیں مہیا کرتی ہوگی اور توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتی ہوگی، وہ کوئی معمولی عورت نہ تھی عزیزِ مصر کی بیوی تھی، یقیناً خود بھی دلکشی اور دلربائی کا مرقع ہوگی، کامل تنہائی کے لیے اس نے سارے

دروازے بھی بند کردیے، نہ گھر میں کوئی فرد موجود نہ باہر سے کسی کی مداخلت کا خطرہ، دوسری طرف عین شباب کا زمانہ، تجرد کی زندگی، قوت اور شہوت کا زور، طلب نہیں مطلوبیت، وہ بھی دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی، ان سارے زہد شکن دواعی کے جواب میں اللہ سے ڈرنے اور محبت کرنے والے بندے نے صرف ایک لفظ کہا اور شیطانی جال کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا، فرمایا، معاذ اللہ! یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے اللہ کی پناہ مانگنا واجب ہے،{۴۲} اور میں بھی انہی میں سے ہوں جو اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ضمیر بیدار کرنے کی کوشش:

﴿إِنَّهُ رَبِّيٓ﴾ پہلا جواب مذہبی سوچ اور خاندانی تربیت کے مطابق تھا تو دوسرا جواب انسانی نفسیات کے اعتبار سے آپ نے دیا، جس کے ذریعہ ایسی عورت کے ضمیر اور اخلاق کو آپ نے بیدار کرنے کی کوشش فرمائی جو شہوانی جذبات میں بالکل اندھی ہو چکی تھی، آپ فرمارہے ہیں کہ حرام کاری تو ویسے بھی بہت بڑا گناہ ہے اور وہ بھی اپنے اس محسن کی بیوی کے ساتھ جس نے مجھے پردیس میں باعزت ٹھکانہ دیا اور میرے اوپر اعتماد کرتے ہوئے سب کچھ میرے حوالے کردیا، توریت میں ہے:

''لیکن اس نے نہ مانا اور اپنے آقا کی جورو سے کہا کہ دیکھ! میرا آقا کسی چیز سے، جو گھر میں میرے پاس ہے، واقف نہیں اور اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں کردیا، اس گھر میں مجھ سے زیادہ کوئی بڑا نہیں۔''{۴۳}

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ ''بہت سے جاہلی مذہبوں میں زنا کاری بجائے خود کوئی جرم ہی نہیں، البتہ حقوقِ شوہری میں خیانت جرم ہے، عجب نہیں جو اس وقت کے مصری مذہب میں بھی یہی ہو اور یہ ٹکڑا حضرت نے زلیخا کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے اضافہ کیا ہو؟ اری! تم تو شوہر دار عورت ہو، جواب کے اس جزء کو جنہوں نے مرتبۂ پیمبری سے فروتر قرار دیا ہے، انہوں نے خود ہی بڑی سطحیت برتی ہے، یہ جواب تو حضرت کی حکیمانہ عظمت کا ایک گہرا ثبوت ہے۔''{۴۴}

بعض حضرات نے ''إنّـه ربی'' کی ضمیر کا مرجع اللہ کو قرار دیتے ہوئے معنی کیا ہے ''اللہ میرا رب ہے'' لیکن سیاق وسباق اس کی تائید نہیں کرتا، ویسے بھی خوف خدا سے عاری اور اخروی انجام سے بے خبر عورت کے سامنے اللہ کی

{۴۲} وهذا اجتناب منه عليه السلام على أتم الوجوه واشارة الى التعليل بانه منكر هائل يجب ان يعاذ بالله (روح المعاني ۷، ۱۲/۳۱۹)

{۴۳} (عہدِ عتیق، پیدائش باب ۳۹: ۹-۱۰ / ص ۴۸)

{۴۴} (ماجدی ۲/ ۵۹۱)

قدرت اور اس کے علم وسمع کا ذکر بے فائدہ تھا، اس کے جذباتی ہیجان کو صرف اسی فقرے سے ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا جو حضرت نے فرمایا، اس میں اگر ذرا بھی شرافت ہوتی تو وہ یہ ضرور سوچتی کہ اگر یہ اجنبی نوجوان اپنے آقا کے معمولی احسان کی وجہ سے میری دعوت کے باوجود اس سے بے وفائی کے لیے آمادہ نہیں تو مجھے اس سے کہیں زیادہ بے وفائی سے بچنا چاہیے کیونکہ میں اس کی بیوی ہوں، وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے اور اس نے مجھے اپنے گھر کی ملکہ بنا رکھا ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ ہر گناہ کی طرح بدکاری بھی ظلم ہے اور ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتا، دنیا میں بھی رسوا ہوتا ہے اور آخرت میں بھی رسوا ہوگا۔

غیر اختیاری وسوسہ:

﴿۲۴﴾......اس آیتِ کریمہ کے ابتدائی الفاظ کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے "تسہیل" میں اختیار کیا ہے یعنی "اس عورت نے تو برائی کا ارادہ کر ہی لیا تھا، یوسف بھی ارادہ کر لیتے اگر انہوں نے اپنے رب کی واضح دلیل نہ دیکھ لی ہوتی" اس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ آپ نے "واضح دلیل" دیکھ لی تھی اس لیے آپ کے دل میں برائی کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "بشری تقاضے کے مطابق آپ کے دل میں بھی میلان پیدا ہوا تھا مگر جب انہوں نے واضح دلیل کو دیکھا اور یاد کیا تو ان کے لیے گناہ سے بچنا آسان ہوگیا" سوال اٹھا کہ دل میں برائی کا خیال پیدا ہونا کیا منصبِ نبوّت کے منافی نہیں؟ جواب دیا گیا، ہرگز نہیں، غیر اختیاری وسوسہ نہ ولایت کے منافی ہے نہ منصبِ نبوّت کے، مواخذہ صرف ان اعمال پر ہوتا ہے جن سے بچنا انسان کے اختیار میں ہو پھر بھی نہ بچے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾{۴۵} "اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا۔"

سورۂ اسراء میں جنابِ نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا﴾{۴۶} "اور اگر ہم آپ کو ثابت قدمی عطا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ آپ ان کافروں کی جانب تھوڑے سے مائل ہو جاتے۔"

بلکہ حدیث سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص برائی کا خیال دل میں پیدا ہو جانے کے بعد محض اللہ کے ڈر سے اسے عملی جامہ پہنانے سے باز آ جائے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔

{۴۵} (البقرۃ ۲/۲۸۶)

{۴۶} (الاسراء ۱۷/۷۴)

ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الله تبارك وتعالىٰ وقوله الحق: اذاهمّ عبدى بحسنة فاكتبوها له حسنة فان عملها فاكتبوها له بعشر امثالها واذاهمّ بسيّئة فلا تكتبوها فان عملها فاكتبوها بمثلها فان تركها وربما قال فان لم يعمل بها فاكتبوها له حسنة﴾{۴۷}

''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے اور اس کا فرمان سچ ہے:''جب میرا بندہ نیکی کا ارادہ کرے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو اور اگر وہ اس ارادے پر عمل بھی کرے تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دو اور اگر وہ برائی کا ارادہ کرے اور اس سے وہ گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک گناہ لکھ دو، اور اگر وہ گناہ سے باز آ جائے تو اس کے لیے نیکی لکھ دو۔''

﴿لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ جس برھان اور واضح دلیل کا اس آیت میں ذکر ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ کسی نے کہا حکمِ الٰہی {۴۸} کسی نے منصب نبوت {۴۹} کسی نے تقوی وطہارت {۵۰} اور کسی نے کہا وہ نورِ فطرت {۵۱} مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر رکھا ہے، جو لوگ اس نور کی قدر کرتے ہیں ان کے اندر یہ نور دن بدن قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے اور جو اس کی قدر نہیں کرتے ان کے اندر ضعیف سے ضعیف تر، حتّٰی کہ بجھ ہی جاتا ہے، یہ سبھی مفہوم مراد لیے جاسکتے ہیں، زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مقامِ نبوت یا مقامِ صدیقیت مراد لیا جائے اور جسے ان میں سے کوئی بھی مقام مل جائے اسے ہمہ وقت یہ حقیقت مستحضر رہتی ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے بلکہ یہ کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں، جیسا کہ سرورِ دو عالم ﷺ نے احسان کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

''تم اللہ کی عبادت یوں کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، ورنہ کم از کم یہ یقین تو ضرور رکھو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔''{۵۲}

جسے یہ مقام نصیب ہو جائے وہ برائی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، حیا اور مراقبہ کی وجہ سے اس کے دل میں برائی سے نفرت بیٹھ جاتی ہے۔ جناب یوسف علیہ السلام کو ان میں سے ایک مقام ضرور حاصل تھا۔

گناہ سے رکنے کے دو مرتبے ہیں، پہلا مرتبہ یہ ہے کہ نفس کے ساتھ مجاہدہ کرتے ہوئے اللہ کے ڈر سے گناہ سے اپنے آپ کو بچا لیا جائے، یہ مرتبہ صلحاء کو حاصل ہوتا ہے، دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے مشاہدہ میں مستغرق ہونے کی وجہ

{۴۷} (ترمذی ۲، ابواب التفسیر/۱۳۳)
{۴۸} انه حجة الله فى تحريم الزنا...... (كبير ۶، ۱ الجزء الثامن عشر/ ۴۴۳)
{۴۹} انه النبوّة المانعة من ارتكاب الفواحش (حوالة مذكوره)
{۵۰} والمراد برؤيته لها كمال ايقانه بها ومشاهدته لها واصله الى مرتبة عين اليقين (روح المعانى ۷، ۱۲/ ۳۲۱)
{۵۱} هو برهان الله المأخوذ على المكلفين من وجوب اجتناب المحارم (التفسير المنير ۱۲/ ۲۴۳)
{۵۲} (بخارى ۲، كتاب التفسير/ ۷۰۴، مسلم ۱، كتاب الايمان/ ۲۷)

سے گناہ سے نفرت محسوس ہو، یہ مرتبہ صدیقوں اور انبیاء کو نصیب ہوتا ہے، یہی وہ ''برھان'' ہے جو اللہ کے مخصوص بندے دیکھ لیتے ہیں، اس کی برکت سے صرف انہیں برائی سے دور نہیں رکھا جاتا بلکہ برائی کو بھی ان سے دور ہٹا دیا جاتا ہے، اسی لیے تو فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ ''تاکہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں''

﴿۲۵﴾...... حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا دونوں دروازے کی طرف دوڑے، یوسف بچاؤ کے لیے اور زلیخا گھیراؤ کے لیے، آپ کی قمیص کا پچھلا حصّہ زلیخا کے ہاتھ میں آ گیا، اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا، اس کھینچا تانی میں کرتا پھٹ گیا مگر آپ گناہ سے بچ گئے، دونوں بھاگتے ہوئے دروازے تک پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں وہاں عزیزِ مصر کھڑا ہے، زلیخا نے پینترا بدلا اور مظلوم اور معصوم بننے کے لیے الزام یوسف علیہ السلام پر لگا دیا، نہ صرف الزام بلکہ سزا بھی سنا دی یعنی جیل یا سخت عذاب، زلیخا کا زیادہ زور بدکاری پر نہیں بلکہ ''تیری بیوی کے ساتھ بدکاری'' پر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر کی بگڑی ہوئی تہذیب میں اقدامِ زنا خود کوئی جرم نہ تھا بلکہ شوہر کی ناموس میں خیانت اصل جرم تھا۔

﴿۲۶-۲۷﴾...... ایک انداز زلیخا کا تھا، دوسرا انداز اللہ کے منتخب بندے کا ہے، زلیخا نے کہا تھا ''اس شخص کی کیا سزا ہے جس نے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا؟'' آپ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا ''تیری بیوی نے مجھے پھسلانا چاہا'' بلکہ عزیزِ مصر کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے غائب کے صیغہ سے زلیخا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نے مجھے پھسلانے اور بہکانے کی کوشش کی تھی۔

﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ قرائن کی گواہی بالکل واضح تھی، دونوں کا دوڑتے ہانپتے دروازے تک پہنچنا، یوسف علیہ السلام کا آگے اور زلیخا کا پیچھے ہونا، پشت کی جانب سے قمیص کا پھٹ جانا، یہ سب چیزیں زلیخا کی کارستانی کی گواہی دے رہی تھیں، اتفاق سے زلیخا کے خاندان میں سے ایک شخص نے انہی قرائن کو مدار بناتے ہوئے ایک طرح سے فیصلہ ہی کر دیا...... یہ شخص کون تھا؟ کہا گیا کہ دودھ پیتا بچہ تھا، اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:

''چار بچوں کو اللہ تعالیٰ نے گہوارہ میں قوتِ گویائی عطا فرمادی تھی یعنی فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی کے بیٹے کو، یوسف کے گواہ، جریج کے صاحب اور عیسیٰ ابنِ مریم کو۔'' {۵۳}

بعض حضرات نے اس گواہ سے زلیخا کا چچازاد بھائی مراد لیا ہے جو کہ عاقل و بالغ اور سمجھدار انسان تھا۔

{۵۳} (رواہ الحاکم فی تفسیر سورۃ التحریم بحوالہ المراغی ۱۲/۱۳۵ ...... وضعفہ رجال الحدیث)

ان دو کے علاوہ بھی متعدد اقوال تفسیروں میں منقول ہیں، مثلاً یہ کہ وہ ''گواہ'' انسان نہیں بلکہ حیوان یا جن تھا اور یہ کہ نہ وہ انسان اور نہ ہی جن تھا بلکہ کوئی انوکھی مخلوق تھا جسے اللہ نے گواہی کے لیے پیدا کیا تھا، ان اقوال میں ان حضرات کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے جو مبہمات اور عجائبات کی تلاش میں رہتے ہیں، حیرت اس بات پر ہے کہ قرآن واضح طور پر کہہ رہا ہے ''اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے گواہی دی'' اس وضاحت کے باوجود کہا جارہا ہے کہ وہ حیوان یا جن یا کوئی جدید مخلوق تھا۔

بہرحال گواہ نے یہ بات بتادی کہ سچ اور جھوٹ کی پرکھ کے لیے یوسف کی قمیص کو دیکھا جائے، اگر قمیص آگے سے چاک ہے تو یوسف جھوٹا اور زلیخا سچی، اور اگر پیچھے سے پھٹی ہوئی ہو تو یوسف حق پر اور زلیخا جھوٹی!

﴿۲۸﴾......گواہ کی گواہی کے مطابق جب عزیز نے کُرتا دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا، جس سے ثابت ہوگیا کہ یوسف نے ہاتھاپائی نہ کی تھی بلکہ وہ گناہ سے بچنے کے لیے زلیخا کی طرف پیٹھ کرکے بھاگ رہے تھے اور کُرتا جو پھٹا تو زلیخا کی دست درازی کی وجہ سے! اس واضح ثبوت کو دیکھ کر عزیز بے ساختہ بول پڑا ''بے شک یہ تم عورتوں کا فریب ہے۔'' ساتھ ہی اس نے عمومی انداز میں یہ بھی کہہ دیا کہ تمہارا فریب بڑے غضب کا ہوتا ہے، مردوں کے لیے ان کی حقیقت تک پہنچنا اور ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

بعض حضرات نے یہاں سے استدلال کیا ہے کہ بگڑی ہوئی عورتوں کا فریب شیطان سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ شیطان کے فریب کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾{۵۴} ''بے شک شیطان کی تدبیر کمزور ہے۔''

عورت کی مکاری کے لیے بعض اوقات کسی روایت کا سہارا بھی لے لیا جاتا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس آیت کو بنیاد بنا کر ساری ہی عورتوں کو مکار اور فریب کار قرار دے دینا قطعاً غلط ہے۔

﴿۲۹﴾......معاملہ کی تہہ تک پہنچ جانے کے بعد عزیز نے یوسف سے درخواست کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا، اسے بھول جاؤ، کسی کے سامنے اس کا ذکر مت کرنا اور زلیخا سے کہا کہ اپنے معبود سے یا یوسف سے اپنے گناہ کی معافی مانگو کیونکہ قصور تمہارا ہی تھا۔

حکمت وہدایت:

۱......زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ پر آمادہ کرنے کے لیے تین طریقے اختیار کیے، ناز وانداز اور سخن سازی

{۵۴} (النساء ۴/۷۶)

سے ورغلانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، دروازے بند کرلیے اور کھلے لفظوں میں دعوت دی۔(۲۳)

۲......حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوتِ گناہ کے جواب میں تین چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنا دفاع کیا: ☆اللہ کی پناہ اور جسے اللہ کی پناہ حاصل ہوجائے وہ بچ ہی جاتا ہے۔☆تمہارا شوہر میرا آقا اور محسن ہے۔☆ظالم اور احسان ناشناس لوگ فلاح نہیں پاسکتے۔(۲۳)

۳......جو لوگ باری تعالیٰ کی ذات وصفات کا مشاہدہ اور مراقبہ کرتے ہیں، ان کے لیے گناہ سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔(۲۴)

۴......اللہ اپنے منتخب بندوں کی گناہوں سے خود حفاظت کرتا ہے۔(۲۴)

۵......اگرچہ "ھَمّ" کا لفظ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لیے بولا گیا ہے۔مگر دونوں کے "ھَمّ" میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لیے قرآن نے دونوں کو ایک لفظ میں جمع نہیں کیا بلکہ الگ الگ ذکر کیا ہے۔(۲۴)

۶......جس جگہ گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔(۲۵){۵۵}

۷......حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں اپنی طاقت کے مطابق گناہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کے لیے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔(۲۵)

۸......جھوٹی تہمت اور الزام کی صورت میں اپنی صفائی پیش کرنا انبیاء کی سنت ہے، ایسے موقع پر خاموشی اختیار کرنا توکل ہرگز نہیں۔(۲٦)

۹......معاملات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے علامات اور قرائن سے مدد لی جاسکتی ہے۔

۱۰......عورتوں کے فتنہ سے بچنا ضروری ہے کیونکہ ان کا فتنہ عظیم ہے، ایک حدیث میں ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا:

﴿ما ادع بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء﴾{۵٦} "میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑا فتنہ نہیں چھوڑا۔"

ظاہر ہے اس سے بے حیا عورتیں ہی مراد ہوسکتی ہیں ورنہ حیادار عورت تو گھر کی زینت اور اسلامی معاشرہ کی بنیاد

{۵۵} (معارف القرآن ۵/۵۵)

{۵٦} (ابن ماجہ، کتاب الفتن/۲۸۸)

ہوتی ہے، آوارہ عورت کی فتنہ گری کا حال اس عفیفہ سے پوچھیے جو اس قسم کی عورت کی دخل اندازی کی وجہ سے شوہر سے محروم ہوگئی ہو یا ان والدین سے پوچھیے جن کی اولاد غلط راستے پر چل کر اپنا سب کچھ تباہ کر چکی ہو۔

۱۱......گناہ پر پردہ ڈالنا مستحب اور اس کی اشاعت مکروہ ہے۔(۲۹)

چند عورتوں کا فریب اور ناکامی

﴿۳۰......۳۵﴾

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے اس کے جی کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اس کی

شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۞ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ

محبت میں، ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر ○ پھر جب سنا اس نے ان کا فریب بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی

وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا

ان کے واسطے ایک مجلس اور دی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری اور بولی یوسف نکل آ ان کے سامنے پھر جب دیکھا

رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۞

اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں حاشا اللہ نہیں یہ شخص آدمی یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ ○

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ

بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے مجھ کو اس کے واسطے اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی پھر اس نے تھام رکھا اور

لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۞ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا

بے شک اگر نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑے گا اور ہوگا بے عزت ○ یوسف بولا اے رب! مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے

يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞

جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں اور اگر تو نہ دفع کرے گا مجھ سے ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل ○

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

سو قبول کر لی اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب البتہ وہی ہے سننے والا خبردار ○ پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی

مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۞

ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت تک ○

تسہیل: مصر کی چند عورتوں نے کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے، اس کی محبت اس کے دل ودماغ پر چھا گئی ہے، ہمارے خیال میں تو وہ کھلی حماقت میں مبتلا ہے O جب عزیز کی بیوی نے عورتوں کی پر فریب باتیں سنیں تو انہیں پیغام بھیج کر بلوالیا اور ان کے لیے خصوصی نشست گاہ تیار کی اور پھل کاٹنے کے لیے ان میں سے ہر ایک کو چھری بھی دے دی، پھر یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے آجاؤ، جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو ہکا بکا رہ گئیں اور انہوں نے پھلوں کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا سبحان اللہ! یہ انسان ہرگز نہیں بلکہ کوئی بزرگ فرشتہ ہے O وہ بولی یہی تو ہے جس کی محبت کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں، میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے اسے ورغلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اپنے آپ کو بچالیا اور اگر اس نے وہ کام نہ کیا جس کی دعوت میں اسے دیتی ہوں تو اسے جیل میں بھی ڈالا جائے گا اور یہ ذلیل بھی ہوگا O یہ دھمکی سن کر یوسف نے دعا کی، اے میرے رب! مجھے قید خانہ زیادہ محبوب ہے اس چیز سے جس کی طرف یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں، اور اگر آپ نے ان کے مکر وفریب سے میری حفاظت نہ فرمائی تو ممکن ہے میں ان کی طرف مائل ہو کر جاہلوں جیسی حرکت کر بیٹھوں O سو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور عورتوں کے مکر وفریب سے اس کی حفاظت فرمائی، بے شک وہ دعاؤں کا سننے والا اور دلوں کا حال جاننے والا ہے O یوسف کی پاکدامنی کی نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ یوسف کو کچھ وقت کے لیے جیل میں ڈال دیا جائے O

﴿تفسیر﴾

﴿۳۰﴾...... مصر کے بڑے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی چند بیگمات کے ہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن وجمال اور عفت وعصمت کے ساتھ زلیخا کی دیوانگی کا چرچا شروع ہوگیا اور ان کے دل میں بھی اس جوانِ رعنا کو دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوگئی جس نے زلیخا کے دل کا سکون چھین لیا تھا، انہوں نے بظاہر تعجب اور انکار کے لہجے میں کہا ”عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے“ یعنی باوجودیکہ وہ سلطنت کے سب سے بڑے رکن کی اہلیہ اور یوسف اس کا غلام اور خادم ہے، وہ اس کے سامنے ذلیل ہو کر اسے ورغلانے اور بہکانے کی کوشش کر رہی ہے، اس کے شوہر کے علم میں بھی سارا معاملہ آچکا ہے لیکن وہ پھر بھی باز آنے کے لیے تیار نہیں۔

﴿نِسْوَةٌ﴾ قرآن مجید میں عورتوں کا ذکر بصیغۂ جمع بیسیوں مرتبہ آیا ہے، ہر جگہ اس مفہوم کے لیے لفظِ ”نساء“ آیا ہے، اس عام لفظ کو چھوڑ کر قرآن میں صرف دو ہی جگہ ”نِسْوَةٌ“ آخر کیوں آیا ہے؟ (ایک تو یہی اور یہ دوسری جگہ بھی

اسی سیاق میں چند آیتوں کے بعد) اس سوال سے ایک عقدہ حل ہو جاتا ہے "نسوۃ" جمع تکسیر ہے، اس کو جمع قلت بھی کہتے ہیں اور یہ دلالت بھی کرتی ہے قلتِ عدد پر یعنی ایسی کہنے والیاں صرف چند ہی تھیں، جمع کثرت کے لیے لفظِ "نساء" آتا ہے۔

گویا قرآن نے یہ لفظ لا کر خود ادھر اشارہ کر دیا کہ ان بیویوں کی تعداد کچھ ایسی بڑی نہ تھی، یہ گنتی کی چند بیویاں تھیں، بیگم کی ہم سرو ہم چشم، چنانچہ روایتوں میں ان کی تعداد کل پانچ آتی ہے بلکہ بعض میں چار بھی۔" {۵۷}

﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ ایسی محبت جو دل میں سوراخ کر کے اندر تک سرایت کر گئی ہے {۵۸} حتیٰ کہ اب اسے اپنی ذلت وعزت کی کوئی پرواہ نہیں، وہ بہر صورت اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہے۔

﴿إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ "ہمارے خیال میں وہ کھلی گمراہی اور حماقت میں مبتلا ہے۔" ان امیر زادیوں کی بحث جائز ناجائز اور ضلالت وہدایت کے حوالے سے نہ تھی بلکہ یہ طعن وتشنیع محض اس لیے تھی کہ زلیخا تک ہماری باتیں پہنچ جائیں اور وہ انہیں اپنے محل میں بلا کر "نظارے" کا موقع فراہم کرے۔

انسان نہیں، دیوتا:

﴿۳۱﴾...... زلیخا تک ان غیبتوں اور زبان درازیوں کی خبر پہنچ گئی، کیسے نہ پہنچتی اس لعن طعن کا مقصد ہی یہ تھا، اس نے ان سب کو دعوت میں بلا بھیجا، مصر کے طبقۂ امراء کے رواج کے مطابق آنے والیوں کو اونچی مسندوں پر بٹھایا گیا اور دسترخوان پر دوسری چیزوں کے علاوہ چھری کانٹے بھی رکھ دیئے گئے، جب دعوت اپنے عروج پر پہنچی، گپ شپ اور جملہ بازی ہو رہی تھی، چھریاں ہاتھوں میں تھیں، زلیخا نے دفعۃً حضرت یوسف علیہ السلام کو سامنے آنے کے لیے کہا، آپ اس انداز سے کمرے سے باہر تشریف لائے کہ آنکھیں حیا سے جھکی ہوئیں، چہرے کے اردگرد نور کا ہالہ اور ہر قدم باوقار، سامنے وہ بیٹھی ہیں جن کا فتنہ ساماں حسن راہ چلتے مسافروں کے قدم روک لیتا ہے، مگر جو جلوۂ ربانی کا مشاہدہ کر چکا اسے دائیں بائیں کی خبر ہی نہیں، نہ نظر اٹھی نہ زبان بہکی، حسینانِ مصر نے اس سراپائے نور کو جو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں، پلک جھپکنا تک یاد نہ رہا اور چھریاں بجائے پھلوں کے ہاتھوں پر چل گئیں، یہ بھی [illegible] ہے کہ اپنی محبت کا یقین دلانے یا مرہم پٹی کے بہانے قریب تر بلانے کے لیے جان بوجھ کر ہاتھ زخمی کر لیے ہوں۔

﴿إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ مادر پدر آزاد سوسائٹی سے تعلق رکھنے والیوں نے اس سے پہلے نہ ایسا حسین دیکھا تھا

{۵۷} وكنّ فيما روى عن مقاتل خمسا...... وروى الكلبي انّهن كنّ اربعا (روح المعانى ۷، ۱۲/۲۳۹).
{۵۸} خرق حبّه شغاف قلبها حتیٰ وصل الى الفؤاد (كشاف ۲/۴۳۶)

اور نہ ہی ایسا عفیف اور پاکباز، جو بازارِ حسن سے گزر جائے مگر آنکھوں سے حیا کا پردہ نہ ہٹے، بے ساختہ پکار اٹھیں یہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور وہ بھی بزرگ تر! ایک صاحب نے ترجمہ کیا ہے ''ارے یہ تو کوئی دیوتا ہے۔'' یہ ترجمہ بھی خوب ہے۔

﴿۳۲﴾......زلیخا کو کھل کر بولنے کا موقع مل گیا، اس نے کہا، جسے دیکھ کر تم حواس باختہ ہوگئیں اور چھریوں سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے اور جسے تم نے انسان کے بجائے آسمانی اور نورانی مخلوق سمجھا، یہی ہے وہ جس کی وجہ سے تم مجھ پر ملامت کرتی ہو، تم اسے ایک نظر دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئیں، میرے بارے میں تمہارا کیا فیصلہ ہے جو اسے ہر دن اور ہر رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے اور حرکت وسکون میں دیکھتی ہوں، میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے ہر طرح سے اس کا دل لبھانے کی کوشش کی، اس کے سامنے بن سنور کر بھی آئی اور ناز و انداز سے بھی انسے رام کرنا چاہا لیکن یہ میری طرف نظر اٹھاتا ہی نہیں، محبت کا جواب محبت سے دیتا ہی نہیں، لگتا ہے اس کے دل میں کسی اور کی محبت اس طرح سما گئی ہے کہ کسی دوسرے کی محبت کے لیے جگہ ہی نہیں رہی، اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ وہ ''دوسرا'' اللہ کے سوا کوئی نہ تھا، جس کے دل میں اس کی پاک محبت سما جائے اس کے دل میں کسی عاشق اور معشوق کی ''ناپاک'' محبت کی گنجائش نہیں رہتی، یہ حال تو عام مومنوں کا ہے اور وہ تو یوسف تھے، نبی ابنِ نبی!

﴿وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ﴾ اظہارِ عشق اور عشوہ طرازی کا حربہ ناکام ہوتا دیکھ کر زلیخا دھمکیوں پر اتر آئی، وہ معمولی عورت نہ تھی، سینئر اور بااختیار وزیر کی سر چڑھی بیوی تھی اور ایسے معاشرے کا حصّہ تھی جس میں اس جیسی عورتیں اپنے شوہروں سے ہر جائز ناجائز بات منوالیتی ہیں، اس لیے اس نے قسم کھا کر کہا کہ اگر یوسف نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو اسے جیل میں ڈال دیا جائے گا اور اسے ذلّت کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ بھول گیا ہے کہ جو اسے عزت دے سکتے ہیں وہ ذلیل بھی کر سکتے ہیں، زلیخا کی یہ دھمکی جیل والی دھمکی سے بھی زیادہ سخت تھی اس لیے کہ معزّز اور نیک انسان کے پاس ایمان کے بعد سب سے قیمتی سرمایہ عزّت ہی ہوتی ہے۔

مصیبت نہ کہ معصیت:

﴿۳۳﴾......سیاقِ کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت میں موجود ساری امیر زادیاں یوسف کو سمجھانے بجھانے لگ گئی تھیں کہ اپنی مالکہ کو ناراض نہ کرو اور اس کی خواہش پوری کر دو، اللہ کے منتخب بندے نے جب اپنے آپ کو شہوت پرست لیڈیوں کے ہجوم میں گھرا ہوا پایا تو اپنے پروردگار کے سامنے ہاتھ اٹھا دیئے، میرے رب! یہ مجھے تیری محبت سے محروم کر کے اپنی محبت، تیرے قرب سے ہٹا کر اپنے قریب اور تیری مناجات سے جدا کر کے اپنی سرگوشیوں میں

مشغول دیکھنا چاہتی ہیں، بصورتِ دیگر جیل کے تاریک درودیوار ہیں اور وہاں کی اذیت ناک زندگی! لیکن مجھے جیل کی مصیبت محبوب ہے تیری معصیت سے۔

﴿أَحَبُّ﴾ یہ اگرچہ اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے لیکن اس میں زیادتی کا معنیٰ نہیں پایا جاتا{۵۹} لہٰذا اس کا یہ معنیٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ویسے تو مجھے ان لیڈیوں کی دعوت بھی محبوب ہے مگر اس کے مقابلے میں جیل زیادہ محبوب ہے بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان عورتوں نے میرے سامنے دوصورتیں پیش کی ہیں، جن میں سے ایک کا اختیار کرنا ضروری ہے، تو میں ان میں سے جیل جانے کی صورت کو پسند کرتا ہوں، آپ کا مصیبت کو معصیت پر ترجیح دینا دلیل ہے کمالِ صدیقیت کے مقام پر فائز ہونے کی۔{۶۰}

﴿وَإِلَّا تَصْرِفْ﴾ اے اللہ! اگر تو نے ان کے مکروفریب کو مجھ سے دور نہ ہٹایا تو میں بشری تقاضے کے مطابق ان کی طرف مائل ہو کر ان جاہلوں میں ہو جاؤں گا جو نفسانی خواہشات کی اتباع کرتے ہیں، انبیائے کرام علیہم السلام کو اپنے زہد وتقویٰ پر ناز نہیں ہوتا بلکہ ان کا سارا اعتماد اللہ کی ذات پر ہوتا ہے، وہی ڈگمگاتے قدموں کو ثبات اور گناہ کی تیز ہوا کے سامنے لرزتے دل کو قوت عطا فرماتا ہے{۶۱} یہی حال اولیاء اور صلحاء کا ہوتا ہے، علاوہ ازیں وہ علم وعمل کے ہر کمال کو اللہ کی جانب اور ہر کمزوری کو اپنی جانب منسوب کرتے ہیں۔

﴿۳۴﴾......یقین اور عجز والحاح کے ساتھ کی گئی دعا قبول ہوئی اور تقویٰ شکن ماحول میں حضرت یوسف علیہ السلام کو عصمت پر ثابت قدمی عطا کر دی گئی، دعوتِ گناہ دینے والی عورتوں کا مکروفریب ان سے ہٹا دیا گیا لہٰذا نہ تو آپ ان کی طرف مائل ہوئے اور نہ ہی کسی قسم کی جہالت کا آپ نے ارتکاب کیا۔

﴿السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ اللہ نے یوسف کو اس لیے بچالیا کیونکہ یہ اس کی صفتِ سمع اور علم کا تقاضا تھا کہ وہ اخلاص اور عاجزی کے ساتھ کی گئی دعا قبول کرتا اور دعا کرنے والے کی ذات سے مکروفریب اور گناہ کو دور ہٹا دیتا ہے۔

﴿۳۵﴾......حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کے متعدد شواہد دیکھ لینے کے باوجود{۶۲} عزیز اور اس کے مشیروں نے یہی مناسب سمجھا کہ یوسف کو کچھ وقت کے لیے{۶۳} قید کر دیا جائے، بدنامی سے کسی قدر بچاؤ بھی ہو جائے گا اور

{۵۹} "أحب" الذی معناه أكثرحبا ولكن حولت العبارة......(نظم الدرر۴/۳۶)

{۶۰} وهذا فی غاية مقامات الكمال انه مع شبابه...... ويختار السجن على ذلك خوفا من الله ورجاء ثوابه (ابن كثير۲/۲۲۰ ومابعدها)

{۶۱} دل هذا على ان احدالايمتنع عن معصية الابعون الله (قرطبی۹/۱۵۸)

{۶۲} وهی الشواهد الدالة علىٰ براء ته عليه السلام وطهارته (روح المعانی۷،۱۲/۳۵۵)

{۶۳} والاولىٰ ان لايجزم بمقدار وانما يجزم بالمدة الطويله (روح المعانی ۷،۱۲/۳۵۷)

ان عورتوں کے سفلی جذبات بھی سرد ہو جائیں گے جو بہرصورت دامنِ یوسفی تارتار کرنے پر تلی بیٹھی تھیں۔

توریت میں ہے:

''اور یوسف کے آقا نے اس کو پکڑا اور ایک جگہ جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے، قید میں ڈالا۔''{۶۴}

حکمت وہدایت:

۱...... تجسس اور تحقیق انسان کی فطرت میں ہے، یہ جو کچھ نہیں جانتا اسے جاننا چاہتا ہے۔(۳۰) یہی جذبہ تجسس مصر کی عورتوں میں بھی تھا۔

۲...... برائی کی خبر بہت جلد پھیل جاتی ہے بالخصوص ایسی خبر جس کے پیچھے عورتوں کا ہاتھ ہو۔(۳۰)

۳...... مغربی تہذیب میں عوت کی بے باکی اور آزادی دیکھ کر مصر کی اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی خواتین کی آزاد خیالی اور رومانس پروری سمجھ میں آتی ہے۔

۴...... قید خانے کی تاریخ دنیا میں بہت قدیم ہے اور مصر کے اس عہد کی حکومت میں قید خانے نہ صرف موجود تھے بلکہ ایک سرکاری جیل کے علاوہ متعدد بڑے معابد کے تحت جیل موجود تھے البتہ جیل میں عیش وآرام کے ساز وسامان جواب موجود ہو گئے ہیں قدیم جیل خانے اس سے ناآشنا تھے۔{۶۵}

۵...... اللہ کے نیک بندے مصیبت برداشت کر لیتے ہیں مگر معصیت نہیں۔(۳۳)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ جب مالٹا سے رہا ہو کر آئے تو بعض تلامذہ نے بڑھاپے میں جیل کی تکلیفوں پر دکھ کا اظہار کیا، آپ نے جواب میں فرمایا: ''الحمدللہ! بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے'' (اللہ کا شکر ہے مصیبت میں مبتلا ہوا تھا معصیت میں نہیں۔)

۶...... حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف گناہ سے بچنے کے لیے قید کو ترجیح دی ورنہ ان کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ مجھے جیل جانا محبوب ہے، بعض روایات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے کہا ''السجن احبّ الیّ'' تو انہیں بذریعہ وحی کہا گیا، اے یوسف! تم نے خود اپنے لیے جیل کا انتخاب کر لیا، اگر تم یوں کہتے ''العافیة احبّ الیّ'' (مجھے عافیت زیادہ پسند ہے) تو تمہیں عافیت عطا کی جاتی۔{۶۶} ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''بندہ اللہ سے جو کچھ مانگتا ہے ان میں سے بہترین چیز عافیت ہے۔''

{۶۴} (پیدائش باب ۳۹:۲۰/ص ۴۹)

{۶۵} (تفسیر ماجدی ۲/۶۰۰)

{۶۶} (قرطبی ۹/۱۵۸)

۷......حضرت یوسف علیہ السلام کا دعا میں یہ عرض کرنا کہ "اگر تو نے ان کے مکروفریب سے میری حفاظت نہ فرمائی تو میں ان کی طرف مائل ہو کر جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا" یہ دعا ذرا بھی عصمت کے منافی نہیں، کیونکہ یہ عصمت بھی تو حفاظتِ الٰہی کی بدولت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نظر اصل مؤثر کی طرف ہوتی ہے اس لیے ان کو اپنی عصمت پر ذرا بھی اعتماد اور ناز نہیں ہوتا۔{۶۷}

۸......حقیقی جہالت کا تعلق کسی کے خواندہ یا ناخواندہ ہونے سے نہیں ہوتا بلکہ سیرت و کردار سے ہوتا ہے، بدکردار اور بدعمل کو جاہل ہی کہا جائے گا اگرچہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو(۳۳) اہلِ مغرب، جنھیں اپنے علم و تحقیق پر بڑا ناز ہے، درحقیقت جہالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں ہم "پڑھے لکھے جاہل" کہہ سکتے ہیں۔

۹......صبر و استقامت کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی یونہی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے جو اس کے ڈر سے اپنے آپ کو گناہ سے بچاتے اور ہر حال میں صراطِ مستقیم پر جمے رہتے ہیں۔(۳۴)

۱۰......اگر کسی کو قید کی دھمکی دے کر زنا پر مجبور کیا جائے تو اس کے لیے یہ فعلِ بد جائز نہیں۔

قید خانہ میں دعوتِ توحید

﴿۳۶......۴۲﴾

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي

اور داخل ہوئے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں شراب اور دوسرے نے

أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾

کہا میں دیکھتا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اس میں سے، بتلا ہم کو اس کی تعبیر ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا O

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا

بولا نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے یہ

عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٧﴾

علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رب نے، میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں O

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ

اور پکڑا میں نے دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا

{۶۷} (بیان القرآن، حصہ اول، جلد ۵/۷۸)

شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

کسی چیز کو یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے O

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ

اے رفیقو قید خانہ کے! بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست؟ O کچھ نہیں پوجتے ہو

مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ

سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند حکومت نہیں ہے

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

کسی کی سوائے اللہ کے، اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو یہی ہے راستہ سیدھا پر بہت لوگ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَاَمَّا

نہیں جانتے O اے رفیقو قید خانہ کے! ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائے گا اپنے مالک (خاوند) کو شراب اور دوسرا جو ہے سولی دیا

الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

جائے گا، پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق تم چاہتے تھے O

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ

اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں، میرا ذکر کرنا اپنے مالک (خاوند) کے پاس سو بھلا دیا اس

رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے مالک (خاوند) سے پھر رہا قید میں کئی برس O

تسہیل: اور یوسف کے ساتھ دو اور نوجوان بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا کہ شراب بنانے کے لیے انگور کا شیرہ نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا، میں نے خواب میں دیکھا کہ سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں، آپ ہمارے خواب کی تعبیر بتا دیجیے ہم آپ کو نیک آدمی سمجھتے ہیں O یوسف علیہ السلام نے فرمایا، روزانہ تمہیں جو کھانا ملتا ہے، اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا، تعبیر بتانے کی یہ مہارت اس علم کا حصہ ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے، میں ان لوگوں کے دین سے بچتا ہوں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی ہیں جو آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں O میں تو اپنے باپ دادا یعنی ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کے دین کی اتباع کرتا ہوں، ہمارے لیے مناسب ہی نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، یہ عقیدۂ توحید ہم پر اللہ کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں

کرتے O اے جیل خانہ کے ساتھیو! مجھے یہ بتاؤ کہ کیا متفرق معبود بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے؟ O تم اللہ کو چھوڑ کر جن معبودوں کی عبادت کرتے ہو، وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، ان کے پیچھے حقیقت کچھ نہیں اور نہ ہی اللہ نے ان کے معبود ہونے کی کوئی سند اتاری ہے، یاد رکھو! ساری کائنات پر اقتدار صرف اللہ کا ہے، اس کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، توحید ہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے O اے میرے قید خانہ کے دوستو! جہاں تک تمہارے خواب کی تعبیر کا تعلق ہے، تو سن لو کہ تم میں سے ایک تو حسب سابق اپنے آقا کو شراب پلاتا رہے گا اور دوسرے کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا، پھر پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے، جو بات تم مجھ سے پوچھ رہے تھے، اس کا فیصلہ یونہی ہو چکا O ان دونوں میں سے جس شخص کے بارے میں یوسف علیہ السلام کا خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا، اس سے انہوں نے کہا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی ذکر کر دینا لیکن شیطان نے اسے اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا پس وہ کئی سال تک جیل میں پڑے رہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۳۶﴾......جس زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اسی زمانے میں شاہی غلاموں میں سے دو غلاموں کو بھی جیل کی سزا سنائی گئی تھی، ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا باورچی تھا، ان پر الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کو زہر دینے کی کوشش کی تھی، توریت میں ہے:

''بعد ان باتوں کے یوں ہوا کہ شاہِ مصر کا ساقی اور نان پُز اپنے خداوند شاہِ مصر کے مجرم ہوئے اور فرعون اپنے دو سرداروں پر جن میں ایک ساقیوں کا، دوسرا نان پُزوں کا داروغہ تھا، غصّہ ہوا اور اس نے ان کو نگہبانی کے لیے جلوداروں کے سرداروں کے گھر میں اسی جگہ جہاں یوسف بند تھا، قید خانہ میں ڈالا۔'' {۶۸}

چند دنوں بعد ان دونوں قیدیوں نے الگ الگ خواب دیکھا اور چونکہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسنِ اخلاق اور فضل و کمال سے متاثر ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے تعبیر کے لیے آپ کی طرف رجوع کیا۔

﴿اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ پھولوں کی خوشبو کی طرح کردار کی خوشبو بھی ایسی چیز ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا، کیا دوست اور کیا دشمن، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی زبان سے اعتراف کر لیتا ہے اور کسی کو اعتراف میں جھجک محسوس ہوتی ہے، جب زنانِ مصر نے نظارۂ یوسفی کیا تھا تو کہہ اٹھی تھیں ''یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے'' اور جب جیل کے قیدیوں نے ان کے شب و روز دیکھے اور ان کی وسعتِ علمی اور حسنِ سیرت کا مشاہدہ کیا تو بلا

{۶۸} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۴۰: ۱-۳/ص ۴۹)

توقف اعتراف کرلیا ''ہم تمہیں نیک آدمی سمجھتے ہیں'' یہ تأثر اور اعتراف دو قیدیوں تک محدود نہ تھا بلکہ توریت کہتی ہے کہ داروغۂ جیل تک ہر کوئی آپ سے متأثر تھا۔

''قید خانہ کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے، یوسف کے ہاتھ میں سونپا اور جو کچھ وہ کرتے اسی کے حکم سے کرتے تھے اور قید خانہ کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے، بے فکر تھا۔'' {۶۹}

جذبۂ دعوت:

﴿۳۷﴾...... حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت مل چکی تھی اور اللہ کے نبی دعوت کے بغیر نہیں رہ سکتے، عام طور پر انبیاء کی دعوت سے مظلوم، غریب اور پسے ہوئے لوگ زیادہ متأثر ہوتے ہیں، جیل میں زیادہ تر یہی لوگ تھے، آپ کو موقع مل گیا کہ آپ انہیں توحید کی دعوت دیں، آپ کی دعوت پیغمبرانہ مزاج اور اسلوب کا اعلیٰ نمونہ ہے، آپ نے فوری طور پر نہ تو بت پرستی کی مذمت فرمائی اور نہ ہی ان کے آباء واجداد کو برا بھلا کہا، آپ نے پہلے تو انہیں تسلی دی کہ روزانہ تمہارے لیے جو کھانا آتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہارے خوابوں کی تعبیر بتادوں گا {۷۰} تاکہ وہ پریشان نہ ہوجائیں کہ ہم کیا مقصد لے کر آئے تھے اور انہوں نے کیا قصہ چھیڑ دیا ہے، پھر اپنے علم کے بارے میں بتایا کہ یہ وہ علم نہیں ہے جس کی بنیاد پر مصر کے جوتشی، نجومی اور کاہن غیبی امور کے بارے میں پیشگوئیاں کرتے اور اٹکل پچو سے عوام کو مرعوب کرتے ہیں بلکہ یہ علم خالص عطاءِ ربانی ہے، {۷۱} مصر میں چلنے عملیات اور اپنے علم میں فرق کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کردیا کہ تعبیر میں مہارت میرا ذاتی کمال نہیں بلکہ سراسر فضلِ الٰہی کا نتیجہ ہے، یوں انہیں اپنی دعوت قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلیا، انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت میں جو حکمت وبصیرت، تیسیر اور تدریج اور نفسیات شناسی ہوتی ہے، وہ سب کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت میں کارفرما نظر آتا ہے۔

﴿إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ﴾ جو دین قوم کا تھا وہی ان نوجوانوں کا تھا، اس کے باوجود یہ نہیں فرمایا کہ میں نے تمہارا دین چھوڑ دیا ہے تاکہ ان کے دل میں بُعد اور نفرت نہ پیدا ہوجائے بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے اس قوم کا دین چھوڑ دیا ہے جس میں میری تربیت ہوئی۔

﴿تَرَكْتُ﴾ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے میں مشرکوں کے مذہب پر تھا اور اب میں نے اسے چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کا

{۶۹} (عہد عتیق، پیدائش ۳۹: ۲۲-۲۳/ ص ۴۹)

{۷۰} اخبرتكما بتاويل ماقصصتهما علىٰ قبل أن يأتيكما ذلك الطعام الموقت (روح المعانی ۱۲/۷، ۳۶۳)

{۷۱} علمنی ربی بوحی منه إلیّ لابكهانة ولا عرافة......(المراغی ۱۴۶/۱۲)

مطلب یہ ہے کہ میں نے اس مشرکانہ مذہب کو اختیار ہی نہیں کیا{۷۲} اور بت پرستوں کی کبھی اتباع کی ہی نہیں، اصل میں ترک کا لفظ دو معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، کسی کام کو کبھی بھی نہ کرنا اور دوسرا یہ کہ کرنے کے بعد چھوڑ دینا، یہاں یہ پہلے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ مصری مختلف بتوں کی پرستش کرتے تھے، فراعنۂ مصر اور گائے بھی ان کے معبودوں میں شامل تھے اور سب سے بڑا دیوتا آفتاب کو مانتے تھے۔

﴿وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ﴾ مصری اگرچہ آخرت پر ایمان رکھتے تھے مگر اس طریقے سے ایمان نہیں رکھتے تھے جس طریقے سے ایمان رکھنے کا حکم اللہ اور اس کے رسولوں نے دیا ہے بلکہ عقیدۂ آخرت میں انہوں نے اپنے خودساختہ نظریات بھی شامل کر لیے تھے، مثلاً یہ کہ ان کے فرعون انہی اجسام میں دوبارہ زندہ ہو جائیں گے جن اجسام میں انہیں حنوط کرنے کے بعد دفن کیا گیا ہے اور ان کا تاج و تخت بھی انہیں دوبارہ واپس مل جائے گا، اسی لیے جب وہ فرعونوں کی آخری رسوم ادا کرتے تھے تو ان کا اسلحہ اور زیورات وغیرہ بھی ان کے ساتھ رکھ دیتے تھے اور ان کی ممیوں کی حفاظت کے لیے ایسے اہرام تعمیر کرتے تھے جن کے طرزِ تعمیر اور مضبوطی نے جدید دور کے انجینئرز اور سائنسدانوں کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔

﴿۳۸﴾...... مخاطبین کے دل میں مزید شوق پیدا کرنے کے لیے اپنا خاندانی تعارف بھی کرا دیا کہ کہیں معمولی غلام اور عام قیدی سمجھ کر میری دعوت کو نظرانداز نہ کر دینا، میں اس خاندان کا فرد ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے دعوتِ توحید کے عنوان سے صرف کنعاں ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ عزت و شہرت عطا کی ہے۔

﴿مَا كَانَ لَنَا﴾ ہم جو کاروانِ نبوت سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں، ہمارے لیے مناسب ہی نہیں کہ ہم کسی بھی قسم کا شرک کریں۔{۷۳}

﴿ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ یہ عقیدۂ توحید ہم پر اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں اس کی ہدایت دی۔

﴿عَلَى النَّاسِ﴾ ان لوگوں پر بھی فضل ہے جن کے لیے ہمیں رسول بنا کر بھیجا گیا۔{۷۴}

{۷۲} الترک عبارة عن عدم التعرض للشئی ولیس من شرطه ان یکون قد کان خائضا فیه (کبیر۶، الجزء الثامن عشر/۴۵۶)

{۷۳} "ماکان" ای ماینبغی...... من للتاکید کقولك ماجاء نی من أحد (قرطبی ۹/۱۶۳) ایک طرف قرآن ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کی زبان سے کہلواتا ہے کہ ہم ذرہ برابر شرک نہیں کر سکتے، دوسری طرف بائبل ہے جو بتاتی ہے کہ عیسو بن اسحاق بت پرست تھا جبکہ اس کا جڑواں بھائی یعقوب موحد تھا، اس کے باوجود اسحاق عیسو سے زیادہ محبت کرتا تھا اور یعقوب نے دھوکہ دہی کے ذریعے اس اسحاق سے برکت لے لی تھی حالانکہ وہ عیسو کا حق تھا اس لیے کہ عیسو شکم مادر سے یعقوب سے پہلے نکلا تھا.......... قرآن اور بائبل کی ہدایت میں کتنا فرق ہے؟

{۷۴} "وعلی الناس" اذا جعلنا الرّسل الیهم (قرطبی ۹/۱۶۳)

﴿۳۹﴾......مصری بھی دوسری مشرک قوموں کی طرح متعدد خداؤں کو مانتے تھے، اس لیے فرمایا، اے جیل کے ساتھیو! یہ بتاؤ متعدد معبود بہتر ہیں جن کے درمیان تصادم اور تنازع کا ہمیشہ امکان رہے گا یا وہ اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے؟ کیا ارض وسما اور کیا انسان، جن اور ملائکہ، سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔

﴿۴۰﴾......اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو اور جن کے لیے تم نے یہ مختلف نام تجویز کر رکھے ہیں، تو وہ حقیقت میں صرف نام ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں، تم انہیں ''رب'' کہتے ہو حالانکہ ان کے اندر رب والی کوئی بات نہیں، نہ پیدا کر سکتے ہیں نہ رزق دے سکتے ہیں اور نہ ہی نفع نقصان ان کے اختیار میں ہے۔

﴿مِنۡ سُلۡطٰنٍ﴾ علاوہ ازیں تمہارے پاس کوئی ایسی آسمانی دلیل بھی نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ انہیں ''رب'' کا نام دینا صحیح ہے اور ان کی ایسی عبادت واطاعت اور تعظیم جائز ہے جو توحید کے منافی نہ ہو، جیسے طوافِ کعبہ کے وقت حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا محبت وعقیدت سے ہاتھ لگانا نفلی عبادت ہے مگر ہر مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حجرِ اسود نہ نفع دے سکتا ہے اور نہ ہی نقصان۔

﴿اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ﴾ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں، نہ فرشتے اور جن کی، نہ ولی اور پیغمبر کی، نہ قبر اور درگاہ کی، نہ شجر وحجر کی، نہ شمس وقمر کی، نہ نہر اور دریا کی، نہ کسی حیوان اور کیڑے مکوڑے کی، تاریخِ انسانی کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کی عبادت کرنے والے مل جائیں گے بلکہ آج بھی گنگا اور جمنا، کالی مائی، بندر اور سانپ اور دوسری مخلوق کی پرستش کرنے والوں کی کمی نہیں۔

﴿ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ﴾ ''توحید ہی سیدھا راستہ ہے جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔''

''قرآن مجید نے اس حقیقت کا اعلان دعوٰی کے ساتھ بار بار کیا ہے کہ دینِ فطرت اور انسانوں کا دینِ قدیم یہی مسلکِ توحید ہے اور شرک کی آمیزش بعد کو ہوئی ہے، انیسویں صدی کے ''روشن خیال'' مدتوں اس منزل میں بھٹکتے رہے اور یہی کہتے گئے کہ انسان تو رفتہ رفتہ ارتقاء کے ذریعہ سے شرک سے توحید تک پہنچا ہے، یہاں تک کہ اب بیسویں صدی میں بڑے بڑے اہلِ سائنس کو بھی قائل ہونا پڑا کہ انسان کا قدیم ترین دین، دینِ توحید ہی تھا۔'' {۷۵}

خواب کی تعبیر:

﴿۴۱﴾......دعوتِ توحید کے بعد دونوں کو خواب کی تعبیر بتائی {۷۶} کہ تم میں سے جو ساقی ہے، وہ اپنے عہدے پر

{۷۵} (ماجدی ۲/۲۰۸)

{۷۶} (توریت میں یہ سارا قصہ تو ہے مگر دعوت توحید کا ذکر بالکل نہیں)

بحال ہوکر اپنے ''رب'' کو حسب سابق شراب پلائے گا اور دوسرے کو پھانسی دے دی جائے گی۔

﴿رَبَّهُ﴾ بادشاہِ مصر پر ''رب'' کا اطلاق عبودیت کے اعتبار سے نہیں کیونکہ وہ بادشاہ خدائی کا دعویدار نہیں تھا بلکہ اس سے مراد مجازی آقا ہے اور لغتِ عرب میں اس پر رب کا اطلاق ہوسکتا ہے۔{۷۷}

﴿فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِ﴾ ''پرندے اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے'' ممکن ہے اس زمانے میں مجرم کو پھانسی دے کر عبرت کے لیے سولی پر چھوڑ دیا جاتا ہو یہاں تک کہ گوشت خور پرندے اس کی لاش نوچ نوچ کر کھا جاتے ہوں۔

﴿قُضِيَ الْأَمْرُ﴾ بعض تفسیروں میں ہے کہ تعبیر سننے کے بعد ان نوجوانوں نے کہا کہ ہم مذاق کر رہے تھے، ہم نے کوئی خواب نہیں دیکھا، آپ نے جواب میں فرمایا '' جو بات تم مجھ سے پوچھ رہے تھے اس کا فیصلہ یونہی ہو چکا۔'' {۷۸}

یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے چہرے دیکھ کر ان کے دل میں کھٹکنے والا سوال پڑھ لیا ہو کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں یہ کوئی ظنی چیز ہے یا قطعی، آپ نے ان کا تردد دور کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قطعی بات ہے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے، جس جزم اور وثوق کے ساتھ آپ نے انہیں جواب دیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی تعبیر مکاشفہ اور الہامِ الٰہی کے ماتحت تھی۔

﴿۴۲﴾...... وہ ساقی جس کے بارے میں آپ کا گمان تھا کہ وہ قید سے رہا ہو جائے گا، آپ نے اس سے کہا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر بادشاہ کے سامنے ہمارا ذکر کر دینا کہ ایک بے گناہ شخص جیل میں بند ہے {۷۹} اور اس کے اس قسم کے حالات اور اخلاق ہیں۔{۸۰}

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں ظن یقین کے معنی میں ہے {۸۱} لہٰذا کسی کو یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ پہلی آیت میں جو تعبیر مذکور ہے اس سے تو قطعیت ثابت ہو رہی ہے جبکہ یہاں ظن کا ذکر ہے، علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مستقبل کے بعض حالات کے بارے میں انبیاء کو اللہ کی طرف سے اجمالی علم دیا جاتا ہے،

{۷۷} ولا يقال الرب مطلقًا الا لله...... وبالاضافه له ولغيره (المفردات/۱۸۴)

{۷۸} قيل: جحدا وقالا: مارأيناشيئا...... فأخبرهما ان ذلك كائن صدقتما أو كذبتما (كشاف ۲/۴۴۴) لماقالا ماقالا وأخبرهما قالا: مارأينا شيئاً، فقال: قضى الأمر......(ابن كثير ۲/۶۲۳)

{۷۹} اخبره أني مظلوم محبوس بلاذنب (قرطبی ۹/۱۶۵)

{۸۰} أي أذكرني لدى سيدك الملك بما رأيت مني وما سمعت وعلمت من أمري (المراغی ۱۲/۱۵۲)

{۸۱} ويكون الظن بمعنى اليقين (كشاف ۲/۴۴۵)...... تحمل هذا الظن على العلم واليقين وورود لفظ الظن بمعنى اليقين كثير في القرآن (كبير ۱۸،۶/۴۶۰)

ان دوغلاموں کے بارے میں آپ کو جو کچھ بتایا گیا تھا، اس میں وقت کا تعین بھی نہیں تھا اور یہ بھی احتمال تھا کہ اس کے نفاذ میں اللہ کی تقدیر آڑے آ جائے، تقدیرِ معلّق میں یہی ہوتا ہے، باری تعالیٰ کی طرف سے کسی معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے مگر وہ مشروط ہوتا ہے، شرط نہ پائی جائے تو مشروط بھی نہیں پایا جاتا۔

اس تاویل کے پہلے جزء کی تائید میں حضورِ اکرم ﷺ کے اس خواب کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے جو آپ نے ۶ھ میں مکہ میں داخل ہونے اور بیت اللہ کے طواف کے بارے میں دیکھا تھا اور شدّتِ اشتیاق کی بناء پر صحابہ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کی تعبیر اس سال سامنے آ جائے گی چنانچہ وہ آپ کی قیادت میں روانہ بھی ہو گئے مگر قریش کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مکہ میں داخل نہ ہو سکے اور انہیں عمرہ کیے بغیر واپس آنا پڑا۔

نسیان کی سزا؟

﴿فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ﴾ نسیان کسی کو بھی ہوسکتا ہے، کافر اور فاجر تو کیا صاحبِ تقویٰ مومن بلکہ اللہ کا نبی بھی بھول سکتا ہے اور اس کی نسبت بالعموم شیطان کی طرف کی جاتی ہے۔ سید المرسلین ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ {۸۲}

''اور اگر کبھی شیطان تمہیں یہ حکم بھلا دے تو یاد آنے پر تم ایسے ظالموں کے پاس مت بیٹھو۔''

سورۂ اعراف میں اپنے متقی بندوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ {۸۳}

''جن لوگوں کے دل میں تقویٰ ہوتا ہے، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی شیطانی خیال ان کے قریب سے بھی گزر جائے تو وہ فوراً چونکنے ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے لیے درست طریقہ کیا ہے۔''

بعض حضرات نے ''فانساہ الشیطان'' کا معنیٰ کیا ہے ''شیطان نے یوسف کو اپنے رب یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا دیا تھا'' {۸۴} جس کی سزا اللہ نے ان کو یہ دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں پڑے رہے، اس تفسیر پر وہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

{۸۲} (الانعام ۶/۶۸)

{۸۳} (الاعراف ۷/۲۰۱)

{۸۴} (''فانساہ'' یقال ان الضمیر عائد الی یوسف علیہ السلام (ابن کثیر ۲/۲۲۴) ''فانساہ الشیطن'' وفیہ قولان: الأول انه راجع الی یوسف (کبیر ۶، الجزء الثامن عشر/۱۴۱)

’’اگر یوسف وہ کلمہ نہ کہتے جوانہوں نے کہا تو وہ اتنا عرصہ جیل میں نہ رہتے جتنا عرصہ انہیں رہنا پڑا، انہیں یہ سزا اس لیے دی گئی کہ انہوں نے غیر اللہ سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔‘‘ {۸۵}

اگر بالفرض مان لیا جائے کہ ’’بھولنے والا‘‘ ساقی نہیں تھا بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور آپ کچھ دیر کے لیے نسیان کا شکار ہو گئے تھے، تو بھی آپ سزا کے حقدار نہیں ٹھہرتے کیونکہ نسیان ایسا گناہ نہیں جس پر کسی کو سزا دی جائے، یہ غیر اختیاری چیز ہے اور نبی اور غیر نبی ہر کسی کو ہو سکتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اگر ساقی سے کہا تھا کہ ’’آقا کے سامنے میرا بھی ذکر کر دینا‘‘ تو اس سے یہ درخواست کر کے آپ نے عادی اسباب میں سے ایک سبب سے کام لیا تھا اور اسبابِ عادیہ سے کام لینا بالکل جائز ہے، مصائب و آلام کے ازالہ اور بیماریوں سے شفا کے لیے مخلوق سے مدد لینے میں قطعاً کوئی حرج نہیں، یہ مناسب نہیں کہ جب کوئی مومن بندہ اپنے مسئلہ کے حل کے لیے کوئی جائز سبب اختیار کرے تو ہم یہ کہیں کہ شیطان نے اسے اللہ کا ذکر بھلا دیا تھا، اللہ کو یاد رکھتے ہوئے بھی ظاہری اسباب اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

یہ ساری تقریر ہمیں اس لیے کرنی پڑی تا کہ نبی کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اللہ کے نبی سے ایسا جرم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ سزا کے مستحق ہو گئے، البتہ یہ اصول اپنی جگہ صحیح ہے کہ ’’حسنات الأبرار سیّئات المقرّبین‘‘ (نیک بندوں کی نیکیاں مقربین کی غلطیاں شمار ہوتی ہیں۔)

حدیث کو ضعیف مان لینے کی صورت میں اس تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

﴿بِضْعَ سِنِيْنَ﴾ عربی میں ’’بضع‘‘ کا اطلاق تین سے نو پر ہوتا ہے، اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو سات سال جیل میں رہنا پڑا تھا۔ {۸۶}

حکمت و ہدایت:

۱......کائنات میں ظاہر ہونے والے امور اگرچہ انسان کو اتفاقات محسوس ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے طے کردہ معاملات کا حصہ ہوتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوانوں کا جیل میں داخل ہونا بظاہر اتفاق تھا مگر آگے چل کر انہی میں سے ایک نوجوان آپ کی باعزت رہائی اور پھر مملکت کے سب سے بڑے عہدے تک رسائی کا ذریعہ بنا۔ (۳۶)

{۸۵} (بحواله ابن كثير ۲/۶۲۴) اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "وهذا الحديث ضعيف جدا" (یہ حدیث بے حد کمزور ہے۔)

{۸۶} واتفق الأكثرون على أن المراد ههنا ببضع سنين، سبع سنين (كبير ۱۸/۶، ۴۶۳)

۲......حضرت یوسف علیہ السلام کا جیل میں داخل ہونا ایسے واقعات کی ابتداء تھی جو اگرچہ بظاہر مایوس کن تھے مگر انہی کے بطن سے امید کا سورج پوری آب وتاب سے طلوع ہوا۔(۳۶)

۳......جیل میں جانا کسی کے مجرم ہونے کی دلیل نہیں، اللہ کے بے شار نیک بندے بھی جیل کی کال کوٹھڑیوں میں رہے ہیں۔(۳۶) مگر یہ بھی روا نہیں کہ جو ایرا غیرا جیل میں چلا جائے وہ کہتا پھرے کہ میں نے "سنتِ یوسفی" زندہ کردی ہے۔

۴......تعبیر میں مہارت علم وتقویٰ اور فراست کے تابع ہوتی ہے۔

۵......بعض خواب سچے ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

"مومن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔"{۸۷}

۶......قیدیوں نے یوسف علیہ السلام کے نیک ہونے کا اندازہ ان کے اچھے اخلاق اور عبادت سے لگایا کیونکہ آپ بیماروں کی عیادت اور غمزدوں سے تعزیت فرماتے تھے۔{۸۸}

۷......جس انسان کے اندر اخلاق اور روحانی فضل وکمال ہو وہ بالآخر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔(۳۶)

۸......داعی کو چاہیے کہ وہ دعوے سے قبل مخاطبین کو اپنے سے مانوس کرلے۔(۳۷)

۹......سامعین کے دل میں شوق پیدا کرنے کے لیے اپنی عالی نسبی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔(۳۸)

۱۰......حسبِ موقع ومصلحت اپنے دین کو رجالِ اکابر کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔(۳۸)

۱۱......دین کے جو سچے داعی ہوتے ہیں وہ ہر وقت دعوت کے لیے مستعد اور بے تاب رہتے ہیں۔(۳۸)

۱۲......عقلی اور نقلی دلائل سے متعدد معبودوں کی تردید اور ایک معبود کے برحق ہونے کی تائید ہوتی ہے۔(۴۰)
جو معبودانِ باطلہ کے پرستار ہیں ان کے پاس صرف نام ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔(۴۰)

۱۳......کائنات میں بھی صرف اللہ کا حکم چلتا ہے اور شریعت میں بھی صرف اسی کا حکم چلتا ہے، حق صرف وہی ہے جسے وہ حق کہے اور باطل وہی ہے جسے وہ باطل قرار دے دے۔

۱۴......انسان کا قدیم دین توحید ہی رہا ہے، شرک کی آمیزش اس میں جہالت وحماقت کی وجہ سے ہوئی۔(۴۰)

۱۵......مشکل مسائل میں سوال اور استفتاء مشروع ہے۔(۴۱)

۱۶......صرف انبیاء کی تعبیر یقینی ہوتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد وحی پر ہوتی ہے، غیر انبیاء کی تعبیر محض ظن پر مبنی ہوتی ہے۔(۴۲)

۱۷......مصائب وحوادث کے ازالہ کے لیے کسی مخلوق سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں خصوصاً اس سے جس پر احسان کیا

{۸۷} (بخاری ۲، کتاب التعبیر/۱۰۳۵، مسلم ۲، کتاب الرؤیا/۲۴۱)
{۸۸} قال قتادة: کان یداوی مریضهم ویعزی حزینهم ویجتهد فی عبادة ربه (جصاص ۳/۱۷۳)

ہو، احسان سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے ہر استعانت گوارا ہو جاتی ہے۔ (۴۲){۸۹}

۱۸......شیطان کی تدبیروں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انسان پر نسیان طاری کر دیتا ہے۔ (۴۲)

بادشاہ کے خواب کی تعبیر

﴿۴۳......۴۹﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں دبلی اور سات بالیں

سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا

ہری اور دوسری سوکھی، اے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم خواب کی

تَعْبُرُونَ ﴿۴۳﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِي

تعبیر دینے والے ○ بولے یہ خیالی خواب ہیں اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں ○ اور بولا وہ

نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿۴۵﴾ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ

جو بچا تھا ان دونوں میں سے اور یاد آ گیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو ○ جا کر کہا اے یوسف! اے سچے! حکم دے

أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ

ہم کو اس خواب میں سات گائیں موٹی ان کو کھائیں سات دبلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی

يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا

تا کہ لے جاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو ○ کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر

حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ

سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ ○ پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے

شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ

کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے ○ پھر آئے گا اس کے پیچھے ایک برس اس میں

يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿۴۹﴾

مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے ○

{۸۹} (بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد۵/۷۹)

تسہیل: بادشاہ نے اپنے درباریوں کو جمع کر کے ان سے کہا، میں نے عجیب خواب دیکھا ہے، سات موٹی گائیں تھیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا گئیں، اور یہ بھی دیکھا کہ سات بالیاں سبز ہیں اور سات بالیاں خشک ہیں، اے اہلِ دربار! اگر تم تعبیر کی صلاحیت رکھتے ہو تو میرے خواب کی تعبیر بتاؤ O درباریوں نے جواب دیا، اوّل تو یہ خواب نہیں بلکہ پریشان خیالات ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ہم خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے O اور وہ شخص جوان دونوں قیدیوں میں سے نجات پا گیا تھا، اسے ایک عرصہ کے بعد یوسف کا معاملہ یاد آ گیا، اس نے کہا اگر تم مجھے قید خانہ میں جانے کی اجازت دے دو تو میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں O اسے اجازت دے دی گئی چنانچہ اس نے قید خانہ میں پہنچ کر یوسف سے کہا، اے سچے انسان! آپ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتاؤ کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیاں سبز اور سات بالیاں خشک ہیں، تاکہ میں ان لوگوں کو جا کر بتاؤں جنہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے تاکہ وہ بھی آپ کا مقام اور مرتبہ جان لیں O آپ نے فرمایا تم لوگ مسلسل سات سال تک خوب غلہ اگاؤ گے، اس کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ جو فصل بھی کاٹو اسے بالیوں سمیت رکھ چھوڑ والبتہ تھوڑا سا غلہ، جو تمہارے کھانے کے کام آئے، وہ نکال لو O خوشحالی کے ان سات برسوں کے بعد سات سال سختی اور قحط کے آئیں گے، وہ اس سارے ذخیرے کو کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے جمع کر رکھا ہوگا، بجز اس تھوڑی سی مقدار کے جسے تم نے بیج کی نیت سے محفوظ کیا ہوگا O اس طویل قحط سالی کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور اس میں لوگ پھلوں سے رس نچوڑیں گے O

﴿تفسیر﴾

﴿۴۴﴾...... عجیب وغریب خواب نے بادشاہ کو خوف اور دہشت میں مبتلا کر دیا، اس نے اپنے وزیروں، مشیروں اور کاہنوں کو جمع کر کے ان سے اس کی تعبیر پوچھی، انہوں نے جواب دیا کہ یہ پریشان خیالات ہیں جو بدہضمی، تھکاوٹ اور ان حالات کے نتیجے میں انسان کے حواس پر چھا جاتے ہیں جن حالات سے وہ دن بھر دوچار رہتا ہے۔

﴿وَمَا نَحْنُ﴾ اور ہم اس قسم کی پریشان خیالیوں کی تعبیر نہیں جانتے، البتہ اگر کوئی ڈھنگ کا خواب ہو تو ہم اس کی تعبیر بتا سکتے ہیں۔ دوسرا مطلب اس جملے کا یہ ہے کہ ہم کسی بھی قسم کے خواب کی تعبیر نہیں جانتے کیونکہ ان کی کوئی تعبیر ہوتی ہی نہیں۔

یہ واضح رہے کہ ملکِ مصر اس وقت سات صوبوں میں تقسیم تھا اور زراعت کی دیوی گائے کی مورت میں تھی۔

توریت نے اس خواب کو بھی حسبِ معمول بڑی طوالت سے بیان کیا ہے۔{۹۰}

﴿الْمَلِكُ﴾ یہ بادشاہ کون تھا؟ اس کا کیا نام تھا؟ اس کا عہدِ سلطنت کب سے کب تک رہا؟ تاریخ ان سوالات کا صاف وواضح جواب دینے سے قاصر ہے، البتہ جیوش انسائیکلوپیڈیا نے سندِ ضعیف کے ساتھ اس کا نام اپوفس (APHOHIS) دیا ہے اور اس کی لمبی مدّتِ سلطنت لکھی ہے{۹۱} بعض اور حوالوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔

توریت میں غالباً فرعونِ موسیٰ پر قیاس کر کے اس بادشاہ کا لقب بھی فرعون ہی درج کیا ہے{۹۲} لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون اس وقت تک شاہی لقب نہ تھا، یہ لقب فرمانروانِ مصر کا بہت بعد کو چلا، قرآن توریتِ مروّجہ کی کیسی کیسی باریک غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا جاتا ہے۔

قرآن مجید اسی لیے بجائے اس اصطلاحی سرکاری لقب ''فرعون'' کے محض عام لفظ ''ملک'' لایا ہے۔{۹۳}

﴿۴۵﴾...... بادشاہ کا خواب اور اس کے درباریوں کا جواب سن کر ساقی کو حضرت یوسف علیہ السلام کا فضل وکمال اور ان سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آ گیا، اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھے جیل جانے کی اجازت دے دو۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جیل شہر سے باہر تھی۔{۹۴}

﴿۴۶﴾...... ساقی جب خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے جیل میں پہنچا تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ''ایھا الصدیق'' کہہ کر خطاب کیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند دن کی صحبت نے اسے آپ کے اخلاق کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

﴿الصِّدِّيقُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اقوال وافعال میں سچائی، حقائق تک رسائی اور تعبیر کی مہارت میں آپ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ بادشاہ کا خواب سنا کر ساقی نے تعبیر پوچھی، ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ جب میں بادشاہ اور اس کے حواریوں کو جا کر تعبیر بتاؤں گا تو امید ہے کہ وہ بھی آپ کا علمی مقام جان لیں گے،{۹۵} جب آپ کا مقام اور

{۹۰} (پیدائش ۴۱:۱-۷)

{۹۱} (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۲/ص ۱۱)

{۹۲} (دیکھیے پیدائش باب ۴۰-۴۱)

{۹۳} (ماجدی ۲/۲۱۱)

{۹۴} قال ابن عباس: لم یکن السّجن فی المدینة (نظم الدرر ۴/۵۱)

{۹۵} "یعلمون" انی لأرجو أن یحقق الله أملك بالخروج من السجن وانتفاع الملك وملئه بفضلك وعلمك (المراغی ۱۲/۱۵۵)

مرتبہ ان پر کھلے گا تو آپ کی رہائی کی صورت بھی بن جائے گی، بعض حضرات نے "لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ" کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ بادشاہ اور اس کے وزراء خواب کی تعبیر بھی جان لیں{۹۶} اور یہ بھی جان لیں کہ انہیں خواب میں دیئے گئے پیغام پر کس طرح عمل کرنا چاہیے۔

تعبیر اور تدبیر:

﴿۴۷﴾......ساقی نے صرف تعبیر پوچھی تھی اللہ کے نبی نے تعبیر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا کہ آنے والے حالات اور خطرات سے بچاؤ کے لیے تمہیں کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے، بظاہر آپ کا خطاب ساقی سے ہے لیکن اس کے واسطہ سے آپ ان کارپردازانِ حکومت کو مشورہ دے رہے ہیں جنہوں نے اسے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

آپ نے بتایا کہ سات موٹی گایوں اور سبز بالیوں سے خوشحالی کے سات سالوں کی طرف اشارہ ہے، تمہیں چاہیے کہ خوشحالی کے زمانے میں جو غلّہ حاصل ہو اس میں سے بقدرِ ضرورت استعمال کرو بقیہ بالیوں ہی میں رہنے دو، اس طرح وہ کیڑا لگنے سے محفوظ رہے گا۔

﴿۴۸﴾......سات دبلی گایوں اور خشک بالیوں سے قحط اور تنگی ترشی کے سات سالوں کی طرف اشارہ ہے، تم لوگوں نے فراوانی کے دنوں میں جو کچھ جمع کیا ہوگا، وہ سب ان دنوں میں ختم ہو جائے گا۔

﴿۴۹﴾......بادشاہ کے خواب سے صرف یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ سات سال پیداوار اور سات سال قحط کے ہوں گے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر اضافہ فرماتے ہوئے یہ بھی بتادیا کہ قحط کے اختتام پر ایک سال ایسا آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی، اس کا علم یا تو آپ کو اس سے ہوا کہ جب قحط کے کل سات سال ہیں تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا{۹۷} یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو بذریعہ وحی اس بارے مطلع کر دیا گیا ہو۔{۹۸}

حکمت وہدایت:

۱......انجام دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا خواب اور یوسف علیہ السلام کی تعبیر حقیقت میں اللہ کی طرف سے

{۹۶} "یعلمون" تأویلها (بیضاوی ۲۹۲/۳۲)

{۹۷} "وفیه یعصرون" کأنه أخذمن انتهاء القحط ابتداء الخصب (نظم الدّرر ۵۳/۴)...... انّ هذه البشارة منه علیه السلام لم تکن عن وحی بل لانّ العادة جاریة بأن انتهاء الجدب الخصب (روح المعانی ۳۸۲/۱۲،۷)

{۹۸} "وفیه یعصرون" لایعلم الاّبالوحی (کبیر ۳۶۶/۱۸،۶)

آپ کو تختِ اقتدار تک پہنچانے کی تدبیر ہے۔ (۴۳)

۲......ہر خواب سچا نہیں ہوتا یونہی ہر خواب جھوٹا بھی نہیں ہوتا۔ (۴۴)

۳......بعض اوقات کافر اور فاسق و فاجر کا خواب بھی سچا ہو جاتا ہے۔ (۴۳)

۴......یہ جو مشہور ہے کہ پہلی دفعہ خواب کی جو تعبیر بتا دی جائے اسی طرح واقع ہو جاتا ہے، تو قرآن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اگرچہ اس بارے میں ایک روایت بھی منقول ہے لیکن یا تو یہ روایت ضعیف ہے یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تعبیر بتانے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

بادشاہ کے حواریوں نے اس کے خواب کو پریشان خیالی قرار دیا تھا جبکہ بعد میں ثابت ہوا کہ اس میں ٹھوس حقائق کی نشاندہی کی گئی تھی۔

۵......جب بادشاہ نے خواب دیکھا، اس زمانے میں مصر سات صوبوں میں تقسیم تھا اور زراعت کی دیوی گائے کی مورت میں تھی۔

۶......انبیائے کرام علیہم السلام انسانوں کے لیے دینی اور دنیاوی معاملات میں رحمت اور سلامتی ثابت ہوتے ہیں اور انہیں اخروی عذاب کے ساتھ دنیاوی مصائب اور آفات سے بھی بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۷......ہر وہ چیز شرعی مصلحتوں میں شمار ہوگی جس کے ذریعے عقیدہ، جان، عقل، نسب اور مال کی حفاظت ہوتی ہو اور جو ان میں سے کسی چیز کے فوت ہونے کا سبب ہو اسے فساد کہا جائے گا۔ (۴۷)

۸......ایسی ذخیرہ اندوزی جائز ہے جس کا مقصد مشکل حالات میں عوام کے لیے آسانی پیدا کرنا ہو۔ (۴۷)

بادشاہ کی دعوت اور یوسف علیہ السلام کا جواب

﴿۵۰......۵۲﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اس کے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا اپنے خاوند کے پاس اور پوچھ اس سے کیا حقیقت ہے

اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ

ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے؟ میرا رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے O کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلانا چاہا

يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ

یوسف کو اُس کے نفس کی حفاظت سے؟ بولیں حاشاللہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ برائی بولی عورت عزیز کی اب کھل گئی سچی بات، میں نے

حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ

پھسلانا چاہا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ سچا ہے O یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کر لیوے کہ میں نے اس کی

بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

چوری نہیں کی چھپ کر، اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغا بازوں کا O

تسہیل: یہ تعبیر سُن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف کو میرے پاس لاؤ، جب بادشاہ کا قاصد یوسف کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا، اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے ان عورتوں کے بارے میں دریافت کرو جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے کہ وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہیں؟ بے شک میرا رب ان کی مکاری سے خوب واقف ہے O بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر ان سے پوچھا کہ جب تم نے یوسف کو بہکانے کی کوشش کی تھی، اس وقت کیا معاملہ پیش آیا تھا؟ عورتوں نے جواب دیا، حاشاللہ! ہمیں یوسف میں ذرہ بھی برائی نظر نہیں آئی، یہ سن کر عزیز کی بیوی بولی کہ اب تو سب پر حقیقت واضح ہوگئی ہے، میں نے ہی اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی اور بے شک وہی سچا ہے O یوسف علیہ السلام نے فرمایا، میں نے یہ اہتمام اس لیے کیا ہے تاکہ عزیز خوب اچھی طرح جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت بازوں کا مکر و فریب چلنے نہیں دیتا O

تفسیر

﴿۵۰﴾...... بادشاہ نے ساقی کی زبان سے خواب کی تعبیر اور پھر حالات سے نمٹنے کی تدبیر سنی تو وہ نہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کی وسعتِ علمی، ذہانت، دور اندیشی اور ہمدردی کا قائل ہو گیا بلکہ اس کے دل میں ان کی زیارت اور ملاقات کا شوق بھی پیدا ہو گیا، اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسف کو جیل سے رہا کر کے میرے پاس لے آؤ۔

جب بادشاہ کا نمائندہ آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے اس وقت تک جیل سے باہر آنے سے انکار کر دیا جب تک اس الزام کی تحقیق نہ ہو جائے جو عزیز کی بیوی نے آپ پر لگایا تھا، الزام تو اس اکیلی نے لگایا تھا مگر آپ نے احسان شناسی، مروّت اور طبعی حیا کی بناء پر متعین طور پر اسے ہدف بنانے کے بجائے ان تمام خواتین سے تحقیق کرنے کا مشورہ دیا جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے۔

تحقیق کا مشورہ آپ نے اس لیے دیا تھا کیونکہ اپنے منصب کی عظمت اور اہمیت کا احساس آپ کے دل میں تھا، آپ نہیں چاہتے تھے کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر آپ کے کردار پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ہاتھ آئے۔

ایک اشکال:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿ولو لبثت فی السجن مالبث یوسف لأجبت الداعی﴾{۹۹} ''اگر میں اتنی دیر جیل میں رہتا جتنی دیر یوسف علیہ السلام رہے اور پھر مجھے رہائی کے لیے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔''

اس روایت کے حوالے سے اشکال ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ بظاہر افضل تھا اور آپ اپنے لیے جس طرزِ عمل کو پسند فرما رہے ہیں وہ مفضول ہے، حالانکہ سید الانبیاء ﷺ ہونے کی حیثیت سے یہ چیز آپ کے شایانِ شان نہیں۔

اس اشکال کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ کسی دوسرے پیغمبر کو کسی جزوی عمل میں فضیلت کا حاصل ہو جانا اس کلی فضیلت کے منافی نہیں جو حضورِ اکرم ﷺ کو حاصل ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیمت پر عمل کیا اور آپ اپنے اور اپنی امت کے لیے رخصت کو پسند فرما رہے ہیں، چونکہ بادشاہوں کا مزاج بدلنے میں دیر نہیں لگتی اس لیے ایسے مواقع پر شرطیں لگانا مناسب نہیں ہوتا، ممکن ہے بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر تا دیر جیل کی کال کوٹھری میں رہنا پڑے، اللہ کے نبیوں کا معاملہ دوسرا ہے، اوّل تو انہیں بعض اوقات مستقبل کے حوالے سے بتا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ وحی اور الہام کی روشنی میں اٹل موقف اختیار کر لیتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جن اعلیٰ اخلاق اور صبر و استقامت جیسی صفات سے انبیاء متصف ہوتے ہیں، عام امتی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، حضورِ اکرم ﷺ سراپائے شفقت و رحمت ہونے کی وجہ سے اپنی امت کے لیے یسر اور آسانی پسند فرماتے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا تو انہیں حکم دیا:

﴿یسّرا ولا تعسّرا وبشّرا ولا تنفّرا﴾{۱۰۰} ''آسانی پیدا کرنا، لوگوں کو مشکلات میں نہ ڈالنا، خوشخبری دینا اور متنفر نہ کرنا۔''

﴿اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ﴾ میرا رب تو اُن عورتوں کے مکر و فریب کو جانتا ہی ہے{۱۰۱} جنھوں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی، میں چاہتا ہوں کہ عام لوگوں پر بھی حقیقت واضح ہو جائے۔

{۹۹} (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۰)
{۱۰۰} (بخاری ۲، کتاب الأدب/۹۰۴)
{۱۰۱} أراد الله كيد عظيم لا يعلمه الا الله (كشاف ۲/۴۵۱)

﴿۵۱﴾...... بادشاہ نے ان عورتوں کو دربار میں بلا کر ان سے یوسف والے معاملے کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا، اس کا سوال تو بظاہر ساری عورتوں سے تھا مگر اصل خطاب عزیز کی بیوی سے تھا۔{۱۰۲}

دربار میں آئی ہوئی آزاد خیال لیڈیاں بیک زبان بول اٹھیں کہ ہمیں یوسف کے دامنِ سیرت پر معمولی سا دھبہ بھی نظر نہیں آیا، یہ وہ موقع تھا کہ زوجۂ عزیز نے بھی اپنی غلطی اور یوسف کی پاکدامنی تسلیم کر لی۔

﴿۵۲﴾...... حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں{۱۰۳} کہ میں نے یہ سارا اہتمام اس لیے کیا ہے تاکہ سب کے سامنے میری براءت اور پاکدامنی ظاہر ہو جائے اور عزیز اگرچہ اس واقعہ کی حقیقت پہلے ہی جانتا ہے مگر اسے مزید یقین آ جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی خیانت نہیں کی۔

''مصری تہذیب و تمدن میں زنا بجائے خود کوئی اتنا بڑا جرم نہ تھا جتنا ایک شادی شدہ عورت کا اپنے شوہر کے حقوقِ خصوصی میں خیانت۔''{۱۰۴}

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ آخری آیت میں زوجۂ عزیز کا کلام مذکور ہے، وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں نے حقیقت کا اعتراف اس لیے کیا ہے تاکہ یوسف جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں نہ تو اسے بدنام کیا ہے اور نہ ہی اس کی عفت و طہارت پر کوئی داغ لگایا ہے۔{۱۰۵}

حکمت و ہدایت:

۱...... باعمل اہلِ علم کو یقیناً عزّت حاصل ہوتی ہے حتّٰی کہ ان کے دشمن بھی ان کی فضیلت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔(۵۰)

۲...... وہ علم جس کے ساتھ عملِ صالح بھی ہو، دنیوی اور اخروی مصائب سے نجات کا ذریعہ بنتا ہے۔(۵۰)

۳...... اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کے لیے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنونِ احسان کرنا پسند نہیں فرماتے...... ساقی کو بادشاہ کے سامنے خواب کا تذکرہ کرنا یاد نہ رہا، اللہ نے بادشاہ کو خواب دکھا دیا جو بالآخر رہائی اور عزّت افزائی کا سبب بن گیا۔

۴...... صبر و وقار، حلم اور بردباری، عزّتِ نفس کا احساس اور تحفظ انبیائے کرام علیہم السلام کے اخلاق میں سے ہے۔(۵۰)

۶...... زلیخا سے اگرچہ غلطی ہو گئی تھی مگر اس کی اس خوبی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے برسرِ عام اپنی غلطی اور حضرت

{۱۰۲} "راودتن" وان کانت صیغۃ الجمع فالمراد منھا الواحدۃ (کبیر ۱۸۰۶/۳۶۸)

{۱۰۳} وقد قیل: ان ذلک من کلام یوسف علیہ السلام (ابن کثیر ۲/۲۲۶)

{۱۰۴} (تفسیر ماجدی ۲/۲۱۶)

{۱۰۵} "ذلک لیعلم" کلام امرأۃ العزیز والمعنی:...... ما أحلت الذنب علیہ عند غیبتہ (کبیر ۱۸۰۶/۳۶۸)

یوسف علیہ السلام کی براءت کا اقرار کرلیا۔(۵۱)

۷......خیانت اور مکاری کا انجام کبھی بھی اچھا نہیں ہوتا۔(۵۲)

حضرت یوسف علیہ السلام کی ریاست و وزارت

﴿۵۳......۵۷﴾

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو بے شک جی تو سکھلاتا ہے برائی مگر جو رحم کر دیا میرے رب نے بے شک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان O

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں پھر جب بات چیت کی اس سے، کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس

مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا

جگہ پائی معتبر ہو کر O یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر، میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا O اور یوں قدرت دی

لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیْعُ

ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں اور ضائع نہیں کرتے

اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

ہم بدلہ بھلائی والوں کا O اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے اور رہے پرہیزگاری میں O

تسہیل: اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا کیونکہ نفس برائی کا راستہ دکھاتا ہے، البتہ جس پر میرا رب رحم کرے وہ اس کے شر سے بچ جاتا ہے، بے شک میرا رب بہت بخشنے والا اور بے حد مہربان ہے O بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف کو میرے پاس لے آؤ، میں اسے صرف اپنے معاملات کے لیے مخصوص کرلوں گا، جب حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کے پاس لایا گیا اور اسے ان سے بات چیت کا موقع ملا تو اس نے ان سے کہا، آج سے تم ہمارے ہاں معزز اور معتبر ہو O یوسف نے کہا، مجھے وزیر خزانہ بنا دیجیے کیونکہ میں دیانتداری سے حفاظت بھی کرسکتا ہوں اور حساب کتاب سے بھی خوب واقف ہوں O جیسے ہم نے جیل سے آزادی کی صورت میں یوسف پر انعام کیا تھا یونہی ہم نے اسے ملکِ مصر میں بااختیار بنا کر انعام کیا، وہ جہاں چاہتے تھے رہتے تھے، ہم جس پر چاہتے ہیں اپنی رحمت متوجہ کردیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے O البتہ آخرت کا اجر دنیا کے اجر سے کہیں زیادہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر قائم رہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۵۳﴾...... حضرت یوسف علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ میں نے اپنی پاکدامنی ثابت کرنے کے لیے جو اہتمام کیا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے اپنے زہد و تقویٰ پر ناز ہے کیونکہ ہر انسان کی طرح میرے ساتھ بھی نفس لگا ہوا ہے اور ہر نفس طبعی طور پر شہوات اور معاصی کی طرف میلان رکھتا ہے {۱۰۶} سوائے اس نفس {۱۰۷} کے جس پر اللہ رحم کرے اور اسے گناہوں سے بچنے اور نیکی کی راہ پر استقامت کی توفیق عطا فرمادے، جیسا کہ اولیاء اور صلحاء کو توفیق مل جاتی ہے، انبیاء کا معاملہ صلحاء اور اولیاء سے بھی برتر ہے کہ انہیں نفسِ بشری کے ساتھ ایک نفسِ پیمبری بھی عطا کیا جاتا ہے، انہیں ہمہ وقت دربارِ الٰہی میں حضوری کی کیفیت حاصل رہتی ہے، یہ کیفیت اور ملأ اعلیٰ سے شدید تعلق نفسِ امارہ کے تقاضے کے باوجود انہیں گناہ سے بچائے رکھتا ہے، اسی کا نام ''معصومیت'' ہے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ آیتِ کریمہ میں ''ما'' کا لفظ وقت اور زمانے کے لیے استعمال ہوا ہے {۱۰۸} جبکہ اوپر ہم نے جو تفسیر بیان کی ہے، اس میں ''ما'' کو ''من'' کے معنی میں لیا گیا ہے۔

پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ شیطان ہر شخص کو برائی کا حکم دیتا ہے سوائے اس شخص کے جس پر اللہ رحم کرے اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ شیطان ہر وقت برائی کا حکم دیتا ہے سوائے اس وقت کے جب اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے۔{۱۰۹}

﴿اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ اس کی شانِ غفوری کا تقاضا یہ ہے کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو معاف کردے اور نفسِ امّارہ کو لوّامہ (برائی پر ملامت کرنے والا) بنادے، جبکہ شانِ رحیمی کی وجہ سے انبیاء کو نفسِ مطمئنہ عطا کرتا ہے اور صدقِ دل سے توبہ کرنے والوں کو گناہوں کے آثار اور غلاظتوں سے پاک کردیتا ہے۔

﴿۵۴﴾...... بادشاہِ مصر نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کے حسنِ کردار، اعلیٰ اخلاق، پیغمبرانہ معصومیت اور انتظامی صلاحیت کے بارے میں سنا تو اپنے کارندوں سے کہا، ان صلاحیتوں اور سیرت و کردار کے حامل شخص کو جیل میں رکھنا زیادتی ہے، اسے تو کسی شاہی منصب پر فائز ہونا چاہیے، بادشاہ کا یہ فیصلہ تو ان حکایات کے بناء پر تھا جو اس نے اپنے بااعتماد لوگوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں سنی تھیں، جب اسے روبرو گفتگو کا موقع ملا تو وہ

{۱۰۶} أی لست أقول هذا ادّعاء بان النفس بريئة من ارتكاب الذنوب (التحرير والتنوير۷، الجزء الثالث عشر/۲)

{۱۰۷} ای الأنفسا رحمها ربّی فصرف عنها السوء والفحشاء (تفسير المراغی ۱۳/۴)

{۱۰۸} "الأما رحم ربّی" ای الأوقت رحمة ربّی......(کبیر ۶، ۱۸/۴۷۰)

{۱۰۹} یعنی انّها امارة بالسوء فی کلّ وقت الا فی وقت العصمة (المرجع السابق نفسه)

ان کے علم وفضل اور حسنِ ادب کا گردیدہ ہو کر رہ گیا اور اس نے فوراً انہیں اعلیٰ سرکاری منصب کی یہ کہتے ہوئے پیشکش کردی کہ ''آج سے تم ہمارے ہاں معزز اور معتبر ہو'' یوسف علیہ السلام اور بادشاہ کے دین وعقیدہ اور نسل ونسب میں ازحد تفاوت کے باوجود بادشاہ کے تأثر کو سیرت کے معجزہ کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے نکلنے سے پہلے غسل کر کے نیا لباس پہنا، اور بادشاہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے یہ دعا مانگی:

﴿اللّٰهم انّی اسألک بخیرک من خیره وأعوذ بعزتک وقدرتک من شره﴾{۱۱۰} ''اے اللہ! میں تجھ سے تیری خیر کے واسطے سے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور تیری عزت وقدرت سے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔''

توریت میں ہے:

''اور فرعون نے یوسف سے کہا، چونکہ تجھے خدا نے یہ سب کچھ سکھایا ہے، سو کوئی تجھ سا عاقل ودانشور نہیں ہے، میرے گھر کا مختار ہو اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر، فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگ تر رہوں گا۔''{۱۱۱}

﴿۵۵﴾......یوسف علیہ السلام نے نفع رسانی اور خیرخواہی کے جذبہ سے کہا کہ مجھے مصر کے خزانوں پر مامور کردیجیے۔ ''خزائن'' جمع ہے خزانة اور خزینة کی! اس سے مراد غلّے کے گودام بھی ہوسکتے ہیں اور ملک کے تمام ذرائع پیداوار بھی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر آپ مجھے کوئی عہدہ دینے اور میری صلاحیتوں سے استفادہ کا فیصلہ کرہی چکے ہیں تو میرے خیال میں اس کی مناسب شکل یہ ہے کہ محاصل اور مالیات کا سارا نظام میرے حوالے کردیجیے تاکہ میں اپنی صوابدید سے اس میں تصرّف کرسکوں اور خوشحالی اور قحط کے سالوں میں اقتصادی توازن پیدا کرسکوں اور عوام کو مشکلات سے بچاسکوں۔

﴿إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس دیانت اور علم کی ضرورت ہے، اللہ نے مجھے اس سے نواز رکھا ہے۔

﴿۵۶﴾......جس طرح ہم نے یوسف کو قید سے رہائی دی تھی، یونہی ہم نے عجیب وغریب طریقے سے اسے مصر میں اقتدار عطا کردیا، کل کا بے بس قیدی اور مملوک آج کا خودمختار، آزاد اور مالک بن گیا، انہیں مکمل اختیار حاصل تھا کہ وہ جس علاقے کا چاہیں دورہ کریں، جہاں چاہیں رہائش اختیار کرلیں اور مملکت کی اصلاح کے لیے جو چاہیں آرڈر

{۱۱۰}(کشاف ۲/۴۵۴، دار أحیاء التراث العربی)

{۱۱۱}(عہدعتیق، تکوین باب ۴۱: ۳۹-۴۰/ص ۵۱)

جاری کریں، کارپردازانِ سلطنت پر لازم تھا کہ ان کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کریں۔

﴿نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا﴾ آیتِ کریمہ کے اختتامی جملے میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے، ایک تو یہ کہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے، اس کا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا۔

دوسری یہ کہ جو حُسن واحسان کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اللہ ان کا اجر ضائع نہیں کرتا، بسا اوقات انہیں آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انجام کار میں عزت اور کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے۔

﴿۵۷﴾...... دنیا میں محسنین کے حسنِ عمل، ایثار واحسان اور صبر واستقامت کا جو اجر انہیں ملتا ہے وہ تو خیر ملتا ہے، آخرت میں انہیں جو اجر وثواب ملے گا اس کا دنیا میں تصور بھی مشکل ہے اور حقیقی محسن وہ ہیں جو ایمان اور تقویٰ کی صفات سے متصف ہوں۔ پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی دو حقیقتوں کی وضاحت ہے:

پہلی حقیقت یہ کہ یوسف علیہ السلام کو جو عزت اور اقتدار ملا، اسے ان کے صبر واستقامت کا کل معاوضہ نہ سمجھا جائے کیونکہ دنیا کا مال ومتاع اور تخت وتاج کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا آخرت کی بے بدلی اور بے مثال نعمتوں کے مقابلے میں، جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿هَٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ۝﴾ {۱۱۲}

"یہ ہماری عطا ہے، چاہو تو احسان کرو اور چاہو تو رکھ چھوڑو، تم سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا، اور بلاشبہ ان کے لیے ہمارے ہاں خاص قرب اور اچھا ٹھکانا ہے۔"

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ وہ نعمتیں جو اللہ کی طرف سے بطور انعام ملتی ہیں، ان کی بنیاد ایمان وتقویٰ پر ہوتی ہے۔

حکمت وہدایت:

۱...... نفس کی طرف سے کبھی بھی مطمئن نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ بہر حال بدی کی ترغیب دیتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ انسان اس کے بہکاوے میں آئے یا نہ آئے، حدیث میں ہے کہ ایک موقع پر سرورِ دوعالم ﷺ نے صحابہ سے سوال کیا:

"تمہاری اپنے اس دوست کے بارے میں کیا رائے ہے جس کی اگر تم عزت کرو اور اسے کھلاؤ اور پہناؤ تو وہ تمہیں بدی کی طرف لے جاتا ہے اور اگر تم اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کرو اور اس کے ساتھ سختی سے پیش آؤ تو وہ تمہیں نیکی کا راستہ بتاتا ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو دنیا کا بدترین دوست ہے،

{۱۱۲} (ص ۳۸/۳۹-۴۰)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ دوست تمہارے وہ نفوس ہیں جو تمہارے پہلوؤں کے درمیان ہیں۔'' (۵۳)

۲......کسی بھی انسان کے لیے نیکی کا کرنا اور برائی سے بچنا اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ (۵۳)

۳......مذکورہ آیت میں ہر نفسِ انسانی کو ''اَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ'' (برائی کی ترغیب دینے والا) بتایا گیا ہے جبکہ سورۂ قیامہ میں نفسِ انسانی کو ''لوّامہ'' کا لقب دے کر اس کی قسم کھائی ہے اور سورۂ فجر میں اسے ''مطمئنة'' کا لقب دے کر جنّت کی بشارت دی ہے، ان مختلف آیات میں علماء نے تطبیق یوں دی ہے کہ ''ہر نفسِ انسانی اپنی ذات میں تو ''اَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ'' یعنی برے کاموں کا تقاضا کرنے والا ہے لیکن جب انسان اللہ اور آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے پورے نہ کرے تو اس کا نفس ''لوّامہ'' بن جاتا ہے یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنے والا، جیسے عام صلحائے امت کے نفوس ہیں، اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہنچا دے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے تو وہ نفسِ مطمئنہ ہو جاتا ہے، صلحائے امت کو یہ حال مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا، اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطائے الٰہی سے ایسا ہی نفسِ مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے اور ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ {۱۱۳}

۴......مشہور عربی محاورہ ہے ''المرء مخبوء تحت لسانه'' (انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوتا ہے) اس محاورہ کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ بادشاہِ مصر بات چیت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا گرویدہ ہو گیا۔ (۵۴)

۵......علمی اور اخلاقی کمال انسان کے لیے عزّت و مرتبہ کی راہ ہموار کرتا ہے۔ (۵۴)

۶......ایسا شخص جسے اپنی ذات، دینداری اور علم پر اعتماد ہو اور اس کا مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی عہدہ اور منصب کے لیے پیش کرے بلکہ کافرانہ نظامِ حکومت کے ماتحت بھی عہدہ قبول کرنا حرام نہیں۔ {۱۱۴}

{۱۱۳} (معارف ۵/۸۷)

{۱۱۴} وفيه دليل على جواز طلب التولية والاظهار انه مستعد والتولى من يد الكافر اذا علم أنه لاسبيل الى اقامة الحق وسياسة الخلق إلا بالا ستظهار به (بيضاوى ۳/۲۹۵)

کیا اپنی تعریف جائز ہے؟

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں اپنی تعریف سے اور حدیث میں طلب عہدہ سے منع کیا گیا ہے، سورۂ نجم میں ہے:

﴿فَلَا تُزَكُّوٓا۟ أَنفُسَكُمْ﴾{۱۱۵}　　''اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کیا کرو۔''

اور حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿لاتسأل الأمارة﴾{۱۱۶}　　''امارت اور عہدے کا سوال نہ کرو۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ممانعت ان لوگوں کے لیے ہے جو نا اہل ہوں یا جو مادی اور ذاتی مفادات کے حصول کے لیے اپنی قصیدہ خوانی کریں۔

اسی طرح حدیث میں طلبِ عہدہ سے ممانعت ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اس کا حق ادا نہ کر سکتے ہوں یا ان کا مقصد شکم پروری ہو، یونہی اگر ان سے بہتر لوگ موجود ہوں تو بھی انہیں عہدے کا سوال نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کے معصوم نبی تھے، ہمیں ان کے بارے میں سو فیصد یقین ہے کہ وہ رضائے الٰہی کے طالب اور مخلوقِ باری تعالیٰ کی نفع رسانی کے آرزومند تھے، دوسری جانب قحط سالی کی صورت میں جو مشکل دور آنے والا تھا، اس سے نمٹنے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی، کارپردازانِ حکومت میں ان صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تھا، ان حالات میں ان پر لازم تھا کہ وہ اس اہم منصب کے لیے خود اپنے آپ کو پیش کرتے۔

۷......فاسق و فاجر بلکہ کافر شخص کی حکومت، فیکٹری اور کارخانے میں بھی ملازمت کرنا جائز ہے۔(۵۵)

۸......تجارت اور ملازمت ہو یا حکومت اور وزارت......ولایت تو کیا نبوت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتے ہیں۔(۵۵)

۹......احسان نظریہ اور عقیدہ میں ہو یا قول و عمل میں، اللہ کو بہت پسند ہے۔(۵۵)

۱۰......آخرت میں اجر و ثواب ایمان اور تقوٰی کی بنیاد پر ملے گا نہ کہ حسب و نسب کی بناء پر۔

برادرانِ یوسف کی آمد

﴿۵۸......۶۲﴾

وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا۟ عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُۥ مُنكِرُونَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُم

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو، اور وہ نہیں پہچانتے تھے ○ اور جب تیار کر دیا ان کو

{۱۱۵} (النجم ۵۳/۳۲)

{۱۱۶} (بخاری ۲، کتاب الاحکام/۷۱۴۶......مسلم ۲، کتاب الأمارة/۱۶۵۲)

بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ

ان کا اسباب کہا لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو تمہارا ہے باپ کی طرف سے، تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا ہوں ناپ اور خوب طرح

الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ قَالُوا سَنُرَاوِدُ

اتارتا ہوں مہمانوں کو ○ پھر اس کو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لیے بھرتی نہیں میرے نزدیک اور میرے پاس نہ آئیو ○ بولے ہم خواہش کریں گے

عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ

اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے ○ اور کہہ دیا اپنے خدمت گاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں

يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

شاید اس کو پہچانیں جب پھر کر پہنچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں ○

تسہیل: قحط سے پریشان ہو کر یوسف کے بھائی مصر آئے تو انہیں یوسف نے پہچان لیا مگر وہ یوسف کو نہ پہچان سکے ○ اور جب یوسف نے ساتھ لے جانے کے لیے بھائیوں کے لیے غلّہ تیار کر دیا تو انہیں رخصت کرتے وقت کہا، اگر دوبارہ آنا ہوا تو اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لانا، تم نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہے کہ میں غلّہ بھی پورے ناپ سے دیتا ہوں اور میزبانی بھی خوب کرتا ہوں ○ اگر تم بنیامین کو نہ لا سکے تو تمہیں نہ تو میرے ہاں سے غلّہ ملے گا اور نہ ہی میرے قریب پھٹکنے کی اجازت ہوگی ○ انہوں نے وعدہ کیا کہ ہم بنیامین کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے، آپ مطمئن رہیں کہ ہم یہ وعدہ ضرور نبھائیں گے ○ جب وہ مصر سے روانہ ہونے لگے تو یوسف نے اپنے خادموں سے کہا کہ یہ جو پونجی لے کر آئے تھے، اسے ان کے سامان میں چھپا کر رکھ دو، امید ہے کہ جب یہ اپنے گھر پہنچیں گے تو اسے پہچان لیں گے اور امید یہ بھی ہے کہ یہ دوبارہ واپس آئیں گے ○

تفسیر

﴿۵۸﴾ ...... تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کو وزارت ملنے کے بعد ابتدائی سات سال بڑی خوشحالی رہی، زمین نے خوب پیداوار دی، آپ نے اسے جمع کرنے پر بھرپور توجہ دی، اس کے بعد قحط کا دور شروع ہوا اور وہ بھی سات سال پر محیط رہا اور اس نے نہ صرف مصر بلکہ گردوپیش کے علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، کنعان کا علاقہ جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد رہائش پذیر تھی، وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جمع شدہ غلّہ انتہائی احتیاط سے حاجت مندوں میں تقسیم کرنا شروع کیا، شہرت سن کر دور دراز سے لوگ آنے لگے، وہ اپنے لیے بھی غلّہ حاصل کرتے تھے اور اپنے اہل وعیال کے لیے بھی، راشن بندی کے نظام کے تحت کسی شخص کو ایک

اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے، ہمارے وزن کے اعتبار سے پانچ من سے کچھ زائد مقدار بنتی ہے، خود حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے وزراء کا یہ حال تھا کہ وہ دن میں صرف ایک بار کھانا تناول فرماتے تھے، اسی قحط کے زمانے میں برادرانِ یوسف نے بھی مصر کا رخ کیا، توریت میں ہے:

''اور سب زمین میں گرانی ہوئی پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی، پھر جب ساری زمینِ مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائی......اور تمام روئے زمین پر کال تھا......اور ملکوں کے لوگ اناج مول لینے کے لیے ملکِ مصر میں یوسف کے پاس آنے لگے کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا{۱۱۷}......سو یوسف کے دس بھائی غلّہ مول لینے کو مصر میں آئے۔'' {۱۱۸}

جب یہ دس کنعانی نوجوان حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے انہیں فوراً پہچان لیا، اس میں آپ کی ذہانت وفراست کے علاوہ بھائیوں کے خدوخال میں زیادہ تبدیلی نہ ہونے کا بھی دخل تھا، اس لیے کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تھے، وہ سب جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور جوانی کے بعد انسان کے چہرے مہرے میں بہت کم تغیر واقع ہوتا ہے، جبکہ آپ بچے تھے اور لڑکپن کے نقشے اور جوانی کے بعد کے نقشے میں فرق ہوتا ہے، پھر کہاں وہ کمزور سا غلام جسے وہ جنگل کے کنویں میں ڈال آئے تھے اور کہاں اتنی بڑی سلطنت کا خودمختار وزیرِ اعظم! کنعانی نوجوان سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کنعان کے ویران کنویں میں پھینکا جانے والا بچہ مصر کا حکمران ہوسکتا ہے، اس لیے وہ آپ کو نہ پہچان سکے اور اسی طرح آپ کے سامنے پیش ہوئے جیسے دوسرے حاجتمند بڑی نیازمندی اور عاجزی سے پیش ہو رہے تھے۔

توریت میں ہے:

''سو یوسف کے بھائی آئے، یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیکھا اور پہچان گیا...... یوسف نے اپنے بھائیوں کو پہچانا پر انہوں نے اسے نہ پہچانا'' {۱۱۹}

﴿۵۹-۶۰﴾......راشنگ کا جو نظام اللہ کے نبی نے بنایا تھا، اس میں طے کیا گیا اصول یہی تھا کہ غلّہ کی ایک خاص مقدار ہر سائل کو ملتی تھی جبکہ غائب کو کچھ نہیں دیا جاتا تھا، یقیناً کنعانی قافلہ نے اپنے والد اور بھائی کا حصّہ مانگا ہوگا، اِدھر حضرت یوسف علیہ السلام سالوں سے بچھڑے ہوئے بھائی اور پدرِ بزرگوار سے نہ صرف ملاقات چاہتے تھے بلکہ

{۱۱۷} (عہدِ عتیق، تکوین باب ۴۱:۵۴-۵۷/ص ۵۲)
{۱۱۸} (عہدِ عتیق، تکوین، باب ۴۲:۳/ص ۵۲)
{۱۱۹} (عہدِ عتیق، تکوین، باب ۴۲:۷-۸ص ۵۲)

ان کا تذکرہ بھی ان کے لیے باعثِ تسکین تھا، ان کا ذکر آ ہی گیا تو صاف کہہ دیا کہ بوڑھے شیخ کو تو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے مگر نوجوان بھائی کی حاضری ضروری ہے، اگر تم اسے نہ لاسکے تو خود تمہیں بھی کچھ نہیں ملے گا۔

﴿اَلَا تَرَوْنَ﴾ ایک ایسا حکم جس میں کئی مصلحتیں پوشیدہ تھیں، اس کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی خوش معاملگی اور مہمان نوازی کا ذکر کردیا اور یہ تقوی کے منافی ہرگز نہیں تھا۔

﴿۶۱﴾...... جواب میں بھائیوں نے بتایا کہ ہمیں تو چھوٹے بھائی کو لانے میں کوئی اعتراض نہیں، اصل مسئلہ ہمارے والد کا ہے، ان کے کچھ تحفظات ہیں، اپنی طرف سے ہم انہیں راضی کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھیں گے۔

یوسف علیہ السلام کی تدبیر:

﴿۶۲﴾...... اِدھر کنعانی نوجوانوں سے سوتیلے بھائی کو لانے کا وعدہ لے لیا اُدھر اپنے خادموں سے یوسف علیہ السلام نے کہہ دیا کہ غلّہ کی خریداری کے لیے جو بھی پونجی اور مالِ تجارت لے کر یہ آئے تھے، وہ بھی ان کے سامان میں رکھ دو تاکہ نقدی کا نہ ہونا دوبارہ آنے میں رکاوٹ نہ ہو اور غیر متوقع احسان و کرم سے متاثر ہو کر یہ جلد از جلد واپس آئیں۔

﴿بِضَاعَتَهُمْ﴾ عربی میں "بضاعة" کا لفظ نقدی اور سکّہ کے معنی میں نہیں، مالِ تجارت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، امام راغب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

﴿البضاعة قطعة وافرة من المال تقتنی للتجارة﴾{۱۲۰} "مال کی وہ وافر مقدار جو تجارت کے لیے رکھی جائے، اسے بضاعت کہا جاتا ہے۔"

ہمیں اس لفظ کے استعمال میں بھی قرآن کے اعجاز کا ایک پہلو سمجھ آتا ہے کہ وہ کسی بھی دَور اور ملک کا ذکر کرتے ہوئے تاریخی اور معاشی جزئیات کا لحاظ بھی خوب رکھتا ہے، جس زمانے میں قصّۂ یوسف پیش آیا، اس زمانے میں نقدی اور سکّہ کا رواج نہ تھا، اجناس کے تبادلہ اور سونے چاندی ہی سے تجارت ہوتی تھی، قرآن نے جس لفظ کا انتخاب کیا ہے، اس کا اطلاق ہر قسم کے مالِ تجارت بشمول اجناس پر ہوسکتا ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱...... جب طویل زمانہ گزر جائے تو بسا اوقات بھائی اپنے حقیقی بھائی کو اور والد اپنی قلبی اولاد کو پہچان نہیں پاتا بالخصوص جب وہ ایسے مقام اور مرتبہ تک پہنچ جائے جہاں پہنچنے کا تصوّر بھی محال ہو۔ (۵۸)

۲...... کسی جائز مصلحت کے لیے اپنی تعریف بھی جائز ہے اور ترغیب و ترہیب بھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے

{۱۲۰} (المفردات/۵۰)

دونوں طریقے استعمال کیے۔(۵۹-۶۰)

۳......اگر خشک سالی کی وجہ سے انسانوں کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو ہر فرد کی ضرورت کے مطابق حکام کی طرف سے راشن کی مقدار مقرر کرنا جائز ہے۔{۱۲۱}

امتحان کی تکمیل:

۴......اشکال ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے کی جدائی سے اتنے متاثر ہوئے کہ رو رو کر بینائی گنوا بیٹھے، دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو اللہ کے نبی اور رسول ہیں، والد سے محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں اور انہیں طویل آزمائش کے بعد ہر طرح کی سہولتیں اور اختیارات بھی میسّر ہیں، ان کی سیرت کا انتہائی باعثِ تعجب پہلو یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو والد سے ملاقات کا پروگرام بنایا نہ ارادہ ظاہر کیا اور نہ ہی انہیں پیغام بھیج کر تسلّی دی بلکہ الٹا اپنے دوسرے بھائی کو بھی بلوا کر انہیں مزید رنج و غم میں مبتلا کر دیا، حالانکہ کسی عام انسان سے بھی اس کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ اللہ کا برگزیدہ پیغمبر ایسا کرے۔

اہلِ علم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے نبی کو اپنے والد اور دوسرے اہلِ خاندان کو اپنے متعلق بتانے سے روک دیا تھا{۱۲۲} اس روکنے میں کیا حکمت تھی؟ ویسے تو اللہ کے فیصلوں کی حکمتوں کا انسانی عقل احاطہ نہیں کر سکتی، بظاہر جو حکمت سمجھ میں آتی ہے، وہ اس امتحان کی تکمیل تھی جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ڈال دیا گیا تھا۔

بیٹوں کی درخواست اور والد کا جواب

﴿۶۳......۶۶﴾

فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس، بولے اے باپ! روک دی گئی ہم سے بھرتی سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ

لے آئیں، اور ہم اس کے نگہبان ہیں O کہا میں کیا اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی پر اس سے پہلے،

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ

سو اللہ بہتر ہے نگہبان اور وہی ہے سب مہربانوں سے مہربان O اور جب کھولی اپنی چیز بست پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی ان کی طرف، بولے

{۱۲۱} وفی ماقص اللہ تعالیٰ ...... دلالۃ علی ان الائمۃ فی کل عصران یفعلوا مثل ذلک اذا خافوا ہلاک الناس من القحط (جصاص ۳/۱۷۶)

{۱۲۲} "إن قيل: كيف استجاز يوسف ادخال الحزن على أبيه بطلب أخيه؟...... يجوز أن يكون الله عزّوجلّ أمره بذلك ابتلاء ليعقوب، ليعظم له الثواب فاتّبع أمره فيه (قرطبی ۹/۱۸۹)

رُدَّتْ اِلَیْهِمْ ؕ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِیْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا ۚ وَ نَمِیْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ

اے باپ! ہم کو اور کیا چاہیے؟ یہ پونجی ہماری پھیر دی ہے ہم کو اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور خبرداری کریں گے

اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ ﴿۶۵﴾ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ

اپنے بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی، وہ بھرتی آسان ہے ○ کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو تمہارے ساتھ

مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى

یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس، مگر یہ کہ گھیرے جاؤ تم سب، پھر جب دیا اس کو سب نے عہد، بولا

مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾

اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے ○

تسہیل: جب وہ سفر سے لوٹ کر اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہنے لگے، ابا جان! آئندہ ہمیں غلّہ دینے سے منع کر دیا گیا ہے، بس ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ ہمارے بھائی بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تو ہم غلّہ لا سکتے ہیں اور یقیناً ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے ○ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس کے بارے میں تم پر ویسے ہی اعتماد کروں جیسے اس سے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں تم پر اعتماد کیا تھا، میں صرف اللہ پر اعتماد کرتا ہوں، وہی سب سے بہتر نگہبان ہے اور وہی سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ○ جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی پونجی انہیں واپس کر دی گئی ہے، خوش ہو کر کہنے لگے، ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے؟ یہ دیکھیں! ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے، آپ نے اجازت دے دی تو ہم گھر والوں کے لیے دوبارہ رسد لائیں گے، اپنے بھائی کی خوب حفاظت کریں گے اور اس کے حصّے کا بارِ شتر غلّہ زیادہ حاصل کریں گے، یہ زائد مقدار دینا بادشاہ کے لیے بہت آسان ہے ○ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، میں اس وقت تک کسی بھی صورت اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام کی قسم کھا کر مجھ سے یہ پکّا عہد نہ کرو کہ تم اسے ضرور واپس لاؤ گے، سوائے اس کے کہ تم بالکل ہی لاچار ہو جاؤ، جب انہوں نے قسم کھا کر پکّا قول دے دیا تو آپ نے فرمایا، جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں، اس پر اللہ نگہبان ہے ○

تفسیر

﴿۶۳﴾ ...... برادرانِ یوسف نے سفر سے واپسی پر سارے حالات والد کو سنا کر گزارش کی کہ اب کی بار بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجیے ورنہ آئندہ ہم میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا، یہ سمجھا جائے گا کہ ہمارا کوئی اور بھائی تھا ہی

نہیں، ہم محض جھوٹ بول کر گیارہویں کا حصہ وصول کرنا چاہتے تھے، جہاں تک اس کی حفاظت کا تعلق ہے، تو آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں، ہم دس پُرقوت اور شہ زور نوجوان ہیں، ہماری موجودگی میں کوئی بنیامین کا بال بیکا کرنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔

﴿۶۴﴾......حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں تمہیں بہت اچھی طرح آزما چکا ہوں، کل یوسف کی حفاظت کا بھی تم نے اسی طرح وعدہ کیا تھا مگر اس کا ایفاء نہ کرسکے، اب میں اللہ ہی کی حفاظت اور رحمت کا طلبگار ہوں کیونکہ اس سے بہتر محافظ اور اس سے زیادہ رحم کرنے والا کوئی نہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس گفتگو میں طبعی تقاضوں اور ایمانی مطالبات کی حسین جامعیت پائی جاتی ہے اور یہ مقام اللہ کے مخصوص بندوں ہی کو حاصل ہوتا ہے ورنہ نیک بندوں میں سے بھی بعض پر طبعی تقاضے اور بعض پر ایمانی مطالبات غالب آجاتے ہیں۔

﴿۶۵﴾......اب تک جو بھی گفتگو ہوئی وہ سامان کھولنے سے پہلے ہوئی تھی، جب سامان کھولا اور دیکھا کہ غلّہ کی قیمت کے طور پر جو پونجی وہ ادا کرکے آئے تھے وہ قصداً انہیں واپس کردی گئی ہے، تو وہ خوشی سے پکار اٹھے "مانبغی" بادشاہ کی طرف سے اس سے زیادہ اکرام اور تعاون کی ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں{۱۲۳} کہ اس نے ہماری پونجی بھی واپس کردی اور غلّہ بھی پورا دے دیا؟ ایسے مہربان انسان کے پاس تو ضرور جانا چاہیے تاکہ اس قحط سالی میں خاندان کے لیے غلّہ حاصل کیا جاسکے، بنیامین کے ساتھ ہونے کی صورت میں بارِشتر کے برابر غلّہ مزید حاصل ہونے کی توقع ہے۔

قرآن اور بائبل:

﴿۶۶﴾......کن کن نزاکتوں کا لحاظ ہے اللہ کے نبی کے کلام میں؟ ایک طرف سابقہ تلخ تجربے کی روشنی میں ظاہری تدابیر کی رعایت اور بیٹوں سے عہد و پیمان، دوسری جانب ان مجبوریوں اور انہونیوں کا لحاظ جن کے پیش آنے کی صورت میں انسانی تدابیر دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، تیسری جانب اللہ پر توکل اور شرعی تاکید۔

یہی مضمون توریت میں بھی ہے مگر بغور دیکھیے کہ قرآن اور بائبل میں کتنا فرق ہے:

"تب یہوداہ نے اپنے باپ اسرائیل کو کہا کہ اس جوان کو میرے ساتھ بھیجیے کہ ہم اٹھیں اور جاویں تاکہ ہم اور تُو اور ہمارے بچے جیویں اور مر نہ جاویں اور میں اس کا ضامن ہوتا ہوں، تُو میرے ہی ہاتھ سے اسے طلب کیجیو اگر میں اسے تیرے پاس نہ لاؤں اور تیرے سامنے نہ بٹھاؤں تو یہ گناہ ابد تک میری گردن پر رکھیو۔"{۱۲۴}

{۱۲۳} أي ماذا نطلب وراء ما وصفنا لك من إحسان الملك إلينا...... (المراغی ۱۳/۱۴)

{۱۲۴} (عہدِ عتیق، تکوین ۴۳: ۸-۹/ص ۵۳، ۵۴)

حکمت وہدایت:

۱......موضوعِ سخن کچھ بھی کیوں نہ ہو، اللہ کے نیک بندے ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے ذکر اور اس کی حمد وثناء کا پہلو نکال ہی لیتے ہیں...... بات ہو رہی تھی برادرانِ یوسف کی ضمانت اور اعتماد، عدمِ اعتماد کی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے گفتگو کا رخ پھیر دیا رحمٰن ورحیم کی طرف، فرمایا "فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ"

۲......بھائیوں کی طرف سے بنیامین کی حفاظت کے زوردار وعدوں کی ایک وجہ اپنے سابقہ جرم کا احساس تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ والدین کی نظر میں یوسف علیہ السلام کی محبوبیت نے انہیں جس حسد میں مبتلا کر دیا تھا، وہ حسد بنیامین سے نہ تھا۔

۳......سابقہ تجربہ کی بناء پر حضرت یعقوب علیہ السلام حساس اور چوکنا ہو گئے تھے اسی لیے انہوں نے بنیامین کے بارے میں عہد وپیمان کا زیادہ اہتمام کیا اور یہی مسلمان کی شان ہے کہ وہ ایک دفعہ ڈسے جانے کے بعد محتاط ہو جائے۔

۴......قرآن نے "حمل بعیر" یعنی بارِ شتر کو جو صراحۃً ذکر کیا ہے تو ممکن ہے اس میں ایک حکمت بائبل کی تصحیح ہو کیونکہ بائبل میں اونٹ کے بجائے گدھے کا ذکر ہے، توریت میں ہے:

"اور انہوں نے گدھوں پر غلہ لادا اور وہاں سے روانہ ہوئے۔" {۱۲۵}

حالانکہ عرب ملکوں میں لمبے سفر میں باربرداری کے لیے گدھے کے بجائے اونٹ استعمال ہوتا ہے، خصوصاً ریگستانی صحراؤں میں تو گدھا چل ہی نہیں سکتا، خاندانِ یعقوب کے حالات کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اونٹوں کی بہتات تھی۔

۵......کسی سے ایسا وعدہ نہیں لینا چاہیے جس کا ایفاء اس کے اختیار میں نہ ہو، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے بنیامین کی بحفاظت واپسی کا وعدہ لیتے ہوئے خود ہی استثناء بھی کر دیا کہ "اگر تم کسی وجہ سے بالکل ہی لاچار ہو جاؤ" تو تم ذمہ دار نہ ہو گے، ہمارے آقا ﷺ جب صحابہ سے اطاعت کا وعدہ لیتے تو اس میں ازخود "استطاعت" کی قید لگا دیتے۔

۶......اولاد سے اگر غلطی ہو جائے تو ان کی اصلاح کی فکر کی جائے، جلد بازی میں نہ تو انہیں بد دعا دی جائے اور نہ ہی قطع تعلق کیا جائے، برادرانِ یوسف سے ایک نہیں کئی غلطیاں ہوئیں اور وہ بھی شدید ترین! مگر پھر بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں نہ تو عاق کیا نہ گھر سے نکالا بلکہ مسلسل ان کی اصلاح اور تربیت کے لیے فکرمند رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بالآخر اپنی خطاؤں پر ندامت اور ان سے توبہ کی

{۱۲۵} (عہد عتیق، تکوین باب ۴۲: ۲۶/ص ۵۳)

توفیق عطا فرمادی۔

۷......حُسنِ خلق اور حُسنِ معاملہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لازمی اوصاف میں سے ہیں۔

۸......اصلاح کی نیت سے اگر خطاکار کو اس کی غلطی جتلادی جائے تو کوئی حرج نہیں تاکہ وہ شرمندہ ہو کر اس سے کلی طور پر تائب ہو جائے، البتہ محض ذلیل کرنے کے لیے اسے غلطی جتلانا جائز نہیں۔

۹......مؤمن اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرتا ہے، وہی ہے جو اسباب میں اثر اور جان پیدا کرتا ہے، جو شخص ظاہری اسباب اور انسانوں پر حقیقی بھروسہ کرے، وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔

۱۰......اگر اپنے سامان میں سے کسی دوسرے شخص کا مال نکلے اور مضبوط قرائن سے ثابت ہوتا ہو کہ اس نے ہمیں دینے ہی کے لیے ہمارے سامان میں رکھا ہے، تو اس کا لینا اور اس میں تصرّف کرنا جائز ہے۔

۱۱......مالی ضمانت کے جواز پر تمام علماء کا اتفاق ہے مگر شخصی ضمانت کے جواز میں بعض حضرات کا اختلاف ہے، مذکورہ آیت (۶۶) سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔{۱۲۶}

تدبیر اور تقدیر

﴿۶۷......۶۸﴾

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ

اور کہا اے بیٹو! نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے اور داخل ہونا کئی دروازوں سے جدا جدا اور

اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ

میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے، حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ چاہیے

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ

بھروسہ کرنے والوں کو ○ اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے کچھ نہ بچا سکتا تھا

عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا

ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ

عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

ہم نے اس کو سکھایا، لیکن بہت لوگوں کو خبر نہیں ○

{۱۲۶} (درج شدہ مسائل وہدایات میں سے چند "معارف القرآن" سے ماخوذ ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے "معارف ۵/۱۰۵-۱۰۶ ...... مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ)

تسہیل: یعقوب نے بیٹوں کو رخصت کرتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ مصر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، یہ محض ایک ظاہری تدبیر ہے ورنہ میں تمہیں اللہ کے کسی حکم سے نہیں بچا سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے، میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے O جب وہ مصر میں اپنے والد کے مشورہ کے مطابق داخل ہوئے تو وہ تدبیر انہیں اللہ کے حکم سے نہ بچا سکی، وہ تو بس یعقوب کے دل کا ایک ارمان تھا جسے اس نے پورا کر دیا تھا، بلاشبہ یعقوب صاحبِ علم تھے کیونکہ ہم نے انہیں علم عطا کیا تھا لیکن اکثر لوگ علمِ حقیقی سے محروم ہوتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۶۷﴾......اولاد کے ساتھ والدین کی محبت بھی عجیب چیز ہوتی ہے، موہوم خطرات بھی انہیں پریشان کر دیتے ہیں، کڑیل جوان انہیں کل کے بچے نظر آتے ہیں، انبیاء اور صلحاء کے دل آلائشوں سے پاک ہونے کی وجہ سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، تدیّن اور تقویٰ فطری جذبات کی موت کے بجائے ان کی نشوونما کا سبب بنتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو سفر پر روانہ کرتے ہوئے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، اتفاق اور محبت سے رہنے کے بارے میں نمعلوم کیا کیا نصیحتیں فرمائی ہوں گی، قرآن نے ان میں سے صرف ایک نصیحت کا ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ مصر میں کسی ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا، اس نصیحت کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا وہ انہیں حسد اور نظرِ بد سے بچانے کا تھا، محبت سے بھرا ہوا دل رکھنے والے باپ نے جب اپنے گیارہ خوبصورت تنومند اور نوجوان بیٹوں کو دیکھا تو انہیں یہ خدشہ پریشان کرنے لگا کہ جب یہ گیارہ اکٹھے شہر میں داخل ہوں گے تو ان کی وجاہت اور جمعیت کی وجہ سے نگاہیں ان کی طرف ضرور اٹھیں گی، گزشتہ سفر میں بادشاہ کی طرف سے ان کا جو غیر معمولی اکرام ہوا تھا وہ بھی مصر کے شہریوں کو یاد ہوگا، کہیں انہیں دیکھ کر وہ حسد میں مبتلا نہ ہو جائیں﴿۱۲۷﴾ یا ان کی نظر انہیں نہ لگ جائے﴿۱۲۸﴾ اس لیے آپ نے دو دو چار چار کی صورت میں الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کی تاکید فرمائی۔

﴿وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ﴾ ساتھ ہی یہ بھی وضاحت فرما دی کہ یہ محض ایک تدبیر ہے لیکن اگر اللہ تمہیں کسی آزمائش میں ڈالنا چاہے تو میری تدبیر تمہیں نہیں بچا سکتی، ساری کائنات پر اسی کا حکم چلتا ہے، اس کے حکم کے مقابلے میں کسی کی

﴿۱۲۷﴾ لئلا یأمن علیهم حسد الناس (کبیر ۱۸،۶/ ۴۸۳)

﴿۱۲۸﴾ قال المفسّرون: خاف علیهم من العین إن دخلوا مجتمعین إذ کانوا أهل جمال وهیبة (صفوة التفاسیر ۵۹/۲، دار القرآن الکریم، بیروت) ویجوز أن یکون خوفه علیه السلام علیهم من العین (روح المعانی ۱۳،۸/ ۲۳)

تدبیر اور چاہت نہیں چل سکتی، ظاہری اسباب اور تدبیریں بھی اس لیے اختیار کی جاتی ہیں کہ اللہ کا حکم ہے ورنہ جہاں تقدیر ہو وہاں تدبیر بے اثر ہو جاتی ہے۔

﴿عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ﴾ عبرت حاصل کریں اللہ کے نیک بندوں کو معاذ اللہ! الوہیت کے منصب پر فائز کرنے والے، دیکھیں کیا تواضع اور عبدیت اور اپنی ذات کی نفی پائی جاتی ہے ان کے کلام میں اور کیسے وہ بات بات میں اللہ کی قدرت وحاکمیت اور حمد وثناء کو لے آتے ہیں۔

﴿فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾ حضرت یعقوب علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ سب توکل کرنے والے جن میں انبیاء سرِ فہرست ہیں چونکہ اللہ پر توکل کرتے ہیں اسی لیے میں بھی اسی پر توکل کرتا ہوں۔{۱۲۹}

﴿۶۸﴾...... برادرانِ یوسف اپنے والد کی وصیت کے مطابق مختلف دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے مگر اللہ کی طرف سے انہیں جس آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، یہ تدبیر انہیں اس آزمائش سے بچانے میں سود مند ثابت نہ ہوئی، جس حادثہ سے بچانے کے لیے والدِ محترم نے اس تدبیر پر عمل کرنے کا حکم دیا تھا وہ حادثہ تو پیش نہ آیا اور جس حادثے سے وہ دوچار ہوئے اس کی طرف حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظر نہیں گئی اور نہ ہی وہ کسی کے وہم وگمان میں تھا۔

﴿إِلَّا حَاجَةً﴾ کیسے کیسے نکتے ہیں جو اشاروں کنایوں میں بیان ہو رہے ہیں اور کیسے کیسے شرعی اور نفسیاتی عقدے ہیں جو اللہ کی کتاب کھول رہی ہے، سمجھایا جا رہا ہے کہ تقدیر تو بہرحال ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں مگر تدبیر بھی لایعنی اور فضول چیز نہیں، اگر فضول چیز ہوتی تو اللہ کا نبی کبھی اسے اختیار نہ کرتا، معاملہ کسی ایک نبی کا نہیں تمام انبیاء بلکہ سید الانبیاء ﷺ نے بھی بے شمار مواقع پر مناسب تدابیر اختیار فرمائیں۔

قرآن کہتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں ایک ارمان تھا جو انہوں نے بیٹوں کو وصیت کی صورت میں پورا کر لیا، جب دل کے جائز ارمان نکالنا مرتبۂ نبوت کے منافی نہیں تو عام مسلمان کے مقام اور مرتبہ کے منافی کیسے ہو سکتا ہے؟

﴿وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ﴾ کوئی حرمان نصیب یہ نہ سمجھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو تقدیر کی طاقت اور اس کے مقابلے میں تدبیر کی بے چارگی کا علم نہ تھا، وہ صاحبِ علم تھے اور علم بھی کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ وہبی! اسی علم نے انہیں ظاہری تدبیر اختیار کرنے مگر اسے مؤثرِ حقیقی نہ سمجھنے کا راستہ دکھایا تھا اور یہی تقاضا ہے علمِ حقیقی کا۔

{۱۲۹} "فلیتوکل" الفاء لافادۃ التسبیب فان فعل الانبیاء سبب لان یقتدی بھم (بیضاوی ۲۹۹/۳)

حکمت وہدایت:

ا......ایک انسان کی دوسرے کونظر لگ جاناحق ہے اوراس سے نقصان بھی ہوسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿العین حق﴾{۱۳۰} ''نظر کا اثر ہوناایک حقیقت ہے۔''

آپ نظر لگنے سے ان الفاظ میں اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے:

﴿أعوذ بکلمات اللہ التامه من کل شیطان وھامّه ومن کل عین لامّة﴾{۱۳۱} ''میں اللہ کے کامل کلمات کے ذریعے پناہ مانگتا ہوں ہر شیطان سے، زہریلے کیڑے سے اور نظرِ بد سے۔''

اور حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما پر ان کلمات سے دم فرماتے تھے:

﴿اعیذ کما بکلمات اللہ التامّة من کل شیطان وھامّة ومن کل عین لامّة﴾{۱۳۲}

اور دم کے بعد فرماتے کہ: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام پر یونہی دم کیا کرتے تھے۔''{۱۳۳}

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں دن کے ابتدائی حصے میں رسولِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ سخت تکلیف میں ہیں، پھر میں دن کے آخر میں گیا تو آپ کو افاقہ ہو چکا تھا، آپ نے خود ہی بتایا کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے تھے اور انہوں نے یہ دعا پڑھ کر مجھے دم کیا:

﴿بسم اللہ أرقیک من کل شیء یؤذیک ومن کل عین وحاسد، اللہ یشفیک﴾{۱۳۴} ''اللہ کے نام سے ہر ایسی چیز سے آپ پر دم کرتا ہوں جو آپ کو تکلیف دیتی ہے اور ہر نظرِ بد اور حاسد سے، اللہ آپ کو بیماری سے شفا عطا فرمائے۔''

ہمارے آقا ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی چیز پسند آئے تو اس کے لیے برکت کی دعا کیا کرو، اس طرح وہ نظرِ بد کے اثر سے محفوظ رہے گی اور اگر کسی کو نظر لگ ہی جائے تو اس کے دفعیہ کی تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ جس کے بارے میں خیال ہو کہ اس کی نظر لگی ہے، اس کے وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کر کے نظر زدہ پر ڈالا جائے۔

صحابہ کرام میں حضرت سہل بن حُنیف کا واقعہ مشہور ہے کہ انہیں حضرت عامر بن ربیعہ کی نظر لگ گئی تھی، رسول

{۱۳۰} (بخاری ۲، کتاب الطب/۸۵۴)
{۱۳۱} (ابن ماجہ، کتاب الطب/۲۵۱)
{۱۳۲} (ابوداؤد ۲، کتاب شرح السنّة/۳۰۴)
{۱۳۳} (المرجع السابق نفسه والصّفحة نفسها)
{۱۳۴} (مسند احمد ۲/۳۳۲......۳/۲۸، ۵۶-۵۸، ۱۵۱)

اللہ ﷺ نے عامر کو وضو کرنے اور ان کے وضو کا پانی سہل بن حُنیف کے بدن پر ڈالنے کا حکم دیا، حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ بالکل تندرست ہو گئے، آپ ﷺ نے عامر بن ربیعہ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿علام یقتل احدکم اخاہ الابرّکت ان العین حق﴾{۱۳۵} ''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے؟ تم نے ان کا خوبصورت بدن دیکھ کر ان کے لیے برکت کی دعا کیوں نہ کی؟ کیا جانتے نہیں کہ نظر کا اثر ہو جانا حق ہے؟''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی دوسرے کے جان و مال میں کوئی چیز اچھی لگے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے برکت کی دعا کرنی چاہیے، بعض روایات میں ہے کہ ''ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ'' کہنے سے نظرِ بد کا اثر جاتا رہتا ہے۔

۲......لوگوں کے حسد سے بچنے کے لیے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا چھپانا درست ہے۔(۶۷)

۳......ظاہری تدابیر اور اسباب کا اختیار کرنا نہ شانِ انبیاء کے خلاف ہے اور نہ ہی توکل کے منافی ہے، البتہ ان کو مؤثرِ حقیقی سمجھ لینا توکل کے منافی ہے۔(۶۷)

۴......اگر کسی شخص کے بارے میں ہمیں اندیشہ ہو کہ اسے کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے تو اسے بچاؤ کی ممکن تدبیر کے بارے میں آگاہ کر دینا چاہیے کیونکہ دین خیر خواہی کا نام ہے۔(۶۷)

۵......تدبیر کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۶......نظرِ بد سے بچنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے، سب سے مؤثر تدبیر مسنون دعائیں ہیں۔

۷......حقیقی علم اللہ کی مرضیات اور ایمانیات کا علم ہے اور حقیقی صاحبِ علم وہ ہے جو علم پر عمل بھی کرے۔

بھائی کو روکنے کی تدبیر

﴿۶۹......۷۶﴾

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا

اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو، کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ

سے جو انہوں نے کیے ہیں ○ پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے

{۱۳۵} (مستدرک حاکم ۲۱۵/۴، مسند احمد ۳۸۶/۴، موطا ۹۳۹/۲ ......بحوالہ قرطبی ۱۹۲/۹)

اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو ○ کہنے لگے منہ کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہوگئی؟ ○

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک بوجھ اونٹ کا، اور میں ہوں اس کا ضامن ○

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا

بولے قسم اللہ کی، تم کو معلوم ہے ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک میں اور نہ ہم کبھی چور تھے ○ بولے

فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِىْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ

پھر کیا سزا ہے اس کی، اگر تم نکلے جھوٹے ○ کہنے لگے اس کی سزا یہ کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں

كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا

جائے، ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو ○ پھر شروع کیں یوسف نے ان کی خرجیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے، آخر

مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ۚ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ

کو وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے، یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو

اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

چاہے اللہ ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا ○

تسہیل: اور جب سب بھائی یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے تنہائی میں اپنے بھائی سے ملاقات کر کے اسے بتا دیا کہ میں تمہارا بھائی ہوں تو جو کچھ یہ ہمارے ساتھ کرتے رہے ہیں، اس پر غم نہ کرو ○ پھر جب یوسف نے واپسی کے لیے بھائیوں کا سامان تیار کر دیا تو ایک قیمتی پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا، پھر جب یہ روانہ ہو گئے تو ایک منادی نے زور سے آواز دے کر کہا، اے قافلے والو! تم چور ہو ○ قافلے والوں نے پلٹ کر پوچھا، تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے؟ ○ انہوں نے جواب دیا، ہمیں شاہی پیمانہ نہیں مل رہا اور جو کوئی یہ پیمانہ لائے گا اسے بارِ شتر غلّہ بطور انعام دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں ○ انہوں نے کہا اللہ کی قسم! تم خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں چوری اور فساد کے لیے نہیں آئے اور نہ ہی ہم چوری کیا کرتے ہیں ○ بادشاہ کے خدام نے پوچھا، اچھا یہ بتاؤ اگر تم اپنی بات میں جھوٹے ثابت ہوئے تو چور کی کیا سزا ہوگی؟ ○ انہوں نے جواب دیا کہ جس کے سامان سے وہ پیالہ نکلے اسے اس کی سزا میں گرفتار کر لیا جائے، ہم ظالموں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں ○ پس یوسف نے اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان

کے تھیلوں کی تلاشی لی پھر اسے اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کرلیا، یہ تدبیر ہم نے یوسف کو بتائی تھی ورنہ ملکی قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو پکڑنے کے مجاز نہ تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے، ہم جسے چاہتے ہیں اس کے درجات بلند کردیتے ہیں اور ہر علم والے سے بالاتر کوئی علم والا ہے O

تفسیر

﴿۶۹﴾......قرآن قصوں اور کہانیوں کی کتاب نہیں، یہ تو انسان سازی کا ہدایت نامہ ہے، کوئی قصہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، اس کی ساری جزئیات قرآن بیان نہیں کرتا بلکہ صرف اس حصے کے ذکر کرنے پر اکتفاء کرتا ہے جس میں انسانِ مطلوب کی اصلاح وفلاح اور تعلیم وتربیت کا کوئی پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔

جب برادرانِ یوسف مصر میں دوبارہ آئے تو قرآن بتاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مناسب موقع دیکھ کر بنیامین کو بتادیا کہ آزمائش کے دن ختم ہوگئے ہیں، جو کچھ سوتیلے بھائی تمہارے ساتھ کرتے رہے ہیں اسے بھول جاؤ، میں تمہارا بھائی ہوں، اب تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔

اسرائیلی روایات میں جو تفصیلات ہوتی ہیں وہ ضروری بھی نہیں ہوتیں اور ساری کی ساری مبنی برحقیقت بھی نہیں ہوتیں، بعض مفسرین ان کے ایسے حصے بیان کردیتے ہیں جن میں دلچسپی کا کوئی پہلو ہوتا ہے یا پیچ کی کڑیوں کی کوئی تفصیل ہوتی ہے، جیسے اس موقع پر کہا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے آنے والے مہمانوں میں سے ہر دو افراد کے لیے الگ الگ کرنے کا انتظام کیا، بنیامین اکیلے رہ گئے انہیں اپنے ساتھ ٹھہرالیا، ان سے خاندانی حالات کے بارے میں پوچھا، انہوں نے حالات بتاتے ہوئے اپنے ہلاک ہوجانے والے بھائی کا بھی ذکر کردیا، جنابِ یوسف نے پوچھا، کیا تم پسند کروگے کہ اس ہلاک شدہ بھائی کے بدلے میں تمہارا بھائی بن جاؤں؟ بنیامین نے جواب دیا تمہارے جیسا بھائی کسے میسّر آسکتا ہے؟ مگر حقیقی بھائی کا بدل تو کوئی نہیں ہوسکتا، حضرت یوسف علیہ السلام جذباتی ہوکر رو پڑے اور بنیامین کو سینے سے لگا کر کنعان کے کنویں سے لیکر مصر کی بادشاہت تک پہنچنے کی ساری داستان سنادی۔{۱۳۶}

﴿۷۰﴾......حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کا سامان تیار کروانے کے بعد وہ کٹورا اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوادیا جس میں پانی بھی پیا جاتا تھا اور غلّہ ناپنے کا کام بھی اس سے لیا جاتا تھا، پھر جب یہ کارواں، کنعان جانے کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا اور شاہی مہمان خانہ کے اہلکاروں کو وہ کٹورا غائب نظر آیا تو انہیں گیارہ نوجوانوں پر مشتمل اسی

{۱۳۶} (کشاف ۲/۱۴۲)

کارواں پر شک گزرا جو وہاں ٹھہرا ہوا تھا، انہوں نے اس کارواں کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے ظنِ غالب کی بناء پر آواز دی کہ تم چور ہو۔{۱۳۷}

تدبیر کیوں؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کے لیے یہ جو تدبیر اختیار کی اس میں چند چیزوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۱......آپ نے جو کچھ کیا اللہ کے حکم سے کیا، جیسا کہ آیت ۷۶ میں ہے "اسی طرح کی تدبیر ہم نے یوسف کو سکھائی" جب آپ نے اللہ کے حکم سے یہ تدبیر اختیار کی تو اس کے جواز میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔

۲......جن بھائیوں کے ہاتھوں آپ خود زخم اٹھا چکے تھے، آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ بنیامین کو انہی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں، آتے ہوئے انہوں نے اس لیے بھی حفاظت کی تھی کیونکہ اس کے بغیر انہیں غلہ ملنے کی کوئی امید نہ تھی جبکہ واپس جاتے ہوئے والد کے سامنے کیے گئے عہد و پیان کے سوا کوئی دوسری رکاوٹ نہ تھی، مگر عہد و پیان تو انہوں نے یوسف کے معاملے میں بھی کیا تھا۔

۳......حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے خادموں نے جو کچھ کیا وہ "توریہ" تھا، توریہ ذو معنی بات کو کہا جاتا ہے، جو بجائے خود صحیح اور سچی ہوتی ہے لیکن اس کے کہنے یا کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب مغالطہ میں پڑ جاتا ہے، توریہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں مصلحتِ حق کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے، برادرانِ یوسف اگرچہ شاہی کٹورا کے چور نہ تھے مگر اس میں کیا شک ہے کہ انہوں نے یوسف کو یعقوب سے جدا کرنے میں چوروں والا کردار ادا کیا تھا۔

۴......یہ بھی ضروری نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم ہی سے ملازمین نے اہلِ کارواں پر چوری کا الزام لگایا ہو، ممکن ہے کہ شاہی پیمانہ (جو یقیناً قیمتی ہوگا) کی گمشدگی کی افواہ پھیلتے ہی ملازموں کی دوڑیں لگ گئی ہوں اور بعض قرائن کی بناء پر ان کی نظریں کنعانی قافلہ کی طرف اٹھی ہوں۔

۵......مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ وقت کے لیے حقائق پر پردہ پڑا رہنے دیا جائے، اللہ کی طرف سے بھی بھائیوں پر افشائے راز کی اجازت نہ تھی، دوسری طرف ملکی قانون ثبوتِ جرم کے بغیر کسی کو اپنے پاس روکنے کی اجازت نہ دیتا تھا، ملکی قانون جبکہ مبنی بر عدل ہو، اس کی پاسداری ضروری ہے، اب بنیامین کو روکنے کی وہی مناسب صورت

{۱۳۷} فلم یکن قول ھذا القائل کذبا اذ کان مرجعہ الی غالب ظنہ (جصاص ۳/۱۷۵)

رہ جاتی تھی جو اختیار کی گئی، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہ تھی اور مروّجہ قانون بھی اس کی اجازت دیتا تھا...... اب اگلی آیت کو لیجیے:

﴿۷۱﴾...... جاتے ہوئے قافلے نے پلٹ کر پوچھا، کونسا سامان گم ہو گیا ہے جو ہم پر الزام دھرا جا رہا ہے؟

﴿۷۲﴾...... شاہی کارندوں نے بتایا، شاہی پیانہ! اور جو کوئی اس کی دریافت میں مدد دے گا، اسے بارِ شتر غلّہ بطور انعام دیا جائے گا، خشک سالی کے زمانے میں غلّے کی یہ مقدار بہت بڑا انعام تھی۔

﴿وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ﴾ لگتا ہے کوئی اہم سرکاری آفیسر ہوگا{۱۳۸} جس نے چلتے قافلے کو روک کر پہلے فردِ جرم سنائی، پھر انعام کا اعلان کیا اور اس پر ضمانت بھی قبول کر لی۔

﴿۷۳﴾...... اندازِ گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہی مہمان ہونے کی وجہ سے سرکاری عہدیداروں سے برادرانِ یوسف کا میل ملاپ رہا ہوگا، وہ ان کے عالی نسب ہونے سے بھی آگاہ ہو گئے ہوں گے، عام ملازمین ان کی خدمت اور دیکھ بھال میں خوشی محسوس کرتے ہوں گے، حسد کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک غلط حرکت کا ہو جانا الگ بات ہے ورنہ ان کی عمومی زندگی میں وقار اور سنجیدگی ہوگی، اس لیے انہوں نے چوری کا الزام سننے کے بعد جواب دیا کہ تم گزشتہ سفر میں بھی ہمارے معاملات دیکھ چکے ہو، ہمارے خاندانی پسِ منظر اور مقصدِ سفر سے بھی تم آگاہ ہو، اس لیے تم سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ہم مصر میں نہ فتنہ و فساد کے لیے آئے ہیں اور نہ ہی چوری چکاری ہمارا پیشہ ہے۔

﴿۷۴﴾...... شاہی ملازمین نے پوچھا کہ اگر تم اپنی بات میں جھوٹے ثابت ہوئے تو تم خود ہی بتا دو کہ چور کو کیا سزا دی جائے؟

﴿۷۵﴾...... برادرانِ یوسف نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق جواب دیا کہ جس شخص کے پاس چوری کا مال برآمد ہو، مالک کو حق حاصل ہے کہ اسے اپنا غلام بنا کر رکھ لے۔

﴿۷۶﴾...... سرکاری کارندوں نے اپنے آقا کے حکم کے مطابق سارے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لینے کے بعد آخر میں یہ پیالہ بنیامین کے سامان سے برآمد کر لیا، اس پیالے کی برآمدگی نے سارے بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھکا دیں۔

﴿كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ﴾ اللہ فرما رہے ہیں کہ اس حیلہ سازی میں ہمارے معصوم پیغمبر کو مطعون نہ کیا جائے

{۱۳۸} "وأنا به زعيم"...... الزعيم: رئیس (قرطبی ۹/۱۹۷)

کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کی چاہت پر یہ تدبیر اختیار نہیں کی تھی بلکہ یہ راستہ ہم نے انہیں سکھایا تھا۔

﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ﴾ مصری قانون کے لحاظ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے بنیامین کو گرفتار کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ چور کے بارے میں مصر کا قانون یہ تھا کہ مارنے پیٹنے کے ساتھ اس سے مالِ مسروق کا دوگنا وصول کرلیا جائے {۱۳۹} لیکن چونکہ اللہ کو یہی منظور تھا کہ بنیامین کو مصر میں روک لیا جائے اس لیے خود اس کے سرپرست بھائیوں کی زبان سے یہ نکل گیا کہ ہم میں سے جس کی چوری ثابت ہو جائے، اسے غلام بنا لینے کا آپ کو اختیار ہوگا۔

حکمت و ہدایت:

۱......قدرت حاصل ہونے کے باوجود زیادتی کرنے والے کے ماضی کو فراموش کر دینا اور بدلتے حالات کا خوشدلی سے استقبال کرنا اہلِ ایمان کی شان ہے۔(۶۹)

۲......ایسا حیلہ اختیار کرنا جائز ہے جس سے کوئی شرعی حکم باطل نہ ہوتا ہو۔(۷۰)

۳......کسی مصلحت کی بناء پر توریہ یعنی ذو معنی بات کہنا جائز ہے۔(۷۰)

۴......اگر ظنِ غالب کی بناء پر کسی کو چور کہہ دیا جائے تو اس پر کذب کا اطلاق نہیں ہوگا۔(۷۰)

۵......کفالت بالمال اور کفالت بالنفس دونوں جائز ہیں {۱۴۰} یعنی ملزم کو معین وقت اور جگہ پر حاضر کرنے یا اس کے ذمہ اگر کوئی مالی حق ہو تو اسے ادا کرنے کی ضمانت دینا جائز ہے۔(۷۰)

۶......مالی کفالت کی صورت میں مالک کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو اصل مدیون سے اپنا حق وصول کرے یا ضامن سے، اگر اس نے ضامن سے وصول کیا تو ضامن کو حق حاصل ہوگا کہ جتنا مال اس سے لیا گیا ہے، وہ اصل مدیون سے وصول کرلے۔

۷......کسی مجرم کی گرفتاری یا گمشدہ چیز کی واپسی پر اجرت یا انعام کا اعلان کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔(۷۰)

۸......اللہ تعالیٰ کے معاملات اپنی مخلوق کے ساتھ مختلف ہیں، وہ کسی کو عزت دیتا ہے اور کسی کو ذلیل کرتا ہے، کسی کے درجات بلند کرتا ہے اور کسی کو پستی میں گرا دیتا ہے۔(۷۶)

۹......اس دنیا میں ہر صاحبِ علم سے زیادہ علم والا کوئی نہ کوئی ہے اور سب سے بڑا عالم اللہ ہے، جیسے وہ خود لامحدود ہے اس کا علم بھی لامحدود ہے۔(۷۶)

{۱۳۹} كان حكم الملك في السارق ان يضرب ويغرم ضعفي ماسرق (كبير ۱۸۰۲/۴۸۹)

{۱۴۰} قوله "وأنابه زعيم" أصل في الضمان والكفالة (تفسير القاسمي ۲۵۸/۹)

بنیامین کی گرفتاری پر بھائیوں اور والد کے تأثرات

﴿۷۷......۸۷﴾

قَالُوْٓا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ

کہنے لگے، اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے تب آہستہ سے کہا یوسف نے اپنی جی

یُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا یٰٓاَیُّهَا الْعَزِیْزُ

میں اور ان کو نہ جتایا، کہا جی میں کہ تم بدتر ہو درجہ میں اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو O کہنے لگے اے عزیز! اس کا

اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۷۸﴾

ایک باپ ہے بوڑھا بڑی عمر کا سو رکھ لے ایک کو ہم میں سے اس کی جگہ ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا O

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پکڑیں مگر جس کے پاس پائی ہم نے اپنی چیز تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوئے O پھر جب

اسْتَیْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ۭ قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ

ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو، بولا ان میں بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے تم سے

عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ

عہد اللہ کا؟ اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق میں، سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا اس ملک سے جب تک کہ حکم دے مجھ کو

حَتّٰى یَاْذَنَ لِیْٓ اَبِیْٓ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِیْكُمْ

باپ میرا یا قضیہ چکا دے اللہ میری طرف اور وہ ہے سب سے بہتر چکانے والا O پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے

فَقُوْلُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَیْبِ

باپ! تیرے بیٹے نے تو چوری کی اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو غیب کی بات کا

حٰفِظِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْــَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْٓ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ۭ وَاِنَّا

دھیان نہ تھا O اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے، اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بے شک

لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

سچ کہتے ہیں O بولا کوئی نہیں، بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے شاید اللہ لے آئے میرے پاس

یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ یٰٓاَسَفٰى

ان سب کو وہی ہے خبردار حکمتوں والا O اور الٹا پھرا ان کے پاس سے، اور بولا اے افسوس یوسف پر اور سفید ہو گئیں

عَلٰى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ

آنکھیں اس کی غم سے سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا ○ کہنے لگے قسم اللہ کی تو نہ چھوڑے گا

يُوسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ

یوسف کی یاد کو جب تک کہ گھل جائے یا ہو جائے مردہ ○ بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے

وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ

اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ○ اے بیٹو! جاؤ اور تلاش کرو

يُّوسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا

یوسف کی اور اس کے بھائی کی اور نا امید مت ہو اللہ کے فیض سے بے شک نا امید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی

الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٧﴾

لوگ جو کافر ہیں ○

تسہیل: قافلے والوں نے کہا، اگر بنیامین نے چوری کی ہے تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ اس کا ایک بھائی بھی تھا وہ بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے، یوسف نے ان پر ظاہر کیے بغیر دل ہی دل میں کہا کہ تم بہت برے لوگ ہو اور جو کچھ تم ہم دونوں بھائیوں کے بارے میں کہہ رہے ہو اس کی صحیح حقیقت اللہ ہی جانتا ہے ○ اہلِ کارواں نے درخواست کی کہ اے عزیز! بنیامین کے والد بہت بوڑھے ہیں، وہ اس کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گے، آپ ایسا کیجیے کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نیکوکار انسانوں میں سے ہیں ○ یوسف نے کہا معاذ اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سوا کسی اور کو گرفتار کر لیں جس سے ہمارا سامان برآمد ہوا ہے، اس صورت میں تو ہم بڑے ظالم ہوں گے ○ پھر جب وہ یوسف سے ناامید ہو گئے تو تنہائی میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ ان بھائیوں میں جو سب سے بڑا تھا، اس نے کہا، کیا تم نہیں جانتے کہ والد نے اللہ کی قسم دے کر تم سے عہد لیا ہے؟ اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں بھی تم سخت کوتاہی کر چکے ہو، میں تو یہاں سے اس وقت تک نہ ہلوں گا جب تک میرے والد مجھے واپسی کی اجازت نہ دے دیں یا اللہ ہی میرے لیے کوئی فیصلہ فرما دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ○ جاؤ! اپنے والد کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے، ہم آپ کے سامنے وہی کچھ بیان کرتے ہیں جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ورنہ غیب کا علم تو ہمیں بالکل نہیں ہے ○ اگر ہماری بات پر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ اس بستی والوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم گئے تھے یا اس قافلہ والوں سے

دریافت فرما لیجیے جن کی معیت میں ہم واپس آئے ہیں، یقین جانیے ہم بالکل سچ کہتے ہیں O یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے اپنی طرف سے ایک کہانی بنالی ہے مگر میرے لیے صبر کرنا ہی بہتر ہے، مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ مجھے ان سب سے ملوا دے گا، بلاشبہ وہ علیم اور حکیم ہے O یہ کہہ کر یعقوب علیہ السلام نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور کہنے لگے، ہائے یوسف! اور غم سے روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ دل ہی دل میں گھٹتے رہتے تھے O بیٹے بولے، اللہ کی قسم! آپ تو یوسف ہی کی یاد میں تڑپتے رہیں گے یہاں تک کہ جاں بلب ہو جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے O فرمایا، میں تو اپنے رنج و غم کی شکایت بس اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے O اے میرے بیٹو! جاؤ! یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۷۷﴾...... جونہی بنیامین کے سامان سے کٹورا برآمد ہوا، برادرانِ یوسف کا اندازِ گفتگو بدل گیا، ان کے دل میں موجود جذبۂ حسد باہر آ گیا اور انہوں نے یوں ظاہر کیا گویا ان کا بنیامین سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، کہنے لگے، اگر اس نے چوری کی ہے تو چنداں تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کے حقیقی بھائی نے بھی یہی حرکت کی تھی اور ظاہر ہے بھائیوں کے اخلاق، عادات اور طبیعتوں میں مشابہت تو ہوتی ہے۔

چوری کی جس واردات کا برادرانِ یوسف نے ذکر کیا، اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں (ان میں سے ہر روایت پر کسی نہ کسی انداز میں جرح کی گئی ہے){۱۴۱}

ایک روایت میں اپنے نانا کے ہاں سے سونے کی مورتی غائب کرنے کا ذکر ہے، دوسری روایت میں پھوپھی کی طرف سے پٹکا یوسف کی کمر سے باندھنے کا ذکر ہے۔

﴿قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا﴾ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام بعض مصلحتوں کی وجہ سے فی الحال حقائق سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے اور ویسے بھی آپ جن کریمانہ اخلاق سے متصف تھے وہ آپ کو بھائیوں کو رسوا اور شرمندہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے، اس لیے آپ نے زبان سے تو نہ کہا مگر دل ہی دل میں ضرور کہا کہ "تم بہت برے لوگ ہو" کہ جان بوجھ کر بھائی پر چوری کا الزام لگاتے ہو جبکہ خود تمہارا اپنا حال یہ ہے کہ مال تو مال تم نے انسان چُرا لیا تھا اور

{۱۴۱} علامہ قرطبی اس بارے میں فرماتے ہیں: "الآثار الواردة فی تعیین المسروق یستأنس بها ولا حجّة فیها، لأن مصدرها کتب الأقدمین (دیکھیے قرطبی ۹/۲۰۳ - حاشیہ ۱)

انسان بھی کیسا؟ باپ کا محبوب ترین بیٹا!{۱۴۲}

﴿۷۸﴾...... برادرانِ یوسف نے جب دیکھا کہ بنیامین کے چھوٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اب منت سماجت اور خوشامد پر اتر آئے کہ جناب عالی! اس لڑکے کا باپ بہت بوڑھا ہے، وہ اپنے عزیز لختِ جگر کی گرفتاری کا صدمہ برداشت نہیں کر پائے گا، آپ ایسا کیجیے کہ ہم میں سے کسی کو غلام بنا لیجیے اور اسے وطن واپس جانے کی اجازت دے دیجیے۔

﴿۷۹﴾...... آپ نے فرمایا، کیسی عجیب بات کرتے ہو؟ جرم کسی نے کیا سزا کسی اور کو دوں، یہ تو خود تمہارے اپنے مذہب کے مطابق ظلم ہے، میں اس ظلم کا ارتکاب کیسے کر سکتا ہوں؟

﴿۸۰﴾...... عزیزِ مصر سے مایوس ہونے کے بعد آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے کہ کیا کیا جائے؟ انہیں اپنی وہ قسمیں بھی یاد تھیں جو بنیامین کی بحفاظت واپسی کی بابت اپنے والد کے سامنے کھا چکے تھے اور اپنا وہ ظلم بھی یاد تھا جو یوسف پر بلکہ اس کے ساتھ اپنے والد پر بھی ڈھا چکے تھے، اس لیے ان میں سے جو علم اور عقل کے اعتبار سے{۱۴۳} بڑا تھا اس نے حتمی طور پر اعلان کر دیا کہ جب تک والدِ محترم مجھے وطن آنے کی اجازت نہیں دیں گے یا اللہ تعالیٰ بنیامین کی رہائی کی صورت پیدا نہیں کر دیتا{۱۴۴} میں مصر سے ہرگز نہیں نکلوں گا۔

﴿۸۱﴾...... اپنائیت کی بات کرتے کرتے ان کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نکل ہی جاتا ہے جو اجنبیت اور غیریت کا رنگ لیے ہوتا ہے، یہ صاحب جو ان میں علم اور عقل کے اعتبار سے ممتاز ہیں ذرا ان کا اندازِ گفتگو دیکھیے، فرماتے ہیں جاؤ! والدِ گرامی کی خدمت میں جا کر کہو "آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے" حالانکہ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ ہمارے بھائی سے یہ حرکت ہوگئی ہے۔

﴿۸۲﴾...... برادرانِ یوسف کا ماضی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا، انہیں یاد ہے کہ ہم نے یوسف پر کیا ستم ڈھایا تھا اور پھر اس ستم پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا کہانی گھڑی تھی، انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں بنیامین کے واقعہ کو بھی من گھڑت نہ سمجھ لیا جائے، اس لیے وہ اپنے والد سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر آپ کو ہماری بات پر یقین نہیں ہے تو آپ کسی معتبر آدمی کو بھیج کر مصر سے تصدیق کرا لیجیے یا اس قافلے والوں سے دریافت کر لیجیے جن کے ساتھ ہم نے سفر کیا ہے، اس

{۱۴۲}أنكم سرقتم من أبيكم أحبّ اولاده اليه (المراغی ۱۳/۲۴)

{۱۴۳}"قال كبيرهم"...... فی العقل (روح المعانی ۸،۱۳/۵۱)...... وقيل: كبيرهم فی العقل (كبير ۶،۱۸/۴۹۲)

{۱۴۴} "أويحكم الله لی" ای يحكم لی بخلاص أخی (صفوة التفاسير ۲/۶۳)...... "أويحكم الله لی" فی ردّ أخی (تنوير المقباس/۲۵۶)

زمانے میں یہی رواج تھا کہ بہت سارے لوگ مل کر قافلے کی صورت میں سفر کرتے تھے، ایسا کرنے سے وہ راستے کے خطرات سے محفوظ ہوجاتے تھے۔

نیا صدمہ:

﴿۸۳﴾...... بیٹوں نے والد کی خدمت میں حاضر ہوکر روئیدادِ سفر سنائی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں کے سامنے وہ پورا منظر آ گیا جب یہی بیٹے یوسف کی حفاظت کا وعدہ کر کے اسے جنگل میں اپنے ساتھ لے گئے تھے اور پھر رات گئے آنسوے بہاتے اور ہائے واویلا کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے اور یوسف کی ہلاکت کی ایسی کہانی سنائی تھی جس میں جھول ہی جھول تھے، نہ دل اسے درست مانتا تھا نہ ہی عقل! آج ان کے کان دوسرے محبوب بیٹے کی گرفتاری کی خبر سن رہے تھے اور وہ بھی چوری جیسے قبیح جرم کی پاداش میں، وہ صرف حساس باپ ہی نہ تھے اللہ کے نبی بھی تھے، جس انداز میں انہوں نے تربیت کی تھی اور جس طرح کا بچپن ان کے بیٹے نے گزارا تھا، اس کی بناء پر یہ تصور کرنا بھی ان کے لیے محال تھا کہ بنیامین چوری کرے گا اور وہ بھی دیارِ غیر میں جا کر! اس لیے سنتے ہی فرمادیا، نہیں! بنیامین ایسا نہیں کرسکتا، یہ ایک کہانی ہے جو بنائی گئی ہے، اور اس میں شک ہی کیا ہے کہ یہ کہانی بنائی گئی تھی، یہ الگ بات ہے کہ ان بھائیوں نے نہیں بنائی تھی جو اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے چہرے لٹکا کے بیٹھے تھے بلکہ ان کے بھائی یوسف نے بنائی تھی لیکن اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے بنائی تھی، یوسف کوئی غیر نہ تھے انہی میں سے تھے اگرچہ انہیں خبر نہ تھی، اس لیے یہ اشکال نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ کے نبی نے بغیر کسی ثبوت کے ان پر کیسے الزام لگادیا، ویسے بھی جو بات اجتہاد سے کی جائے اس میں غلطی کا امکان ہوتا ہے{۱۴۵} اگرچہ اجتہاد کرنے والا اللہ کا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، یہ الگ چیز ہے کہ پیغمبر کو اجتہادی خطا پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا اور اللہ کی طرف سے تنبیہ کر کے اس سے ہٹادیا جاتا ہے۔

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اس فقرے کو ہم جملہ بھی بناسکتے ہیں اور جملے کا ایک حصہ بھی، اگر مکمل جملہ بنائیں تو معنیٰ یہ ہوگا کہ صبر کرنا ہی میرے لیے بہتر{۱۴۶} ہے اور اگر اسے جملے کا ایک حصہ بنائیں تو معنیٰ یہ ہوگا کہ صبرِ جمیل میرے لیے بہتر ہے۔{۱۴۷}

"صبرِ جمیل" اس صبر کو کہا جاتا ہے جس میں شکوہ شکایت اور جزع فزع نہ ہو{۱۴۸} دل اللہ کی تقدیر اور فیصلے پر

{۱۴۵} حدیث سے مجتہد کا مخطی ومصیب ہونا ثابت ہے......(دیکھیے ابن ماجہ، کتاب الاحکام/۱۶۷)
{۱۴۶} فشانی صبرجمیل (قرطبی ۲۰۹/۹)
{۱۴۷} فصبرجمیل أولی بی (حوالہ مذکورہ)
{۱۴۸} "فصبرجمیل" ای بلاجزع (تفسیرالقاسمی ۲۶۶/۹)...... صبرجمیل لاجزع فیه ولاشکایة لأحد (المراغی ۲۷/۱۳)

راضی ہو اور یہ یقین ہو کہ اس میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور ہوگی۔

﴿عَسَى اللّٰهُ﴾ ایک طرف جدائی پر صبر ہے تو دوسری طرف اللہ کی طرف سے امید بھی ہے کہ وہ بچھڑے ہوؤں سے ملا دے گا، اللہ کے پیغمبر نے بتا دیا کہ صبر کا مطلب حالات سے مایوسی نہیں، صبر اور امید دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

﴿جَمِيعًا﴾ دل میں تمنا صرف یوسف اور بنیامین کی ملاقات کی نہیں تیسرے بیٹے روبیل کی بھی ہے جو حکمِ الٰہی کے انتظار میں مصر میں رہ پڑا ہے۔

﴿إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ میرا اللہ علیم ہے، وہ جانتا ہے میرے بیٹے کہاں اور کس حال میں ہیں اور ان کی جدائی کے غم میں میرے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ علیم کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے، اس کی طرف سے آنے والی خوشی اور غمی، صحت اور بیماری، وصل اور فراق غرضیکہ ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے۔

﴿۸۴﴾ ...... نئے زخم نے پرانا زخم ہرا کر دیا، بنیامین کی گرفتاری کی خبر نے یوسف کی برسوں پہلے گمشدگی کا سانحہ یاد کرا دیا جسے آپ بھولے ہی کہاں تھے، یہ انسانی فطرت ہے کہ نئی چوٹ سے پرانی چوٹ کی ٹیس زیادہ محسوس ہوتی ہے، بنیامین کی زندگی اور خیریت کی تو پھر بھی اطلاع تھی، یوسف کے بارے میں تو کوئی خبر ہی نہ تھی، ایک دم یوسف بھی یاد آ گئے اور بیٹوں کی غفلت کیشی یا زیادتی بھی، ان سے منہ پھیر کر دوسری جانب کر لیا اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کہہ اٹھے "ہائے یوسف" تڑپا دیا تیری جدائی نے۔

﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ﴾ کثرتِ گریہ سے آنکھیں سفید ہو گئی تھیں اور بینائی جاتی رہی تھی۔

﴿فَهُوَ كَظِيمٌ﴾ دل ہی دل میں کڑھتے اور گھٹتے رہتے تھے، زبان پر نہ شکوہ نہ شکایت، نہ ماتم نہ سینہ کوبی، اپنوں سے جدائی اور ان کی وفات پر حزن والم اور اشک فشانی کسی طرح بھی مقامِ نبوت وولایت کے منافی نہیں {۱۴۹} کیونکہ یہ غیر اختیاری اور فطری چیز ہے، اللہ کے نیک بندے فطری اور بشری تقاضوں سے مبرا نہیں ہوتے، سید الانبیاء ﷺ سے زیادہ نیک کون ہوگا، آپ کے نواسے نے آپ کی گود میں آخری ہچکی لی تو آپ رو پڑے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! آپ ہمیں تو ایسے مواقع پر آہ و بکا سے منع فرماتے ہیں مگر خود آپ رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں تمہیں مطلقاً رونے سے منع نہیں کرتا بلکہ دو احمق آوازوں سے منع کرتا ہوں یعنی خوشی کے وقت گانے بجانے کی آواز سے اور غمی کے وقت ماتم کی آواز سے۔ {۱۵۰}

{۱۴۹} فان قلت کیف جاز لنبی اللہ ...... قلت: الانسان مجبول علیٰ ان لا یملک نفسه عندالشدائد من الحزن (کشاف ۲/۳۶۹)

{۱۵۰} (مستدرک حاکم ۴/۴۰ ...... طبقات ابن سعد ۱/۱۱۰)

اگر مصائب وآلام کے موقع پر اظہار رنج مذموم ہوتا تو قرآن حضرت یعقوب علیہ السلام کے رونے دھونے کا ذکر نہ کرتا۔

﴿۸۵﴾......لڑکوں نے تعجب کے ساتھ کہا، جس میں محبت اور شفقت کا معنیٰ بھی پایا جاتا تھا{۱۵۱} کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ یوسف کو یاد کرتے کرتے آپ ادھ موئے ہو جائیں گے{۱۵۲} بلکہ یہ بھی خطرہ ہے کہ جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

﴿۸۶﴾......والدِ محترم نے جواب دیا کہ میں اپنے دکھ درد کا اظہار مخلوق کے سامنے نہیں بلکہ خالق کے سامنے کرتا ہوں، حوادث اور پریشانیاں بندگانِ رب کو رب کے قریب کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں، دور کرنے کا نہیں، اللہ سے تعلق کو مضبوط کرتی ہیں، کمزور نہیں، مصیبتوں میں وہ اللہ کو اور زیادہ یاد کرتے ہیں۔

﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور ابتلاؤں کی حکمتوں کا جتنا علم مجھے ہے، تمہیں نہیں ہے۔

﴿۸۷﴾......حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے کا خواب یاد تھا اور اس کے سچا ہونے کا یقین بھی تھا، اس لیے بیٹوں کو حکم دیا کہ یوسف کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔

﴿اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ﴾ قرآن کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جزئی واقعات کے ضمن میں اصولی حقیقتوں کو بیان کر دیتا ہے، یہاں بھی ایک اصولی حقیقت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ''مومن کبھی بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔''

حکمت وہدایت:

۱......حسد ایسی بیماری ہے جو انسان کو لگ جائے تو سالہا سال بعد بھی اس کی جان نہیں چھوڑتی۔(۷۷)

۲......انتہائی بردبار انسان بھی بعض اوقات ایسی بات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو عام حالات میں کہنا پسند نہیں کرتا۔(۷۷)

۳......جب کوئی مصیبت سر پر آن پڑے تو رحم طلبی جائز ہے۔(۷۸)

۴......اسلامی شریعت میں بھی بدنی سزا میں مبادلہ جائز نہیں اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے مجرم کے بدلے اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرے تو قاضی کے لیے جائز نہیں کہ اسے قبول کرے۔{۱۵۳}(۷۹)

{۱۵۱} على سبيل الرِّفق به والشفقة عليه (تفسير القاسمي ۲۶۸/۹)
{۱۵۲} أي حتّى تكون مريضًا مشرفا على الهلاك (صفوة التفاسير ۲/۶۴)
{۱۵۳} (تفسیر ماجدی ۲/۶۳۶)

۵......اہم معاملات میں مشورہ کے لیے سرگوشی جائز ہے۔(۸۰)

۶......انسان کو اپنا قول وقرار یاد رکھنا چاہیے اور اس کی پابندی کرنی چاہیے۔(۸۰)

۷......شہادت کا مدار اس علم پر ہے جو حواسِ ظاہرہ سے حاصل ہوتا ہے، خواہ علم کسی بھی طریقے سے حاصل ہو، آنکھوں سے دیکھ کر یا کانوں سے سن کر، چنانچہ بعض معاملات میں نابینا، گونگے اور بہرے کی شہادت بھی جائز ہے، شہادت کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ صاحب معاملہ نے اسے گواہ بنایا ہو بلکہ جسے کسی بھی ذریعے سے علم حاصل ہو جائے اس کے لیے گواہی دینا جائز ہے، قرآنِ کریم میں ہے:

﴿إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾{۱۵۴} ''ہاں البتہ جن لوگوں نے حق بات کی گواہی دی ہو اور انہیں اس کا علم بھی ہو۔''

صحیح مسلم میں زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تمہیں بہترین گواہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ سب سے بہترین گواہ وہ ہے جو طلب کیے جانے کے بغیر گواہی دے۔''{۱۵۵}

ایک دوسری حدیث میں اس قسم کے گواہوں کی مذمت کی گئی ہے{۱۵۶} دونوں میں فرق یہ ہے کہ مذمت ان گواہوں کی ہے جو جھوٹی گواہی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں جبکہ تعریف ان گواہوں کی ہے جو کسی کا حق ڈوبنے سے بچانے کے لیے سچی گواہی دیتے ہیں۔(۸۱)

۸......اگر بے گناہ شخص کو کسی الزام کا سامنا ہو تو اسے چاہیے کہ اشتباہ کو دور کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کردے، جیسا کہ برادرانِ یوسف نے اپنے والد سے درخواست کی کہ آپ بنیامین کا واقعہ اہلِ مصر سے بھی پوچھ سکتے ہیں اور ہمارے قافلے کے شرکاء سے بھی۔(۸۲)

۹......ناموافق حالات میں مسلمان کو صبرِ جمیل کرنا چاہیے یعنی ایسا صبر جس میں مخلوق کے سامنے جزع فزع اور شکوہ وشکایت نہ ہو، فریاد ہو تو اللہ سے اور رونا دھونا ہو تو اسی کے سامنے۔

۱۰......یوسف کی گمشدگی ہو یا بنیامین کی گرفتاری، دونوں مواقع پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا''فصبر جمیل''. البتہ پہلے حادثہ کے موقع پر فرمایا:

{۱۵۴}(الزخرف ۴۳/۸۶)

{۱۵۵}(مسلم ۲، کتاب الاقضیة/۷۷)

{۱۵۶}ثم یجیء أقوام تسبق شهادة أحدهم یمینه ویمینه شهادته (بخاری ۱، کتاب الشهادات/۳۶۲)

﴿وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ ''اور اللہ ہی سے مدد مانگی جاتی ہے اس پر جو کچھ تم بیان کرتے ہو۔''

اور دوسرے حادثہ کی اطلاع سن کر فرمایا:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا﴾ ''امید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملوادے گا۔''

ایسا لگتا ہے کہ پہلے واقعہ میں آپ کو اللہ کی طرف سے بتادیا گیا تھا کہ شبِ فراق طویل ہوگی اس لیے آپ اللہ کی مدد کے طلبگار رہوئے اور دوسرے واقعہ میں ایسے اشارات ملے ہوں گے جن سے آپ نے جان لیا کہ وصال کی گھڑی اب زیادہ دور نہیں۔(۸۳)

۱۱......حوادث وآلام میں رنج وغم کا ہونا اور اشک فشانی، نہ صبر کے منافی ہے اور نہ ولایت ونبوت کے۔(۸۴) ہمارے آقا ﷺ نے بیٹے کی وفات پر فرمایا تھا:

﴿تدمع العين ويحزن القلب ولانقول ما يسخط الرب﴾{۱۵۷} ''آنکھیں اشک فشاں ہیں، دل غمگین ہے مگر ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جو رب کو ناراض کردے۔''

اللہ کو ناراض کرنے والی بات کونسی ہے؟ قضاوقدر پر اعتراض، چہرہ پیٹنا، گریباں پھاڑنا اور جاہلیت والی آوازیں نکالنا۔

۱۲......محبتِ طبعی، محبتِ حق کے منافی نہیں، اس کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے اور کاملین میں محبتِ طبعی کا غلبہ انہیں رضائے حق سے غافل نہیں کرتا بلکہ اس تعلّق کو اور مضبوط کردیتا ہے۔{۱۵۸}

۱۳......مصیبت اور پریشانی میں بعض لوگ خالق کے سامنے شکایت کرتے ہیں اور بعض خلق کے سامنے، خالق کے سامنے شکایت محمود ہے اور مخلوق کے سامنے شکایت مذموم!

۱۴......ناامیدی کبیرہ گناہ ہے، مومن کسی حال میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا۔(۸۷)

افشائے راز

﴿۸۸......۹۳﴾

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے اے عزیز! پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور لائے ہیں

{۱۵۷} (ابن ماجه، ابواب ماجاء فی الجنائز/۱۱۴)

{۱۵۸} (بیان القرآن، حصه اوّل، جلد۵/۹۲)

مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۞ قَالَ

ہم پونجی ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر اللہ بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو ۞ کہا

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۞ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ

کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے اور اس کے بھائی سے جب تم کو سمجھ نہ تھی؟ ۞ بولے کیا سچ، تو ہی ہے یوسف؟ یوسف نے کہا

يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ

میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا

تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا ۞ بولے قسم اللہ کی، البتہ پسند کر لیا تجھ کو اللہ نے ہم سے

وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــِٕيْنَ ۞ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ

اور ہم تھے چوکنے والے ۞ کہا کچھ الزام نہیں تم پر آج، بخشے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے

الرّٰحِمِيْنَ ۞ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ

مہربان ۞ لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا،

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞ ع

اور لے آؤ میرے پاس گھر اپنا سارا ۞

تسہیل: جب وہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو کہنے لگے، اے عزیز! قحط کی وجہ سے ہم اور ہمارے گھر والے تکلیف میں ہیں، ناداری کی وجہ سے معقول رقم کا انتظام بھی ہم نہیں کر سکے اور نکمی پونجی لے کر آئے ہیں لیکن آپ غلہ پورا دیجیے گا اور ہمارے معاملے میں چشم پوشی سے کام لیجیے گا، بے شک اللہ چشم پوشی کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیتا ہے ۞ عزیزِ مصر نے کہا، تمہیں کچھ یاد بھی ہے کہ تم نے نادانی میں یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ۞ وہ بول اٹھے، ارے! کیا سچ مچ تم یوسف ہی ہو؟ فرمایا، ہاں! میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم پر اللہ نے بڑا ہی احسان کیا ہے، واقعی جو شخص تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا ۞ وہ بولے، اللہ کی قسم! اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت عطا کی ہے اور بے شک ہم ہی غلطی پر تھے ۞ یوسف نے کہا، نہیں! آج میری طرف سے تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے ۞ جاؤ! تم میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے والدِ گرامی کے چہرے پر ڈال دو تا کہ ان کی بینائی لوٹ آئے اور اپنے سارے گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ ۞

﴿تفسیر﴾

﴿۸۸﴾...... برادرانِ یوسف تیسری بار مصر پہنچ کر عزیزِ مصر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اب کی بار ان کے لہجے میں رحم طلبی اور عاجزی غالب تھی، اپنے اہل وعیال کی پریشانی، ناداری اور غربت کا اس انداز میں ذکر کیا کہ کوئی دوسرا بھی ہوتا تو اس کا دل پسیج جاتا جبکہ ان کی مخاطب وہ شخصیت تھی جو اللہ کے نبی بھی تھے اور ان کے حقیقی بھائی بھی، آپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

﴿۸۹﴾......اس تاثر نے انہیں اپنی شخصیت پر پڑا ہوا پردہ اٹھانے پر مجبور کردیا، مگر اس کے لیے آپ نے ایسا باوقار طریقہ اختیار کیا کہ بھائیوں کی تذلیل نہ ہو، پہلے ان سے ان زیادتیوں کے بارے میں سوال کیا جو ان سے ہو چکی تھیں پھر خود ہی ان کی طرف سے ایک قسم کا عذر بھی ذکر کردیا یعنی یہ کہ تم سے جو کچھ ہوا وہ نادانی اور جہالت میں ہوا۔

﴿۹۰﴾......عزیزِ مصر کی صورت میں تخت آرا ہونے والے یوسف کی بھولی بسری دلکش صورت، اپنے ساتھ غیر معمولی برتاؤ اور بنیامین کی طرف واضح جھکاؤ دیکھ کر یہ خیال...... اگرچہ کمزور درجہ ہی میں سہی......ان کے دل میں آیا تو ہوگا کہ کہیں یہ یوسف ہی تو نہیں؟ مگر کنعان کے کنویں اور مصر کے تاج وتخت کے درمیان وسیع وعریض خلیج کا تصور کر کے وہ اس خیال کو جھٹک دیتے ہوں گے لیکن اب تو کوئی ہلکا سا خِفاء بھی باقی نہیں رہ گیا تھا چنانچہ وہ بے ساختہ 'دل' پڑے، ارے! کیا سچ مچ تم یوسف ہی ہو؟

﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ﴾ اللہ اللہ! کیا انوکھا اور منفرد اسلوب ہے قصہ بیان کرنے کا، ایسا نہیں کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اختتام پر چند عبرتیں اور نصیحتیں بیان کردی گئی ہوں بلکہ موقع بہ موقع واقعہ کی جزئیات کے ساتھ ساتھ اصول اور کلیات بھی بیان ہو رہے ہیں، اللہ کا نبی فرما رہا ہے کہ احسانِ باری تعالیٰ کا یہ معاملہ صرف میرے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو لوگ بھی صبر اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان سب کو اجر وثواب سے ضرور نوازا جاتا ہے۔

﴿۹۱﴾......انکشافِ حقیقت کے بعد بھائیوں نے نمعلوم کیا کچھ کہا ہوگا مگر قرآن نے ان کی تقریر کو جن مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے، ان الفاظ میں اعترافِ جرم، ندامت، عاجزی اور معذرت سبھی کچھ ہے اور وہ بھی ان بھائیوں کی زبان سے جو عمر میں بڑے ہیں اور ماضی میں چھوٹے بھائی کو حسد، مار پٹائی اور نفرت کا نشانہ بناتے رہے ہیں...... عجب منظر ہوگا جب ان کے سر ندامت سے جھک گئے ہوں گے اور ان کی زبان پر معافی کے بول ہوں گے۔

﴿۹۲﴾...... کیسے ممکن تھا کہ بھائی معافی مانگتے اور اللہ کا نبی انہیں معاف نہ کردیتا، یہ آپ کے اخلاقِ کریمانہ کے خلاف تھا، آپ نے اس طرح معاف کیا کہ نہ طعنہ دیا اور نہ ہی ان کے جرائم گنوائے۔

یہی وہ آیتِ کریمہ ہے جو ہمارے آقا ﷺ نے اس وقت پڑھی تھی جب آپ مکّہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے اور قریش آپ کے سامنے حرم میں صف بستہ کھڑے اپنی قسمت کا انتظار کررہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

﴿لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء﴾{۱۵۹} ''آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو۔''

﴿۹۳﴾......حضرت یعقوب علیہ السلام کی دل کی آنکھیں روشن تر تھیں البتہ ظاہری بصارت کثرتِ گریہ سے متاثر ہوگئی تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص یہ کہتے ہوئے دی کہ والدِ محترم کے چہرے پر ڈال دینا، اس سے ان کی بینائی واپس آجائے گی، شدّتِ مسرّت سے بینائی کی واپسی عجیب تو ہے مگر ناممکن نہیں، غم ہو یا خوشی، ان کی شدّت کبھی کبھی عجائب کو جنم دیتی ہے، کوئی ظاہری سبب نہ بھی ہو تو بھی اللہ کی قدرت میں کونسی چیز محال ہے؟ اس میں شک ہی کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کیا اور فرمایا، وہ اللہ کے حکم ہی سے کیا اور فرمایا ہوگا۔

حکمت و ہدایت:

۱......ویسے تو حتی الامکان نہ تو انسانوں سے سوال کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنی مصیبت اور پریشانی کا اظہار کرنا چاہیے لیکن مجبوری کی بناء پر ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہوجاتا ہے{۱۶۰} خصوصاً جبکہ جان یا عزت وآبرو خطرے میں ہو۔(۸۸)

۲......صدقہ کے طور پر اپنے حق سے زائد طلب کرنا جائز ہے، باقی رہا یہ سوال کہ انبیاء کی اولاد کے لیے صدقہ کیسے حلال ہوگیا؟ تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں صدقہ رعایت کے معنی میں ہے{۱۶۱} کیونکہ مفت کا سوال تو انہوں نے کیا ہی نہیں تھا، وہ پونجی لے کر آئے تھے مگر چونکہ وہ معیار اور مقدار میں کم تر تھی، اس لیے انہوں نے عزیزِ مصر سے چشم پوشی اور رعایت کی درخواست کی تھی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کی آل کے علاوہ کسی دوسرے نبی پر صدقہ حرام نہیں تھا، ابنِ جریر نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت سفیان بن عیینہ سے سوال کیا گیا کہ نبی ﷺ سے پہلے بھی کسی نبی پر صدقہ حرام کیا گیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا، کیا تم نے یہ ارشادِ باری تعالیٰ نہیں سُنا؟

{۱۵۹} (بحوالہ الرحیق المختوم/۳۴۸، صفی الرحمن مبارکپوری، دارالبیان العربی)

{۱۶۰} (تفسیر منیر ۵۸/۱۳)

{۱۶۱} وقدجاءت الصدقة بمعنی التفضّل......(روح المعانی ۶۷/۱۳،۸)

﴿فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ﴾{۱۶۲} ''ہمیں پورا پورا ناپ کردو اور ہمارے اوپر صدقہ کرو، بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔'' (۸۸)

۳......علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، دعا میں یہ کہنا جائز نہیں ''اللّٰھم تصدّق علیّ'' کیونکہ صدقہ کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے جو اجر و ثواب کی امید رکھتا ہو جبکہ اللہ تعالیٰ تو ثواب دیتا ہے کسی سے حصولِ ثواب کی امید نہیں رکھتا۔{۱۶۳} (۸۸) مگر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے کیونکہ ایک حدیث میں خود نبی کریم ﷺ نے صدقہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿صدقة تصدّق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته﴾{۱۶۴} ''سفر میں قصر کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ایک صدقہ ہے پس تم اس کے صدقہ کو قبول کرلو۔''

جہاں صدقہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی وہاں یہ رعایت، نرمی اور چشم پوشی کے معنی میں ہوگا۔{۱۶۵}

۴......صدقہ ایسا عمل ہے جس کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی، حتّٰی کہ کفار کو بھی یکسر محروم نہیں رکھا جاتا، یہ فرق ضرور ہے کہ دنیا کا بدلہ ردِّ بلاء اور دفعِ مصائب کی صورت میں ہر کسی کو ملتا ہے مگر جنت کی صورت میں آخرت کا بدلہ صرف اہلِ ایمان کو ملے گا۔ (۸۸)

۵......ہر معصیت جہالت سے سرزد ہوتی ہے{۱۶۶} وہ عالم جو علم کے تقاضوں پر عمل نہ کرے، اسے بھی جاہل ہی کہا جائے گا۔{۱۶۷} (۸۹) عالم بھی، جاہل بھی، حیرت ہے حیرت!

۶......تقوٰی اور صبر یعنی گناہوں سے بچنا اور آزمائشوں میں ثابت قدمی، انسان کو مشکلات سے نکال دیتی ہے۔ (۹۰)

۷......حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے صبر و تقوٰی کا ذکر بطور فخر نہیں بلکہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کیا تھا کہ اوّل اس نے ہمیں صبر و تقوٰی کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعہ تمام نعمتیں عطا فرمائیں۔

۸......انبیائے کرام علیہم السلام اخلاقِ کریمانہ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں، ستم ڈھانے والوں کو قدرت کے باوجود معاف کردیتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے اعتراف جرم اور معذرت طلبی کے جواب

{۱۶۲} (ابن جریر بحوالہ منیر ۵۸/۱۳)
{۱۶۳} (قرطبی ۲۱۷/۹)
{۱۶۴} (مسلم ۱، کتاب صلوٰۃ المسافرین/۲۴۱)
{۱۶۵} (روح المعانی ۶۷/۱۳،۸)
{۱۶۶} قال بعض السلف: کل من عصی اللہ فھو جاھل (ابن کثیر ۶۳۵/۲)
{۱۶۷} لمالم یفعلوا ماتقتضیه العلم ولا یقدم علیه الا جاھل سمّاھم "جاھلین" (کشاف ۴۷۲/۲)

میں "لاتثریب" فرمایا، عربی زبان میں "تثریب" کا معنی ہے اس پتلی باریک چربی کو زائل کردینا جو انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔{۱۶۸}

اردو میں "لاتثریب" کا معنی کیا جاتا ہے "تم پر کوئی الزام نہیں" مگر یہ ترجمہ ان الفاظ کی پوری حقیقت نہیں کھولتا، اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ نہ تمہیں ملامت کی جائے گی نہ تمہاری زیادتیاں یاد کرا کر تمہیں شرمندہ کروں گا، نہ دل میں تمہارے لیے بغض اور حسد رکھوں گا اور نہ ہی تم سے انتقام لوں گا۔

ہم یقیناً اختلاف کر سکتے ہیں حضرت عطاء خراسانی رحمہ اللہ سے مگر عجیب نکتہ انہوں نے اس مقام پر بیان کیا ہے، فرماتے ہیں بوڑھوں سے معذرت طلبی کے مقابلہ میں نوجوانوں سے معذرت طلب کرنا آسان ہے، حضرت یوسف علیہ السلام سے بھائیوں نے معافی مانگی تو انہوں نے فوراً کہہ دیا: "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ" لیکن جب انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے معافی مانگی تو انہوں نے فرمایا: "سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي" (میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت طلب کروں گا۔){۱۶۹}

۹......بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی شدید مسرّت کی وجہ سے لوٹ آئی تھی، خوشی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ روح توانا ہو جاتی ہے بلکہ ظاہری اعضاء میں بھی طاقت آ جاتی ہے، طب اس نظریے کی تائید کرتی ہے۔ جبکہ دوسرے حضرات اسے معجزہ قرار دیتے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اصل میں یہ وہ قمیص تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت پہنائی تھی جب انہیں آتش نمرود میں ڈالا گیا تھا، پھر یہ قمیص حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ملی، ان سے حضرت یعقوب اور ان سے حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچی، چونکہ اسے جنت سے لایا گیا تھا، اس لیے اس کے اندر یہ خصوصیت تھی کہ اسے جس بیمار پر ڈالا جاتا تھا وہ تندرست ہو جاتا تھا۔{۱۷۰}

۱۰......خاندانی نظام اور خاندان سے محبت، انسانی فطرت ہی نہیں تعلیماتِ نبوت کے بھی مطابق ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف اپنے والدین ہی کو نہیں پورے خاندان کو اپنے پاس لانے کا حکم دیا جو کہ خاصا وسیع ہو چکا تھا۔

بائبل کے بیان کے مطابق بیٹے، بہویں، پوتے اور پوتیاں سب ملا کر ستر نفوس تھے، توریت میں ہے:

{۱۶۸} ولا یعرف من لفظه الا قولهم الثرب وهو شحمة رقيقة (المفردات/۷۹)

{۱۶۹} (التفسیر المنیر ۱۳/۶۱)

{۱۷۰} (قرطبی ۹/۲۲۰)

''اور وہ سب ستر نفوس تھے...... اور یوسف اپنی گاڑی پر اپنے باپ اسرائیل کے استقبال کے لیے جوشن کی سرزمین کو گیا۔''{۱۷۱}

یوسف کی خوشبو

﴿۹۴......۹۸﴾

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

اور جب جدا جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ نے میں پاتا ہوں بو یوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو بوڑھا بہک گیا O

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰی

لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے O پھر جب پہنچا خوشخبری والا ڈالا اس نے

وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

وہ کرتہ اس کے منہ پر پھر لوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا، بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے؟ O

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ

بولے اے باپ! بخشوا ہمارے گناہوں کو بے شک ہم تھے چوکنے والے O کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو

رَبِّیْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

اپنے رب سے وہی ہے بخشنے والا مہربان O

تسھیل: اور جب قافلہ مصر سے چلا تو ان کے والد نے ان سے کہا کہ اگر تم مجھے خبطی قرار نہ دو تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے O حاضرینِ مجلس نے کہا، اللہ کی قسم! آپ اب تک اپنے پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں O جب خوشخبری دینے والا آ گیا تو اس نے آتے ہی وہ کرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا جس سے ان کی بینائی بحال ہو گئی تو انہوں نے فرمایا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟ O اس وقت بیٹوں نے درخواست کی کہ اے ہمارے والد! اللہ سے ہمارے گناہوں کی مغفرت کی دعا کیجیے، بلاشبہ ہم خطاوار تھے O یعقوب نے کہا، عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش کی دعا مانگوں گا، بے شک وہ غفور رحیم ہے O

{۱۷۱} (تکوین باب ۴۶: ۲۷-۲۹/ص ۵۸)

﴿تفسیر﴾

﴿۹۴﴾...... جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے گمشدہ لختِ جگر کی خوشبو محسوس ہونے لگی، یہ احساس مشیتِ الٰہیہ کا نتیجہ تھا، جب آپ کنعان کے کنویں میں تھے، اللہ کو ملاقات منظور نہ تھی اس لیے بہت قریب ہونے کے باوجود والد کو پتہ نہ چل سکا لیکن جب اللہ نے اپنے بندے کو اچھی طرح آزمالیا اور باپ بیٹے کی ملاقات کا فیصلہ فرمادیا تو سینکڑوں میل کی مسافت سے پیراہنِ یوسفی کی خوشبو محسوس ہوگئی، ظاہری طور پر اس میں آپ کی ذکاوتِ حس کا بھی دخل تھا، شدّتِ توجہ میں عام آدمی کے حواس کی قوت میں بھی بہت اضافہ ہوجاتا ہے جبکہ حضراتِ انبیاء کے حواس عام انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوی ہوتے ہیں، دونوں قسم کی صورتحال کے لیے فارسی کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم ...... گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کبھی تو میں بلندیوں پر ہوتا ہوں اور دیکھ لیتا ہوں اور کبھی اپنے پاؤں کی پشت پر پڑی ہوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔

دوسرا شعر کچھ یوں ہے۔

فلسفی کہ او منکرِ جنانہ است ...... از حواسِ انبیاء بیگانہ است

وہ فلسفی جو کہ جنّت کا منکر ہے، انبیاء کے حواس سے بیگانہ ہے۔

﴿۹۵﴾...... حاضرینِ مجلس نے کہا، اللہ کی قسم! یوسف کے زندہ ہونے کے بارے میں آپ کا وہم کبھی ختم نہیں ہوگا جبکہ وہ ختم ہوچکا اور اس سے ملاقات ناممکنات میں سے ہے۔

﴿۹۶﴾...... جب وہ خوشخبری دینے والا آپہنچا...... کہا گیا کہ اس سے مراد یہوذا ابن یعقوب ہے {۱۷۲} اسی کو سب سے زیادہ اس بات کا احساس تھا کہ ہم نے والد کو ناحق پریشان کیا ہے اور وہ اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔

﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ﴾ فرمایا: ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟'' رحمتِ باری تعالیٰ پر اٹل یقین اور مختلف قرائن کی بناء پر آپ یوسف سے ملاقات کی جو امید لگائے بیٹھے تھے، اس جملے میں اس امید کے بر آنے پر اظہارِ مسرّت بھی ہے اور بیٹوں کو یہ تعلیم بھی کہ صرف ظاہری حالات پر نظر نہ رکھا کرو، ان ظاہری حالات میں جو مخفی امکانات ہیں، ان پر ایمان رکھنا بھی ضروری ہے۔

{۱۷۲} قال جمهور المفسرين، البشير هو يهوذا (كبير ۶، ۱۸/ ۵۰۸)

توریت میں یہ جزء یوں مذکور ہے:

''اور یوسف اپنی گاڑی پر اپنے باپ اسرائیل کے استقبال کے لیے جوشن کی سرزمین کو گیا...... تب اسرائیل نے یوسف سے کہا، اب موت کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں نے تیرا منہ دیکھا۔''{۱۷۳}

﴿۹۷﴾...... حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت لوٹ آئی، قافلہ بھی مصر سے کنعان پہنچ گیا۔ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی، برادرانِ یوسف سے غلطیاں تو ہوئیں مگر وہ بہرحال خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے تھے، اللہ کے برگزیدہ بندے کے سائے میں بچپن بھی گزارا تھا اور جوانی بھی، اس کے پاکیزہ اثرات سے کیسے محروم رہ سکتے تھے؟ پوری طرح ادب واحترام کا لحاظ کرتے ہوئے عرض کیا، ہم اپنی حرکتوں پر نادم ہیں، خود بھی معاف کر دیجیے اور اللہ تعالیٰ سے بھی ہمارے لیے مغفرت طلب کیجیے۔

﴿۹۸﴾...... حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے بلکہ فرمایا کہ کسی مناسب موقع اور مقام پر تمہارے لیے دعا کروں گا، بعض روایات میں ہے کہ آپ کو وقتِ تہجد کا انتظار تھا کیونکہ وہ سب سے افضل وقت ہے اس وقت کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔{۱۷۴}

حکمت وہدایت:

۱...... انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاتھوں مختلف معجزات ظاہر ہوتے رہتے تھے، سینکڑوں میل کی مسافت سے یوسف کی خوشبو محسوس کر لینے اور بینائی کے واپس آ جانے کی اگرچہ ظاہری توجیہ بھی کی گئی ہے مگر زیادہ تر علماء نے اسے معجزہ قرار دیا ہے، معجزہ اگرچہ نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ اللہ کا فعل ہوتا ہے۔

۲...... کہا جاتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بشارت سنانے والے کو انعام دینا چاہتے تھے مگر آپ کے پاس کچھ تھا ہی نہیں تو آپ نے یہ دعا دینے پر اکتفا کیا:

﴿هون الله عليك سكرات الموت﴾{۱۷۵} ''اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر موت کی سختی آسان کردے۔''

لیکن یہ حقیقت میں بہت بڑا انعام تھا۔ ایمان پر خاتمہ اور جان کنی میں آسانی سے بڑھ کر کونسی نعمت ہو سکتی ہے؟

{۱۷۳} (تکوین باب ۴۵: ۲۹-۳۰/ص ۵۷)

{۱۷۴} قال ابن عباس رضی الله عنهما والأكثرون: أراد ان يستغفرلهم في وقت السحر لان هذا الوقت أوفق الأوقات لرجاء الإجابة (كبير ۱۸،۶/ ۵۰۸-۵۰۹)

{۱۷۵} (قرطبی ۹/ ۲۲۲)

اس واقعہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ بشارت دینے والے کو انعام دینا چاہیے، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو جب قبولِ توبہ کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے یہ عظیم خوشخبری سنانے والے کو اپنے کپڑے اتار کر دے دیے تھے{۱۷۶} کیونکہ ان کے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں۔

عام حالات میں بھی کسی نعمت کے عطا ہونے پر بچوں میں شیرینی تقسیم کر کے یا احباب اور اقارب کی دعوت کر کے اظہارِ مسرّت جائز ہے، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب سورہ بقرہ حفظ کر لی تو انہوں نے اس خوشی میں اونٹ ذبح کیا تھا...... اگرچہ تفصیل کا موقع نہیں مگر یہ وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین خالی الفاظ حفظ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تمام مضامین اور مطالب کے ساتھ قرآن یاد کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ پڑھتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

معافی تلافی کیسے؟

۳...... اگر ہمارے ہاتھ، زبان، عمل یا رویے سے کسی مسلمان کو تکلیف پہنچی ہو یا اس کا کوئی حق ہمارے ذمہ ہو تو ہم پر لازم ہے کہ اس کا حق ادا کر دیں یا اس سے صراحۃً معاف کروائیں، بعض لوگوں نے کسی کا مالی حق دبا رکھا ہوتا ہے، اگر خوفِ خدا غالب آئے تو یوں کہہ دیتے ہیں کہ ”بھائی اگر ہم سے کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا“ اس صورت میں اگر صاحبِ حق نے معاف کر بھی دیا تو معاف نہیں ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿قال رسول الله ﷺ: من كانت له مظلمة لأخيه من عرضه أوشي فليتحلّله منه اليوم قبل أن لا يكون دينار ولادرهم، إن كان له عملٌ صالح أخذ منه بقدر مظلمته وان لم تكن له حسنات أخذ من سيّات صاحبه فحمل عليه﴾{۱۷۷}

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے اپنے کسی بھائی کی عزت کو داغدار کر کے یا کسی دوسرے طریقے سے اس پر ظلم کیا ہو تو اسے چاہیے کہ صاحبِ حق کا حق ادا کر دے یا معاف کروالے، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جب اس کے پاس نہ دینار ہوگا نہ درہم، اگر اس کے پاس اعمالِ صالحہ ہوں گے تو وہ لے کر مظلوم کو دے دیئے جائیں گے اور اگر اعمالِ صالحہ نہ ہوئے تو مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔“

{۱۷۶} حضرت کعب فرماتے ہیں: ”فلمّا جاء نی الذی سمعت صوته یبشرّنی نزعت له ثوبیّ فکسوتهما ببشارته (مسلم ۲، کتاب التوبة/۳۶۲)

{۱۷۷} (بخاری ۱، کتاب المظالم/۳۳۱)

۴...... جب برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی مانگی تو انہوں نے بلاتوقف معاف فرمادیا جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں بعد میں تمہارے لیے دعائے مغفرت کروں گا، علماء نے اس کے کئی اسباب لکھے ہیں.

پہلا سبب یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی حیثیت مربی کی سی تھی، آپ چاہتے تھے کہ انہیں اچھی طرح اپنی غلطی کا احساس ہوجائے۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ ان کی زیادتی بالواسطہ تھی جبکہ یوسف اور بنیامین کے ساتھ بلاواسطہ تھی، اسی لیے اصل میں معاف کرنے کا حق انہیں کو تھا جن پر زیادتی ہوئی تھی۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ ان کا گناہ اتنا بڑا تھا کہ محض طلبِ دعا سے معاف نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اس کے لیے خود توبہ کرنا ضروری تھا اور ان کے والدِ بزرگوار یہی چاہتے تھے۔

چوتھا سبب یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس مقام پر تھے کہ اگر وہ چاہتے تو بھائیوں سے انتقام لے سکتے تھے، ممکن ہے بھائیوں کو بھی اس کا اندیشہ ہو، اس لیے انہوں نے فوری طور پر معاف کرتے ہوئے انہیں مطمئن کرنا ضروری سمجھا۔{۱۷۸}

۵......اولادِ یعقوب نے دعا کی درخواست کرتے ہوئے اپنے گناہوں کا تو ذکر کیا مگر ''رب'' کا ذکر نہیں کیا، ایسا لگتا ہے کہ ان پر اپنے گناہوں کی فکر اور اللہ کی پکڑ کا احساس غالب تھا جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظر رحمتِ باری تعالیٰ پر تھی، وہ جانتے تھے کہ گناہ کتنے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں، سچے دل سے توبہ کی جائے تو معاف ہوجاتے ہیں اس لیے آپ نے ''رب'' کا ذکر تو کیا مگر گناہوں کا ذکر نہیں کیا۔{۱۷۹}

خواب کی تعبیر

﴿۹۹......۱۰۱﴾

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس، جگہ دی اپنے پاس اپنے ماں باپ کو اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دل جمعی سے ٥

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ

اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے سجدہ میں اور کہا اے باپ! یہ بیان ہے میرے

{۱۷۸} (المراغی ۱۳/۴۰-۴۱)
{۱۷۹} (تفسیر القاسمی ۲۷۸/۹)

مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ۖ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ

اس پہلے خواب کا اس کو میرے رب نے سچ کر دیا اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا

بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ۭ اِنَّ رَبِّیْ

گاؤں سے بعد اس کے کہ جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں، میرا رب تدبیر سے کرتا ہے

لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ

جو چاہتا ہے، بے شک وہی ہے خبردار حکمت والا O اے رب! تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا مجھ کو

مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

کچھ پھیرنا باتوں کا، اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں O

تسہیل: پھر جب یوسف کے خاندان کے سارے افراد ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور ان سب سے کہا کہ مصر میں داخل ہو جاؤ، اگر اللہ نے چاہا تو یہاں تمہیں امن حاصل رہے گا O مصر میں داخل ہونے کے بعد یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب یوسف کے سامنے سجدے میں گر پڑے، اس موقع پر یوسف نے عرض کیا، اے میرے والدِ گرامی! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچ کر دکھایا، اس وقت بھی اسی نے مجھ پر کرم کیا تھا جب اس نے مجھے جیل سے نکالا اور تم سب کو گاؤں سے اٹھا کر یہاں لے آیا، یہ سب کچھ اس فساد کے بعد ہوا جو شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان ڈال دیا تھا، بے شک میرا رب جو کچھ کرنا چاہتا ہے اسے انجام تک پہنچانے کے لیے لطیف تدبیر کرتا ہے، بلاشبہ وہ علیم اور حکیم ہے O پھر یوسف نے اللہ سے دعا کی، اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بھی عطا کی اور باتوں کی حقیقت تک پہنچنے کا ملکہ بھی عطا فرمایا، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، مجھے اسلام کی حالت میں موت دینا اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمالینا O

تفسیر

﴿۹۹﴾...... جب حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا سارا خاندان اس جگہ پر پہنچے جہاں حضرت یوسف علیہ السلام اپنے اعوان وانصار کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے، تو برسوں کی جدائی کے بعد ملاقات کے عجیب مناظر دیکھنے

میں آئے، توریت میں ہے:

''اور یوسف اپنے باپ اسرائیل کے استقبال کے لیے جوشن کو چلا اور جب اس نے اسے دیکھا تو اس کے گلے سے لپٹا اور دیر تک روتا رہا۔''{۱۸۰}

﴿اَبَوَیۡهِ﴾ حضرت کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، ان کے انتقال کے بعد یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خالہ سے شادی کر لی تھی، چونکہ خالہ پر بھی ماں کا اطلاق ہوتا ہے، اس لیے یہاں ''والدین'' کی تعبیر اختیار کی گئی{۱۸۱}، جبکہ ظاہرِ آیت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ آپ کی والدہ زندہ تھیں اور مصر تشریف لائی تھیں۔{۱۸۲}

﴿۱۰۰﴾...... بہت بڑے ہجوم کے ساتھ مصر سے باہر نکل کر اپنے خاندان کا استقبال کرتے ہوئے آپ انہیں شہر میں لے کر آئے اور پھر اپنے والدین کا اکرام کرتے ہوئے آپ نے انہیں تخت پر بٹھایا، پھر یہ ہوا کہ یہ سب لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

اللہ کے ماسوا کے سامنے انہوں نے سجدہ کیوں کیا؟ ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ پہلی امتوں میں غیر اللہ کے سامنے سجدۂ تعظیمی جائز تھا۔{۱۸۳}

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سجدہ نہیں تھا بلکہ محض زمین بوسی یا جھکاؤ تھا اور اس پر بھی سجدہ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔{۱۸۴}

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ سجدہ اللہ کے سامنے تھا{۱۸۵} مگر اس کا سبب بنے تھے حضرت یوسف علیہ السلام! انہیں پا کر اور وہ بھی عزت کے ناقابلِ یقین مقام پر، سارے خاندان پر وارفتگی کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ سب کے سب بے ساختہ سجدے میں گر پڑے۔

﴿یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ﴾ اس پُر اثر اور یادگار منظر کو دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام پکار اٹھے، اے میرے ابا! یہ ہے اس خواب کی تعبیر جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا، آج برسہا برس کے بعد اللہ نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔

{۱۸۰} (عہدعتیق، تکوین باب ۴۶: ۲۹/ص ۵۸)

{۱۸۱} قال جمع من المفسرین ان المراد بابویه ابوه وخالته لانّ أمّه قدماتت قبل ذلک فتزوّج ابوه خالته (المراغی ۱۳/۴۲)

{۱۸۲} وظاهرالآیه یدلّ علی ان أمّه کانت لا تزال حیّة (المرجع السابق نفسه)

{۱۸۳} ارادوبذلک التعظیم لیوسف (جصّاص ۳/۱۷۸)، والسجود، وأصله الخضوع والتذلل، کان مباحا فی تلک الأزمنة (نظم الدرر ۴/۹۸)

{۱۸۴} قدیسمی التواضع سجودا وکان المرادههنا التواضع (کبیر ۱۸،۶/۵۱۱)

{۱۸۵} سجدوالله شکرا لنعمة وجداله (کبیر ۱۸،۶/۵۱۱)

﴿وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ﴾ یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ کا مقرب بندہ خوشی کے اس موقع پر اللہ کے احسانات بھول جاتا مگر اخلاقِ کریمانہ کی انتہا دیکھیے کہ کنویں سے نکالے جانے اور زندگی بچ جانے کی صورت میں جو بہت بڑا انعام ہوا تھا، اس کا ذکر تک نہیں کیا، مبادا بھائیوں کو سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے، ذکر کیا تو جیل سے آزادی کا کیا جہاں سے آپ کے ظاہری عروج کا آغاز ہوا تھا۔ جیل سے رہائی بھی معمولی نعمت نہیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کے دروازے پر یہ جملے لکھ دیئے تھے:

﴿ھذہ منازل البلاء وتجربة الاصدقاء، وشماتة الاعداء، وقبور الاحیاء﴾{۱۸۶} ”جیل خانہ آزمائشوں کا گھر، بچوں کی تجربہ گاہ، دشمنوں کی خوشی کا سامان اور زندوں کا قبرستان ہے۔“

کسی قیدی شاعر نے کہا تھا۔

خرجنا من الدنیا ونحن من أھلھا فلسنا من الأحیاء فیھا ولا الموتی

اذا جاء السجّان یوما لحاجة عجبنا وقلنا: جاء ھذا من الدنیا

”ہم جو کہ دنیا میں رہتے تھے وہاں سے نکل کر قید خانے میں آ گئے، اب ہمارا شمار نہ زندوں میں ہوتا ہے نہ مُردوں میں، ایک دن جیل کا داروغہ کسی کام سے آیا تو ہم نے بڑے تعجب سے کہا، ارے! اسے دیکھو یہ دنیا سے آ رہا ہے۔“

﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ﴾ بات بات پر اللہ کے انعامات کا تو ذکر ہے مگر ابتلاؤں اور پریشانیوں کا ذکر نہیں، کریم النفسی کی انتہا یہ ہے کہ بھائیوں کے حسد، مکروفریب اور اقدامِ قتل کا ارشارةً بھی ذکر نہیں کیا بلکہ شیطان پر ذمہ داری ڈال کر انہیں ایک طرح سے بری کر دیا۔

﴿اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ﴾ لطیف کا معنی مہربان بھی ہے، دقیقہ رس اور باریک بین بھی، آسانی اور بھلائی کے اسباب مہیا کرنے والا اور خفیہ تدبیر کرنے والا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اللطیف الذی یوصل الیک أربک فی رفق﴾{۱۸۷} ”لطیف وہ ذات ہے جو تمہاری ضروریات مہربانی سے پوری فرماتا ہے۔“

اور علامہ رازی فرماتے ہیں:

{۱۸۶} (تفسیر القاسمی ۹/۲۸۰)

{۱۸۷} (النھج الاسمی ۱/۲۶۰)

﴿فاذا اراد حصول شئی سهل اسبابه فحصل وان کان فی غایة البعد عن الحصول﴾{۱۸۸} ''جب وہ کسی کام کا ارادہ فرمالے تو اس کے اسباب مہیا فرمادیتا ہے اور وہ چیز بہر حال حاصل ہو کر رہتی ہے اگر چہ بظاہر اس کا حصول کتنا ہی مشکل معلوم ہوتا ہو۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ ہی اسم ''لطیف'' کی تجلیات کا مظہر ہے، بھائیوں نے ہلاکت کا ارادہ کیا اللہ نے بچالیا، زلیخا نے جیل میں بھیج کر گم کر دینا چاہا اللہ نے شہرت اور عزت کے بامِ عروج تک پہنچا دیا، بھائیوں نے باپ اور بیٹے میں جدائی کا پروگرام بنایا اللہ نے سارے خاندان کو ایک جگہ جمع فرمادیا۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ حکیم وہ ذات ہے جس کا ہر قول اور فیصلہ حکمت اور انصاف پر مبنی ہے، وہ ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھتا ہے، اس کی تدبیریں مضبوط ہیں اور ان میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔

﴿الْعَلِيْمُ﴾ وہ ایسی ذات ہے جسے ماضی، حال، مستقبل، دلوں کے اسرار، چیزوں کی حقیقت غرضیکہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا تفصیلی علم ہے۔ ایک نظر قصۂ یوسف علیہ السلام کے مدو جزر، بالخصوص آخری آیت کے مضمون پر ڈالیے اور پھر لطیف، حکیم اور علیم کے معانی میں غور کیجیے، کیسی حسین مناسبت ہے ان صفات اور بیان ہوتے قصے کے درمیان! یہ مناسبت آپ کو پورے قرآن میں دکھائی دے گی۔ کبھی آیات کے خاتمہ اور مضمون میں تدبّر تو کیجیے!

﴿۱۰۱﴾...... جب آزمائش کا دور ختم ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی مادی اور روحانی نعمتیں اپنے کمال کو پہنچ گئیں تو اللہ کے نبی نے محسنِ حقیقی کے سامنے ہاتھ اٹھا دیئے، پہلے انعاماتِ الٰہیہ کا اقرار کیا پھر اس کی حمد و ثناء کی، اس کے بعد درخواست کی کہ مجھے اسلام پر موت دینا اور مجھے اپنے نیک بندوں کے ساتھ ملا دینا۔

حکمت وہدایت:

۱...... اپنے خاندان خصوصاً والدین کے ساتھ محبت اور ان کا اکرام اور استقبال طبعی اور فطری چیز ہے۔ (۹۹)

۲...... امن اور بقدرِ ضرورت رزقِ حلال اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلدِ حرام والوں کے لیے امن اور رزق ہی کی دعا مانگی تھی، سورۂ قریش میں رب تعالیٰ نے قریشِ مکہ پر اپنے دو انعامات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، بھوک میں کھلانا اور خوف سے امن دینا۔

۳...... کسی دوسری مملکت میں داخل ہونے والے اجنبیوں کو ''تامین'' (امن اور تحفظ دینے کا رواج) جسے آج کل ویزا کہتے ہیں، قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، مگر حقیقی امن اللہ ہی کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اس لیے اللہ

{۱۸۸} (کبیر ۱۸،۶/۵۱۴)

یوسف علیہ السلام
تانیس یا افاریس (صان الحجر)
ہکسوس (چرواہے) بادشاہوں کا دارالحکومت
بحیرۂ روم
اردن
عرب
مصر
صحرائے سیناء
جزیرہ نمائے سیناء
صحرائے شام
دریائے اردن
وادی سرحان
قیساریہ
نابلس (سِکم)
یافا
اریحا
عمان
القدس (یروشلم)
اسدود
غزہ
الخلیل (حبرون)
بحیرۂ مردار
بئر سبع
کرک
عریش
بحیرۂ تانیس
فرما
نقب
پٹرا
معان
عقبہ
ایلہ (ایلات)
مدین
کوہ طور
خلیج سویس (سویز)
بحیرۂ قلزم (احمر)
اسکندریہ
بوطو
سائیس
بحیرۂ منزلہ
تانیس
افاریس
(صان الحجر)
جشن
بلبیس
بوبسطہ
نیل کاڈیلٹا
ہیلیوپولس
(مصر الجدیدہ)
القاہرہ
ممفس
قلزم (سویز)
بحیرۂ قارون
فیوم
دریائے نیل
تل العمارنہ
بشکریہ "اطلس القرآن" (اردو)

کے نبی نے ''اِنْ شَآءَ اللّٰهُ'' کہنا ضروری سمجھا۔

۴......گاؤں سے شہر میں منتقل ہونے کو بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے شمار کیا ہے چنانچہ اہلِ علم اسے بھی اللہ کی نعمت بتاتے ہیں، دیہاتی زندگی میں سہولیات کا فقدان ہوتا ہے، انسانی کمالات اور علم کے حصول کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں، دیہات میں رہنے والوں کو مختلف قسم کی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایک حدیث میں ہے:

﴿من بدا جفا﴾ {۱۸۹} ''جس نے گاؤں میں سکونت اختیار کی اس نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالا۔''

دوسری حدیث میں ہے:

''ألا انّ القسوة وغلظ القلوب في الفدادين'' {۱۹۰} ''(چرواہوں کے مزاج میں شدت اور قساوت ہوتی ہے۔''

۵......بعض مذاہب میں انسانوں کے سامنے سجدۂ تعظیمی جائز تھا مگر اسلام نے غیر اللہ کے لیے ہر قسم کے سجدے کو حرام کر دیا ہے، سجدہ تو دور کی بات ہے، اللہ کے ماسوا کے سامنے جھکنا بھی جائز نہیں۔(۱۰۰)

۶......سچے خوابوں کی تعبیر بھی بعض اوقات سالہا سال بعد وقوع پذیر ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر چالیس سال بعد سامنے آئی، بعض نے اس سے بھی زیادہ مدت نقل کی ہے۔

۷......جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرمالے تو اس کی تکمیل کے اسباب خود مہیا فرما دیتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے خاندان کو جمع کرنے کا ارادہ فرمالیا تو اس کے اسباب خود ہی آسان فرمادیئے۔

اثباتِ نبوّتِ محمد ﷺ

﴿۱۰۲......۱۰۸﴾

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس، اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھہرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے

يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ

لگے ○ اور اکثر لوگ نہیں ہیں یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے ○ اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ، یہ تو اور

{۱۸۹} (مسند احمد/رقم ۳۷۱)
{۱۹۰} (بخاری ۱، کتاب بدء الخلق/۳۶۶)

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا

کچھ نہیں مگر نصیحت سارے عالم کو O اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر گزر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان

وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ

پر دھیان نہیں کرتے O اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں O کیا نڈر ہو گئے اس سے

تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ

کہ آ ڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آپہنچے قیامت اچانک اور ان کو خبر نہ ہو O کہہ دے!

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا

یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

شریک بتانے والوں میں O

تسہیل: اے میرے پیغمبر! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے آپ کو بتاتے ہیں اور آپ اس وقت ان کے پاس نہیں تھے جب انہوں نے یوسف کو کنویں میں ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا اور وہ اس بارے میں تدبیریں سوچ رہے تھے O لوگوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں اگرچہ آپ ان کے ایمان کے کتنے ہی حریص کیوں نہ ہوں O اور آپ انہیں قرآن سنانے پر کچھ صلہ بھی تو نہیں مانگتے، یہ تو بس سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے O اور آسمانوں اور زمین میں اللہ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے مگر یہ ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے O اور ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں O کیا یہ لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کا ایسا عذاب آن پڑے جو ان پر چھا جائے یا ان پر اچانک قیامت آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟ O اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیجیے، یہ میرا راستہ ہے، میں اور میری اتباع کرنے والے انسانوں کو اللہ کے دین کی طرف پوری بصیرت کے ساتھ بلاتے ہیں، اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۰۲﴾...... یہ جو عجیب وغریب اتار چڑھاؤ پر مشتمل قصہ ہے یوسف علیہ السلام کا، جس کی ابتداء ہوئی خواب دیکھنے سے اور انتہا ہوئی مصر کی حکمرانی پر، یہ غیب کی ان خبروں میں سے تھا جن پر وحی کے بغیر نبی کریم ﷺ مطلع نہیں ہو سکتے

تھے، اس لیے کہ نہ تو آپ نے کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی آپ مصر اور کنعان میں موجود تھے، ویسے تو آپ کسی بھی ایسی جگہ موجود نہ تھے جہاں اس قصّے کا کوئی جزء پیش آیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے خاص طور پر اس موقع کی نفی فرمائی ہے جب برادرانِ یوسف آپ کو کنویں میں ڈالنے کی تدبیر کر رہے تھے، کیونکہ اس قصّے کی ابتداء یہیں سے ہوئی تھی، ویسے بھی یہ اس قصّے کا مخفی ترین حصّہ تھا، بھائیوں نے ہر قسم کی احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی خفیہ تدبیر سوچی تھی جس کا ان کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔{۱۹۱}

اس آیتِ کریمہ میں اگرچہ خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے مگر الزام ان لوگوں پر قائم کیا جا رہا ہے جو آپ کی نبوت کو جھٹلاتے تھے، اسی طرح اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اصل قصہ وہی ہے جو قرآن میں ہے، باقی رہے اہلِ کتاب تو ان کے بیان کردہ واقعات کو قرآن کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا جائے گا، جو کچھ اس کے مطابق ہوگا اسے لے لیا جائے گا اور جو کچھ اس کے خلاف ہوگا اسے ایجادِ بندہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔

﴿۱۰۳﴾......اے میرے حبیب! اگرچہ آپ نے پوری صحت کے ساتھ ایسا قصہ بیان کیا ہے جو آپ کی نبوت اور صداقت پر واضح دلیل ہے اور آپ کفار کے قبولِ ایمان کے شدید حریص بھی ہیں، پھر بھی آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ ان کی اکثریت ایمان قبول کر لے گی۔

اس آیتِ کریمہ کا ماقبل سے ربط یہ بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ قریش اور یہود کی ایک جماعت نے حضورِ اکرم ﷺ سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر آپ واقعی نبی ہیں تو آپ ہمیں قصۂ یوسف سنائیں، آپ کا خیال تھا کہ شاید قصہ سن کر یہ ایمان لے آئیں مگر ان پر الٹا اثر ہوا اور وہ ضد وعناد میں پہلے سے بھی شدید ہو گئے۔

﴿۱۰۴﴾......حالانکہ ان کے پاس کفر وعناد کے لیے کوئی عذر بھی نہیں، اس لیے کہ قرآن مشتمل ہے وعظ وتذکیر اور حکمت ونصیحت پر اور آپ ان سے دعوت وارشاد پر کسی قسم کی اجرت بھی نہیں مانگتے، اگر یہ اپنے خیر خواہ ہوتے تو قبولِ ایمان میں ذرا بھی دیر نہ کرتے۔

﴿۱۰۵﴾......اگر یہ آپ کی نبوت کے دلائل کے بارے غور وفکر نہیں کرتے تو زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ تو وہ بدنصیب ہیں جنہوں نے کبھی دلائلِ توحید کے بارے میں تدبر ہی نہیں کیا، حالانکہ توحید کے دلائل ارض وسما میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں، یہ سورج اور چاند، یہ ستارے اور سیارے، یہ باغات اور چشمے، یہ پہاڑ اور دریا، یہ باغات اور مختلف قسم کی نباتات، یہ رنگا رنگ پھول اور پھل سب اس کے وجود اور علم وقدرت کے دلائل ہیں۔

{۱۹۱} وإنما تخصيصه بالذكر لكونه مطلع القصة وأخفى أحوالها كما ينبیء عنه قوله تعالى: "وهم يمكرون" (ابوسعود ۳/ ۴۳۱)

وفـی کـل شـئ لـہ آیۃ.......... تـدل عـلـی انـہ واحـد

''اور ہر چیز میں کوئی نہ کوئی ایسی نشانی پائی جاتی ہے جو اس کے ''ایک'' ہونے پر دلالت کرتی ہے۔''

﴿۱۰۶﴾......مشرکین کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ایک طرف وہ اللہ کے وجود کا اقرار کرتے ہیں دوسری طرف وہ کسی نہ کسی انداز میں شرک کا ارتکاب بھی کرتے ہیں، غیر اللہ کی ایسی تعظیم و تقدیس، عبادت و اطاعت اور عشق و محبت جو اللہ کا حق ہے، شرک ہے، اور صرف قریشِ مکہ ہی نہیں دنیا بھر کے مشرکین اس شرک میں مبتلا ہیں، جب یہ مشرک دوزخ میں اپنے معبودوں کے ساتھ جمع ہوں گے تو اپنی اس جہالت کا اقرار کریں گے:

﴿تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ {۱۹۲}

''اللہ کی قسم! ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب تمہیں رب العلمین کے برابر ٹھہراتے تھے۔''

کتنا بڑا ستم ڈھاتے ہیں وہ لوگ، جو اس عظیم ہستی کے ساتھ، جو غنی اور مغنی، قادر اور مقتدر ہے، شریک ٹھہراتے ہیں ایسی چیزوں اور افراد کو جو فقیر اور محتاج، ضعیف اور فانی ہیں۔

جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک ہے، یونہی ریا اور دکھاوا بھی شرک ہے، اسے شرکِ خفی اور شرکِ اصغر کہا گیا ہے، حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿ان اخوف ما أخاف علیکم الشرک الأصغر! قالوا: وما الشرک الأصغر یارسول اللہ؟ قال: ''الریاء!''﴾ {۱۹۳}

''مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ شرکِ اصغر کا خوف ہے، سوال کیا گیا یارسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا، ریا!''

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿قال رسول اللہ ﷺ: یقول اللہ أنا أغنی الشرکاء عن الشرک، من عمل عملا أشرک فیہ معی غیری ترکتہ وشرکہ﴾ {۱۹۴}

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں سے زیادہ شرک سے بیزار ہوں، جو کوئی ایسا عمل کرے گا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے گا، میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دوں گا۔''

مختصر یہ کہ بہت سارے مشرک ایسے ہیں جو بعض چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بے شمار مومن ایسے ہیں جو کسی نہ کسی انداز میں شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔

{۱۹۲} الشعراء ۲۶/۹۸-۹۹

{۱۹۳} (مسند احمد ۵/۴۲۹)

{۱۹۴} (مسلم ۲، کتاب الزھد/۲۱۱)

آپ نے یقیناً ایسے لوگ دیکھے ہوں گے جو قبروں پر سجدے کرتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں، نجومیوں، کاہنوں، پیروں، فقیروں اور پیشہ ور عاملوں کے پاس جاتے اور ان سے اپنے مسائل کے حل کی امیدیں رکھتے ہیں، عام حالات میں بھی اللہ کو پکارنے کے بجائے انہیں نبیوں اور ولیوں کو پکارنے میں زیادہ سکون محسوس ہوتا ہے جبکہ ان کا دعوٰی یہ ہے کہ ہم مومن بھی ہیں اور موحّد بھی!

﴿۱۰۷﴾......مشرکوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے بے خوف نہ ہوجائیں، اللہ کا عذاب ان پر دن اور رات میں کسی بھی وقت آسکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اچانک قیامت قائم ہوجائے اور انہیں خبر ہی نہ ہو۔

یہ مضمون قرآن میں کئی جگہ آیا ہے مثلاً سورۂ اعراف میں ہے:

''کیا یہ بستیوں والے اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آپڑے جبکہ وہ سورہے ہوں؟ کیا یہ بستیوں والے اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آپڑے جبکہ وہ کھیل کود میں لگے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہوگئے ہیں؟ حالانکہ اللہ کی تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہوں۔'' {۱۹۵}

﴿۱۰۸﴾......اللہ اپنے نبی سے کہلوا رہے ہیں کہ لوگوں کو بتا دیجیے کہ میرا اور میرے متبعین کا راستہ اور مسلک ایمان اور توحید کی دعوت کا راستہ ہے مگر یہ دعوت خالی خولی لفاظی اور کورانہ تقلید پر مبنی نہیں ہے بلکہ بصیرت اور عقل وحکمت کا ثمرہ ہے، مجھے اور میرے متبعین کو اپنی دعوت کی سچائی پر یقین ہے۔

ویسے تو ''متبعین'' کے عموم میں ہر وہ خوش نصیب آجاتا ہے جو دعوت جیسے عظیم عمل میں مشغول ہے مگر اس کے اولین مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جنہوں نے وراثتِ نبوی اور دعوتِ دین کا حق ادا کردیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اس امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے، تکلف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت وخدمت کے لیے منتخب فرمالیا ہے، تم انہی کے اخلاق وعادات اور طریقوں کو سیکھو کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔'' {۱۹۶}

﴿وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ چونکہ اوپر یہ ذکر آیا تھا کہ بعض لوگ ایمان کو شرک کے ساتھ خلط ملط کردیتے ہیں، اس لیے آپ نے شرک سے اپنی برأت کا اعلان فرمایا۔

{۱۹۵} (الأعراف/۷/۹۷-۹۹)

{۱۹۶} (البغوی بحوالہ المراغی ۱۳/۵۲-۵۳)

حکمت وہدایت:

۱......کسی کتاب کے مطالعہ اور کسی استاد سے استفادہ کے بغیر سابقہ انبیاء کے واقعات صحت اور صداقت کے ساتھ بیان کردینا سرورِ دو عالم ﷺ کی نبوت پر واضح اور قطعی دلیل ہے۔(۱۰۲)

۲......انسانوں کی اکثریت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اطلاع یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے لہٰذا داعیانِ دین کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

۳......حضراتِ انبیاء اپنی امت کی ہلاکت کے نہیں، ہدایت کے شدید حریص ہوتے ہیں، اس سے ان شدّت پسند داعیوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو اپنے مخالفین کی ہدایت سے زیادہ ان کی ہلاکت اور بربادی کی دعائیں مانگتے ہیں۔(۱۰۳)

۴......دین کی دعوت مفت ہونی چاہیے، داعی کی اجرت اللہ کے ذمہ ہوتی ہے، ہر پیغمبر نے اپنی امت سے یہی کہا کہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت اللہ کے ذمہ ہے۔(۱۰۳)

۵......قرآن صرف اہلِ عرب کے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔(۱۰۴)

۶......آیاتِ الٰہیہ سے غفلت اور ان میں عدمِ تفکر اللہ کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے۔(۱۰۵) تعجب ہوتا ہے جب ہم ان سطحیت پسندوں کے خیالات پڑھتے اور سنتے ہیں جو غور وتدبر کو گمراہی کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں اور مغز غیروں کے سامنے پھینک کر خود ہڈیوں پر گزارہ کرتے ہیں۔

۷......انسانوں میں سے بے شمار ایسے ہیں جو اللہ کو خالق، رازق اور مدبّر تسلیم کرنے کے باوجود بعض صفات اور عبادات میں مخلوق کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔(۱۰۶) خود مشرکینِ عرب کا بھی یہی حال تھا، وہ حج میں یوں تلبیہ پڑھا کرتے تھے:

﴿لبّیک لاشریک لک الاّ شریکا هو لک تملکه وماملک﴾{۱۹۷}

''میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے تیرے اس شریک کے کہ تو اس کا اور اس کی ملکیت میں آنے والی چیزوں کا مالک ہے۔''

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ منافقین کے بارے میں ہے، جو زبان سے تو ایمان کے دعوے کرتے تھے مگر ان کے دلوں میں کفر اور شرک تھا۔

{۱۹۷} (مسلم ۱، کتاب الحج/۳۷۶)

۸......نبی اکرم ﷺ اور آپ کے متبعین کا طریقہ اور سنت پورے یقین اور شرحِ صدر کے ساتھ ''دعوت الی اللہ'' ہے، جو خوش نصیب اس میدان میں اپنی صلاحیتیں لگائے ہوئے ہیں، وہ کارِ نبوت میں مصروف ہیں۔

قرآنی قصص سے عبرت

﴿۱۰۹......۱۱۱﴾

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰىؕ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے، سو کیا ان لوگوں نے

فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ؕ اَفَلَا

نہیں سیر کی ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے؟ اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنے

تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا اسۡتَيۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّىَ

والوں کو کیا اب بھی نہیں سمجھتے؟ ○ یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا

مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۱۰﴾ لَقَدۡ كَانَ فِىۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِى

پہنچی ان کو ہماری مدد، پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھرتا نہیں عذاب ہمارا قوم گناہ گار سے ○ البتہ ان کے احوال سے اپنا

الۡاَلۡبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيۡثًا يُّفۡتَرٰى وَلٰـكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَ

حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز

تَفۡصِيۡلَ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں ○

ربط: رسولِ اکرم ﷺ کا سیّدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ پوری صحت اور تفصیل سے بیان کر دینا آپ کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہے، اثباتِ نبوت کے بعد ان لوگوں کی تردید ہے جو مختلف اعتراضات کرتے تھے، ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر رسول بھیجنے کی واقعی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا، ایک انسان نبی کیسے بن گیا؟ اسی طرح وہ بار بار یہ بھی کہتے تھے کہ اے محمد! (ﷺ) اگر آپ واقعی سچے رسول ہیں تو آپ ہم پر اللہ کا عذاب کیوں نہیں لے آتے؟ اس عجلت پسندی کا جواب بھی یہاں دیا گیا ہے۔

تسہیل: ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء بھیجے وہ سب آدمی تھے، کیا یہ لوگ اللہ کی زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں، ان کا انجام کیا ہوا؟ البتہ آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہت بہتر

ہے جو تقوٰی والی زندگی بسر کرتے ہیں، کیا تم ان حقائق کو سمجھتے نہیں ہو؟ O جیسے آج کے کفار کو مہلت دی گئی ہے یونہی ماضی کے کفار کو بھی مہلت دی گئی تھی، یہاں تک کہ جب اللہ کے نبی ان پر عذاب کے آنے سے مایوس ہونے لگے اور انہیں خیال آنے لگا کہ کہیں عذابِ الٰہی کا وقت سمجھنے میں ہم سے غلطی تو نہیں ہوگئی تو مایوسی کے اس عالم میں ہماری مدد آ گئی، پھر جسے چاہا ہم نے بچا لیا لیکن مجرموں کو ہمارے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا O عقلِ سلیم والوں کے لیے ان کے قصوں میں بڑی عبرت ہے، یہ قرآن کسی انسان کا خود ساختہ کلام نہیں ہے بلکہ یہ ان کتابوں کے موافق ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئیں، اس میں ہر ضروری چیز کی تفصیل ہے اور یہ ایمان والوں کے لیے رحمت اور ہدایت کا ذریعہ ہے O

تفسیر

﴿۱۰۹﴾......تاریخِ نبوت اور سیرتِ انبیاء پر نظر ڈالنے سے دو حقیقتیں سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ جتنے بھی انبیاء آئے وہ سب مرد تھے، نہ وہ فرشتے تھے اور نہ ہی عورتیں، اگرچہ بعض حضرات حضرت سارہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم (سلامٌ علیھن) کی نبوت کے قائل ہیں اور اپنے اس دعوٰی پر وہ بعض آیات سے استدلال کرتے ہیں مگر جمہور علماء نے ان کے دعوٰی کو مرجوح اور دلائل کو کمزور قرار دیا ہے۔{۱۹۸}

دوسری حقیقت جو اہلِ علم نے بیان کی ہے، وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء شہروں میں مبعوث ہوئے، اس لیے کہ عام طور پر دیہاتیوں کی طبیعت پر جہالت اور شدت کا غلبہ ہوتا ہے{۱۹۹} جبکہ ان کے مقابلے میں شہری نرم مزاج اور علم دوست ہوتے ہیں، قرآنِ کریم میں ہے:

﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾{۲۰۰}

"ان منافقوں میں جو دیہاتی ہیں، وہ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ انہیں ان احکام کا علم ہی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں۔"

طبائع کے اختلاف کے علاوہ ایک امر یہ بھی ہے کہ شہروں کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے، جس دعوت اور تحریک کا آغاز کسی بڑے شہر سے ہوتا ہے، اس کے اثرات بہت جلد دور دور تک پہنچ جاتے ہیں جبکہ دیہات سے اٹھنے والی آواز

{۱۹۸} (ابن کثیر ۲/۶۴۴-۶۴۵)
{۱۹۹} أهل البوادی الذین هم من أجفی الناس طباعًا واخلاقًا (حواله مذكوره)
{۲۰۰} (التوبة ۹/۹۷)

بسا اوقات نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوتی ہے، کھیت کھلیانوں اور وادیوں سے اٹھ کر وہیں گم ہو جاتی ہے۔

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ﴾ قرآن بار بار گزشتہ اقوام وملل کے حالات اور انجام کے مطالعہ کی ترغیب دیتا ہے اور نافرمان قوموں کو سمجھاتا ہے کہ اللہ نے اپنا قانونِ جزا وسزا نہیں بدلا، اگر حضرت نوح، ھود، صالح اور لوط علیہم السلام کی قوموں کو ضد عناد اور تکذیب کی وجہ سے ہلاک کیا گیا تھا تو تمہیں بھی ان بیماریوں کی وجہ سے ہلاکت ہی کا سامنا کرنا پڑے گا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ انہیں تو ہلاک کیا جائے اور تم پر انعامات کی بارش ہو۔

﴿۱۱۰﴾......اسے قرآنِ کریم کی مشکل آیات میں سے شمار کیا جاتا ہے، وجہِ اشکال یہ ہے کہ اگر "ظـنـوا" اور "کـذبـوا" کی ضمیر "رسل" کی طرف لوٹائی جائے تو بظاہر معنی یہ بنتا ہے کہ انبیاء نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا یا اللہ کی طرف سے معاذ اللہ! ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا، حالانکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی شان سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں ایسا گمان رکھیں، اس اشکال سے بچنے کے لیے مختلف طریقوں سے تفسیر کی گئی ہے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جو تفسیر کی ہے وہ بے تکلف بھی ہے اور آسان بھی، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب نافرمان قوموں کو طویل مہلتیں دی گئیں تو انبیائے کرام ان پر عذاب آنے سے مایوس ہو گئے، اللہ کے بارے میں تو وہ یہ بدگمانی نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ نے وعدہ خلافی کی ہے، سو انہوں نے اپنے بارے میں یہ سوچا کہ اللہ نے مسلسل نافرمانی کی صورت میں قوم پر عذاب بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا، اس کے وقت کی تعیین میں ہم سے غلطی ہو گئی، اللہ نے تو کوئی وقت متعین نہیں کیا تھا ہم نے ہی اپنے طور پر وقت متعین کر لیا۔{۲۰۱}

یہاں یہ اعتراض بہت کمزور ہے کہ انبیاء سے غلطی کیسے ہو گئی، کیونکہ انبیاء سے اجتہادی غلطی کا ہونا تسلیم شدہ چیز ہے، البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں فرق یہ ہے کہ انبیاء کو غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ انہیں باخبر کر کے ان پر حقیقت کھول دی جاتی ہے جبکہ عام مجتہدین کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ "ظنوا" اور "کـذبوا" کی ضمیر قوم کی طرف لوٹائی جائے جیسا کہ حضرت ابنِ مسعود اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے{۲۰۲} اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ جب رسول اپنی قوم کے قبولِ ایمان سے مایوس ہو گئے اور قوم نے یہ گمان کر لیا کہ یہ انبیاء ہمیں اللہ کے عذاب سے جو ڈراتے تھے وہ جھوٹی باتیں تھیں تو اس موقع پر اللہ کا عذاب آ گیا۔

{۲۰۱} (بیان القرآن حصہ اول، جلد ۵/ ۱۰۲)
{۲۰۲} (قرطبی ۹/ ۲۳۵)

یہ تقریر اس صورت میں ہوگی جبکہ ''کـذبـو''کو ذال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا جائے اور اگر اسے تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو بھی دو مفہوم بن سکتے ہیں۔

پہلا یہ کہ ظن کو یقین کے معنی میں لیا جائے، مطلب یہ ہوگا کہ جب رسولوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی امتوں نے انہیں مکمل طور پر جھٹلا دیا ہے اور اب ان سے ایمان لانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تو انہوں نے اللہ سے ان سڑے ہوئے اعضاء کی تباہی کی دعا مانگی چنانچہ انہیں تباہ کر دیا گیا۔

دوسرا مفہوم وہ ہے جو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، وہ یہ کہ جب سرکش قوم کی ضد اور عناد کے باوجود عزاب نہ آیا اور ایمان لانے والے سوال اٹھانے لگے ''متٰی نصر اللہ'' (اللہ کی مدد کب آئے گی؟) تو رسولوں کو یہ گمان پریشان کرنے لگا کہ کہیں ایمان لانے والے بھی ہمیں جھوٹا نہ سمجھ لیں۔{۲۰۳}

﴿۱۱۱﴾......حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہو یا دیگر انبیاء کے قصے، یہ محض دفع الوقتی، تحیّر خیزی اور داستان گوئی کے طور پر بیان نہیں کیے جاتے بلکہ ان کا مقصد عبرت و نصیحت اور ہدایت ہوتا ہے، ان قصوں کے آئینے میں ہر قوم اپنا چہرہ دیکھ سکتی ہے، فرمانبردار بھی اور نافرمان بھی، ظالم و سرکش بھی اور عادل و منکسر مزاج بھی۔

﴿لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ مگر ان قصوں سے نصیحت صرف وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں، ''الباب'' لُب کی جمع ہے اور ''لُب'' صرف اس عقل کو کہا جاتا ہے جو کھوٹ سے پاک ہو،{۲۰۴} جس پر نفسانی خواہشات اور قومی تعصّبات اثر انداز نہ ہوں، بعض حضرات اسے عقلِ معاد سے بھی تعبیر کرتے ہیں، حصولِ ہدایت کے لیے عقلِ معاش کافی نہیں، عقلِ معاد ضروری ہے، آخرت کی فکر رکھنے والے ہر آیت، ہر حدیث اور ہر قصہ سے شاہراہِ حیات پر چلنے کے لیے چراغ تلاش کر لیتے ہیں جبکہ اپنی سوچ دنیا اور کسبِ معاش تک محدود رکھنے والوں کو پورے قرآن میں پہلوں کے قصوں اور کہانیوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

﴿مَا كَانَ حَدِيثًا﴾ یہ قرآن کوئی ایسا کلام نہیں ہے جسے کسی انسان نے خود گھڑ لیا ہو، اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ وہ کلام جو تحقیق کے ہر معیار پر پورا اترتا ہو اور اس کے مضامین نہ صرف یہ کہ پہلی آسمانی کتابوں کے موافق ہوں بلکہ ان کے صحیح اور غلط میں فرق بھی کرتے ہوں، اسے ایک اُمّی انسان نے گھر بیٹھے خود ہی گھڑ لیا ہو۔

﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ اور اس قرآن میں ہر اس چیز کی تفصیل ہے جس کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے رضائے

{۲۰۳} فظنّ الرّسل انّ الّذین اٰمنوا بھم کذبوھم (کبیر ۱۸،۲/ ۵۲۱)

{۲۰۴} ''اللّبّ'' العقل الخالص من الشوائب (مفردات/۴۴۶)

الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے، خواہ اس کا تعلق عبادات اور معاملات سے ہو یا اخلاق اور معاشرت سے ہو۔
﴿وَهُدًى وَّرَحْمَةً﴾ اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے...... قرآن تو سارے انسانوں کے لیے ہدایت ہے خواہ کافر ہوں یا مومن، مگر اس سے فائدہ صرف ایمان والے ہی اٹھاتے ہیں، کافروں کے لیے یہ ہدایت اور رحمت کے بجائے ضلالت اور زحمت کا سبب بن جاتا ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱...... انبیاء ہمیشہ مردوں میں سے ہوئے ہیں، نہ ان میں کوئی عورت تھی نہ جن نہ فرشتہ۔ (۱۰۹)

۲...... بہت سی مصلحتوں کی بناء پر انبیاء شہروں میں آتے ہیں (۱۰۹) انہی مصلحتوں کی وجہ سے بڑے علمی اور اصلاحی مراکز بھی شہروں میں ہوتے ہیں۔

۳...... ہر صاحبِ نظر و فکر پر لازم ہے کہ تباہ شدہ اقوام کے حالات اور انجام پر غور و فکر کرے اور عبرت حاصل کرے۔ (۱۰۹)

۴...... اجتہادی خطا انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے۔ (۱۱۰)

۵...... نافرمانوں کو مہلت دینا اور اپنے اولیاء کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی قدیم سنّت ہے۔ (۱۱۰)

۶...... ظاہری حالات سے گھبرا جانا ایمان اور تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ (۱۱۰)

۷...... اللہ والوں کے دل میں بھی غیر اختیاری وساوس آ جاتے ہیں۔ (۱۱۰)

۸...... اقوامِ عالم کے مدّ و جزر، عروج و زوال اور ہلاکت و بقاء میں عبرت کا بڑا سامان ہے، مگر ان کے لیے جو تعصبات سے پاک دل اور دماغ رکھتے ہیں۔ (۱۱۱)

۹...... قرآنِ کریم اللہ کا کلام ہے، کسی انسان کا اس میں کوئی دخل نہیں اور نہ ہی اس کی مثل کوئی بنا سکتا ہے۔ (۱۱۱)

۱۰...... قرآن مجید پہلی کتابوں کا مصدِّق بھی ہے اور ان کے مضامین کا محافظ بھی ہے۔ (۱۱۱)

۱۱...... دین اور دنیا کے معاملات کی اصلاح اور اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے جن احکام اور ہدایات کی ضرورت ہے، وہ سب قرآن میں ہیں۔ (۱۱۱)

۱۲...... آخری آیت میں قرآنِ کریم کی جو پانچ صفات مذکور ہیں، اگر ان کی روشنی میں قصۂ یوسف علیہ السلام کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

(۱)...... اس قصّہ میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے۔

(۲)...... حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے یہ قصہ خود نہیں گھڑ لیا کیونکہ آپ نے نہ تو کوئی کتاب پڑھی تھی نہ کسی کا تلمذ اختیار کیا، نہ اہلِ علم کی صحبت میں بیٹھے اور نہ ہی زندگی بھر آپ پر جھوٹ بولنے کا الزام عائد کیا گیا۔

پھر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس قصے کے کسی جزء کا تعارض تورات اور انجیل سے نہیں ہے۔

(۳)...... حضرت یوسف علیہ السلام کا جو معاملہ اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ پیش آیا اسے پوری تفصیل کے ساتھ قرآن نے بیان کیا ہے۔

(۴)...... یہ قصہ دنیا میں ہدایت کا سبب ہے۔

(۵)...... اس ہدایت پر عمل آخرت میں اہلِ ایمان کے لیے حصولِ رحمت کا سبب ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆

سُورَةُ الرَّعْد
مَكِّيَّةٌ

﴿سورۂ رعد کے اہم مضامین﴾

سورۂ رعد مکی ہے، اس میں ۴۳ آیات اور ۶ رکوع ہیں، اس سورت میں تینوں بنیادی عقائد یعنی توحید، نبوت اور بعث بعد الموت سے بحث کی گئی ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں قرآنِ کریم کی حقانیت کا ذکر ہے، یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جن سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے ان کی ابتداء میں عام طور پر قرآنِ کریم کا ذکر ہوتا ہے، جس سے اس قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے جس کے مطابق حروفِ مقطعات ان مخالفین کو چیلنج کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں جو قرآن مجید کو معاذ اللہ انسانی کاوش قرار دیتے ہیں۔ اس سورت میں جو اہم مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

﴿۱﴾...... سورت کی ابتداء میں اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کے دلائل بیان کئے گئے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں، سورج اور چاند، رات اور دن، پہاڑوں اور نہروں، غلہ جات اور مختلف رنگوں، ذائقوں اور خوشبوؤں والے پھلوں کو پیدا کرنے والا وہی ہے اور موت اور زندگی، نفع اور نقصان اس اکیلے کے ہاتھ میں ہے۔

﴿۲﴾...... قیامت کے دن بعث وجزا کو ثابت کیا گیا ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو مشرکین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ اللہ کے وجود کا اقرار بھی کرتے تھے، اسے ارض وسما کا خالق بھی تسلیم کرتے تھے لیکن مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہڈیوں کے بوسیدہ اور گوشت پوست کے مٹی میں رل مل جانے کے بعد انسان دوبارہ کیسے زندہ ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مشرکوں کو تو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ مردہ ہڈیوں میں زندگی کیسے ڈالی جائے گی جبکہ درحقیقت باعثِ تعجب بعث بعد الموت نہیں ہے بلکہ بعث بعد الموت کا انکار باعثِ تعجب ہے۔ (۵)

﴿۳﴾...... اللہ تعالیٰ نے ایسے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو اللہ کے حکم سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔

﴿۴﴾...... ایک اصولی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ کسی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی معاملہ ہوتا ہے وہ اپنے معاملے کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس قوم کے حالات نہیں بدل جاتے، جب وہ قوم خود ہی اپنے آپ کو نعمت کی بجائے مصیبت اور کشائش کی بجائے تنگی کا مستحق بنالیتی ہے تو پھر اللہ بھی اپنا معاملہ بدل دیتا ہے۔ آج اگر امتِ مسلمہ اپنے لیے عزت چاہتی ہے تو اسے ذلت والے اسباب ترک کر کے عزت والے اسباب ووسائل اختیار کرنے ہوں گے، محض عزت کی آرزو سے عزت کا حصول ناممکن ہے۔

﴿۵﴾...... باطل اور اہلِ باطل کو اس سیلابی جھاگ سے تشبیہ دی گئی ہے جو بظاہر ہر چیز پر چھائی ہوتی ہے لیکن بالآخر

سوکھ کر زائل ہو جاتی ہے۔حق اور اہلِ حق کو اس سونے اور چاندی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو زمین پر ٹھہرا رہتا ہے، پھر آگ میں تپ کر بالکل خالص ہو جاتا ہے اور میل کچیل اس سے الگ ہو جاتا ہے۔(۱۷)

دنیا بھر میں باطل کی مادی جھاگ جو اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے یہ جھاگ خود بخود بیٹھ جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں حق کے سچے پرستار کھڑے ہو جائیں لیکن جو صورت نظر آ رہی ہے وہ تو یہ ہے کہ حق کے نام لیواؤں نے اہلِ باطل کے اور اہلِ باطل نے اہلِ حق کے بعض طور طریقے اپنا رکھے ہیں۔

﴿۶﴾......اہلِ تقویٰ اور حقیقی عقل مندوں کی آٹھ صفات بتائی گئی ہیں:

۱......وہ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہوتے۔

۲......جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑے رکھتے ہیں۔

۳......اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

۴......برے حساب سے خوف رکھتے ہیں۔

۵......اللہ کی رضا کے لیے صبر کرتے ہیں۔

۶......نماز قائم کرتے ہیں۔

۷......اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

۸......برائی کا جواب بھلائی اور اچھائی سے دیتے ہیں۔(۲۴۔۲۰)

ان کے مقابلے میں اشقیاء کی تین نمایاں علامات ہیں، پہلی یہ کہ وہ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں، دوسری یہ کہ اللہ نے جن رشتوں کو باقی رکھنے کا حکم دیا ہے وہ انہیں ختم کرتے ہیں اور تیسری یہ کہ وہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔(۱۳:۲۵)

﴿۷﴾......انبیاء بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہوتے ہیں، ان کے بیوی بچے بھی ہوتے ہیں، جہاں تک ان کے معجزات کا تعلق ہے تو یہ ان کا ذاتی کمال نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کے حکم سے صادر ہوتے ہیں، وہ لوگ مقامِ نبوت سے ناواقف ہیں جو بشر ہونے کی وجہ سے ان کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔

﴿۸﴾......سورت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی نبوت و رسالت کی خود شہادت دی ہے، اسی طرح وہ اہلِ کتاب بھی آپ کی نبوت کے گواہ ہیں جو تعصب سے پاک ہیں۔

☆☆☆☆☆

اللہ کی قدرت کی نشانیاں

﴿۱......۴﴾

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

الٓمّٓرٰ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے سو حق ہے لیکن بہت لوگ

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

نہیں مانتے O اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو پھر قائم ہوا عرش پر اور کام میں لگا دیا سورج

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ

اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے وقت مقرر پر، تدبیر کرتا ہے کام کی ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ شاید تم

بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ

اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو O اور وہی ہے جس نے پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ اور ندیاں اور ہر

كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

میوے کے رکھے اس میں جوڑے دو دو قسم، ڈھانکتا ہے دن پر رات کو اس میں نشانیاں ہیں ان کے واسطے جو کہ

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ

دھیان کرتے ہیں O اور زمین میں کھیت ہیں مختلف ایک دوسرے سے متصل، اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں

صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ

ایک کی جڑ دوسری سے ملی ہوئی اور بعضے بن ملی ان کو پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتے ہیں ان میں ایک کو ایک سے میووں میں

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۴

ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں O

تسہیل: الٓمّٓرٰ...... یہ ایک کامل اور مکمل کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، وہ حق ہے لیکن اکثر لوگوں کو ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی O اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کیا جو تمہیں نظر آئیں، پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا، ہر ایک، ایک معیّن وقت تک اپنے مدار میں گردش کرتا رہے گا، وہی اللہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور اپنی قدرت کی نشانیاں وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں اپنے رب سے ملاقات کا یقین آ جائے O اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا

بنائے اوراس میں دو دو قسم کے پھل پیدا کیے، وہ رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کو چھپا دیتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں O اور زمین میں آپس میں ملے ہوئے مختلف قطعات ہیں اور انگور کے باغات اور غلّے کی کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن میں بعض ایسے ہیں کہ ایک تنہ اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعض کا اوپر تک ایک ہی تنہ رہتا ہے، سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم بعض پھلوں کو لذّت اور ذائقے میں بعض پھلوں پر فوقیت دیتے ہیں، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾...... یہ کامل کتاب کی آیات ہیں جو محض زبانی یادداشتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ باضابطہ لکھی ہوئی کتاب ہے، یہ ایسی کامل اور مکمل کتاب ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی دوسری کتاب کو رکھنا اچھا ہی نہیں۔

﴿وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ﴾ اسے اعجاز کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے کہ قرآن نے صدیوں پہلے جیسے بتایا تھا ویسے ہی ہوا، قرآن نے بتایا کہ صداقت وحقّانیت اور عظمت وبیان کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے! ماضی کے انسانوں کی اکثریت بھی قرآن پر ایمان سے محروم تھی اور آج کے انسانوں کی اکثریت بھی ایمان سے محروم ہے۔

سورت کی پہلی آیت میں اجمالی طور پر جو کچھ بیان کر دیا گیا ہے، سورت کی بقیہ آیات میں اسی کی تفصیل ہے۔

﴿۲﴾......دوسری آیت میں اللہ کے کمالِ قدرت اور بیکراں بادشاہت کو بیان کیا گیا ہے، وہی ہے جس نے کسی ایک بھی ستون کے بغیر پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لینے والی آسمان جیسی خوبصورت اور پائیدار چھت تعمیر کی ہے، اس چھت میں کروڑوں ستارے اور سیارے ہیں جن میں سے بعض اس زمین سے کئی گنا بڑے ہیں۔

انسان کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی معمار اور انجینئر اپنے سینکڑوں ماہرین اور کارکنوں کے ساتھ مل کر چند ہزار مربع فٹ کی عمارت ستونوں کے بغیر کھڑی کر دے تو اس کی تعریف کرتے کرتے اس کی زبان خشک ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بلند ترین اور وسیع ترین انتہائی پرکشش عمارت کو نظر انداز کر دیتا ہے جس کا بنانے والا دنیا بھر کے سائنسدانوں، انجینئروں اور ماہرین کو بار بار دعوت دیتا ہے کہ اگر تمہیں اس عمارت میں کوئی خامی نظر آتی ہے تو اس کی نشاندہی کرو۔

آسمان کیا ہے؟ قدیم اور جدید محققین نے اس سوال کے مختلف جوابات دیئے ہیں، ہم اس بحث میں اُلجھے بغیر سامنے نظر آنے والے منظر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا دل اس کے خالق کی عظمت سے بھر جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ اپنی محدود سوچ کے مطابق ہم عرشِ الٰہی کو تختِ سلطنت کے مشابہ قرار دے سکتے

ہیں لیکن اس کی وسعت اور عظمت انسانی فکر و خیال سے وراء الوراء ہے۔

عرش پر مستوی یا جلوہ فرما ہونے کی کیفیت بیان کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح کا استواء اللہ کی شان کے لائق ہے، وہ مراد ہے۔

﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ﴾ سورج اور چاند کو اس کام میں لگا دیا گیا جس کام کے لیے انہیں پیدا کیا گیا تھا اور آج تک وہ اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، نہ سورج بے نور ہوا نہ چاند کو اوور ہالنگ کی ضرورت پیش آئی، نہ وہ ڈیزل اور پیٹرول کے محتاج ہوئے نہ تھکے نہ رکے، نہ اپنے مدار سے ہٹے نہ ان کی رفتار میں کمی واقع ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو رفتار اور منزلیں متعین کر دی ہیں انہی منزلوں میں طے شدہ رفتار کے ساتھ وہ چل رہے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ﴾ {۱}

”اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے، یہ اس اللہ کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے جو غالب اور علم والا ہے، اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔“

﴿كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ سورج، چاند اور سیاروں میں سے ہر ایک کے لیے کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح اللہ نے زندگی اور حرکت و حرارت کی ایک حد متعین کی ہے، جب تک وہ حد نہیں آ جائے گی یہ چلتے رہیں گے، جب وہ حد آ جائے گی جس کا اصطلاحی نام قیامت ہے تو ان پر موت واقع ہو جائے گی، پھر ان کے اندر نہ حرکت باقی رہے گی نہ حرارت۔

اس کا دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر سیارے کے لیے جو ایک خاص رفتار اور مخصوص مدار متعین کیا ہے، یہ سیارے اس مدار میں اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، چنانچہ سورج کی اپنے مدار میں گردش ایک سال میں اور چاند کی ایک ماہ میں مکمل ہو جاتی ہے۔

یہ سیارے جن میں سے بعض کی گردش اور بھاگنے کی رفتار ۸۴ میل فی سیکنڈ بتائی جاتی ہے، ہزاروں سال سے اپنے اپنے مدار میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گردش کر رہے ہیں، ان پر نہ کوئی ڈرائیور ہے نہ دکھائی دینے والا کوئی محافظ اور کانسٹیبل، مگر آج تک نہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا نہ ان کی رفتار میں کمی واقع ہوئی اور نہ ہی ان کی مشین خراب ہوئی، کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں کہ لاکھوں کروڑوں سیارے غیر معمولی رفتار کے ساتھ بھاگ رہے ہوں مگر نہ تو ان میں ٹکراؤ ہوا اور نہ ہی کوئی خرابی واقع ہو؟ ایک صاحبِ ایمان شخص جب ان دلائل میں غور و فکر کرتا ہے تو اس کا دل خالقِ حقیقی کی عظمت سے بھر جاتا ہے۔

{۱} (یٰس ۳۶/۳۸-۳۹)

﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾ کائنات کے تمام معاملات کی تدبیر اللہ تعالیٰ اپنے ارادے اور حکمت کے ساتھ کرتا ہے، وہ کسی کو زندگی کسی کو موت، کسی کو صحت کسی کو بیماری، کسی کو عزت کسی کو ذلت عطا کرتا ہے، تخلیق سے لے کر موت اور بقاء تک ہر کام اس کے حکم سے ہوتا ہے۔

﴿يُفَصِّلُ الْآيَاتِ﴾ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ آیات سے قرآنی اور تکوینی دونوں قسم کی آیات مراد لی جاسکتی ہیں، قرآنی آیات کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اور نبی کریم ﷺ نے احادیث میں فرمائی ہے جبکہ تکوینی آیات، ارض وسما، شمس وقمر، نباتات وجمادات، فلکیات وارضیات، انسان اور حیوان کی صورت میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں، اور تو اور خود انسان کے اندر بھی بے شمار ہیں۔

﴿لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ﴾ انسان جب کائنات پر اور اس کے عجیب وغریب نظام پر غور وفکر کرتا ہے تو اسے یقین آجاتا ہے کہ وہ عظیم ذات، جو یہ سب کچھ پہلی دفعہ پیدا کرسکتی ہے، وہ اسے دوبارہ بھی پیدا کرسکتی ہے، اس ذات کا کوئی حکم اور کوئی تخلیق حکمت اور فائدہ سے خالی نہیں، انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے، اسے بھی عبث اور فضول پیدا نہیں کیا گیا لہٰذا موت کے بعد اس کا اللہ کے حضور پیش ہونا اور زندگی کا حساب دینا ضروری ہے۔

﴿۳﴾...... آسمانوں کے بعد زمینی نشانیاں بیان کی جارہی ہیں، ان میں سے پہلی نشانی زمین ہے، جو اگرچہ گول ہے لیکن چونکہ طویل وعریض ہے، اس لیے بچھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

دوسری نشانی بلند وبالا اور بھاری بھرکم پہاڑ ہیں جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں تو دوسری طرف ان کی چوٹیوں پر برف کی شکل میں پانی کا بہت بڑا ذخیرہ رکھ دیا گیا ہے جو چشموں کی صورت میں دنیا کو سیراب کرتا ہے، ایسے پہاڑ بھی ہیں جن کی چوٹی پر برف تو نہیں ہوتی مگر ان کی بلندیوں پر رہنے والے انسانوں کے لیے قدرتی پائپ لائن کے ذریعے اوپر ہی پانی پہنچایا جاتا ہے، یہ پانی گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم ہوتا ہے، اور ایسے پہاڑوں کی بھی کمی نہیں جن کا سینہ معدنیات کا خزینہ ہوتا ہے، کہیں سے پٹرول نکلتا ہے اور کہیں سے کوئلہ، کہیں سے سونا چاندی اور کہیں سے ہیرے جواہرات۔

تیسری نشانی وہ نہریں ہیں جو پہاڑوں کے درمیان بہتی اور دلکش منظر پیدا کرتی ہیں۔

چوتھی نشانی نباتات میں نر اور مادہ کی تقسیم ہے، انسان سائنسی تحقیقات سے قبل اس تقسیم سے واقف نہ تھا، حیوانوں میں نر اور مادہ کا وجود تو وہ تسلیم کرتا تھا مگر اس حقیقت سے قرآن نے پردہ اٹھایا کہ نر اور مادہ نہ صرف پودوں اور پھلوں میں ہوتے ہیں بلکہ اس کائنات کی ہر شے جوڑے کی شکل میں بنائی گئی ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾{۲} ''اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

آج کا انسان اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے۔

پانچویں نشانی رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا ہے، وہ منظر کیسا پُر اثر اور خوبصورت ہوتا ہے جب پو پھٹتی اور صبح صادق طلوع ہوتی ہے، دھیرے دھیرے اندھیرا پیچھے ہٹتا اور روشنی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، پھر افق سرخ ہو جاتا ہے، تاحدِ نظر پھیلے ہوئے نقاب کو ہٹا کر سورج برآمد ہوتا ہے، ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے، چلتے چلتے سورج سر پر آ جاتا ہے، یہ دن کا شباب ہوتا ہے پھر زوال شروع ہو جاتا ہے، قدم بقدم بڑھتا ہوا سورج مغرب میں اتر جاتا ہے اور شب کا اندھیرا دن کے اجالے کو کھا جاتا ہے، دیکھنے میں یوں لگتا ہے جیسے ایک سیاہ چادر ہے جس سے دن کی روشنی کو چھپایا جا رہا ہے۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ بلاشبہ تاحدِ نظر پھیلی ہوئی زمین، فلک بوس پہاڑوں، ان کے دامن میں بہتے ہوئے ندی نالوں، پھلوں اور پھولوں اور آگے پیچھے آنے والے شب و روز میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو ان میں غور و فکر کرتے ہیں، ایسے لوگ ان آیات سے اللہ کے وجود، اس کی قدرت و حکمت اور کمالِ علم پر استدلال کرتے ہیں۔

﴿۴﴾......ارض و سماء کی عمومی نشانیاں بیان کرنے کے بعد قرآن انسان کو خود زمین کی ساخت، اس کی خصوصیات اور اس سے اگنے والی نباتات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

زمین کے مختلف قطعات اور اجزاء باہم متصل ہونے کے باوجود الگ الگ خصوصیات کے حامل ہیں، بعض زرخیز ہیں اور بعض بنجر اور چٹیل ہیں، بعض سنگلاخ ہیں اور بعض ریگِ رواں پر مشتمل ہیں، کوئی قطعہ سرخ ہے اور کوئی زرد، کوئی سفید ہے اور کوئی سیاہ، بعض آبی ہیں اور بعض بارانی، بعض بستیاں بسانے کے لیے ہیں اور بعض جنگلات کے لیے، بعض اجزاء میں کھجور اور انگور کے باغات لہلہاتے ہیں اور بعض میں دوسری فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔

﴿وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ﴾ یہ سارے پھل ایک ہی زمین سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی پانی سے انہیں سیراب کیا جاتا ہے اور آفتاب و ماہتاب کی شعاعوں سے بھی یکساں مستفید ہوتے ہیں، پھر بھی ان کے ذائقے اور رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

{۲} (الذاریات ۵۱/۴۹)

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ اس تقابل اور اختلاف میں اہلِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں، زمین کے قطعات متصل ہونے کے باوجود مختلف، ان قطعات پر اگنے والے باغات مختلف، ان کے ذائقے، رنگ اور مٹھاس مختلف! وہ کون ہے جو ایک ہی زمین کے مختلف اجزاء میں اور ایک ہی درخت پر لگنے والے پھلوں میں فرق رکھتا ہے؟

حکمت و ہدایت:

۱......"وَالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ" سے بعض حضرات نے قیاس کے دلیلِ شرعی نہ ہونے پر استدلال کیا ہے، طرزِ استدلال یہ ہے کہ اللہ نے حق اسی چیز کو فرمایا ہے جسے اس نے نازل فرمایا، اور قیاس سے ثابت ہونے والا حکم "أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ" میں داخل نہیں ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ قیاس حجتِ شرعی نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب قیاس پر عمل کا حکم اللہ کی طرف سے ہے تو اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی اللہ ہی کا حکم ہوگا، اس لیے کہ لفظ "الحق" اگرچہ معرفہ لایا گیا ہے لیکن "ما أنزل" میں عموم ہے، اس لیے اس عموم میں ہر حکم داخل ہے، چاہے وہ صراحتًا ثابت ہو یا ضمنًا! اور قیاس سے صراحتًا تو نہیں لیکن ضمنًا حکم ثابت ہوتا ہے، لہٰذا اس کا حجت ہونا ثابت ہوگیا۔

۲......قرآنِ کریم کا منزل من اللہ ہونا اور اس کا حق وصواب ہونا یقینی ہے، اس کی آیات، اسلوبِ بیان اور اعجاز میں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں لیکن جائے تعجب ہے کہ بدقسمت لوگ اس مدلّل کتاب کے بھی انکاری ہیں۔(۱)

۳......کائنات کی تخلیق، اس کے اثرات وآثار اور زمین پر بکھری حیات اور اس کے عجائبات گہری حکمت پر مبنی ہیں۔(۲)

۴......مناظرِ قدرت صرف انسانی طبیعت کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی عظمت کو پہچاننے کا ایک واسطہ ہیں۔(۲)

۵......سورج، چاند، ستارے اور سیارے اپنے معین مدار سے بال برابر منحرف نہیں ہوتے لیکن انسان اللہ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر اوہام وظنون کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔

۶......سورج طلوع ہو کر غرب ہوتا ہے، اجالا اندھیرے میں بدل جاتا ہے، یہ درحقیقت انسانی وجدان پر ایک ضرب ہے کہ زندگی ہمیشہ کے لیے نہیں بہت جلد اس کا سورج بھی ماند پڑ جائے گا۔(۲)

۷......بلندیوں پر تنا آسمان کا عظیم شامیانہ اور بچھی ہوئی زمین کا شاندار فرش، جامد وساکت پہاڑ اور شور مچاتی ندیاں اور نالے، یہ سب کچھ انسان کے ذہنی جمود کے توڑ کے لیے ہے، تاکہ اس کے ضمیر میں اللہ کی وحدانیت اور قدرت کا تصور راسخ ہوجائے۔

۸......علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح انسانوں کی ابتداء دو افراد یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام سے ہوئی اور بعد میں یہ بڑھتے چلے گئے، اسی طرح پہلے جتنے بھی اشجار، پھل اور میوے ہیں ان کی ابتداء بھی دو قسم کے پھلوں سے ہوئی، بعد میں ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔{۳}

۹......جس طرح ایک ہی قسم کے پانی سے اگنے والے پھل پھول مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مربیّ کے متوسّلین کے باطنی حالات بھی ہوتے ہیں، اس میں قصور مربیّ کا نہیں بلکہ معاملہ دلوں کی استعداد کا ہے۔{۳}(۴)

۱۰......ایک ہی پانی اور ایک ہی زمین سے مختلف قسم کے میووں کا اخراج اس بات کی دلیل ہے کہ فاعلِ حقیقی اللہ رب العزت کی ذات ہے، اگر پانی، مٹی اور سطحِ زمین فاعل ہوتے تو رنگ، خوشبو اور ذائقوں کا یہ اختلاف کبھی نہ ہوتا۔{۵}(۴)

۱۱......مظاہرِ فطرت کا باہم مربوط نظام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ہماری دنیوی زندگی کا ربط بھی ایک اور جہان سے ہے، اور وہ آخرت کا جہاں ہے، اس ربط اور وابستگی کو سامنے رکھ کر دنیا میں آخرت کی تیاری کرنی چاہیے۔

۱۲......ارض وسما میں بکھرے ہوئے مظاہر اللہ تعالیٰ کے وجود اور قدرت پر بہت مظبوط دلیل ہیں۔

۱۳......حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح پھلوں، پھولوں کے رنگ و ذائقہ کے اختلاف کے باوجود ان کی اصل ایک ہے، اور وہ ''پانی'' ہے، اسی طرح انسانوں میں بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ ہیں، لیکن اصل ان کی ایک ہے۔{۶}

مشرکین کا اظہارِ تعجب اور مطالبہ

﴿۵......۷﴾

وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ أُولَٰئِكَ

اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے ہم مٹی کیا نئے سرے سے بنائے جائیں گے؟ وہی ہیں جو

{۳} (تفسیر قاسمی ۳۲۷/۹)
{۴} (بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد ۵/۱۰۴)
{۵} (قرطبی ۲۳۹/۹)
{۶} (منیر ۱۰۹/۱۳)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ

منکر ہو گئے اپنے رب سے اور وہی ہیں کہ طوق ہیں ان کی گردنوں میں اور وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی

فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ

میں رہیں گے برابر ○ اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے برائی کو پہلے بھلائی سے اور گزر چکے ہیں ان سے پہلے

قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ

بہت سے عذاب اور تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے، اور تیرے رب کا

لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا

عذاب بھی سخت ہے ○ اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے، تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے اور ہر

أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

قوم کے لیے ہوا ہے راہ بتانے والا ○

ربط: سابقہ آیات میں ارضی اور سماوی دلائل کے ذریعے اللہ کی قدرت ثابت کی گئی تاکہ انسان جان لیں کہ جو ذات ایسی عظیم اشیاء کی تخلیق پر قدرت رکھتی ہے، وہ بعث بعد الموت پر بھی یقیناً قادر ہے، یہاں مشرکین کے انکار اور عذاب کے لیے ان کی عجلت کا ذکر ہے۔

تسہیل: اے محمد ﷺ! اگر آپ کو کفار کے انکارِ نبوت پر تعجب ہوتا ہے تو اس سے زیادہ تعجب کی بات ان کا یہ کہنا ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں ازسرِ نو پیدا کیا جائے گا؟ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں قیامت کے دن طوق ہوں گے اور یہی اہلِ دوزخ ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ اور یہ لوگ عافیت کے بجائے عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے عذاب کے کئی واقعات گزر چکے ہیں، تو انہیں عذاب دینا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں، اور تمہارا رب گناہوں کے باوجود لوگوں کو معاف کر دیتا ہے دوسری جانب تمہارا رب سخت سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے ○ اور کافر کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ یہ اعتراض حماقت ہے کیونکہ آپ تو صرف خبردار کرنے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی رہنما ہوتا ہے ○

تفسیر

﴿۵﴾...... اے میرے پیغمبر ﷺ! آپ کو تعجب ہوتا ہے مشرکین کے انکارِ نبوت اور بت پرستی پر، حالانکہ اس سے زیادہ

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ دوسری زندگی اور قیامت کا انکار کرتے ہیں، ان کی محدودسی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ان کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی تو انہیں جمع کر کے ان میں دوبارہ روح کیسے پھونکی جائے گی، وہ بار بار سوال کرتے ہیں:

﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ﴾{۷} ''کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ یہ واپسی تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی عقل کو تنگ دائرے میں محدود کر رکھا تھا اور اپنی گردنوں میں رسم ورواج اور آباء پرستی کے طوق ڈال رکھے تھے، یہ طوق انہیں کسی معقول بات پر سنجیدگی سے توجہ کی اجازت نہیں دیتے تھے، چنانچہ انہیں آخرت میں سزا بھی ایسی ہی دی جائے گی اور ان کی گردنوں میں ایسے وزنی طوق ڈال دیئے جائیں گے کہ وہ گردن ہلا نہیں سکیں گے، دنیا میں انہوں نے خود اپنی گردنوں میں طوق ڈالے تھے، آخرت میں بطور سزا ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے جائیں گے، سورۂ غافر میں ہے:

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ﴾{۸} ''جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ گھسیٹے جائیں گے۔''

بعث بعد الموت کے انکار کو سب سے زیادہ قابلِ تعجب اس لیے قرار دیا گیا ہے کیونکہ ہر صاحبِ عقل تسلیم کرتا ہے کہ اعادہ، ابتداء کے مقابلے میں بہت آسان ہوتا ہے، سورۂ روم میں ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ﴾{۹} ''اور وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اس پر بہت آسان ہے۔''

اور یہ کہ جو ذات بڑی بڑی چیزوں کو پیدا کر سکتی ہے اس کے لیے چھوٹی چیزیں پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓي اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾{۱۰} ''وہ یہ حقیقت کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہیں! وہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

{۷} (ق ۵۰/۳)
{۸} (المؤمن ۴۰/۷۱)
{۹} (الروم ۳۰/۲۷)
{۱۰} (الاحقاف ۴۶/۳۳)

﴿۶﴾......چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اللہ کے عذاب سے عافیت اور پناہ مانگتے اور انہیں جو مہلت دی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھاتے، مگر وہ اس کے بجائے عذاب کے لیے جلدی مچانے لگے، سورۂ انفال میں ہے:

﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾{۱۱}

''اور وہ بات بھی یاد کرو جو انہوں نے کہی تھی کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن واقعی تیرا کلام ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا، یا ہمیں المناک عذاب سے دوچار کردے۔''

﴿وَقَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ﴾ یہ عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں مگر ان لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل نہیں کرتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، جب انہوں نے جھٹلایا اور وہ کفر وعناد پر اڑے رہے تو ان پر عذاب آیا اور وہ بعد میں آنے والوں کے لیے ایک عبرت آموز مثال بن گئے۔

﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ﴾ ان جملوں میں اللہ کی مغفرت کا بھی ذکر ہے اور اس کے عذاب کا بھی، اس کی مغفرت کا یہ عالم ہے کہ بندے دن رات نہ صرف اس کی نافرمانی کرتے ہیں بلکہ اس کی کبریائی کو چیلنج بھی کرتے ہیں، وہ اس کے باوجود ان پر اپنا عذاب نازل نہیں کرتا، وہ خود فرماتا ہے:

﴿وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا﴾{۱۲}

''اور تیرا رب بخشنے والا صاحب رحمت ہے، اگر وہ ان کے کرتوتوں پر انہیں پکڑنے لگے تو وہ ان پر فوراً عذاب بھیج دے بلکہ اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، جب وہ وقت آجائے گا تو انہیں اس عذاب سے بچنے کی کوئی پناہ کی جگہ نہیں ملے گی۔''

اور اس کے عذاب کا یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی پر اپنا غضب نازل کرنے کا فیصلہ فرمالے تو اس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

قرآنِ کریم، باری تعالیٰ کی مغفرت اور عذاب دونوں کا اکٹھے ذکر اس لیے کرتا ہے تاکہ امید اور خوف میں اعتدال باقی رہے، {۱۳} حد سے زیادہ امید انسان کو بے عمل بلکہ بدعمل بنادیتی ہے جبکہ حد سے زیادہ خوف اسے مایوسی کے اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

{۱۱} (الانفال ۳۲/۸)

{۱۲} (الکہف ۵۸/۱۸)

{۱۳} ''ان ربک لذو مغفرة'' أی أنه تعالیٰ ذوعفو وصفح...... ثم قرن هذا الحکم بأنه شدید العقاب لیعتدل الرجاء والخوف۔ (ابن کثیر ۲/۶۵۱)

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ﴾ الخ

تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿لولا عفو الله ورحمته وتجاوزه ماهنا أحدًا العيش ولولا وعيده وعقابه لاتكل كل أحد﴾ {۱۴}

”اگر اللہ تعالیٰ عفو ودرگزر کا معاملہ نہ فرماتا تو کسی کے لیے بھی زندگی میں کوئی مزہ باقی نہ رہتا اور اگر اس کی وعید اور سزا کا خوف نہ ہوتا تو ہر کوئی مغفرت کی امید پر بے عمل ہو کر بیٹھ جاتا۔“

مغفرت اور عذاب کے مضمون کو صرف اس آیت میں جمع نہیں کیا گیا بلکہ قرآنِ مجید میں کئی دوسرے مقامات پر بھی ان دونوں کو اکٹھے ذکر کیا گیا ہے۔

سورۂ حجر میں ہے:

﴿نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ۝﴾ {۱۵}

”اے پیغمبر میرے بندوں کو بتا دو کہ میں بڑا بخشنے والا ہوں بڑا مہربان ہوں　اور یہ کہ میرا عذاب بھی درد دینے والا عذاب ہے۔“

سورۂ اعراف میں ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾ {۱۶}

”بلاشبہ تیرا رب نافرمانوں کو جلد سزا دیتا ہے اور توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا اور ان پر رحم فرماتا ہے۔“

﴿۷﴾......عذاب کے لیے مشرکین جو جلدی مچاتے تھے، اسے ذکر کرنے کے بعد ان کا ایک اور مطالبہ ذکر کیا جا رہا ہے، صورت یہ تھی کہ وہ قرآنِ کریم جیسے علمی معجزہ کے علاوہ بے شمار مادی معجزات دیکھ چکے تھے، اس کے باوجود محض ضد اور عناد کی بناء پر وہ نت نئے معجزہ کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، ان کے اس مطالبہ کے جواب میں کہا گیا کہ آپ فرما دیجیے، میں تو صرف خبردار کرنے کے لیے آیا ہوں، معجزات کا ظاہر کرنا میرے اختیار میں نہیں، یہ اختیار تو صرف اللہ کے پاس ہے، وہ چاہے تو کوئی معجزہ دکھا دے اور چاہے تو نہ دکھائے۔

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ جیسے ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی ھادی اور رہنما رہا جو انہیں اللہ کی طرف بلاتا تھا، میں بھی تمہارے لیے ھادی اور داعی بن کر آیا ہوں تا کہ تمہیں خیر و فلاح کی طرف دعوت دیتا رہوں۔

{۱۴} (ابن کثیر ۲/۲۵۲ ...... علامہ قرطبی اور علامہ زمخشری نے ”علی بن زید“ کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔)
{۱۵} (الحجر ۱۵/۴۹-۵۰)
{۱۶} (الاعراف ۷/۱۶۷)

حکمت وہدایت:

۱......مشرکین کی جانب سے بعث بعد الموت کے انکار کی وجہ سے اللہ کو تعجب نہیں ہوا کیونکہ اللہ تعجب سے پاک ہے بلکہ اس سے اللہ کے نبی اور اہلِ ایمان کو تعجب ہوتا تھا۔(۵)

۲......بعث بعد الموت کا انکار کرنے والا کافر ہے کیونکہ وہ اللہ کی قدرت اور علم کا انکار کرتا ہے اور بعث کے متعلق دی گئی خبروں کو جھوٹا کہتا ہے۔(۵)

۳...... دائمی عذاب صرف کفار اور مشرکین کے لیے ہے، گناہ گار مسلمان ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں رہیں گے۔(۵)

۴......عذاب کے لیے جلدی مچانا ضدی اور ہٹ دھرم کفار کی عادت ہے، مسلمان کبھی یہ حرکت نہیں کرتا۔

۵......نبی کریم ﷺ کی امتِ اجابت ہو یا امتِ دعوت، اس پر ایسا عذاب نہیں آئے گا جو اس کا نام ونشان مٹا دے، امتِ اجابت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں قبولِ ایمان کی توفیق مل گئی اور امتِ دعوت میں وہ سارے انسان شامل ہیں جو آپ ﷺ کی تشریف آوری سے لے کر قیامت تک دنیا میں آئیں گے۔

۶......اگر مشرک ایمان لے آئیں اور گناہ گار توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرماتا ہے بلکہ بعض اوقات توبہ سے پہلے ہی کبیرہ کے مرتکب کو معاف فرما دیتا ہے کیونکہ آیت (۶) میں "عَلٰی ظُلْمِهِمْ" کے جو الفاظ آئے ہیں ان کا مصداق وہ شخص ہے جو گناہ میں مشغول ہو اور ظاہر ہے گناہ میں مشغول ہونے کی حالت میں کوئی شخص تائب نہیں ہوتا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیتِ کریمہ کو قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید افزا آیت قرار دیا ہے۔{۱۷}

۷......باری تعالیٰ قرآنِ کریم میں بار بار مغفرت اور عذاب کو اکٹھے ذکر فرماتے ہیں تاکہ انسان اعتدال پر رہے، نہ تو مایوس ہو کر گمراہ ہو جائے اور نہ ہی موہوم امیدوں کی وجہ سے بےعمل ہو جائے۔(۶)

۸......انبیائے کرام علیہم السلام کی نہ تو بعثت کا مقصد یہ تھا اور نہ ہی انہیں یہ اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ معاندین کے الٹے سیدھے مطالبات کے جواب میں معجزات اور کرشمے دکھاتے رہیں بلکہ انہیں تعلیم وتبلیغ اور اصلاح وتزکیہ کے لیے دنیا میں بھیجا جاتا تھا۔(۷)

۹......ہر ملک اور قوم کے لیے اللہ کسی نہ کسی کو ھادی بنا کر بھیجتا ہے(۷) مگر ہر ہادی کا نبی ہونا ضروری نہیں، علماء اور

{۱۷}قال ابن عباس: أرجی آیۃ فی کتاب اللہ "انّ ربّك لذو مغفرۃ......الخ (قرطبی ۹/۲۴۳)

مشائخ کی صورت میں جو وارثانِ انبیاء ہوتے ہیں، یہ بھی ہادی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس آیتِ کریمہ میں ''ھادی'' سے اللہ کی ذات مراد لی ہے یعنی نبی صرف تبلیغ اور انذار کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہدایت دینے والا صرف اللہ ہے، وہ چاہے تو ہدایت دے اور چاہے تو نہ دے۔

۱۰......قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر مخالفین کی طرف سے معجزہ دکھانے کا مطالبہ مذکور ہے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہیں کوئی معجزہ دکھایا ہی نہیں گیا تھا کیونکہ کتبِ سیرت میں ایسے بے شمار معجزات ذکر کیے گئے ہیں جو سرورِ دوعالم ﷺ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے، پھر سب سے بڑا معجزہ قرآن تھا جو ان کے حالات سے بھی بہت زیادہ مناسبت رکھتا تھا کیونکہ انہیں اپنی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا اور قرآن اسی میدان میں انہیں مقابلہ کرنے کی دعوت دے رہا تھا مگر تاریخ گواہ ہے کہ ساری دنیا کو گونگا کہنے والے خود قرآن کے چیلنج کے جواب میں گونگے بنے رہے اور انہیں لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی، مشرکین کے مطالبات یا تو ضد اور عناد پر مبنی تھے یا ذاتی مفادات پر، مثلاً یہ کہ اگر تم واقعی نبی ہو تو پہاڑوں کو دور ہٹا کر وسیع میدان بنا دو اور یہ کہ یہاں نہریں اور چشمے جاری کر دو اور باغات لہلہا دو، یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو لوگ بار بار معجزہ دکھانے کا مطالبہ کرتے رہے ان میں سے اکثر کو معجزہ دیکھ لینے کے باوجود قبولِ ایمان کی توفیق نہ ہوئی اور جنہوں نے ایمان قبول کیا انہوں نے کوئی مادی معجزہ دیکھے بغیر محض آپ کی صورت و سیرت اور دعوت سے متاثر ہو کر صداقت کے سامنے گردن جھکا دی۔

اللہ کا علمِ محیط

﴿۸......۱۱﴾

اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ

اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ اور جو سکڑتے ہیں پیٹ اور بڑھتے ہیں اور ہر چیز کا اس کے یہاں

بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ

اندازہ ہے ۝ جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر ۝ برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر اور

مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ

جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو ۝ اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے

يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى

آگے سے اور پیچھے سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک

يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ‌ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوۡمٍ سُوۡۤءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ‌ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ

وہ نہ بدلیں جو ان کے جیوں میں ہے، اور جب چاہتا ہے اللہ کسی قوم پر آفت پھر وہ نہیں پھرتی اور کوئی نہیں

دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

ان کا اس کے سوا مددگار O

ربط: پہلے بتایا گیا کہ مشرکین بعث بعد الموت کا انکار کرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے معجزات دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں، یہاں بتایا جارہا ہے کہ اللہ کا علم محیط ہے، وہ غائب وحاضر کو بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ قبر میں انسانی جسم کے اجزاء کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون ہدایت کے لیے معجزہ دکھانے کا مطالبہ کرتا ہے اور کون ضد اور عناد کی بناء پر!

تسہیل: اللہ اس بچے کو بھی جانتا ہے جو ہر مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوئے ہے اور اس میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اس سے بھی باخبر ہے، اور اس کے ہاں ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے O وہ پوشیدہ اور ظاہر سب چیزوں کا جاننے والا ہے، وہ سب سے بڑا اور عالی شان ہے O تم میں سے کوئی چپکے سے بات کہے یا پکار کر کہے، پھر کوئی رات کو چھپ جائے یا دن میں چلتا پھرتا ہے، اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں O ہر شخص کے آگے اور پیچھے اللہ کے فرشتے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، اگر کسی قوم کو کوئی نعمت حاصل ہو تو اللہ اسے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنی حالت نہ بدل لے اور اگر اللہ کسی قوم کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کرلے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں O

﴿ تفسیر ﴾

﴿۸﴾......ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کا ذکر ہے، اس کا علم محیط ہے، اسے صرف کلیات کا نہیں جزئیات کا بھی علم ہے، ارض وسما اور بحر وبر کی کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں حتّٰی کہ وہ حاملہ کے حمل کے بارے بھی تفصیل سے جانتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، ایک ہے یا زیادہ، خوبصورت ہے یا بدصورت، ذہین ہے یا غبی، سعید ہے یا شقی، اس کی عمر مختصر ہوگی یا طویل، اس حمل میں جو کمی بیشی ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے کوئی بچہ ناقص ہوتا ہے اور کوئی کامل، کسی کی ولادت جلدی ہوجاتی ہے اور کسی کی دیر سے، وہ اس کی بیشی سے بھی باخبر رہتا ہے۔

﴿ وَكُلُّ شَىۡءٍ عِنۡدَهٗ بِمِقۡدَارٍ ﴾ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک وقت، اندازہ اور پیمانہ متعین ہے، نہ اس میں کمی

ہو سکتی ہے نہ زیادتی، سورۂ قمر میں ہے:

﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ {۱۸} ''ہم نے ہر چیز کو ایک مخصوص انداز سے بنایا ہے۔''

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی بیٹیوں میں سے ایک نے آپ کو پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا جاں کنی کے عالم میں ہے لہٰذا آپ تشریف لائیں، آپ نے جواب میں فرمایا کہ ''اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ وہ لیتا ہے اور اسی کا ہے جو وہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک ہر چیز کا ایک وقت متعین ہے، میری بیٹی سے کہو صبر کرے اور ثواب کی نیت کرلے۔'' {۱۹}

﴿۹﴾......وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو غیب ہیں اور ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو ظاہر ہیں، غیب سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کا حواس سے ادراک نہیں ہو سکتا، نہ انہیں آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، نہ کانوں سے سنا جاسکتا ہے، نہ زبان سے چکھا جاسکتا ہے، نہ ناک سے سونگھا جاسکتا ہے اور نہ ہی ہاتھوں سے چھوا جاسکتا ہے۔

غیب کے مقابلے میں ظاہر سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کا حواس سے ادراک ممکن ہو۔

﴿الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ﴾ پہلے جملوں میں اللہ کے کمالِ علمی کا بیان تھا تو اس جملے میں کمالِ قدرت و عظمت کا بیان ہے، کفار اور مشرکین اللہ کی کبریائی تو تسلیم کرتے تھے مگر نادانی کی وجہ سے اللہ کے لیے ایسی صفات ثابت کر دیتے تھے جن سے وہ منزّہ اور پاک ہے، چنانچہ کسی نے اللہ کے لیے اولاد ثابت کر دی، کسی نے اعضاء اور کسی نے جہت اور سمت ثابت کر دی حالانکہ وہ ان چیزوں سے بہت بلند ہے، اسی لیے اللہ قرآنِ کریم میں مختلف انداز سے بار بار ایسی تمام صفات سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی گئی ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

﴿۱۰﴾......اس آیت میں بھی علم اور قدرت کے کمال ہی کا بیان ہے، وہ علانیہ کلام کو بھی سنتا ہے اور انتہائی پست آواز کو بھی، سورۂ طٰہٰ میں ہے:

﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ {۲۰} ''اور اگر تم پکار کر بات کہو تو اسے بھی وہ سنتا ہے کیونکہ وہ تو پوشیدہ راز اور انتہائی مخفی بات کو بھی جانتا ہے۔''

سورۂ نمل میں ہے:

﴿وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ {۲۱} ''اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔''

{۱۸} (القمر ۵۴/۴۹)
{۱۹} (بخاری ۲، کتاب القدر/ ۹۷۶)
{۲۰} (طٰہٰ ۲۰/۷)
{۲۱} (النمل ۲۷/۲۵)

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر بڑے پیارے انداز میں فرمایا تھا کہ:
پاک ہے وہ ذات جس کی قوتِ سماع ساری آوازیں سن لیتی ہے، اللہ کی قسم! جھگڑا کرنے والی عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے شوہر کی شکایت ایسے حال میں کر رہی تھی کہ میں گھر کے ایک کونے میں موجود تھی اس کے باوجود اس کی بعض باتیں میں سن نہ سکی، مگر اللہ نے آسمانوں پر اس کی باتیں سن لیں {۲۲} اور یہ آیت نازل فرما دی:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①﴾ {۲۳}

"جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑا کرتی اور اللہ سے اپنے رنج والم کی شکایت کر رہی تھی اللہ نے اس کی بات سن لی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

﴿وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ﴾ اللہ اسے بھی جانتا ہے جو رات کی تاریکی میں اپنے گھر میں چھپا ہوا ہو اور اسے بھی جانتا ہے جو دن کی روشنی میں سرِ عام چل پھر رہا ہو، یہ دونوں نہ اس کے علم سے باہر ہیں نہ قدرت سے، غرضیکہ کوئی کسی حال اور کسی مقام میں کیوں نہ ہو، اللہ اسے جانتا بھی ہے اور اللہ کو اس پر مکمل قدرت واختیار بھی حاصل ہے۔

سورۂ یونس میں ہے:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ⑥١﴾ {۲۴}

"اے میرے پیغمبر! آپ کسی حال میں بھی ہوں اور آپ قرآن کے جونسے حصّے کی تلاوت کر رہے ہوں اور اے لوگو! تم جو بھی کام کر رہے ہو، تم ہماری نظر میں ہوتے ہو جب تم کسی کام میں مشغول ہوتے ہو اور تمہارے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، یہ سب کچھ واضح کتاب میں درج ہے۔"

حفاظت کرنے والے فرشتے:

﴿۱۱﴾...... ہر انسان کے ساتھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے انسان کو حوادث سے بھی بچاتے ہیں اور اس کے اعمال اور احوال کی نگرانی بھی کرتے ہیں، ان کی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے، کچھ دن میں ہوتے ہیں اور کچھ رات میں، ان کی ذمہ داریوں میں انسان کی حفاظت بھی شامل ہے اور اس کے اعمال کی کتابت بھی، ویسے تو اللہ

{۲۲} المراغی ۷۶/۱۳)
{۲۳} المجادلۃ ۱/۵۸)
{۲۴} (یونس ۶۱/۱۰)

تبارک وتعالیٰ حفاظت اور کتابت کے لیے کسی واسطے کے محتاج نہیں مگر انسانوں کو تعلیم دینے اور ان پر حجت قائم کرنے کے لیے انہوں نے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے جس نظام سے انسان عام طور پر مانوس بھی ہے اور اس کی وقعت اور اہمیت بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، ہر انسان کے دائیں اور بائیں دو فرشتوں کی ڈیوٹی ہے، دائیں جانب والا نیکیاں لکھتا ہے اور بائیں جانب والا گناہ! جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝﴾ {۲۵}

"جب انسان کوئی کام کرتا ہے تو دو لکھنے والے جو دائیں اور بائیں بیٹھتے ہیں، لکھ لیتے ہیں اس کی زبان پہ جو بات بھی آتی ہے، اسے لکھنے کے لیے ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔"

یونہی یہ فرشتے اللہ کے حکم سے حوادث و مصائب سے انسان کی حفاظت بھی کرتے ہیں، جب خود اللہ کسی کو آزمائش میں ڈالنا چاہیں تو فرشتوں کو ہٹا دیا جاتا ہے، ہر انسان کو زندگی میں ایسے حوادث پیش آتے ہیں جب وہ محسوس کرتا ہے کہ کسی غیبی طاقت نے اسے بچا لیا ہے ورنہ اس کی ہلاکت میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی، آج جبکہ انسان نے نگرانی کے لیے ویڈیو اور آڈیو دونوں قسم کے جدید ترین آلات تیار کر لیے ہیں، فرشتوں کی نگرانی کا معاملہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔

﴿يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ "اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں" اس جملے کا دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو یہ فرشتے اس امید پر اس کے لیے استغفار کرتے ہیں کہ اسے توبہ کی توفیق مل جائے {۲۶} جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ﴾ {۲۷} "اے میرے حبیب! آپ ان سے پوچھیے کہ رات یا دن میں تمہیں رحمٰن کے عذاب سے کون بچاتا ہے؟"

عذاب سے بچاؤ میں ہمارے رب کے رحمٰن ورحیم ہونے کے علاوہ فرشتوں کی دعاؤں کا بھی اہم کردار ہے۔

قوموں کا عروج وزوال:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ﴾ قوموں کے عروج وزوال کے لیے اللہ کے ہاں طے شدہ اصول وضوابط ہیں، نہ تو

{۲۵} (ق ۵۰/۱۷)

{۲۶} يحفظونه من بأسه تعالىٰ متى أذنب بالاستمهال أو الاستغفار له۔ (روح المعانی ۱۳،۸/۱۶۱)

{۲۷} (الأنبياء ۲۱/۴۲)

اس میں حسب نسب کا کوئی دخل ہے اور نہ ہی اتفاقات کا، جیسے شمس وقمر کا طلوع وغروب اور ارض وسما کی گردش سنتِ الٰہیہ کی پابند ہے یونہی اقوامِ عالم کی عزت وذلّت اور خوشحالی وبدحالی بھی سنتِ الٰہیہ کے تابع ہے، کسی قوم کو نعمت اور عافیت سے اس وقت محروم کیا جاتا ہے جب وہ قوم اپنے عدل کو ظلم میں، اطاعت کو بغاوت میں، اعتدال کو افراط وتفریط میں، جہد وسعی کو غفلت اور عیاشی میں، محبت واخوت کو نفرت وعداوت اور غیرت وحمیت کو ضمیر فروشی اور بے حمیتی میں تبدیل کر لیتی ہے۔

ابن ابی حاتم کی ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ:

''اگر کسی بستی یا گھر والے اللہ کی طاعت چھوڑ کر معصیت مں لگ جائیں تو اللہ بھی ان کی خوش عیشی کو قابلِ نفرت زندگی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔''{۲۸}

مصنف ابن ابی شیبہ میں حدیثِ قدسی کے الفاظ یہ ہیں:

﴿مامن قرية ولا أهل بيت كانوا علىٰ ما كرهت من معصيتي ثم تحوّلوا عنها إلىٰ ما أحببت من طاعتي إلاّ تحوّلت لهم عما يكرهون من عذابي إلىٰ مايحبون من رحمتي﴾{۲۹}

''جب کسی بستی یا گھر والے ایسے گناہوں کو چھوڑ کر جن سے میں نفرت کرتا ہوں، میری طاعت میں لگ جاتے ہیں، جس سے میں راضی ہوتا ہوں، تو میں بھی عذاب کو اپنی رحمت میں تبدیل کر دیتا ہوں۔''

بعض سلف سے منقول ہے کہ اگر میں اپنی اولاد یا سواری میں بھی سرکشی دیکھوں تو جان لیتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ ہوگیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سلف کا یہ قول اللہ تعالیٰ کے شدّتِ خوف پر مبنی ہے ورنہ قوموں اور افراد پر آنے والے مصائب اور حالات میں بہت فرق ہے، جہاں تک افراد اور اشخاص کا تعلّق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات کاہلوں، احمقوں اور بدمعاشوں کو ثروت وغنا اور حکومت وسیادت حاصل ہو جاتی ہے اور ان کے مقابلہ میں بڑے بڑے ذہین، محنتی، جفاکش اور شریف لوگ فقر وفاقہ اور مغلوبیت کی زندگی گزارتے ہیں، نافرمانوں کو خوشیاں میسّر آتی ہیں تو فرمانبرداروں پر ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح حوادث کا نزول ہوتا ہے، اس لیے کسی کو غربت، بیماری اور مصیبت میں دیکھ کر یہ کہنا جائز نہیں کہ اس سے اللہ ناراض ہے اور مال ودولت اور صحت وعافیت کی بناء پر ہم کسی کے لیے اللہ کے محبوب ہونے کا

{۲۸} (ابن أبي حاتم بحواله تفسير قاسمي ۹/۳۴۰)
{۲۹} (ابن أبي شيبه بحواله تفسير قاسمي ۹/۳۴۰)

فیصلہ نہیں کر سکتے، کبھی یہ حالات آزمائش اور مہلت کے طور پر آتے ہیں اور کبھی ظاہری اسباب سے ان کا تعلق ہوتا ہے، مثلاً کاہلی اور فضول خرچی کی وجہ سے فقر، حسنِ تدبیر کی وجہ سے خوشحالی، بزدلی کی وجہ سے ذلت اور شجاعت کی وجہ سے عزت، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے بیماری اور پرہیز کی وجہ سے تندرستی، ظلم کی وجہ سے سلطنت کی تباہی اور عدل کی وجہ سے ترقی اور بقاء!

یہ تو معاملہ ہے افراد کا، جہاں تک قوموں اور امتوں کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ دوسرا ہے، قرآنِ کریم کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قومیں آیاتِ الٰہیہ کو مسلسل جھٹلاتی چلی جاتی ہیں، ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتی ہیں، خواہشاتِ نفس کی اتباع میں لگ کر ملک اور قوم کو بھول جاتی ہیں، ظلم اور زیادتی کو اپنا شعار بنا لیتی ہیں، شہوت پرستی میں حد سے تجاوز کر جاتی ہیں، اپنی معیشت اور مادی ترقی پر اتراتی ہیں، اسراف اور نمود و نمائش کی عادت ان میں راسخ ہو جاتی ہے، ان کے دماغ میں اپنی بڑائی کا فتور پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی قومیں زوال کا شکار ہو کر بتدریج ہلاکت کے اندھے کنویں میں جا گرتی ہیں، اس کے برعکس جو قومیں ایمان و یقین، ایثار و احسان، اخوت و محبت، محنت اور جفاکشی، عدل و امانت، اعتدال اور کفایت شعاری جیسی صفات سے متصف ہوتی ہیں اور اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتی ہیں، انہیں عروج اور کمال حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، ایمان کے سوا باقی صفات کا دنیاوی ترقی میں بھی گہرا عمل دخل ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾{۳۰} ''اور جو کوئی آخرت کے ثواب کا طالب ہوگا ہم اسے وہیں کا اجر دیں گے۔''

عذاب تبھی نازل ہوتا ہے جب اجتماعی حالات بدل جاتے ہیں:

﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا﴾{۳۱} ''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیں تو ہم وہاں کے خوشحال لوگوں کو راہِ راست پر چلنے کا حکم دیتے ہیں مگر وہ نافرمانی پر اتر آتے ہیں تو ان پر عذاب کا فیصلہ ثابت ہو جاتا ہے، پھر ہم انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔''

جب اللہ کے عذاب کا فیصلہ آ جائے تو دعائیں رد کر دی جاتی ہیں۔ چند افراد کے رونے دھونے سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ اجتماعی توبہ نہ کی جائے، حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر خوب

{۳۰} (آلِ عمران ۳/۱۴۵)
{۳۱} (الاسراء ۱۷/۱۶)

فرمایا تھا:

﴿اللّٰھم انه لم ینزل بلاء إلاّ بذنب ولم یرفع إلاّ بتوبة﴾ {۳۲}

''اے اللہ! اس میں کوئی شک نہیں کہ بلائیں گناہوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں اور جب تک سچی توبہ نہ کی جائے ان سے نجات نہیں ملتی۔''

پہلی امتوں کے لیے بھی اللہ کا یہی دستور تھا اور اس امت کے لیے بھی یہی دستور ہے:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ {۳۳}

''یہ اللہ کی سنت تھی ان لوگوں کے لیے جو گزر چکے اور تمہیں آج بھی اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئے گی۔''

کتنے سادہ ہیں وہ لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ جن گناہوں کی وجہ سے پہلی قومیں زوال کا شکار ہوئیں، ان گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود ہمارے عروج میں کوئی فرق آئے گا نہ محبوبیت میں! گویا وہ ببول کاشت کرتے تھے تو ببول ہی اگتے تھے مگر ہم ببول کی کاشت کریں گے تو ہر سو گل و لالہ لہلہائیں گے۔

تاریخِ اسلامی اس پر گواہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں جو عزت و سرفرازی، سطوت و سلطنت اور عروج و کمال حاصل تھا، اس سے وہ اسی وقت محروم ہوئے جب ان کے اخلاق و اعمال میں واضح تبدیلی آ گئی، اب بھی اگر وہ دنیا میں باعزت زندگی کی آرزو رکھتے ہیں تو انہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا، ورنہ صرف دعاؤں، تقریروں، نعروں اور دعوؤں سے نہ پہلے کسی کو ذلت سے نجات ملی ہے نہ آج مل سکتی ہے۔

بعض حضرات اس آیت کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتے جب تک کہ کوئی قوم خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کرتی، اگر کوئی قوم ذلت والی زندگی پر قناعت کر چکی ہے تو اسے زبردستی عزت نہیں دی جاتی، یہ مفہوم اگرچہ اپنی جگہ سو فیصد سچائی پر مبنی ہے مگر آیت کا حقیقی مطلب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی کسی بھی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت یا عذاب کا جو بھی معاملہ ہوتا ہے، وہ اس وقت تک تبدیل نہیں ہوتا جب تک کہ اس قوم کے حالات نہیں بدل جاتے۔

﴿وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ﴾ یہ بھی سنتِ الٰہیہ ہی کا بیان ہے کہ جب کوئی قوم اپنے اندر بری تبدیلی لا کر ہلاکت کی مستحق ہو جاتی ہے تو اس پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے اور جب اللہ فیصلہ فرما لیتے ہیں تو انہیں اپنے فیصلے کو عملی

{۳۲} (نیل الاوطار بحوالہ تفسیر قاسمی ۹/۳۴۲)

{۳۳} (الأحزاب ۳۳/۶۲)

جامہ پہنانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

حکمت وہدایت:

۱......اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ ظاہر اور باطن، پوشیدہ اور ظاہر، ماضی حال اور مستقبل، جزئیات اور کلیات ہر ہر چیز کے بارے میں جانتا ہے۔(۸)

۲......یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ مدتِ حمل میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، اگر چہ عام طور پر بچے کی ولادت نو ماہ میں ہوتی ہے مگر یہ کوئی قطعی مدت نہیں، بعض اوقات چھ ماہ میں بھی ولادت ہو جاتی ہے اور کبھی نو ماہ سے زیادہ مدت گزر جاتی ہے۔(۸)

۳......رزق ہو یا زندگی، بارش کا برسنا ہو یا زمین کی پیداوار، اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کی مقدار متعین ہے۔(۸)

۴......عالم الغیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی خصوصیت اور صفت ہے اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔(۹)

۵......ہر انسان کی حفاظت اور اس کے اعمال کی کتابت کے لیے آٹھ فرشتے متعین ہیں، چار دن میں ڈیوٹی دیتے ہیں اور چار رات میں!

۶......اگر چہ افراد کا معاملہ جدا ہے مگر قوموں کے لیے اصول یہ ہے کہ جب ان کی اکثریت اللہ کی نافرمانی پر تل جاتی ہے تو اکا دکا صالحین کے باوجود ان پر اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے جس کی لپیٹ میں صالحین بھی آ جاتے ہیں(۱۱) ایک موقع پر رسولِ اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا:

﴿انھلک وفینا الصّالحون؟﴾ ''کیا صالحین کی موجودگی کے باوجود ہمیں ہلاک کر دیا جائے گا؟''

آپ نے فرمایا:

﴿نعم إذا کثرا لخبث﴾{۳۴} ''ہاں! جب فسق وفجور زیادہ ہو جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾{۳۵} ''اور اس فتنہ سے بچو جس کا وبال صرف ان لوگوں پر واقع نہیں ہوگا جو تم میں سے گناہوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔''

{۳۴}(بخاری ۲، کتاب الفتن/۱۰۴۶)

{۳۵}(الانفال ۸/۲۵)

اللہ کی قدرت اور ربوبیت کے دلائل

﴿۱۲......۱۵﴾

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

وہی ہے کہ تم کو دکھلاتا ہے بجلی ڈر کو اور امید کو اور اٹھاتا ہے بادل بھاری O اور پڑھتا ہے

وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ

گرجنے والا خوبیاں اس کی اور سب فرشتے اس کے ڈر سے اور بھیجتا ہے کڑک بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے اور یہ

يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ

لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی آن سخت ہے O اسی کا پکارنا سچ ہے اور جن لوگوں کو وہ پکارتے ہیں اس کے

مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ

سوا وہ نہیں کام آتے ان کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلائے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آ پہنچے اس کے منہ تک اور وہ کبھی

بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ

نہ پہنچے گا اس تک اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے O اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمانوں

وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾

اور زمین میں خوشی سے اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام O

ربط: اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ بیان کرنے کے بعد اس کے دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔

تسہیل: وہی ہے جو تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے خوف بھی آتا ہے اور امید بھی بندھتی ہے، اور وہی ہے جو پانی سے لدے بادل اٹھاتا ہے O اور بادلوں کی گرج اس کی حمد اور تسبیح بیان کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور وہی ہے جو بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہے گرا بھی دیتا ہے، حیرت ہے کہ یہ دلائل دیکھ لینے کے باوجود کافر اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی قوت والا ہے O اسی کو پکارنا حقیقی پکارنا ہے اور اس کے علاوہ جنہیں یہ پکارتے ہیں، وہ ان کے کسی کام نہیں آسکتے، ان لوگوں کا حال اس شخص جیسا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر یہ چاہے کہ وہ اس کے منہ تک آپہنچے حالانکہ ایسا ہونا ممکن نہیں، بس یونہی کافروں کی دعائیں بھی بے اثر رہتی ہیں O آسمانوں اور زمین میں جتنی بھی مخلوق ہے سب اللہ کے سامنے سجدہ کرتی ہے، کوئی اختیار سے اور کوئی بے اختیار، اور ان کے سائے بھی صبح اور شام سجدہ کرتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۲﴾......اثباتِ توحید اور نفی شرک کے لیے ان آیات میں جو مختلف مناظر اور مثالیں پیش کی گئی ہیں، یہ ان میں سے پہلا منظر ہے جو انسانوں کو اکثر دیکھنے کو ملتا ہے، جب بارش کا سماں ہوتا ہے تو آسمان میں بجلی چمکتی ہے جس سے خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے، کبھی کبھی یہ بجلی انسانوں پر بلائے ناگہانی بن کر آ گرتی ہے جس سے بڑی تباہی ہوتی ہے اس لیے بجلی کی چمک سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے، دوسری طرف بسا اوقات بجلی کی گرج اور چمک کے بعد بارش ہوتی ہے جو زمین میں روئیدگی کا سبب بنتی ہے، اس لیے بجلی کے چمکنے سے دل میں امید پیدا ہوتی ہے۔

﴿وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ ''اور وہی ہے جو پانی سے لدے بادل اٹھاتا ہے'' بظاہر بادلوں کے اٹھنے، بننے، بوجھل ہونے اور برسنے کا پورا ایک نظام ہے جسے سائنسدان اپنے مشاہدات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں، ایمانی حقائق پر یقین رکھنے والا انسان نہ اس نظام سے انکار کرتا ہے نہ مشاہدات کو جھٹلاتا ہے، وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ یہ نظام نہ خود بخود وجود میں آیا ہے اور نہ ہی از خود چل رہا ہے بلکہ ایک قادر و مختار ہستی ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے۔

﴿۱۳﴾......قرآن کا بیان یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ''رعد'' (بادلوں کی گرج) بھی اللہ کی ایک مخلوق ہے جو بظاہر قوتِ گویائی اور عقل و شعور سے محروم ہے مگر قرآن اس کا تذکرہ یوں کرتا ہے گویا وہ ایک زندہ مخلوق ہے اور ذکر و تسبیح میں مصروف ہے، قرآن کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ مناظرِ قدرت کو آثارِ زندگی سے مزین کر دیتا ہے حالانکہ یہ مناظرِ قدرت خاموش ہوتے ہیں، اصل یہ ہے کہ ان مناظر اور مظاہر کا اللہ کے وجود پر دلالت کرنا{۳۶} اور اپنے مقصدِ تخلیق کی تکمیل میں لگے رہنا ہی ان کی تسبیح اور عبادت ہے۔

﴿وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ﴾ تعجب ہے ان لوگوں پر جو اللہ کی قدرت کے مناظر دیکھتے ہیں پھر بھی اس کی قدرت کے بارے جھگڑتے ہیں، کبھی معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں، کبھی عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور کبھی مرنے کے بعد کی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔

﴿۱۴﴾......اللہ ہی اس کا مستحق ہے کہ اسے عبادت، انابت اور عاجزی کے ساتھ پکارا جائے کیونکہ صرف وہی ہے جو مجبور کی دعا قبول کرتا اور کسی کی پریشانی دور کر سکتا ہے، اس کے سوا کسی اور سے دعا کرنا اپنی دعا کو ضائع کرنا ہے، اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارنے والے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی پیاسا پانی کے سامنے کھڑا ہو کر اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا

{۳۶} فلما كان حدوث هذا الصوت دليلا على وجود متعال عن النقص والامكان كان ذلك في الحقيقة تسبيحا وهو معنى قوله تعالىٰ ''وان من شئ الا يسبح بحمده'' (كبير، ۱۹/۲۳)

کر اسے مسلسل پکار رہا ہو کہ آ اے پانی! میرے منہ میں آ جا، حالانکہ پانی خودکسی کے منہ میں جانے والا نہیں، یہ پیاسا شخص پورا دن تو کیا اگر پوری زندگی بھی پانی سے اپنے منہ میں آ پڑنے کی التجا کرتا رہے تو اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا یونہی اللہ کے ماسوا کو پکارنے والوں کے مقاصد بھی کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔

﴿۱۵﴾...... تعجب انگیز منظر یہ ہے کہ صاحب عقل وشعور انسان اپنے جیسے عاجز ولاچار انسانوں، جنوں، فرشتوں، پتھروں اور دوسری دھاتوں سے بنے بتوں کو پکارتا ہے جبکہ آسمانوں اور زمین میں جتنی بھی مخلوق ہے وہ سب اللہ کی عبادت اور بندگی میں مصروف ہے، کوئی نہیں جو اس کے حکم سے سرِ موانحراف کر سکے، کوئی "طَوْعًا" (خوشی سے) اس کی عبادت کرتا ہے اور کوئی "كَرْهًا" (مجبوری سے) بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ "طَوْعًا" کا تعلق آسمانی مخلوق یعنی فرشتوں سے ہے کیونکہ ان کی عبادت مشقت کے بغیر ہوتی ہے جبکہ "کرھا" کا تعلق اہلِ زمین سے ہے کیونکہ ان کی عبادت مشقت سے ہوتی ہے۔{۳۷}

اگر کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ کافر اور مشرک تو اللہ کی عبادت نہیں کرتے پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہوگا کہ سارے زمین والے اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرک اور کافر بھی جب ہر طرف سے مایوس ہو جائیں تو اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾{۳۸}

"پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں اس کے لیے عبادت کو خالص کرتے ہوئے۔"

دوسرا جواب یہ ہے کہ سجدہ سے مراد مخلوق کا اللہ کے سامنے مجبور ہونا ہے اور اس میں کسے شک ہے کہ وجود وعدم، موت وحیات اور فقر وغنا وغیرہ میں کفار بھی حکمِ باری تعالیٰ کے سامنے مجبورِ محض ہیں، نہ اپنی مرضی سے دنیا میں آتے ہیں نہ اپنی مرضی سے جاتے ہیں۔

﴿وَظِلٰلُهُمْ﴾ چیزوں کے سائے بھی اللہ کے سامنے جھکتے ہیں، گویا وہ بھی بندگی میں مصروف ہیں کیونکہ وہ اللہ کی اطاعت سے ذرہ برابر اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔

حکمت وہدایت:

۱...... صاحب نظر انسان جب بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج اور بارش کے برسنے میں غور وفکر کرتا ہے تو اسے اللہ کی

{۳۷} "طوعا" أهل السماء من الملائكة لأنّ عبادتهم بغير مشقة و "كرها" أهل الأرض لأن عبادتهم بالمشقة (تفسير القاسمي ۳۴۸/۹)

{۳۸}(العنكبوت ۲۹/ ۶۵)

قدرت کے دلائل سمجھ آتے ہیں کیونکہ بادل میں ایک طرف پانی ہے جو ٹھنڈا اور تر ہے، دوسری طرف آگ ہے جو گرم اور خشک ہے، ان میں سے بھی پانی کے اجزاء کا غلبہ ہے، پھر وہ کون ہے جو آگ کو پانی پر غلبہ دے کر بجلی کی صورت میں ضد کو ضد سے ظاہر کرتا ہے؟ (۱۲)

یونہی بادلوں میں پانی کا پیدا ہونا اور پھر ان کا لاکھوں کروڑوں ٹن پانی کو اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرنا، یہ بھی کسی حکیم اور قادر کی صنعت گری کے بغیر ناممکن ہے۔

وہ گھن گرج جو ہوا کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے، وہ بھی کسی قادر و مختار ہستی کی قدرت پر واضح دلیل ہے۔ (۱۳)

۲......اس کائنات کی ساری مخلوق خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان، جمادات ہوں یا نباتات، جن ہوں یا فرشتے، سب اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں مگر انسان ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ (۱۳)

۳......جو لوگ نورِ عقل سے محروم ہوتے ہیں وہ سارے دلائل دیکھ لینے کے باوجود اللہ کے وجود، اس کی الوہیت اور قدرت میں شک کرتے اور جھگڑتے ہیں۔ (۱۳)

۴......ایک ہی پکار اور دعا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے اور وہ ہے اللہ سے دعا، اللہ کے سوا جس سے بھی دعا کی جائے وہ باطل اور ضائع ہے۔ (۱۴)

۵......جیسے پانی جامد ہے، نہ کسی کی پکار سنتا ہے اور نہ ہی کسی کی پکار پر اس کے منہ اور پیٹ میں داخل ہو کر اس کی پیاس بجھاتا ہے، یونہی جن بتوں کو مشرک پکارتے ہیں وہ جامد بھی ہیں اور عاجز و لاچار بھی، اپنے پکارنے والے کی کسی حاجت کو وہ پورا نہیں کر سکتے۔ (۱۴)

۶......آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوق طوعًا یا کرھًا اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے، کوئی نہیں جو بال برابر بھی اس کے حکم سے انحراف کر سکے۔ (۱۵)

۷......اشیاء کے سائے کا دائیں بائیں جھکنا پھر گھٹنا اور بڑھنا حقیقت میں اللہ کے سامنے اپنی اطاعت اور بے چارگی کا اظہار ہے۔ (۱۵)

مؤمن اور کافر، حق اور باطل کی مثال

﴿۱۶......۱۷﴾

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ

پوچھ! کون ہے رب آسمان اور زمین کا؟ کہہ دے! اللہ ہے، کہہ! پھر کیا تم نے پکڑے ہیں اس کے سوا ایسے حمایتی جو مالک

لَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ
نہیں اپنے بھلے اور برے کے؟ کہہ! کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا یا کہیں برابر ہے اندھیرا اور اجالا؟
هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ۗ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ
کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اللہ کے لیے شریک کہ انہوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہوگئی
الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ
پیدائش ان کی نظر میں، کہہ! اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست O اتارا اس نے آسمان سے
مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ
پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی موافق پھر اوپر لے آیا وہ نالا جھاگ پھولا ہوا اور جس چیز کو دھونکتے ہیں
عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ
آگ میں واسطے زیور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی، یوں بیان کرتا ہے اللہ حق
وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ
اور باطل کو سو وہ جھاگ تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا
فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾
ہے زمین میں اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں O

ربط: پچھلی آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی عظمت وقدرت کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہے، ان آیات میں عقیدۂ توحید کے اثبات، حق کے دوام اور کفر و باطل کے فنا سے متعلق کلام ہے۔

تسہیل: آپ ان سے سوال کیجیے کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ اور ان کی طرف سے خود ہی جواب دے دیجیے کہ اللہ ہی رب ہے، پھر آپ ان سے سوال کیجیے کہ جب اللہ ہی رب ہے تو تم اسے چھوڑ کر ایسے لوگوں کو کیوں کارساز سمجھتے ہو جو اپنے لیے نفع اور نقصان کا اختیار بھی نہیں رکھتے؟ آپ ان سے یہ بھی پوچھیے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ بھلا جن لوگوں کو یہ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں کیا انہوں نے بھی اللہ جیسی مخلوقات، پیدا کی ہیں جس کی وجہ سے ان پر مخلوقات مشتبہ ہوگئی ہیں؟ فرما دیجیے کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا اور زبردست ہے O وہی آسمان سے بارش برساتا ہے جس سے اپنی اپنی گنجائش کے مطابق نالے بہنے لگتے ہیں اور پانی کا ریلا خس وخاشاک کو اوپر اٹھالیتا ہے اور جس چیز کو زیور یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں، اس میں بھی سیلابی ریلے کی طرح میل کچیل اوپر آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بھی اسی طرح بیان کرتا ہے کہ جھاگ تو خشک ہوکر زائل ہوجاتا ہے لیکن پانی

جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ یہ مثالیں اس لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو O

تفسیر

﴿۱۶﴾...... اے میرے حبیب! آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب متعین ہے اسی لیے ان کے جواب کا انتظار نہیں کیا گیا بلکہ خود ہی جواب دے دیا گیا کہ وہ اللہ ہے، بعض سوالات حصولِ جواب کے لیے نہیں کیے جاتے بلکہ لاجواب اور ذلیل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں، اس آیت میں جو دوسرے سوالات ہیں وہ بھی اسی قبیل کے ہیں، جن سے یہ سوالات کیے جارہے تھے وہ جانتے تھے کہ ہر چیز کا رب اور قادر و مختار صرف اللہ ہے، ان کے خود ساختہ معبود نہ نفع اور نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی مخلوق پیدا کی ہے، ان حقائق کا جاننے اور ماننے والا بینا ہے اور جو ان حقائق سے جاہل ہے یا جاننے کے باوجود انکار کرتا ہے وہ نابینا ہے یونہی ان حقائق سے جہالت، ظلمت اور ان کا علم نور کی طرح ہے، جیسے نابینا اور بینا، ظلمت اور نور مساوی نہیں ہوسکتے یونہی جاہل اور عالم بھی مساوی نہیں ہوسکتے۔

﴿خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ﴾ ان کے معبود کسی بھی قسم کی مخلوق پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، نہ اللہ کی مخلوق جیسی اور نہ ہی اس سے کمتر! لیکن ان پر الزام کو مؤکد کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ "کیا انہوں نے اللہ جیسی مخلوق پیدا کی ہے؟"

﴿۱۷﴾...... ملتے جلتے مناظر ہیں جو مسلسل بیان ہورہے ہیں، بجلی کا چمکنا، بوجھل بادلوں کا فضا میں تیرنا، ان سے بارش کا برسنا اور ندی نالوں کا اپنی گنجائش کے مطابق رواں دواں ہونا، یہ ندی نالے جب بہتے ہیں تو بعض اوقات ان پر اس قدر خس و خاشاک اور جھاگ چھا جاتی ہے کہ پانی چھپ جاتا ہے، سطحی نظر سے دیکھنے والے کو جھاگ ہی جھاگ نظر آتی ہے لیکن اس جھاگ کی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے نہ افادیت اور وزن، اس کے نیچے پانی ہوتا ہے جو شادابی اور زرخیزی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے، اگرچہ وہ کسی کو نظر نہیں آتا لیکن بقاء اسی کے لیے ہوتی ہے اور فوائد بھی اس میں چھپے ہوتے ہیں، یہی حال ان معدنیات کا ہوتا ہے جنہیں زیورات کے حصول اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے آگ میں پگھلایا جاتا ہے، انہیں جب آگ میں ڈالتے ہیں تو ان پر جھاگ اٹھتی اور میل کچیل باہر آجاتا ہے لیکن پانی ہو یا آگ میں ڈالے جانے والی معدنیات، دونوں صورتوں میں جھاگ خشک ہوجاتی ہے یا اسے پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز انسانیت کے لیے مفید ہوتی ہے وہ باقی رہ جاتی ہے، حق اور باطل کی بھی یہی مثال ہے، بسا اوقات ہر طرف باطل ہی کا غلبہ، اس کی اچھل کود کروفر اور شان و شوکت نظر آتی ہے، اس کے مقابلے میں حق دبا ہوا دکھائی دیتا ہے، ایک دم جمود، سکون اور ٹھہراؤ، جلد بازی میں فیصلہ کرنے والے کہہ دیتے ہیں حق ختم ہوگیا اور باطل چھا گیا، اب کبھی بھی حق ابھر نہیں سکتا۔

حکمت و ہدایت:

۱...... اللہ کی ربوبیت کا اقرار بھی اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر اس کی وحدانیت کا انکار بھی، ہے کوئی حد مشرکوں کی

بے عقلی کی؟(۱۶)

۲......مشرکین کی زبانی اللہ کی خالقیت کا اقرار کروانے کا مقصد انہیں غیر اللہ سے بے نیازی کا درس دینا ہے اور گفتگو کا یہ انداز مخاطب کو شرمندہ کرنے کے علاوہ اس سے ہر دلیل و حجت چھین لیتا ہے۔(۱۶)

۳......ایمان و عرفان کے نور سے آراستہ مومن اور کفر و ظلمت کی نجاست سے آلودہ کافر حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی مساوات نہیں۔(۱۶)

۴......جو معبودانِ باطلہ کسی چیز کی تخلیق پر قدرت تو کجا اپنی تخلیق میں بھی اللہ کے محتاج ہیں، انہیں اپنا کارساز اور حاجت روا سمجھ لینا انسان کی سب سے بڑی نادانی ہے۔(۱۶)

۵......کفر و باطل کا ظاہری کروفر پانی پر ابھرنے والی جھاگ کی طرح ہے، جس طرح جھاگ فنا کے لیے ہوتی ہے، باطل کا انجام بھی بالآخر بربادی اور ہلاکت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔(۱۷)

۶......بقائے دوام صرف حق کا خاصہ ہے۔(۱۷)

۷......ہم کہہ سکتے ہیں کہ آیت (۱۷) میں ''تنازع للبقاء'' اور بقائے اصلح'' کی طرف اشارہ ہے، یعنی کائنات میں وہی چیز بقاء اور دوام سے ہمکنار ہوگی جو اپنے اندر افادیت کا عنصر رکھتی ہو، چاہے وہ کوئی فرد اور کوئی قوم ہو یا کوئی نظریہ۔

تسلیم و انقیاد اور کفر و عناد کے نتائج

۱۸......۱۹

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰىؔ ؕ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ

جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم ان کے واسطے بھلائی ہے اور جنہوں نے اس کا حکم نہ مانا اگر ان کے پاس ہو جو کچھ کہ زمین

جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ

میں ہے سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور، تو سب دیویں اپنے بدلہ میں ان لوگوں کے لیے ہے برا حساب اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے اور وہ بری

الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا

آرام کی جگہ ہے ○ بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے، برابر ہو سکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہے؟ سمجھتے وہی ہیں

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

جن کو عقل ہے ○

تسہیل: جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا انہیں بہت اچھا بدلہ دیا جائے گا اور جنہوں نے اس کی بات نہ مانی، ان کے پاس اگر روئے زمین کے سارے خزانے ہوں بلکہ اتنے ہی اور بھی ہوں تو وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دینے کے لیے تیار ہوں گے، ان لوگوں کا حساب بڑا سخت ہوگا، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے O بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا وہ حق ہے، یہ اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ اس فرق کو وہی سمجھتے ہیں جو عقل والے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۸﴾......قرآنِ کریم کا ایک مؤثر اور دل و دماغ میں اتر جانے والا انداز یہ ہے کہ ماننے والوں اور جھٹلانے والوں، دونوں گروہوں کا حال بطور تمثیل ذکر کرتا ہے، اسی انداز کی ایک جھلک یہاں بھی مذکور ہے، فرمایا جا رہا ہے کہ:

اللہ کی توحید اور انبیائے کرام علیہم السلام کی نبوت پر ایمان لانے والے{۳۹} خوش بختوں کے لیے بڑا اچھا بدلہ ہوگا اور جن شور بختوں نے ایمانی دعوت کو ٹھکرا دیا، وہ مال وجاہ کے ہوتے ہوئے بھی دنیا میں قلبی طمانیت سے محروم رہیں گے اور قیامت کے دن جب اعمالِ صالحہ کی پونجی سے تہی دست ہوں گے تو گھبراہٹ اور پریشانی کا یہ عالم ہوگا کہ دنیا بھر کا مال ومتاع فدیہ میں دے کر عذاب سے چھٹکارا چاہیں گے۔

سورۂ آلِ عمران میں اس کا ذکر قرآن نے اس پیرائے میں کیا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ﴾{۴۰}

''وہ لوگ جو کافر ہو گئے پھر کفر کی حالت میں مر گئے، وہ اگر عذاب سے بچنے کے لیے زمین بھر کر سونا بھی دیں گے تو قبول نہیں کیا جائے گا''

اور سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ﴾{۴۱}

''وہ لوگ جو کافر ہیں، اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا ہی ان کے پاس اور بھی ہوتا کہ اسے فدیہ کے طور پر دے کر قیامت کے دن عذاب سے چھوٹ جائیں، تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا''

{۳۹} أی أجاب الی مادعاہ اللہ من التوحید والنبوات (قرطبی ۹/۲۶۰)
{۴۰}(آل عمران ۳/۹۱)
{۴۱} (المائدۃ ۵/۳۶)

اس آیت میں مومنوں کے لیے "الحُسنیٰ" کی صورت میں جس بھلائی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفسیر اکثر مفسرین نے "جنت" سے کی ہے۔{۴۲}

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ﴾......"ان لوگوں کا حساب سخت ہوگا۔"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "سوء الحساب" سے مراد یہ ہے کہ ان سے سخت حساب لیا جائے گا، ہر ہر بات پر گرفت ہوگی اور بچاؤ کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔{۴۳}

﴿وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ "ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔"

ظاہر ہے کہ جب دربارِ الٰہی سے پرسش کا سلسلہ شروع ہوگا تو پھر ہلاکت کے علاوہ کون سی سبیل باقی رہ جائے گی۔

اسی لیے ہمارے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من نوقش الحساب یهلک﴾{۴۴} "جس شخص سے حساب میں مناقشہ ہوا، وہ ہلاک ہوگیا۔"

اور معصوم ہونے کے باوجود سرورِ دو عالم ﷺ اللہ سے دعا فرمایا کرتے تھے:

﴿اللّٰهمّ حاسبنی حسابا یسیرًا﴾{۴۵} "اے اللہ! میرے لیے حساب کو آسان بنا دینا۔"

﴿۱۹﴾......اگر نابینا اور بینا، دیوانہ اور عقلمند، جاہل اور عالم، مردہ اور زندہ برابر نہیں ہو سکتے تو کلامِ الٰہی کی صداقت پر یقین رکھنے والا اور اسے جھٹلانے والا بھی برابر نہیں ہو سکتے، حق کو جھٹلانے والا اندھا بھی ہے اور ناسمجھ بھی، اس کی عقل سونا چاندی جمع کرنے میں تو استعمال ہوتی ہے مگر آخرت کا نفع نقصان پرکھنے میں بالکل بھی نہیں۔

﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ "اس فرق کو وہی سمجھتے ہیں جو عقل والے ہیں۔"

اور عقل والے وہ ہوتے ہیں جو عقل پر تعصّب کی گرد پڑنے نہیں دیتے اور فہم کو وہم سے دور رکھتے ہیں۔{۴۶}

حکمت وہدایت:

۱......ایمان وطاعت کا بدلہ جنت اور رضائے حق ہے جبکہ کفر وعصیاں کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی ہے۔(۱۸)

۲......دنیا میں اللہ کی راہ میں خرچ کیے جانے والے ایک ایک پیسے پر قیامت کے دن اجر ملے گا مگر آخرت میں بالفرض

{۴۲}(دیکھیے کشاف ۲/۴۹۴، نظم الدرر ۴/۱۴۴، ابوالسعود ۳/۴۵۱، تنویرالمقباس/۲۶۴)

{۴۳}قال الحسن البصری: "یحاسبون بذنبهم کلّها، لایغفرلهم منهاشئی" (قبس من نورالقرآن الکریم ۵/۲۵۶)

{۴۴}(بخاری ۱، کتاب العلم/۲۱)

{۴۵}(مسنداحمد ۶/۴۸)

{۴۶} "اولوالألباب"...... اللّب، العقل الخالص من الشوائب (مفردات/۴۴۶...... نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب، کراچی)

ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی گئی تو عذاب سے خلاصی ناممکن ہوگی۔ (۱۸)

۳......اعمال کی روح ایمان ہے اور ایمان کے بغیر نجات محال ہے۔ (۱۸)

۴......قیامت کے دن کا مناقشہ اور محاسبہ یعنی ہر چھوٹی بڑی چیز کا حساب، اخروی خسارے کا دوسرا نام ہے (۱۸) اللہ تعالیٰ سے مناقشہ سے پناہ اور حسابِ یسیر کا سوال کرنا چاہیے۔

۵......آسمانی تعلیمات سے روگردانی کرنے والوں کی بصیرت مردہ ہوجاتی ہے اور ان کی روح نورِ معرفت سے محروم رہتی ہے۔ (۱۹)

۶......''مومن بینا ہے اور کافر نابینا''......انسانی احساس کو معرفتِ الٰہی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس سے لاجواب انداز کیا ہوسکتا ہے؟

عقل والوں کے اوصاف

﴿۲۰......۲۴﴾

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ

وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو O اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کو اللہ نے فرمایا

اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ

ملانا اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا O اور وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا خوشی کو اپنے رب کی

رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیے میں سے پوشیدہ اور ظاہر اور کرتے ہیں برائی کے مقابلہ میں بھلائی ان لوگوں

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ

کے لیے ہے آخرت کا گھر O باغ ہیں رہنے کے داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوئے ان کے باپ دادوں میں

وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى

اور جوروؤں میں اور اولاد میں اور فرشتے آئیں ان کے پاس ہر دروازے سے O کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا،

الدَّارِ ﴿۲۴﴾

سو خوب ملا عاقبت کا گھر O

ربط: ''اولوالالباب'' کی جس خوش نصیب جماعت کا ذکر گزشتہ آیات میں گزر چکا، اب ان کی چند نمایاں صفات کا ذکر ہے۔

تسہیل: اہلِ عقل وہ ہیں جو اللہ سے کیا گیا عہد پورا کرتے ہیں اور قول واقرار نہیں توڑتے O اور قرابت کے جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑتے اور اپنے رب سے ڈرتے اور حساب کی سختی سے خوف کھاتے ہیں O اور وہ جو اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور برائی کے بدلے اچھائی کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کا آخرت میں انجام اچھا ہوگا O یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادا اور بیبیوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوں گے وہ بھی داخل ہوں گے اور فرشتے جنت کے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے O اور کہیں گے سلام ہو تم پر اس ثابت قدمی کی وجہ سے جو تم نے دنیا میں دکھائی، اس جہاں میں تمہارا انجام خوب ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۰-۲۲﴾......(۱)......عقلِ سلیم رکھنے والوں کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ عہدِ الٰہی کا ایفاء کرتے ہیں، بدعہدی نہیں کرتے، ''عہدِ الٰہی'' میں مفسرین کے جو مختلف اقوال ہیں، ان میں سب سے جامع قول علامہ رازی رحمہ اللہ کا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ اس عہد میں روزِ ازل کے عہدِ اطاعت کے علاوہ مرتے دم تک تمام مأمورات کو بجالانا اور منہیات سے اپنے آپ کو بچانا داخل ہے۔{۴۷}

مزید برآں ''الْمِيْثَاقَ'' کی عمومیت یہ بتاتی ہے کہ جس طرح وعدۂ الٰہی کا پاس کرتے ہیں اسی طرح بندوں سے کیے گئے وعدوں کو بھی پامال نہیں کرتے۔{۴۸}

(۲)......دوسری شناخت ان کی یہ ہے کہ جن جن تعلقات کو اللہ نے برقرار رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا انہیں استوار رکھتے ہیں، تمام انبیاء پر ایمان لانا ہو یا تمام آسمانی کتابوں کی بلاتفریق تصدیق، عام لوگوں کے ساتھ تعاون ہو یا اقارب کے ساتھ حسنِ سلوک، وہ ان تمام امور کا التزام کرتے ہیں۔{۴۹}

﴿مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ کے اس عمومی مطلب کے علاوہ اکثر یہاں سے صرف صلہ رحمی بھی مراد لی گئی ہے اور علامہ ابنِ عاشور نے اس تفسیر کو تمام مفسرین کا متفقہ نقطۂ نظر قرار دیا ہے۔{۵۰}

{۴۷} یدخل فیه الاتیان بجمیع المأمورات والانتهاء عن کل المنهیات (کبیر، ۱۹،۷/۳۳)

{۴۸} ولا ینقضون المیثاق"...... ماوثقوا من المواثیق بین الله تعالیٰ وبینهم...... ومابینهم وبین العباد (روح المعانی ۱۳،۸/۲۰۰)

{۴۹} "یصلون ماأمرالله" الظاهرالعموم فی کلّ ماأمرالله تعالیٰ به (روح المعانی ۱۳،۸/۲۰۱)

{۵۰} ومنها آصرة القرابة وهی صلة الرحم وقداتفق المفسّرون علیٰ أنها مرادالله هنا۔ (التحریروالتنویر، ۱۳،۷/۱۲)

(۳)...... ﴿وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ﴾ عقلِ سلیم والے کبھی اپنی عبادت و اطاعت پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ وہ ہر وقت جلالِ الٰہی کے تصوّر سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں اور آخرت کے حساب اور عذاب سے خوف کھاتے ہیں، یہ ان کی تیسری صفت ہے۔

(۴)...... ایک اہم وصف ان کا یہ ہے کہ عبادات پر جمے رہتے ہیں، گناہوں سے اپنا دامن بچاتے ہیں اور دنیاوی پریشانیوں پر {۵۱} اللہ کی خوشنودی کی خاطر صبر کرتے ہیں۔

(۵)...... پانچویں صفت ان کی یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان وجہِ امتیاز بھی ہے اور توجہ الی اللہ کا مظہرِ اتم بھی!

(۶)...... اللہ کا دیا ہوا مال اس کی راہ میں خفیہ و علانیہ خرچ کرنا بھی اللہ کے ان نیک بندوں کا خاص وصف ہے، اس لیے کہ اجتماعی زندگی میں نفرت و انتشار کے خاتمہ اور باہمی الفت و محبت کا رشتہ استوار رکھنے کے لیے معاشرے کے صاحبِ ثروت لوگوں کا موقع و محل کی مناسبت سے خفیہ اور علانیہ انفاق بہت ضروری ہے، اس سے جہاں لینے والے کا دل حسد و کینہ سے پاک ہوتا ہے وہیں حبِ جاہ اور بخل جیسی مذموم صفات سے دینے والے کے دل دماغ کی تطہیر بھی ہوتی ہے۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ دینے والا کسی محتاج و مسکین کی عزتِ نفس مجروح نہ کرے اور لینے والا اپنی خودی کا سودا کر کے بھکاری نہ بن جائے۔

(۷)...... ﴿أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ کی ساتویں علامت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں یا یہ کہ بشری تقاضا کے تحت جب ان سے کسی گناہ کا صدور ہو جائے تو وہ نیکی سے اس کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ {۵۲}

یاد رہے کہ ظلم کے مقابلے میں معافی اس وقت ہے جبکہ ظلم کے خاتمے اور ظالم کی اصلاح کی امید ہو، اور اگر نرم برتاؤ سے شریر قوتوں کی سرکشی میں مزید اضافہ ہوتا ہو تو پھر ظالموں اور سرکشوں کا سر کچلنا ہی واحد اور مفید راستہ باقی رہ جاتا ہے۔

﴿أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ جن انسانوں کے اندر یہ مبارک اوصاف پائے جائیں گے ان کے لیے اس دنیوی زندگی کے بعد بطور اجر و انعام جنّت ہوگی۔ {۵۳}

﴿وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَآئِهِمْ﴾ اللہ عزّ و جل ان عقلمندوں کو تنہا جنت میں داخل نہ کرے گا بلکہ تکمیلِ مسرّت کے لیے اہلِ جنّت کے مومن اعزاء و اقارب کو بھی جنت میں ان کے ساتھ جمع فرما دے گا۔ {۵۴}

{۵۱} "والذين صبروا......" يدخل فيه الصبر علىٰ فعل العبادات والصبر علىٰ ثقل الامراض...... وبالجملة الصبر على ترك المعاصي وعلىٰ اداء الطاعات (كبير ۱۹،۷/۳۴)

{۵۲} فيجازون الإساءة بالاحسان أو يتبعون السيئة الحسنة فتمحوها (بيضاوی ۳/۳۲۷)

{۵۳} "عقبى الدار" اى عاقبة الدنيا وهى الجنّة (تفسير قاسمی ۹/۳۵۸)

{۵۴} "ومن صلح......" قال ابن عباس: هذا الصلاح الايمان باللّٰه والرسول (قرطبی ۹/۲۶۵)

اس مضمون کی ایک جھلک اس آیت میں بھی مذکور ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾{۵۵}

''اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی، تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیں گے۔''

ایک شبہ اور اس کا حل:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان والوں کے لیے قرابت وزوجیت قیامت کے دن سودمند ہوگی جبکہ بیہقی وغیرہ میں حضرت ابنِ عباس اور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن میرے نسب اور رشتۂ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتۂ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔''

بظاہر زیرِ تفسیر آیت اور اس روایت میں تعارض ہے۔

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ شفیع المذنبین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا نسب دو طرح کا ہے، ایک نسب براہِ راست ہے اور دوسرا بالواسطہ! اور اس دوسرے نسب میں تمام مومنین شامل ہیں اس لیے کہ تمام مومن رسول اللہ ﷺ کی روحانی اولاد ہیں اور جب تمام مومنین کا حضور ﷺ سے نسب ثابت ہوگیا تو ایک دوسرے کے لیے ان کی قرابتداری کا سودمند ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

البتہ کفار ایمان سے محرومی کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق ونسب سے خارج ہیں لہٰذا وہ باہمی نسب وقرابت کو کارآمد نہ پائیں گے۔{۵۶}

﴿۲۳-۲۴﴾......﴿وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ......الخ﴾ فرشتے ہر ہر دروازے سے{۵۷} پیغامِ مسرّت لیے ان پر داخل ہوں گے اور انہیں دنیا کی چندروزہ زندگی کے آلام وشدائد پر صبر وضبط کے بدلے ہمیشہ کی سلامتی اور جنت جیسی عظیم نعمت پر مبارکباد پیش کریں گے۔

مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا:

''جانتے ہو جنت میں سب سے پہلے کون داخل ہوگا؟''

صحابہ نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

{۵۵} (الطور ۵۲/۲۱)

{۵۶} (مظہری ۶/۲۵۶......بایجاز)

{۵۷} "من کل باب" کنایة من کثرة غشیان الملئکة ایاھم (التحریر والتنویر ۱۳/۱۳۲)

''وہ فقراء مہاجرین جن کی زندگیاں مشقت میں گزریں اور وہ اپنی حسرتیں دل میں لیے اپنے اللہ سے جا ملے، اللہ تعالیٰ فرشتوں کو ان کے خیر مقدم کا حکم دیں گے تو فرشتے بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں گے:

''اے اللہ! ہم آسمانوں کے مکین اور تیری مقرب مخلوق ہیں، کیا آپ ہمیں ان لوگوں کو سلام پیش کرنے کا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟''

اللہ رب العزت فرمائیں گے:

''یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے خالص میری عبادت کی، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، راحتوں اور لذتوں سے محروم رہے، دنیا کی سختیاں برداشت کرتے رہے اور ان کی آرزوئیں پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔''

اس کے بعد فرشتے اللہ کے ان محبوب بندوں کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے:

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ {۵۸}

حکمت وہدایت:

۱......ایفائے عہد واجب ہے چاہے اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے ہو اور وعدہ خلافی حرام ہے خواہ وہ خالق کے ساتھ ہو یا مخلوق کے ساتھ! (۲۰)

۲......سچا مؤمن اللہ کی اطاعت میں بہت حساس ہوتا ہے اور اطاعت کا یہ رشتہ کبھی ٹوٹنے نہیں دیتا۔ (۲۱)

۳......ہر اپنے و بیگانے کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اللہ کی میزان میں بڑی وزنی نیکی ہے۔

۴......''مَآ اَمَرَ اللّٰهُ'' کے عموم میں سب اہلِ حقوق داخل ہیں، یہاں تک کہ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے ایک مرغی کا حق ادا نہ کرنے والے کو بھی نیکوکاروں میں شمار نہیں کیا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے مرشد و مربی کا حق وادب کیا ہوگا؟ {۵۹}

۵......ایمان والوں کے حسنِ کردار اور حسنِ اخلاق کی بناء خشیتِ الٰہی پر ہوتی ہے۔ (۲۱)

۶......مصیبتوں پر رضائے حق کے لیے صبر کرنا انتہائی فضیلت والا عمل ہے۔ (۲۲)

۷......اسلامی معاشرے میں روابط کے استحکام کے لیے انفاق فی سبیل اللہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ (۲۲)

۸......''رَزَقْنٰهُمْ'' میں رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے سے اشارہ جائز وحلال آمدن کی طرف ہے، اس لیے کہ حرام کمائی کی نسبت اللہ کی طرف ہو ہی نہیں سکتی۔ {۶۰} (۲۲)

{۵۸}مسند احمد بحوالہ ابن کثیر ۲/۶۶۴
{۵۹}بیان القرآن، حصہ اول، جلد ۵/۱۱۰
{۶۰}کبیر ۷، ۱۹/۳۵

۹......گناہ سرزد ہو جانے کے بعد اس کی تلافی کے لیے نیکی کرنا اور زیادتی کے جواب میں احسان کرنا اللہ کے مخصوص بندوں کی علامت ہے۔(۲۲)

۱۰......آیت ۲۰ تا ۲۲ میں جو صفات مذکور ہیں، ان کی نسبت ''اولوالالباب'' کی طرف کرنے سے معلوم ہوا کہ عقل جو معتبر ہے، وہ عقلِ معاد (آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے والی عقل) ہے، اور عقلِ معاد والا شخص ہی عاقل کہلانے کے لائق ہے چاہے وہ دنیوی امور سے ناواقف ہو۔{۶۱}

۱۱......خوشی و مسرّت کے لمحات میں احباب و اقارب کا اجتماع انسانی فطرت کا حصّہ ہے، اور جنت میں انسانی فطرت کے اس تقاضے کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔(۲۳)

۱۲......ایمان و عمل کے بغیر محض اہل اللہ کی قرابت کچھ بھی سود مند نہیں۔(۲۳)

۱۳......دل میں ایمان ہو تو اعمال کی کمزوری کے باوجود اللہ کے فضل کی امید کی جا سکتی ہے، لیکن محض فضل کی امید پر گناہوں میں مبتلا رہنا بہت بڑی حماقت و جہالت ہے۔

۱۴......فانی زندگی کے فانی و عارضی مصائب پر صبر کی وجہ سے جنّت کی لازوال نعمتوں کے حصول کی امید خلافِ طبیعت امور کا برداشت کرنا آسان کر دیتی ہے۔

۱۵...... ''سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ'' سے بعض علماء نے ملائکہ کی انسانوں پر فضیلت ثابت کی ہے، اس لیے کہ اگر وہ انسانوں سے کمتر مرتبہ پر فائز ہوتے تو ان کا سلام انسان کے مقام و مرتبہ میں اضافہ کا سبب نہ بنتا۔{۶۲}(۲۴) جبکہ دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ سلام صرف درجات کی بلندی کے لیے نہیں ہوتا، تکریم و تعظیم کے لیے بھی ہوتا ہے۔

حرماں نصیبوں کی نشانیاں

﴿۲۵﴾

وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے جوڑنا اور فساد

وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰۤـئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ ۝۲۵

اٹھاتے ہیں ملک میں، ایسے لوگ ان کے واسطے ہے لعنت، اور ان کے لیے ہے برا گھر O

ربط: سعادت مند نفوس کی صفات ذکر کرنے کے بعد اب اشقیاء کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔

{۶۱}(بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد ۵/۱۱۰)
{۶۲}(تفسیر الرازی ۱۹/۴۵-۴۶)

تسہیل: اور جو لوگ اللہ سے مضبوط عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جن تعلقات کو اللہ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کر دیتے ہیں ان پر لعنت ہے اور ان کا انجام بہت برا ہوگا O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۵﴾......عقلِ سلیم سے جو لوگ محروم ہیں ان کے اندر دوسری کمزوریوں کے علاوہ تین خرابیاں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ اس عہد کو توڑتے ہیں جس کی تکمیل کا اللہ نے حکم دیا ہے، خواہ اس کا تعلق اللہ اور انبیاء کے ساتھ ہو یا اس کا تعلق انسانوں کے حقوق کے ساتھ ہو۔

دوسری خرابی یہ کہ وہ ان روابط اور تعلقات کو توڑ دیتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، مثلاً اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار، قطع رحمی اور اہلِ ایمان کے ساتھ عدمِ تعاون!

تیسری خرابی یہ کہ وہ اپنی بدعملیوں کے ذریعے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اپنے اوپر اور دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، فتنے اور جنگ کی آگ کو ہوا دیتے ہیں، آئے دن ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے پُرامن بستیوں کی سلامتی اور تحفظ داؤ پر لگ جاتا ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ﴾ یہی ہیں وہ بدنصیب جو اللہ کی رحمت سے محروم ہیں اور ان کا انجام بہت برا ہوگا۔

حکمت وہدایت:

۱......اللہ پر ایمان اور حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں اللہ کے عہد اور حکموں کو توڑنا حرام اور ان کا ایفاء واجب ہے۔

۲......ان تمام روابط اور تعلقات کا قائم رکھنا ضروری ہے جن کے قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۳......کفر وشرک، ظلم اور فتنہ بازی، گناہوں کے ارتکاب اور کسی بھی دوسرے طریقے سے زمین میں فساد پھیلانا حرام ہے۔

۴......جو لوگ ان بدعملیوں کے مرتکب ہوں گے ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور وہ دوزخ کے حقدار ہوں گے۔

۵......دینِ اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان کی دعوت دینا بھی "فسـاد فـی الارض" کے زمرے میں آتا ہے۔{۲۳} جیسے ایک ملک میں ایک ہی قانون چل سکتا ہے یونہی اللہ تعالیٰ کی وسیع وعریض مملکت میں بھی صرف ایک ہی قانون چل سکتا ہے۔

{۲۳} "ویفسدون فی الأرض" وذلك الفساد هوالدعاء الى غير دين الله (كبير۷، ۱۹/۳۸)

رزق اور ہدایت اللہ کے قبضے میں ہے

﴿۲۶......۲۹﴾

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ

اللہ کشادہ کرتا ہے روزی جس کو چاہے اور تنگ کرتا ہے اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے

اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ

آگے مگر متاع حقیر O اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے؟ کہہ دے! اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے اور راہ دکھلاتا ہے

وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ

اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا O وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے، سنتا ہے! اللہ کی یاد ہی سے

الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

چین پاتے ہیں دل O جو لوگ ایمان لائے اور کام کیے اچھے خوشحالی ہے ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا O

ربط: بتایا جارہا ہے کہ سعادت وشقاوت کا حقیقی معیار ایمان وکفر ہیں، فراخ دستی اور تنگدستی کو مقبولیت ومردودیت کے لیے معیار نہیں بنایا جاسکتا، رزق کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی حکمت پر موقوف ہے، جسے چاہے غنی کردے اور جسے چاہے فقیر کردے۔

تسہیل: اللہ جسے چاہے رزق میں وسعت عطا کردیتا ہے اور جسے چاہے تنگی کردیتا ہے، کافر دنیا کی زندگی پر اِتراتے ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں حقیر سے فائدہ کے سوا کچھ نہیں O اور کافر کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے ہدایت دیتا ہے O یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، سن لو! اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے O جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے دنیا میں خوشحالی اور آخرت میں اچھا انجام ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۶﴾...... دنیا کی عیش وفرحت، عہدہ وحکومت، غناو ثروت، جوانی اور صحت، یہ سب کیا ہے؟ فقط اللہ رب العزت کے تکوینی نظام کے مظاہر! کسی کے پاس مال ودولت کی بہتات اور کسی پر غربت وافلاس کے گہرے سائے! قرآن

اس کی وجہ بیان کرتا ہے:

﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ﴾ {۶۴} ''اگر اللہ اپنے تمام بندوں پر رزق کی وسعت فرما دیتا تو وہ زمین میں فساد برپا کر دیتے۔''

غربت اور خوشحالی کا تعلق کفر وایمان سے نہیں، بعض اہلِ ایمان پر روزی تنگ کر دی جاتی ہے اور کافروں کو فراوانی عطا کر دی جاتی ہے، مومن کے لیے تنگی اللہ کی ناراضگی کی علامت نہیں اور کافر کے لیے فراوانی اللہ کی رضا کی دلیل نہیں۔

﴿وَفَرِحُوْا﴾ البتہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مومن کو فراوانی عطا ہو تو شکر کرتا ہے جبکہ کافر اترانے لگتا ہے اور جو نعمتیں اللہ کے پاس ہیں انہیں بھلا ہی دیتا ہے، حالانکہ آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی نعمتیں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں، ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ ''دنیا، آخرت کے مقابلے میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتی جو حیثیت انگلی کے ساتھ لگے اس پانی کی ہوتی ہے جسے دریا میں ڈبو کر نکال لیا جائے۔''

﴿۲۷﴾......کفارِ مکہ چاہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ ہمارے کہنے کے موافق کوئی معجزہ دکھا دیں، قرآن نے بڑے عمدہ اور ذہن میں راسخ ہو جانے والے اسلوب میں جواب دیا کہ:

جب تک تمہارے اندر ضد اور عناد کی گندگی موجود ہے، کسی بھی معجزہ کے دیکھ لینے سے تمہیں ہدایت نہیں مل سکتی، ہدایت اور گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ ضدی لوگوں کو ہدایت قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، وہ تو بس انہی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

﴿۲۸﴾......کفار کے مقابلے میں جو لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں وہ قلبی اطمینان کے لیے معجزات کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ انہیں اللہ کے ذکر ہی سے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے ''ذکر اللہ'' کی تفسیر اللہ کی خشیت {۶۵} زبانی ذکر {۶۶} اور قرآن {۶۷} وغیرہ سے کی گئی ہے اور ہمارا قلبی اور طبعی رجحان اسی آخری قول کی طرف ہے۔

علامہ ابنِ عاشور اور علامہ محمد جمال الدین قاسمی اور بعض دوسرے مفسرین نے بھی مؤخر الذکر معنیٰ کو سیاقِ کلام کے زیادہ مناسب بتایا ہے۔ {۶۸}

{۶۴} (الشوریٰ ۴۲/۲۷)

{۶۵} و''ذکر اللہ'' یجوزان یراد به خشیة اللہ (التحریروالتنویر ۱۳،۷/۱۳۷)

{۶۶} تطمئن قلوبهم علی الدوام بذکر اللہ بألسنتهم (قرطبی ۹/۲۶۸)

{۶۷} ''بذکر اللہ'' بکلامه المعجز الذی لاریب فیه (ابی السعود ۳/۴۵۶)

{۶۸} و''ذکر اللہ'' یجوز ان یراد به القرآن...... وهوالمناسب قولهم ''لولا أنزل علیه آیة من ربه (التحریر والتنویر ۱۳،۷/۱۳۷) ''بذکر اللہ'' القرآن...... هذاالمعنی یناسب قوله ''لولا أنزل...... (تفسیرالقاسمی ۹/۲۶۱)

مؤمنین کے قلبی سکون کے لیے یہاں "تَطْمَئِنُّ" یعنی صیغۂ مضارع استعمال کیا گیا ہے جو استمرار و دوام پر دلالت کرتا ہے،{۶۹} مطلب یہ ہوا کہ قرآن سے ان کی روح کا ویسا ہی تعلق استوار ہو جاتا ہے جیسا تعلق دل اور دھڑکن کا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر انسان کے دل کے دو خانے ہیں، ایک خانہ میں فرشتے کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرا خانہ شیطان کا مسکن ہوتا ہے، جب تک انسان اللہ کے ذکر میں مصروف رہتا ہے شیطان سمٹا رہتا ہے لیکن جونہی اس کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسہ اندازی شروع کر دیتا ہے۔{۷۰}

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ اہل اللہ اپنی روح کی قوت کے لیے ذکر اللہ کا سہارا لیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ قلب و روح کی بے چینی اور اضطراب کا خاتمہ ذکر اللہ ہی کا خاصہ ہے۔{۷۱}

﴿۲۹﴾......وہ خوش نصیب افراد جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کی پونجی سے مالا مال ہیں، انہیں اپنی اطاعت و نیک خوئی کے بدلے بہترین انجام{۷۲} دیکھنے کو ملے گا۔

حکمت و ہدایت:

۱......رزق کی تنگی و کشادگی کے تکوینی نظام کو اللہ کی رضا و ناراضگی کے لیے کسوٹی قرار نہیں دیا جا سکتا۔(۲۶)

۲......فراخیٔ رزق پر اِترانے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔(۲۶)

۳......دنیا میں انہماک اور آخرت سے غفلت کفار اور مادیت پرستوں کا وطیرہ ہے۔(۲۶)

۴......دنیا کی زندگی عارضی ہے اور آخرت کو دوام ہے، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس "متاعِ قلیل" کو آخرت کی فلاح و آسائش کے لیے صرف کرتے ہیں۔(۲۶)

۵......ایمان کا حقیقی سبب وقوعِ معجزات نہیں بلکہ انسان کی نفسیاتی کیفیات اور داخلی فطرت اس کے سب سے بڑے محرک ہیں۔(۲۷)

۶......آسمانی تعلیمات سے انحراف اور غیر متعلق معاندانہ فرمائشیں ہمیشہ سے بھٹکے ہوئے دماغوں کا خاصہ رہا ہے۔

۷......قرآن کی موجودگی میں کفار کی طرف سے مزید کسی معجزے کا مطالبہ ان کی ذہنی و اخلاقی پستی کی عکاسی کرتا ہے۔

۸......عجائبات اور کرشموں کی جستجو میں رہنے والے قلبی اطمینان سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں اور سچی طلب والوں کو اللہ اپنی

{۶۹}والعدول الی صیغة المضارع لافادة دوام الاطمئنان (روح المعانی ۸، ۱۳/۲۱۴)

{۷۰}(رواه ابن ابی شیبة...... بحواله مظهری ۲۵۹/۶)

{۷۱}"الا بذکر اللّٰه تطمئن القلوب" ای هو حقیق بذلك (ابن کثیر ۲۶۶/۲)

{۷۲}"طوبیٰ" مصدر من "طاب" کبشریٰ وزلفیٰ...... والحاصل انه مبالغة فی نیل الطیبات (کبیر۷، ۱۹/۴۰-۴۱)

معرفت سے نواز دیتا ہے۔(۲۷)

۹...... ہدایت و ضلالت اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، کافر عناد اور تعصب کی بناء پر ہدایت سے محروم رہتا ہے جبکہ مومن اپنی پاکیزہ فطرت کے سبب ہدایت کے مدارج طے کرتا جاتا ہے۔(۲۷)

۱۰...... قلبی طمانیت صرف اور صرف ''ذکر اللہ'' ہی سے حاصل ہو سکتی ہے(۲۸) مادی اسباب کی فراوانی سے یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوتی تو ارضِ فرنگ بے سکونی کے لفظ سے یقیناً نا آشنا ہوتی۔

۱۱...... فرمانبرداری کا پھل دنیا میں دلی تسکین کی صورت میں ملتا ہے اور آخرت میں اس کا صلہ خوش انجامی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔(۲۹)

رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم و عظمتِ قرآن

﴿۳۰......۳۴﴾

كَذٰلِكَ أَرْسَلْنٰكَ فِيٓ أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ أُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَ

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گزر چکی ہیں اس سے پہلے بہت امتیں تاکہ سنا دے تو ان کو جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ

هُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْاٰنًا

منکر ہوتے ہیں رحمان سے، تو کہہ! وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں رجوع کر کے O اور اگر کوئی قرآن

سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۗ بَل لِّلّٰهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَاْيْـَٔسِ

ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہووے اس سے زمین یا بولیں اس سے مردے تو کیا ہوتا، بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں سو کیا خاطر جمع نہیں

الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَن لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا

ایمان والوں کو اس پر اگر چاہے اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو؟ اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں کو ان کی کرتوت پر صدمہ یا

قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتّٰى يَأْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۳۱﴾

اترے گا ان کے گھر سے نزدیک جب تک کہ پہنچے وعدہ اللہ کا بے شک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ O

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

اور ٹھٹھا کر چکے ہیں کتنے رسولوں سے تجھ سے پہلے سو ڈھیل دی میں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا سو کیسا تھا میرا بدلہ O

أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّـُٔونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ

بھلا جو لیے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لیے شریک، کہہ! ان کا نام لو یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا

فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ

زمین میں یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں یہ نہیں بلکہ بھلے بھادیے ہیں منکروں کو ان کے فریب اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾ لَّهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ

اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو راہ بتانے والا O ان کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی مار تو بہت ہی

أَشَقُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ﴿٣٤﴾

سخت ہے اور کوئی نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا O

ربط: پہلے ان مشرکوں کا ذکر ہوا جو آپ سے نت نئے معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، یہاں بتایا جارہا ہے کہ آپ ان کے مطالبات سے پریشان نہ ہوں، آپ سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کی قومیں بھی ان سے اسی قسم کے مطالبات کرتی اور ان کا مذاق اڑاتی رہی ہیں، اگر واقعی یہ کوئی معجزہ دیکھنا چاہتے ہیں تو قران کی موجودگی میں کسی دوسرے معجزے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

تسہیل: اے حبیب! دیگر انبیاء کی طرح ہم نے آپ کو بھی ایک ایسی امت میں بھیجا جس سے پہلے دوسری بہت سی امتیں گزر چکی ہیں، تاکہ آپ ہماری وحی کردہ کتاب ان کو پڑھ کر سنادیں، مگر وہ ہیں کہ اس ''رحمٰن'' کے ساتھ کفر پر تلے ہوئے ہیں، آپ فرمادیجیے، میرا رب تو وہی ہے جس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں، میرا بھروسہ اسی پر ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے O اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ذریعے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹادیے جاتے یا اس کے ذریعے زمین کی مسافت طے ہوجاتی یا مُردوں سے کلام کیا جاسکتا، تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے حقیقت یہ ہے کہ تمام امور کا اختیار اللہ ہی کو ہے، کیا اہلِ ایمان اس بات سے مطمئن نہیں ہیں کہ اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت عطا فرمادیتا؟ اور ان کافروں کو ان کے اعمالِ بد کے سبب کوئی نہ کوئی حادثہ پہنچتا ہی رہتا ہے یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے، یہانتک کہ اسی حالت میں آخرت کے عذاب کی صورت میں اللہ کا وعدہ آکر پورا ہوجائے گا، یقینی بات ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا O اے پیغمبر! کفار کی طرف سے آپ کے پیشرو پیغمبروں کا بھی مذاق اڑایا گیا، اور میں ان کافروں کو مہلت دیتا رہا مگر بالآخر میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے ہی لیا، سوائے کفارِ مکہ، دیکھ لو! میرا عذاب کس قدر سخت تھا؟ O تو کیا وہ اللہ، جو ہر شخص کے اعمال سے مطلع ہے، وہ ان بتوں جیسا ہوسکتا ہے جو بالکل بے خبر ہیں؟ اور ان مشرکوں نے اللہ کے شریک ٹھہرا رکھے ہیں، آپ ان سے کہیں کہ ان کا تعارف تو کراؤ، کیا تم اللہ کو ایسے شریکوں کے بارے میں بتاتے ہو جن کا اسے کہیں بھی علم نہیں یا پھر تم کھوکھلی باتیں کرتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ کافروں کو ان کا کفر

خوبصورت معلوم ہوتا ہے اور انہیں راہِ ہدایت سے روک دیا گیا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی بھی ہدایت نہیں دے سکتاO ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے اور انہیں اللہ کے عذاب سے کوئی بھی بچانے والا نہیںO

﴿تفسیر﴾

﴿۳۰﴾......میرے محبوب! آپ کی رسالت کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ آپ سے پہلے کئی نبی اور ان کفارِ مکہ سے پہلے کئی امتیں گزر چکیں، سو جس طرح ہم نے اپنی سنت کے مطابق دیگر امتوں کی رہنمائی کے لیے پیغمبر مبعوث فرمائے، آپ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ اور جس طرح آپ کی بعثت اچنبھے کی بات نہیں، یونہی آپ کے مقاصد بھی دیگر انبیاء سے الگ نہیں، بلکہ تلاوت وتزکیہ ہی آپ کی دنیا میں تشریف آوری کا مقصد ہے، آپ ہمارے حکم کے مطابق ان کے سامنے ہماری کتاب کی تلاوت فرمائیں، اور اگر وہ کفر وانکار ہی کو اپنا وطیرہ بنائے رکھیں تو آپ ان کی تکذیب وانکار کے مقابلے میں یہ فرما دیجیے کہ میرا توکل اسی وحدہٗ لاشریک پر ہے جو میرا محبوبِ حقیقی بھی ہے اور بالآخر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، وہ میرے توکل کے عوض تمہارے خلاف میری نصرت بھی فرمائے گا اور تمہاری طرف سے دی گئی اذیتوں کے بدلے میں مجھے اجر وثواب سے بھی نوازے گا۔{۷۳}

﴿۳۱﴾......مشرکینِ مکہ اپنی مسخ شدہ ذہنیت سے مجبور تھے، انہوں نے کیفیاتِ قرآن میں ڈوب کر اس کے انقلاب کا مشاہدہ ہی کب کیا تھا؟ اسی لیے آنحضرت ﷺ سے مختلف قسم کے لغو مطالبات کرتے، اس پر فرمایا گیا کہ:

اگر بالفرض یہ قرآن ایسا ہوتا کہ اس کی تلاوت سے پہاڑ چلنے لگتے، زمین شق ہو جاتی اور مردے زندہ ہو کر بولنے لگتے تب بھی یہ لوگ ایمان قبول نہ کرتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرآن پر ایمان کی توفیق ملی اور پھر وہ قرآنی کیفیات میں ڈوب گئے تو ان کے اندر جو انقلاب رونما ہوا وہ پہاڑوں کے چلنے، زمین کے پھٹنے اور مردوں کے بولنے سے کہیں بڑا تھا، پھر ان کے ہاتھوں جو کارنامے ظاہر ہوئے وہ بھی معجزات سے کم نہ تھے۔

﴿بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا﴾ ان کے فرمائشی معجزات کے پورا نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ یہ نشانیاں دکھلانے سے عاجز ہے، وہ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ بھی اپنے پیشرو آباؤ اجداد کی طرح فکری جمود میں مبتلا ہیں، مان کر تو یہ

{۷۳} "علیه توکلتُ" فی جمیع أموری لاسیما فی النصرة علیکم......"والیه متاب" فیثیبنی علی مصابرتکم ومجاهدتکم (روح المعانی ۸،۱۳/۲۲۰)

دیں گے نہیں، لہذا خوارق کا وقوع ان کے لیے سودمند نہیں ہوگا۔{۷۴}

﴿اَفَلَمۡ یَاۡیۡـَٔسِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا﴾ لفظ "یَاۡیۡـَٔسِ" کے مادہ کو دیکھا جائے تو اس کا معنیٰ "مایوسی" ہے، البتہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے اس کا معنیٰ "خاطر جمع رکھنا" کیا ہے۔{۷۵}

مطلب یہ کہ کیا ایمان والوں کے اطمینان اور ان کی تسکین کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اگر وہ خالقِ کائنات چاہتا تو آن کی آن میں تمام انسانوں کو راہِ راست پر لے آتا؟ مگر ہدایت کے لیے تو طلبِ صادق شرط ہے جس سے کافروں کے دل خالی ہیں۔

بعض حضرات نے "یَاۡیۡـَٔسِ" کو علم کے معنی میں لیا ہے لیکن علامہ فرّاء نے اسے غلط قرار دیا ہے۔{۷۶}

﴿وَلَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ﴾ ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب ایمان سے محرومی اور احکامِ الٰہی سے بغاوت ہی ان کا مقدر ہے تو انہیں اس جرم کی سزا کیوں نہیں ملتی؟

اس پر فرمایا کہ آسمانی تعلیمات سے انحراف کرکے انہیں سکون بھی کب حاصل ہے؟ کبھی تو قتل، قید و بند اور لڑائی میں شکست جیسی ہزیمتوں کی زد میں یہ براہِ راست آتے ہیں{۷۷} یا اپنی قریبی بستیوں{۷۸} پر کسی نہ کسی آفت کے نزول کا مشاہدہ کرکے ہراساں رہتے ہیں، پریشانیوں اور گھٹن کے یہ سائے ان پر منڈلاتے رہیں گے حتّٰی کہ ان کا "وقتِ موعود" آ پہنچے گا۔

"وقتِ موعود" سے مراد موت یا قیامت ہے۔{۷۹}

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ﴾ عذاب کی تاخیر سے کسی کے ذہن میں کوئی تردّد نہ رہے، اللہ نے کفار کے لیے سزا کا وعدہ کر رکھا ہے، سو یہ وعدہ بالیقین پورا ہو کر رہے گا کیونکہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔

﴿۳۲﴾......حضور سرورِ کونین ﷺ کو تسلی ہے کہ اے حبیب! معاندین کے تمسخر کا شکار ہونے والے آپ پہلے رسول

{۷۴} علمه بانّ اظهارها مفسدة يصرفه (كشاف ۴۹۸/۲...... دار أحياء التراث العربي)

{۷۵} (موضح القرآن /۳۲۷)

{۷۶} وهو (اى لفظ يايئس...... راقم) هنا فى قول الاكثرين بمعنى العلم......وانكر الفراء ان يكون "يئس" بمعنى "علم" وزعم انّه لم يسمع أحدٌ من العرب يقول "يئست" بمعنى "علمت" (البحر المحيط ۳۹۲/۵......دار احياء التراث العربي)

{۷۷} قارعہ کے لغوی معنیٰ "شدید حادثہ" کے ہیں، اس لغوی معنیٰ کی وسعت کے پیشِ نظر ہم نے اس کا اطلاق قید، قتل، شکست تینوں معانی پر کیا ہے...... واللہ اعلم بالصواب (م-ا-ش)

{۷۸} أو بالقرب منهم كقرى المدينة و مكة (قرطبي ۲۷۳/۹)

{۷۹} "حتّٰى ياتى وعد الله" الموت أو القيامة (بيضاوى ۳۳۱/۳)

نہیں، اس کربناک مرحلہ سے آپ کے پیشرو انبیاء بھی گزرے ہیں اپنی رحیمیت کے سبب میں ان کو ڈھیل دیتا رہا، لیکن جب مہلت کی مدّت ختم ہوگئی تو ہم نے وہ دردانگیز عذاب دیا کہ نسل در نسل ان کی تباہی کی داستانیں فراموش نہ کی جاسکیں اور آج بھی دنیا انہیں بھول نہیں سکی، سو آپ کے ساتھ استہزاء کرنے والے بھی اپنے انجام سے زیادہ دور نہیں۔

﴿فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ﴾ تعجب کے معنیٰ میں ہے اور اس میں وعید کا مفہوم بھی ہے۔ {۸۰}

﴿۳۳﴾...... معبودانِ باطلہ کے نقوش دلوں سے کھرچنے کے لیے قرآن کا ایک لاجواب انداز پیش ہے:

فرمایا جارہا ہے کہ اے غیر اللہ کو اللہ کا ہمسر قرار دینے والو! تم جن الٰہوں کو پوجتے ہو یا تو وہ واقعتًا موجود ہیں، اور اگر وہ موجود ہیں تو تم ان کی صفات ذکر کرکے {۸۱} ان کا تعارف تو کرادو؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور الٰہ کا کوئی وجود نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اس علیمِ کل کو ضرور اس کی خبر ہوتی جس سے کائنات کا ذرہ بھی پوشیدہ نہیں اور جب اس معبودِ برحق کے علاوہ کوئی اور معبود ہے ہی نہیں تو ثابت ہوگیا کہ تم محض اپنے وہم وگمان کے پجاری ہو۔

﴿بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا﴾ ان کے دلوں پر اللہ نے ان کے عناد اور اختیاری تعصّب کی بناء پر مہر لگادی ہے چنانچہ انہیں اپنے مکروفریب اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشیں بڑی مفید معلوم ہوتی ہیں، جو لوگ دلائلِ حق دیکھنے کے باوجود بھی ان میں غوروفکر نہیں کرتے تو اللہ ضلالت کو ان کا مقدر بنادیتا ہے اور جس کی گمراہی کا فیصلہ اس کی بارگاہ میں ہوجائے پھر اسے کوئی بھی ہدایت نہیں دے سکتا۔

﴿۳۴﴾...... ضلالت کو ہدایت پر ترجیح دینے والے اس حرماں نصیب طبقے پر دنیا میں بھی عذاب مسلّط رہتا ہے (مثلاً قتل، اسیری، اس کے علاوہ قحط، طوفان، وبائیں، سیلاب، زلزلے، بیماریاں اور بے سکونی وغیرہ) اور دنیا کے ان معمولی مصائب کے علاوہ ان کو آخرت کے دائمی اور بڑے ہی ہولناک عذاب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا، جہاں ان کے خودساختہ شرکاء ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔

حکمت وہدایت:

۱...... ہمارے آقا ﷺ سے قبل بھی بہت سارے رسول دنیا میں بھیجے گئے، ان میں سے بعض پر لوگ ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا گیا۔ (۳۰)

{۸۰} "فكيف كان عقاب" استفهام معناه التعجب...... وفي ضمنه وعيد شديد (نظم الدرر ۱۵۴/۴)

{۸۱} "سمّوهم" اذكروا صفاتهم (روح المعانی ۲۳۱/۱۳،۸)...... والمعنى صفوهم (بيضاوی ۳۳۲/۳)

۲......"لِتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ" سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انبیاء کا اوّلین کام کتابِ الٰہی کی تلاوت رہا ہے، ہمارے آقا ﷺ کی عبادت اور دعوت کا زیادہ تر حصہ تلاوت پر مشتمل تھا، اپنی امت کو بھی آپ نے کثرتِ تلاوت کی ترغیب دی ہے۔(۳۰)

۳......"وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ" فرما کر معاندین کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ احمقو! بغاوت بھی کرتے ہو تو اس ذات سے جو سراپائے رحمت ہے؟(۳۰) اللہ اکبر! قرآن نے بھی زبان و بیان کی کن کن باریکیوں کو ملحوظ رکھا ہے؟

۴......دین کا کام کرنے والوں کو مختلف قسم کے ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے، ایسی صورت میں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے منہاج پر کام کرتے رہنا چاہیے۔(۳۰)

۵......عنادی اور رعونت شعار لوگوں کے سامنے کتنے ہی دلائل پیش کر دیے جائیں، وہ پھر بھی صدہا اشکال کرتے رہیں گے۔(۳۱)

۶......مشرکین قرآن کے ذریعے مُردوں سے کلام اور پہاڑوں کے اپنی جگہ سے سرکنے جیسے خوارق کے طلبگار رہتے تھے لیکن ان کی نظر سے قرآن کی یہ اثر آفرینی اوجھل تھی کہ کفر و شرک کی نحوست سے مُردہ کتنے ہی دلوں کو اس صحیفۂ ہدایت کے سبب حیاتِ جاوداں نصیب ہوگئی۔(۳۱)

۷......اگر کوئی آسمانی کتاب ایسی ہوتی جس کے ذریعے پہاڑوں کو چلانا، زمین کو پھاڑنا اور مردوں کو زندہ کرنا ممکن ہوتا تو وہ کتاب قرآن ہوتی، اس لیے کہ قرآن محض کتاب نہیں کائنات کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

۸......ہدایت جبر اور زور کا معاملہ نہیں، اللہ نے آفاق و انفس میں اسبابِ ہدایت فراہم کر دیے ہیں، اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ عقل و بصیرت کو استعمال کر کے ہدایت یا گمراہی کا راستہ اختیار کرے۔(۳۱)

۹......"أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ" سے ارشارہ ہے کہ اپنے قریب آنے والی آفات سے عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح پر توجہ دینی چاہیے(۳۱)

۱۰......کافر کا حال بڑا عجیب ہے؟ دنیاوی حوادث سے بھی اسے چھٹکارا نہیں ملتا اور مرنے کے بعد تو فرار کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔(۳۱)

۱۱......اہلِ حق کا استہزاء کفار کا وطیرہ ہے جبکہ صبر اہل اللہ کا شیوہ ہے اور ایک محدود عرصہ کی مہلت کے بعد ہلاکت فاسقوں کا انجام ہے۔(۳۲)

۱۲......قدرت کی طرف سے ملنے والی ڈھیل انسان کی غفلت کا سبب نہیں بنی چاہیے، اس لیے کہ جتنی زیادہ ڈھیل ملتی ہے اتنی ہی سخت سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ (۳۲)

۱۳......اللہ کے علاوہ کوئی خالق، مالک، رازق اور نگہبان نہیں، مشرکین جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں وہ صرف نام ہی نام ہیں جن کے پیچھے کوئی قابلِ ذکر حقیقت نہیں۔ (۳۳)

۱۴......کسی عمل کو مزین کرکے پیش کرنا شیطان کا انتہائی مؤثر حربہ ہے چنانچہ وہ کافروں کے لیے کفر، مشرکوں کے لیے شرک اور منافقوں کے لیے منافقت کو ایسا خوبصورت بنا دیتا ہے کہ وہ ان کی خاطر اپنی آخرت تباہ کر لیتے ہیں۔ (۳۳)

۱۵......کفر اور کافرانہ اعمال دنیوی آلام اور اخروی عذابوں کا سبب ہیں۔ (۳۴)

جنت کی کیفیّت

﴿۳۵......۳۹﴾

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ

حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پرہیزگاروں سے بہتی ہیں اس کے نیچے نہریں میوہ اس کا ہمیشہ ہے اور سایہ بھی

عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ

یہ بدلہ ہے ان کا جو ڈرتے رہے اور بدلہ منکروں کا آگ ہے ○ اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ

اس سے جو نازل ہوا تجھ پر اور بعضے فرقے نہیں مانتے اس کی بعضی بات، کہہ! مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی

وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ

اور شریک نہ کروں اس کا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہے میرا ٹھکانا ○ اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم عربی زبان میں اور اگر

اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَمَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝

تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچ چکا کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی اور نہ بچانے والا ○

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ

اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں ان کو جوروئیں اور اولاد اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ

أَنْ يَّأْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ

وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر ایک وعدہ ہے لکھا ہوا O مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے

وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝

اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب O

ربط: دنیا اور آخرت میں کفار کے عذاب کے بعد جنت کی ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اللہ نے اپنے مخصوص بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں، اس کے علاوہ اہلِ کتاب کے دو طبقوں اور مشرکوں کے بعض اعتراضات اور ان کے جوابات بھی اللہ نے ذکر فرمائے ہیں۔

تسہیل: جس جنت کا وعدہ اہلِ تقوٰی سے کیا گیا ہے، اس کے اشجار و عمارات کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور اس کا پھل اور سایہ سدا بہار ہوں گے، یہ انجام تو ٹھہرا متقیوں کا، جبکہ کافروں کا انجام دوزخ کی آگ ہے O جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وہ آپ پر نازل کردہ کتاب سے خوش ہیں اور انہی کے بعض ہم مشرب اس کتاب کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم ہے، میں اسی کی طرف مخلوق کو بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے O اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل فرمایا، اب اگر اس علم الیقین کے حاصل ہو جانے کے بعد بھی آپ ان کافروں کے نفسانی خیالات و خواہشات کی پیروی کریں گے تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا نہ کوئی بچانے والا O آپ سے پہلے بھی ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو صاحبِ ازواج و اولاد بنایا، اور کسی رسول کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ بغیر اذنِ الٰہی کے کوئی نشانی لا دکھاتا، ہر زمانے کے لیے علیحدہ علیحدہ احکام ہوتے ہیں O اللہ جس حکم کو چاہتا ہے موقوف کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے O

تفسیر

ایک سے زائد مقام پر ہم یہ عرض کر چکے کہ قرآن وعدہ و وعید، صلاح و فساد، جزا و سزا اور کفر و ایمان کو ایک تقابلی انداز میں پیش کر کے مخاطب کو ایک فیصلہ کن مرحلے تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے تا کہ وہ اپنے لیے کوئی راستہ متعین کر سکے، یہاں بھی پہلے اہلِ جہنم کا ذکر ہوا، اب ان خوش نصیبوں کا ذکر ہے جنہیں آخرت کی خوش عیشی عطا ہوگی، فرمایا:

﴿۳۵﴾......اہلِ تقوٰی کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے درختوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اس

کے میوے اور اس کے سائے زوال سے ماوراء ہوں گے لیکن اس کے برعکس کفار و مشرکین آتشِ دوزخ کا ایندھن بنے ہوں گے۔

طبرانی کی ایک روایت ہے، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنّتی جب کبھی کسی درخت سے کوئی پھل توڑیں گے تو اس کی جگہ فوزاً ویسا ہی پھل دوبارہ لگ جائے گا۔'' {۸۲}

خود قرآن میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَّفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ ۝﴾ {۸۳} ''اور میوے ہوں گے بہت زیادہ، جو نہ کبھی ختم ہوں گے نہ ان سے کوئی روکے گا۔''

بہشت کا ایک اور نقشہ قرآن نے کس دلکش انداز میں بیان فرمایا:

﴿لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا ۝﴾ {۸۴} ''نہ وہ (جنّتی) دھوپ کی تپش محسوس کریں گے نہ سردی کی شدت۔''

گویا بڑا خوشگوار اور معتدل موسم ہوگا، جس سے جنّتی خوب لطف اندوز ہوں گے۔

﴿۳۶﴾...... اسلام کے ظہور سے لے کر آج تک اہل کتاب کے دو فرقے رہے ہیں، پہلا فرقہ ان حقیقت پسندوں کا جنہوں نے قرآنی مضامین کو اپنی کتابوں کے موافق پاکر ان کی تصدیق کی اور دوسرا فرقہ ان اہلِ تعصّب کا جنہوں نے بعض مضامین کے انکار اور کفر کو اپنا مقدر بنالیا، اس وقت بھی یہی صورتحال ہے، اس میں شک نہیں کہ آج کی دنیا کے ڈھائی ارب عیسائیوں اور تقریباً دو کروڑ یہودیوں نے ہر موقع پر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن ان میں بعض اچھے لوگ بھی ہیں۔

ایسے لوگ قرآن کی تعلیمات کو پہلی آسمانی کتابوں سے ہم آہنگ پاتے ہیں تو قلبی مسرت محسوس کرتے ہیں اور قرآن کی یہ موافقت اور ہم آہنگی بالآخر انہیں ایمان لانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ {۸۵}

﴿قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ﴾ اس حقیقت پسند طبقہ کے مقابلے میں مشرکین ہیں جو اصنام پرستی میں اس قدر تجاوز کر چکے ہیں کہ اب دعوتِ توحید ان کے دلوں پر بجلی بن کر گرتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ نہ تو صدائے توحید ہماری سماعتوں سے

{۸۲} (طبرانی بحوالہ مظہری ۲۶۸/۲)
{۸۳} (الواقعة ۵۶/۳۲-۳۳)
{۸۴} (الدھر ۷۶/۱۳)
{۸۵} "والّذین اتینھم الکتب......" عنی بھم الّذین اٰمنوا بالنبیّ صلی اللہ علیہ وسلم (تفسیر القاسمی ۳۷۰/۹)

ٹکرائے اور نہ کوئی دوسرا اس دعوت پر لبیک کہے، اسی لیے نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ ان کے سامنے اپنا موقف واضح فرمادیں کہ میرا معبود تو وہ ہے جو سب انبیاء وملل کا متفقہ معبود ہے، میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کیسے کرسکتا ہوں جبکہ میں تو اس کی وحدانیت کا داعی ہوں اور آخر کار اسی کی طرف مجھے لوٹ کر بھی جانا ہے۔

﴿لَآ اُشْرِكَ...... الخ﴾ اس مختصر مگر جامع فقرہ میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن کا شریعت نے انسان کو مکلف بنایا ہے۔{۸۶}

﴿۳۷﴾...... جیسے پہلے انبیاء پر کتابیں نازل کی گئیں آپ پر عربی زبان میں یہ محکم کتاب نازل کی گئی ہے، اس کا پیغام تمام اقوام کے لیے ہے، اس آسمانی صحیفہ اور عالمی ضابطہ کے آجانے کے بعد بھی اگر اسے چھوڑ کر آپ کفار کی خواہشات کی پیروی کریں گے تو پھر اس کے برے نتائج سے آپ بچ نہیں سکیں گے۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ...... الخ﴾ میں بظاہر خطاب حضور اکرم ﷺ سے ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے{۸۷} اس بلیغ اندازِ بیان سے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی جارہی ہے کہ احکامِ الٰہی کے مقابلے میں اپنی خواہشات اور کنبہ و قبیلہ کے غیر شرعی مطالبات پر عمل کی کوئی گنجائش نہیں۔

﴿حُكْمًا عَرَبِيًّا﴾ کا معنی بعض نے ''عربی فیصلہ'' کیا ہے، لیکن اس ''ترجمہ'' میں کمزوری یہ ہے کہ اس سے قرآنی منشور کا صرف اہلِ عرب کے لیے خاص ہونا مستفاد ہوتا ہے، حالانکہ قرآن عربی زبان میں ضرور نازل ہوا مگر اس کی دعوت تمام اقوامِ عالم کے لیے ہے صرف عربوں کے لیے نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مذکورہ شبہ سے دور رہتے ہوئے ''حُكْمًا عَرَبِيًّا'' کا ترجمہ ''عربی زبان'' کیا جائے جیسا کہ صاحبِ جلالینؒ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔{۸۸}

﴿۳۸﴾...... بعض کند ذہنوں نے آپ کے صاحبِ ازواج واولاد ہونے کو نبوت کے خلاف سمجھا، اس پر اللہ نے فرمایا کہ:

عیالداری کو نبوت کے منافی سمجھنے والے آپ سے قبل دنیا میں تشریف لانے والے انبیاء کی سیرت پر ایک نظر ڈال لیں، آپ سے پہلے انبیاء بھی ازدواجی زندگی سے منسلک رہے، یہ تو لوازماتِ بشریہ میں سے ہے، اور اگر دیکھا جائے تو یہ پہلو انبیاء کے کمال کا آئینہ دار ہے کہ اہل وعیال اور کنبہ وخاندان کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے دعوت کا بھی حق ادا کیا۔

{۸۶} هذا الكلام جامع لكلّ ما ورد التكليف به (كبير ۷، ۱۹/ ۴۸)
{۸۷} کئی مقامات پر قرآن کا یہ منفرد اندازِ تخاطب پہلے گزر چکا اور ہم وہاں تصریح بھی کرچکے۔ (م۔ا۔ش)
{۸۸} ''حكمًا عربيًّا'' بلغة العرب تحكم به بين الناس (جلالين/ ۳۲۸...... الدار السعودیہ)

﴿وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ﴾ مخالفین کے مشہور اعتراضات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اسلامی شریعت پہلی شریعتوں سے مختلف کیوں ہے؟ آیت ۳۷ میں نزولِ قرآن کا جو ذکر ہوا تو وہ اس اعتراض کا اجمالی جواب تھا، اب اس کا قدرے تفصیلی جواب دیا جارہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اختلافِ شریعت کی وجہ سے مخالفت کرتا ہے وہ شاید نبی کو ایسا بااختیار سمجھتا ہے کہ اپنی مرضی سے جو حکم چاہے لے آئے اور جو چاہے رد کردے حالانکہ کسی بھی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کوئی ایک حکم یا آیت از خود لا سکے، وہ اپنی امت کے سامنے جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اللہ ہی کا نازل کردہ ہوتا ہے۔

﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ﴾ انبیائے کرام علیہم السلام کے درمیان شریعتوں کا اختلاف قابلِ اعتراض ہرگز نہیں اس لیے کہ ہر زمانے کے احکام الگ الگ ہوتے ہیں جن کی حکمت اور مصلحت اللہ ہی جانتا ہے اور احکام بدلنے کا اختیار بھی اسی کو ہے۔

﴿۳۹﴾...... اصل کتاب لوحِ محفوظ کی صورت میں اللہ کے پاس ہے، وہ اس میں سے جس حکم کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور جسے چاہے مٹا دیتا ہے۔ ''لوحِ محفوظ'' میں احکامِ شریعت بھی ہیں اور مخلوق کی تقدیریں بھی، احکام کی طرح تقدیر میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے البتہ اہلِ علم کہتے ہیں کہ تبدیلی صرف تقدیرِ معلّق میں ہوتی ہے تقدیرِ مبرم میں نہیں، جو تقدیر کسی شرط مثلاً دعا، دوا اور احتیاط کے ساتھ معلّق ہو اسے تقدیرِ معلّق اور جو قطعی اور حتمی ہو اسے مبرم کہتے ہیں، درجِ ذیل احادیث سے تقدیرِ معلّق میں تبدیلی کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور تقدیر کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں ٹال سکتی جبکہ گناہ کی وجہ سے انسان رزق سے محروم ہوجاتا ہے۔'' {۸۹}

اسی مضمون کی روایت مستدرکِ حاکم میں بھی ہے، جس میں ارشاد ہے:

''دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے، نیکی رزق میں زیادتی کا سبب ہے اور گناہوں میں مبتلا شخص رزق سے محروم کردیا جاتا ہے۔'' {۹۰}

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے صلہ رحمی کو عمر اور رزق میں زیادتی کی وجہ قرار دیا {۹۱} جبکہ یہ بھی آپ ہی کا فرمان ہے کہ:

{۸۹} (ابن ماجه، ابواب الفتن/۲۹۱)
{۹۰} (مستدرك حاكم بحواله منير ۱۳/۱۸۶)
{۹۱} (بخاری ۲، كتاب الأدب/۸۸۵)

''دعا اور قضاء آسمان وزمین کے درمیان معلّق رہتے ہیں۔'' {۹۲}

حکمت وہدایت:

۱......جنّت، جو نعمتوں اور راحتوں کا مسکن ہے، اس کے حقدار صرف اہلِ ایمان ہیں، کافر کا ٹھکانہ جہنم ہے۔(۳۵)

۲......آخرت میں ملنے والی مسرتیں اور نعمتیں دائمی ہیں جن کے زوال کا کوئی تصوّر نہیں، اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو بہشت کی نعمتوں کو فانی اور زوال پذیر تصور کرتے ہیں۔{۹۳} (۳۵)

۳......تعصب سے پاک دل اور فطرتِ سلیمہ قرآن سے متاثر ہوکر اس پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ نہیں پاتے۔(۳۶) جیسے یہود میں سے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اسی طرح عیسائیوں کا ایک وفد جو حبشہ سے آیا تھا، یہ لوگ قرآن سے متاثر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

۴......جیسے دیگر آسمانی کتب انبیاء کی قومی زبان میں نازل ہوئیں، اسی طرح قرآن بھی عربی زبان میں نازل ہوا جو ہمارے آقا ﷺ کی قومی زبان تھی۔(۳۷) اسی لیے عربی زبان ''ملکۃ اللّغات'' ہے، بحیثیت مسلمان ہمیں اس کی ترویج کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

۵......شرک وبدعت کی بنیاد علم ویقین کے بجائے مشرکین ومبتدعین کی خواہشات پر ہوتی ہے۔(۳۷)

۶......قرآنِ کریم اور نبی کریم ﷺ کی صداقت پر قطعی دلائل کی موجودگی میں ان کے احکامات کو پس پشت ڈال کر مشرکین کی اتباع اور ان کی خوشنودی کے لیے غیر اللہ کی عبادت کرنے اور کعبہ کے علاوہ کسی اور جانب کو قبلہ قرار دینے والے اللہ کی نصرت سے محروم اور اس کے عذاب کے حقدار ٹھہریں گے۔(۳۷)

۷......جس طرح کفار کی خواہشات پر چلنے کی ممانعت ہے یونہی اسلام میں اپنی خواہشات اور قومیت ولسانیت کے بت پوجنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔

{۹۲} (بحوالہ منیر ۱۸۶/۱۳)

{۹۳} یہ ایک قدیم زمانے کا فرقہ ہے جس کا نام جہمیّہ ہے، اس فرقے کے افراد میں سے کسی کا نام معلوم نہیں سوائے ''جہم'' کے، جسے اس کا بانی بتایا جاتا ہے، دوسری صدی ہجری کے بعد جب یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو بشر بن غیاث المریسی اور اسی زمانے کے دیگر لوگوں نے ان کے عقائد کی اشاعت کی۔ ان کے عقائد یہ ہیں: ☆ قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے۔☆ اس بات کا انکار کرتے تھے کہ اللہ کے لیے کوئی مستقل ازلی صفت ثابت ہے۔☆ ان کے نزدیک حوادث دنیوی کا علم اللہ کو ان کے ظہور کے بعد ہوتا ہے۔☆ انہوں نے عقیدۂ جبر کی انتہائی شکل کو اختیار کرتے ہوئے انسان کی طرف افعال کی نسبت کو محض مجازی قرار دیا جیسے غروب ہونے میں سورج کا فعل ''مجازی'' ہے۔☆ قرآن میں ''ید'' اور ''وجہ'' وغیرہ جیسی صفات جو اللہ کے لیے ثابت ہیں، وہ ان کی عقلی تاویل کرتے تھے اور بالعموم وہ تمام صفات الٰہیہ کے علیحدہ وجود کے منکر تھے یعنی اللہ کو محض ایک مجرد ہستی ٹھہراتے تھے۔ اس لیے انہیں ''معطلہ'' کہا جاتا تھا۔

۸......آیت ۳۸ سے علماء نے نکاح کی ترغیب اور تجرّد کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔{۹۴} (۳۸)

۹......اولاد وازواج نہ تو کاملین کے لیے تعلق مع اللہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور نہ یہ ولایت ونبوت کے منافی ہیں۔{۹۵} انبیاء کو عام انسانوں سے ممتاز کرنے والی چیز ان پر نازل ہونے والی وحی اور پھر ان کے اعلیٰ اخلاق ہوتے ہیں۔

۱۰...... "وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ......" میں انبیاء سے مطالبۂ خوارق کی ممانعت ہے، حالانکہ انبیاء صاحبِ خوارق ہوتے ہیں، تو اولیاء اللہ جن کا صاحبِ خوارق ہونا بھی ضروری نہیں ان سے یہ مطالبہ کیسے جائز ہوسکتا ہے؟{۹۶} معلوم ہوا کہ معجزات کا صدور اللہ کے حکم اور اس کی مشیّت پر موقوف ہے، انبیاء کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

۱۱......اللہ کے فیصلے اٹل ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوسکتے، البتہ تقدیرِ معلّق میں نیکیوں مثلاً دعا، صلہ رحمی وغیرہ اور گناہوں کی وجہ سے تبدیلی ممکن ہے (نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے اور گناہوں کی وجہ سے اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے) تبدیلی کے اس حکم میں پہلی شریعتوں کی منسوخی کے علاوہ احکام کی منسوخی بھی شامل ہے یعنی اللہ اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت انسانوں کی بھلائی اور فلاح کے لیے بعض شرعی احکامات کو منسوخ کر کے ان کی جگہ دیگر احکام لے آتا ہے (جیسے بیت اللہ کو قبلہ قرار دینے کے بعد بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا منسوخ ہوگیا) اور احکام کی منسوخی میں سرتاسر اس کے بندوں کی خیرخواہی ہوتی ہے۔ (۳۹)

کفّار کی تدبیریں اور انجام

﴿۴۰......۴۳﴾

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا

اور اگر دکھلا دیں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے یا تجھ کو اٹھالیویں سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے

الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

حساب لینا O کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ

لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ

پیچھے ڈالے اس کا حکم اور وہ جلد لیتا ہے حساب O اور فریب کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے سو اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب

{۹۴} هذه الآية تدلّ علىٰ ترغيب النكاح والحضّ عليه وتنهى عن التبتّل (قرطبی ۹/۲۷۸)

{۹۵} (بیان القرآن، حصّہ اوّل، جلد ۵/۱۱۷)

{۹۶} (حوالہ مذکورہ)...... خوارق کا لفظ عام طور پر معجزات اور کرامات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس سے مراد وہ امور ہوتے ہیں جو طبعی قوانین اور انسانی عقل سے ماوراء ظاہر ہوتے ہیں۔

جَمِیۡعًا ؕ یَعۡلَمُ مَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ ؕ وَ سَیَعۡلَمُ الۡکُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَ یَقُوۡلُ

جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک جی اور اب معلوم کیے لیتے ہیں کافر کہ کس کا ہوتا ہے پچھلا گھرO اور کہتے ہیں

الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا ؕ قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ۙ وَ مَنۡ عِنۡدَہٗ

کافر تو بھیجا ہوا نہیں آیا، کہہ دے! اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں اور جس کو

عِلۡمُ الۡکِتٰبِ ﴿۴۳﴾

خبر ہے کتاب کیO

ربط: سابقہ آیات میں مشرکین کے اس مطالبہ کا ذکر تھا کہ اللہ کا عذاب جلدی کیوں نہیں آجاتا، یہاں بتایا جارہا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو عذاب جلدی نازل کرسکتا ہے، اس کے علاوہ اسلام کے غلبے اور کفار کی مغلوبیت کی صورت میں عذاب کی جو علامات ظاہر ہورہی تھیں ان کا بھی بیان ہے۔

تسہیل: اے حبیب! کفار سے کیا گیا وعدۂ عذاب ہم آپ کو آپ کے جیتے جی دکھادیں یا اس وعدہ کے ایفاء سے پہلے ہی ہم آپ کو اٹھالیں، آپ کا کام ان تک ہمارے احکام پہنچادینا ہے اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہےO کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر چہار طرف سے زمین ان پر تنگ ہوتی جارہی ہے؟ اللہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے حکم پر نظرثانی کرنے والا نہیں، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہےO ان (مشرکینِ مکہ) سے پہلے بھی کافر بڑی چالیں چل چکے، مگر فیصلہ کن تدبیر تو اللہ ہی کی ہے، وہ ہر شخص کے اعمال سے باخبر ہے، سوعنقریب کفار کو معلوم ہوجائے گا کہ نیک انجامی کس کے لیے ہے؟O اور کافر کہتے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں ہیں، آپ فرمادیجیے کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوت پر) اللہ کی گواہی اور پھر اس شخص کی گواہی کافی ہے جو آسمانی کتاب کا علم رکھتا ہےO

تفسیر

﴿۴۰﴾...... کفار، جو اپنی حماقت کی بناء پر عذاب کا مطالبہ کرتے تھے، ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ ضرور ہماری گرفت میں آئیں گے، ان پر آنے والے عذاب کا کچھ نظارہ ہم آپ کو آپ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی کرادیں گے یا پھر آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یہ زیرِ عتاب آئیں گے، آپ بہرحال اپنی تمام تر توجہ دعوت پر مرکوز رکھیں{۹۷} دشمنوں کا حساب، ہم خود بے باق کردیں گے۔

سورۂ غاشیہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{۹۷}"فانما علیک البلاغ" التبلیغ عن اللہ (تنویر المقباس/۲۶۷)

﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝﴾ {۹۸}

''اے پیغمبر! آپ ان کو نصیحت کرتے رہیں، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں، آپ داروغہ کی طرح ان پر مسلط نہیں ہیں، ہاں! جو اعراض اور کفر کا راستہ اختیار کرے گا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا، یقیناً ان سب نے ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر یقیناً ان سے حساب لینا ہمارے ذمہ ہے۔''

﴿۴۱﴾......کفار اگر آپ سے آپ کی سچائی پر کوئی نشانی چاہتے ہیں تو ان کے لیے کیا یہی کافی نہیں کہ دنیا میں بتدریج اسلام کا سکّہ بیٹھ رہا ہے اور مختلف خطے ان کے ہاتھوں سے یوں نکلے جارہے ہیں جیسے خشک ریت مٹھی سے سرک جایا کرتی ہے، سورۂ انبیاء میں اسی مضمون کا اعادہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا﴾ {۹۹}

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم ان کی سرزمین کو اطراف سے کم کرتے جارہے ہیں؟''

اگر چشمِ عبرت ہوتی تو کفار کے لیے قرآن اور صاحبِ قرآن کی حقانیت پر اس سے واضح نشانی اور کیا ہو سکتی تھی؟ مگر صرف کفّار سے کیا گلہ کہ وہ عبرت حاصل نہیں کرتے، خود مسلمان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی مغلوبیت اور سستی کے اسباب جاننے کے لیے آمادہ نہیں، کہاں وہ دور جب اللہ کی زمین اللہ کے باغیوں کے لیے تنگ تھی، ساری دنیا اسلامی قوانین اور مسلمانوں کے سامنے سرنگوں تھی، اور کہاں آج کا دور جب ہم بخارا اور تاشقند کھو بیٹھے، قرطبہ اور غرناطہ کو بھول چکے، سرزمینِ انبیاء یہودی درندوں کے تسلّط میں ہے، عراق وافغانستان پر صیہونیت کی یلغار ہے اور 50 سے زائد اسلامی ممالک کے حکمران مجرمانہ خاموشی اختیار کیے آگ وخون کی اس ہولی پر تماشائی بنے بیٹھے ہیں، دوصدیوں کی انتھک محنت کے بعد جب ہم برطانوی سامراج سے آزاد ہوئے تو برِ صغیر کا ایک بڑا حصّہ ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیا گیا، بخارا میں تقریباً چالیس ہزار کے لگ بھگ مدارس تھے، آج ان میں سے 35 ہزار سے زائد مدارس کا وجود نابود ہو چکا، اسلام کے نام لیواؤں پر پوری دنیا میں عرصۂ حیات تنگ کیا جا چکا، مسلمانوں میں اسلام کی انقلابی روح باقی نہ رہی اور حبِّ جاہ، حبِّ مال جیسی بیماریوں نے کفر کے دلوں سے ہمارا وہ رعب چھین لیا جس سے کفار کبھی لرزاں و ترساں رہتے تھے۔

آج بھی ہماری عظمتِ رفتہ ہمیں مرحبا کہنے کو تیار ہے اگر ہم متحد ہو جائیں اور جمہوریت جیسے بودے نظامِ کفر کے

{۹۸}(الغاشیۃ ۸۸/۲۱-۲۶)
{۹۹}(الانبیاء ۲۱/۴۴)

بجائے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نعرہ بلند کریں، قیامِ خلافت سے ہی ہمارے دکھوں کا مداوا ممکن ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ اللہ کے تکوینی فیصلہ میں کسی سنگِ گراں کی کوئی حیثیت نہیں، وہ کفار کو ان کے انجام تک پہنچانے اور غلبۂ اسلام کا فیصلہ کر چکا، اب اس میں کوئی حائل نہیں ہوسکتا، اور اللہ کے اس حکم میں زیادہ دیر بھی نہیں، دنیا میں ہزیمت وشکست اور قتل واسارت کے بعد بہت جلد کفار ومشرکین کو آخرت میں دائمی عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔{۱۰۰}

﴿۴۲﴾......اے حبیب! عداوتِ حق میں آپ کے معاصر کفار یکتا نہیں، ان سے پہلے معاندین کو بھی اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کبھی ایک آنکھ نہیں بھائی، انہوں نے مہلتِ زندگی کو اسی سعیٔ لاحاصل میں ضائع کر دیا کہ کسی طور توحید کا نور پھیلنے نہ پائے، لیکن ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور ایمان کا نور پھیل کر رہا، آپ بھی رنجیدہ نہ ہوں، اللہ جو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے، وہ ان کی حرکتوں کو خوب جانتا ہے، چنانچہ دنیا میں بدبختی اور مصیبت کے طویل دن دیکھنے کے بعد انہیں آخرت میں سعادتمندی کا معیار بھی معلوم ہو جائے گا، مظلوم، مجبور، بے بس، لاچار اور نادار مسلمان ایمان کی دولت کی وجہ سے آخرت کی خوش عیشی سے ہمکنار ہوں گے اور بڑے بڑے جابر، زور آور، وڈیرے اور جاگیردار ایمان سے محرومی کے سبب اوندھے منہ جہنم میں پڑے ہوں گے۔

﴿۴۳﴾......اگر اہلِ کتاب{۱۰۱} یا مشرکینِ عرب{۱۰۲} آپ کی رسالت پر دیئے گئے دلائل سن لینے کے باوجود ''میں نہ مانوں گا'' کی رٹ لگائے رکھیں تو آپ قولِ فیصل کے طور پر انہیں یہ فرما دیجیے کہ تمہارے منہ کی باتوں کا کیا اعتبار؟ میری نبوت کی صداقت اور تمہاری کذب بیانی پر اللہ عزّ وجلّ اور صاحبِ علم اہلِ کتاب{۱۰۳} کی گواہی کافی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

شبہ یہ ہے کہ اگر رسالتِ محمدیہ ﷺ کے منکر اہلِ کتاب ہوں تو انہیں سمجھانے کے لیے تو اہلِ کتاب کا حوالہ دینا درست معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر مراد مشرکینِ مکہ ہوں تو اس صورت میں ''وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ'' کس معنی میں یہاں لایا گیا ہے؟ جب وہ قران کے مخاطب ہی نہیں تو ان کا ذکر کیوں کیا گیا؟

{۱۰۰} ''وهو سريع الحساب'' اى فعمّا قليل يحاسبهم ويجازيهم فى الآخره بعد عذاب الدنيا بالقتل والأسر (تفسير قاسمى ۳۷۶/۹)

{۱۰۱} قيل: قاله رؤساء اليهود (روح المعانى ۲۵۲/۱۳،۸)

{۱۰۲} قال قتادة: هم مشركو العرب (قرطبى ۲۸۵/۹)

{۱۰۳} ''ومن عنده علم الكتاب'' المراد به: الذى حصل عنده علم التوراة والانجيل (كبير ۵۵/۱۹،۷)

جواب یہ ہے کہ مشرکینِ عرب اپنے معاملات میں اہلِ کتاب کی طرف رجوع کرتے اور ان کے فیصلے کو حرف آخر تسلیم کرتے تھے {۱۰۴} اس لیے یہاں ان کا ذکر کر کے انہیں سمجھایا گیا کہ جن کو تم اپنے معاملات میں حکم تسلیم کرتے ہو وہ تو حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی صداقت کے شاہد ہیں، تم اس نکتے پر ان سے اتفاق کیوں نہیں کرتے؟

حکمت و ہدایت:

۱...... دنیا میں آنے والے ہر رسول کے ذمہ احکامِ الٰہی کی تبلیغ تھی، لوگوں کو ہدایت دینا نہ ان کے اختیار میں تھا اور نہ ہی یہ بات ان کے فرائض میں شامل تھی۔ (۴۰)

۲...... اپنے وعدہ و وعید کے مطابق اللہ تعالیٰ ضرور بہ کفار و مشرکین پر اپنا عذاب نازل کرے گا، چاہے وہ آپ کی زندگی میں ہو یا آپ کی وفات کے بعد! (۴۰) حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کفار کو مختلف عذابوں کا سامنا کرنا پڑتا رہا اور آپ کی وفات کے بعد قیامت تک وہ اس سلسلۂ عذاب سے نجات نہیں پا سکیں گے۔

۳...... یہ ضروری نہیں کہ داعی اپنی محنت کے اثرات و ثمرات کا مشاہدہ اپنی زندگی ہی میں کرے۔ (۴۰)

۴...... اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے اچھے اور برے اعمال کے مطابق بدلہ ضرور دے گا۔ (۴۰)

۵...... رسالت و الوہیت کا دائرۂ کار بالکل الگ الگ ہے، رسول کا فریضہ تبلیغِ احکام ہے جبکہ ہدایت و ضلالت کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔

۶...... "فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ" جیسی آیات جو فرضیتِ جہاد سے پہلے نازل ہوئیں، انہیں دلیل بنا کر جہاد کے انکار یا اس کے دائرۂ عمل کو محدود کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، ایسا مطلب اخذ کرنے والے اللہ سے ڈریں۔

۷...... اسلام کا بڑھتا ہوا دائرۂ اثر اور اس کی فتوحات جبکہ کفار کی ہزیمت اور ان کی مقبوضہ زمینوں کا برابر گھٹتے جانا، اللہ کی قدرت کی دلیل ہے۔

۸...... اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، کوئی جماعت اور کوئی شخصیت اور پلٹا کھاتے حالات اس کے فیصلے تبدیل نہیں کر سکتے۔ (۴۱)

۹...... اللہ تعالیٰ بندوں کو بہت جلد ان کے انجام سے دوچار کر کے رہے گا یعنی کفار کو سزا دے گا اور مؤمنوں کو بہترین

{۱۰۴} "ومن عنده علم الكتاب" هذا احتجاج على مشركي العرب لانهم كانوا يرجعون إلى أهل الكتاب...... وقيل: كانت شهادتهم قاطعة لقول الخصوم (قرطبي ۹/۲۸۵)

اجر عطا فرمائے گا۔(۴۱)

۱۰......اللہ کی تدبیر کے سامنے کفار کی تمام تر تدبیریں بری طرح ناکام ہیں، اور رہیں گی، نیز یہ کہ اللہ کے حکم کے بغیر ان کی چالیں اللہ کے رسول اور ایمان والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس میں جہاں نبی اکرم ﷺ کو تسلی ہے وہیں آپ کی ڈھارس بھی بندھائی جارہی ہے اور اللہ کی مکمل نصرت کا یقین بھی آپ کو دلایا جارہا ہے، مزید یہ کہ کفار پر آنے والی گردشِ ایام کی طرف بھی اشارہ ہے۔(۴۲)

۱۱......اللہ تعالیٰ ہر ہر انسان کے اچھے اور برے اعمال کو جانتا ہے اور ان اعمال کے مطابق وہ ہر ایک کو جزا بھی دے گا۔(۴۲)

۱۲......کفار عنقریب اس یقینی امر کا مشاہدہ کرلیں گے کہ آخرت میں بہترین انجام کس کے لیے ہے، اس اندازِ بیاں میں کفار کے لیے دھمکی ہے کہ ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔(۴۲)

۱۳......مشرکینِ عرب اور یہود نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا انکار اس وجہ سے کرتے تھے کہ انہیں ان کے منہ مانگے معجزات نہیں دکھائے جاتے تھے، چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ آپ نبوت ورسالت کے دعوی میں جھوٹے ہیں، لیکن ان کے اس انکار سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر اللہ کی اور منصف مزاج علمائے اہلِ کتاب کی گواہی کافی ہے۔(۴۳)

۱۴......عالم کو جاہل پر فضیلت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت کی صداقت کے لیے صاحبِ علم اہلِ کتاب کی شہادت کو جاہل مشرکوں کے سامنے بطورِ دلیل پیش کیا گیا۔(۴۳)

☆☆☆☆☆☆

سُورَةُ اِبْرٰهِیْم
مَکِّیَّةٌ

﴿سورۂ ابراہیم کے اہم مضامین﴾

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس میں ۵۲ آیات اور ۷ رکوع ہیں، اس سورت کی ابتداء بھی حروفِ مقطعات سے ہوئی ہے، حروفِ مقطعات والی دوسری سورتوں کی طرح اس سورت کے آغاز میں بھی قرآنِ کریم کا ذکر ہے اور اس کی پہلی آیت میں نزولِ قرآن کی حکمت اور مقصد بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے ”یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالو، اپنے رب کے حکم سے یعنی غالب اور قابلِ تعریف ذات کے راستے کی طرف۔“

سورۂ ابراہیم میں جو اہم مضامین بیان ہوئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

﴿۱﴾......تینوں بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور بعث وجزاء پر ایمان سے بحث کی گئی ہے۔

﴿۲﴾......کافروں کی مذمت اور ان کے لیے جہنم کی وعید ہے جبکہ مومنوں کے لیے جنت کے وعدے ہیں۔ (۲۔۳، ۲۳، ۲۸۔۳۱)

﴿۳﴾......حضرت خاتم النبیین ﷺ کو تسلی دینے کے لیے بتایا گیا ہے کہ سابقہ انبیاء کے ساتھ بھی ان کی قوموں نے اعراض وانکار اور عداوت ومخالفت کا یہی رویہ اختیار کیا تھا جو آپ کی قوم اختیار کیے ہوئے ہے۔ (۹۔۱۲، ۱۳۔۱۸) اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ گفتگو ذکر کی ہے جو بعض انبیاء اور انہیں جھٹلانے والوں کے درمیان ہوئی، ان مکذبین نے انبیاء کی دعوت کے جواب میں چار شبہات پیش کئے:

☆......رب العالمین کے وجود کے بارے میں شبہ جو کہ مشرکین کے ان الفاظ سے ظاہر ہے: ”اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہم اس سے قوی شک میں ہیں“ اس شبہ کے جواب میں انبیاء نے فرمایا: ”اے اللہ کے بندو! کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کرتے ہو جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟“ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کے دلائل تو اس قدر واضح ہیں کہ ان پر کسی دلیل اور برھان کے قیام کی ضرورت ہی نہیں، کائنات کا ہر ذرہ اور ہر حرکت وسکون اس کی وحدانیت کی گواہ ہے، کیا جب سورج طلوع ہو جائے تو پھر دن کے وجود پر کسی اور دلیل کی بھی ضرورت باقی رہتی ہے؟

☆......مشرکین کا خیال تھا کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا، انبیاء نے جواب دیا کہ بے شک ہم بشر ہیں لیکن بشر کا رسول ہونا محال نہیں، رسول اسے کہتے ہیں جس پر وحی نازل ہو اور ہم پر وحی نازل ہوتی ہے، حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کی طرف کسی انسان ہی کو نبی بنا کر بھیجا جائے، اگر زمین پر فرشتے آباد ہوتے تو کسی فرشتے ہی کو نبی بنا کر بھیجا جاتا۔

☆......مشرکین کو ہدایت سے محروم رکھنے والا ایک بڑا سبب ''تقلیدِ آباء'' تھا، وہ اپنے آباء کی راہ چھوڑنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہ تھے، قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی تردید فرمائی ہے۔

☆......چوتھا شبہ وہ یہ پیش کرتے تھے کہ جن معجزات کا ہم مطالبہ کرتے ہیں وہ ہمیں کیوں نہیں دکھائے جاتے؟ اس کا جواب انبیاء نے یہ دیا کہ کسی بھی معجزہ کا دکھانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، معجزہ دکھانا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس کی مرضی ہے وہ دکھائے یا نہ دکھائے۔

﴿۴﴾......اللہ تعالیٰ کا دستور اور وعدہ یہ ہے کہ وہ شکر کرنے والوں کو اور زیادہ دیتا ہے اور ناشکری کرنے والوں کے لیے اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔(۷)

شکر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان، منعم کے فضل واحسان کا اقرار کرے، اس کی تعریف کرے اور نعمت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرے جس مقصد کے لیے وہ نعمت عطا کی گئی ہے، نعمتِ علم کا تقاضا یہ ہے کہ عمل کیا جائے اور جاہلوں کو تعلیم دی جائے، نعمتِ مال کا شکر یہ ہے کہ اسے نیکی اور احسان کے مواقع پر خرچ کیا جائے، اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کر لیا جائے۔

﴿۵﴾......اس سورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعائیں خاص طور پر ذکر کی گئی ہیں جو انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کے بعد اہلِ مکہ، اپنی اولاد اور خود اپنے خاندان کے لیے کی تھیں، ان دعاؤں میں انہوں نے امن، رزق، دلوں کے میلان، اقامتِ صلوٰۃ اور مغفرت کی درخواست کی تھی۔(۳۵۔۴۱)

﴿۶﴾......حق اور ایمان کے کلمہ کو شجرۂ طیبہ (پاکیزہ درخت) کے ساتھ اور باطل اور ضلالت کے کلمہ کو شجرۂ خبیثہ (ناپاک درخت) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، کلمہ طیبہ جب واقعی دل میں اُتر جائے تو اس کی جڑ بڑی مضبوط اور اس کا پھل بڑا شیریں ہوتا ہے، جبکہ کلمۂ خبیثہ کے لیے قرار بھی نہیں ہوتا اور وہ ہوتا بھی بے ثمر ہے۔(۲۴۔۲۷)

﴿۷﴾......سورۂ ابراہیم کے آخری رکوع میں قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے اور جہنم کے ہولناک عذابوں کا تذکرہ ہے۔

﴿۸﴾......جیسے اس سورت کا آغاز نزولِ قرآن کی حکمت کے بیان سے ہوا تھا، اسی طرح اس کی آخری آیت میں اس کا مقصدِ نزول بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''یہ قرآن لوگوں کے لیے اللہ کا پیغام ہے تاکہ اس سے انہیں ڈرایا جائے اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی اکیلا معبود ہے اور تاکہ اہلِ عقل نصیحت حاصل کریں۔''(۵۲)

☆☆☆☆☆

مقصدِ نزولِ قرآن

﴿۱......۴﴾

﴿بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۙ۬ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰی

الرٰ یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے

صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَوَیۡلٌ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ

رستہ پر اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے ○ جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور مصیبت ہے

مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ

کافروں کو ایک سخت عذاب سے ○ جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے

سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَیَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ

اور تلاش کرتے ہیں اس میں کجی وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور ○ اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے

اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمۡ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ

والا اپنی قوم کی تا کہ ان کو سمجھائے پھر راستہ بھلاتا ہے اللہ جس کو چاہے اور راستہ دکھلاتا ہے جس کو چاہے اور وہ ہے

الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ﴿۴﴾

زبردست حکمتوں والا ○

سورۂ ابراھیم مکی ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ کے نزدیک اس کی دو آیتیں مدنی ہیں جبکہ بعض حضرات نے اس کی تین آیات (۲۸ تا ۳۰) کو مدنی شمار کیا ہے۔{۱}

ربط: سورۂ ابراھیم کا ماقبل سورۂ رعد کے ساتھ بوجوہ گہرا ربط ہے، مثلاً:

☆......سورۂ رعد میں قرآن کے عربی میں نازل کیے جانے کا ذکر تھا، سورۂ ابراھیم میں اس کے مقصدِ نزول کی صراحت ہے۔

☆......سورۂ رعد میں فرشتوں سے شرک کی پاکیزگی کا بیان تھا، یہاں حضرت ابراھیم علیہ السلام کی شرک سے بیزاری کا ذکر ہے۔

☆......سورۂ رعد میں نبی اکرم ﷺ کو توکل کا حکم تھا اور اس سورت میں آپ کی تسلی کے لیے دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے توکل علی اللہ کا بیان ہے۔

{۱} قال ابن عباس وقتادۃ: الا آیتین منھا مدنیتین، وقیل: ثلاث (قرطبی ۹/۲۸۸)

☆......پہلی سورتوں میں اثباتِ توحید کے لیے عقلی ونقلی دلائل دیے جاتے رہے، اب ان دلائل کے ساتھ ساتھ وقائع دنیوی واخروی بھی مذکور ہیں، اس لیے کہ بعض طبائع پر اس اندازِ بیان کا خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ توحیدِ باری تعالیٰ، مقصدِ بعثتِ انبیاء، حقانیتِ قرآن، حق و باطل کے لیے امثال، تکوینی آیات کا بیان، انبیاء سے تصرّف واختیار کی نفی اور انفاق فی سبیل اللہ جیسے موضوعات بھی دونوں سورتوں میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

آگے چلنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض متعصب مغربی مؤرخین نے اپنے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے باہمی تعلق کو شکوک وشبہات کی گرد میں چھپانے کی ناپاک جسارت کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے یہ باور کرانا چاہا کہ آپ ﷺ نے اپنی مکی زندگی میں یہودیت کو اسلام کا نام دے رکھا تھا اور آپ (معاذ اللہ!) یہودی مذہب کی پیروی کرتے تھے لیکن مدینہ کے یہودیوں کی شدید مخالفت کی وجہ سے آپ نے ان سے علیحدگی اختیار فرمائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کعبۃ اللہ کا بانی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے والد اور ملتِ ابراہیم کے داعی کے طور پر نمایاں کرنا شروع کر دیا، ورنہ ان کے بقول حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے درمیان نہ نسبی تعلق ہے نہ مذہبی! یہی وجہ ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ملتا ہے۔

اس بے ہودہ اور لغو اعتراض کے جواب میں فقط اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ قرآن مجید کی ۱۷ مکی سورتوں میں جناب خلیل اللہ کا ذکرِ خیر ہے اور اس کے مقابلے میں صرف ۸ مدنی سورتیں ہیں جن میں آپ کا تذکرہ ملتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جس سورت کو خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، وہ سورت (سورۂ ابراہیم) بھی مکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک مستقل شریعت لے کر مبعوث ہوئے، آپ نے نہ کبھی یہودیت کی پیروی کی اور نہ کبھی آپ عیسائیت کے زیرِ سایہ رہے، جیسا کہ بعض ظلمت پسندوں نے یہ لکھا کہ آپ نے مکہ میں رہنے والے ایک رومی عیسائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔{۲}

خود قرآن نے اعلان فرمادیا:

{۲} (بحوالہ موضع القرآن/ ۳۳۰......ایچ ایم سعید کمپنی)

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ﴾ {۳}

''اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس کو سکھاتا ہے ایک آدمی، جس پر تعریض کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ ہے واضح عربی''

اہلِ بائبل اگر تعصب سے بالاتر ہو کر اس بددیانتی اور خیانت پر اپنے ضمیر سے فیصلہ لیں تو یقیناً ان کا ضمیر بھی انہیں اس پر ملامت کرے گا۔

تسہیل: الر، اے ہمارے پیغمبر! یہ عظیم کتاب ہم نے آپ پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ آپ اس کے ذریعے اپنے رب کے حکم سے لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لائیں، یعنی اس ذات کے راستے کی طرف جو قابلِ تعریف اور غالب ہے ○ وہ ذات ایسی ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت میں ہے اور ان کافروں کے لیے عذابِ شدید کی صورت میں بڑی خرابی ہے ○ جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کمزوریاں تلاش کرتے ہیں، ایسے لوگ پرلے درجے کی گمراہی کا شکار ہیں ○ ہم نے ہر رسول کو اس کی قومی زبان میں اپنا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا تاکہ وہ اللہ کے احکام لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کر سکیں، پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ غالب اور حکیم ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾......الر، ابتدائے سورت میں نزولِ قرآن کا مقصد بتایا جا رہا ہے، اور وہ یہ کہ اے میرے محبوب! تاکہ آپ اللہ کی توفیق سے {۴} اس کتابِ مقدس کے ذریعے عالمِ انسانیت {۵} کو اوہام و خرافات، رسوم و تقلید کی تاریکیوں اور جاہلی اقدار و خیالات سے نکال کر عقیدۂ توحید اور ایمان و ایقان کی روشنی سے ہمکنار کریں۔

﴿اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ معرفت و بصیرت کا یہ راستہ اس شہنشاہِ مطلق کا بتایا ہوا ہے جو ستودہ صفات، مستحقِ ستائش اور بالادست ہے۔

﴿۲﴾......وہ کائناتِ ارضی و سماوی کا مالک و متصرف اور مختارِ کل ہے۔ حضور فخر الرسل ﷺ جیسے آفتابِ جہاں تاب کے طلوع اور قرآن جیسی کتابِ معجز کے نزول کے بعد اگر کوئی تیرہ بخت جہالت و ضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے

{۳} (النحل ۱۰۳/۱۶)

{۴} "باذن ربھم" ای بتوفیقہ ایّاھم (قرطبی ۲۸۸/۹)

{۵} والناس عام اذھو مبعوث الی الخلق کلّھم (البحر المحیط ۴۰۳/۵...... داراحیاء التراث العربی)

نکلنا نہ چاہے تو اسے اس کی تقدیر کی بدبختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

﴿۳﴾.....ان کے حق سے اعراض کا اصل سبب یہ ہے انہوں نے دنیا ہی کو مقصودِ اصلی سمجھ رکھا ہے، اسی فانی دنیا کی محبت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور اسی کی خاطر ان کی ساری صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔

کفار کی اس دنیا پرستی کا ذکر دوسرے مقام پر یوں کیا گیا ہے:

﴿یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾{۶} ''وہ دنیوی زندگی کے ظاہر ہی کو جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل غافل ہیں۔''

گویا عقلِ معاش میں تو بہت آگے ہیں لیکن عقلِ معاد کے اعتبار سے پرلے درجے کی پستی میں ہیں۔ حضور سرورِ کونین ﷺ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے:

﴿اللّٰهم لاتجعل الدّنیا اکبر همّنا ولا مبلغ علمنا﴾{۷} ''اے اللہ! دنیا کی زندگی ہی کو ہمارا سب سے بڑا مقصد اور ہمارے علم کا منتہا نہ بنا دینا۔''

تو فرمایا کہ کافر اس فانی زندگی کو عیشِ جاودانی سمجھ بیٹھے ہیں اور ظلم یہ کہ خود تو ضلالت کی پر پیچ پگڈنڈیوں پر ڈگمگا ہی رہے ہیں، دوسروں کو بھی راہِ حق سے دور دیکھنا چاہتے ہیں۔ بندگانِ خدا کی راہ کھوٹی کرنے کی تاریخ مکہ کی سنگلاخ وادیوں سے لے کر امریکہ کے وائٹ ہاؤس تک پھیلی ہوئی ہے، دولت، عورت، طاقت، سازش، مکر و فریب اور خوشحالی! یہ کل کے کافروں کے بھی آزمودہ ہتھیار تھے اور آج کا کافر بھی ان ہتھیاروں سے لیس، میدانِ عمل میں ہے۔

﴿وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ ان کی فطری کجی اور خوردہ گیری کی عادت نے ان کی عقلوں کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ وہ عزیز و حمید کے بھیجے ہوئے دستورِ حیات میں ٹیڑھ تلاش کرتے اور شریعتِ بیضاء کو اپنی فاسد اغراض کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔{۸}

بھلا ایسے لوگوں کے گمراہ در گمراہ ہونے میں بھی کچھ کلام ہے؟

وہ مقتدا و پیشوا جو اپنی خواہشات کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قرآن کی غلط تفسیر اور دینی احکام کی من مانی تاویل کرتے ہیں، وہ بھی اس وعید کے مصداق ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں سرورِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

{۶} (الروم ۳۰/۷)

{۷} (ترمذی/۳۵۰۲.......دارالسلام، الریاض)

{۸} "ویبغونها عوجاً" ای یطلبون لها زیغا ومیلا لموافقة أهوائهم وقضاء حاجاتهم وأغراضهم۔ (قرطبی ۹/۲۸۹)

﴿انما أخاف علی أمتی الائمة المضلین﴾{۹} ”مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ گمراہ پیشواؤں کا ہے۔“

﴿۴﴾......ہر پیغمبر کے اولین مخاطب اس کی اپنی قوم کے افراد ہوتے ہیں، اس لیے ہر پیغمبر کو اس کی قومی زبان{۱۰} دے کر مبعوث فرمایا گیا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی لہٰذا تورات عبرانی زبان میں نازل ہوئی اور حضرت مسیح علیہ السلام سریانی زبان بولتے تھے تو انجیل بھی اسی زبان میں نازل ہوئی۔

ہمارے آقا ﷺ اولین کی بعثت چونکہ عربوں کی طرف ہوئی تھی اس لیے ان کی رعایت میں قرآن بھی عربی زبان میں نازل ہوا۔

رفعِ اعتراض:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا کہ ایک دفعہ مجھے الہ آباد جانا ہوا تو سید اکبر حسین جج اس زمانے میں ایک منتہی طالبعلم سے عربی پڑھتے تھے، انہوں نے طالبعلم مذکور سے سوال کیا کہ:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کی بعثت صرف اہلِ عرب کی طرف ہوئی تھی، اس لیے کہ آپ کی زبان عربی تھی، لیکن دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾{۱۱} ”ہم نے آپ کو ساری انسانیت کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔“

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾{۱۲} ”فرمادیجئے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

ان دونوں باتوں میں صریح تعارض ہے۔

انہیں جواب تو دیا گیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے، اس طالبعلم نے اس بات کا ذکر مجھ سے کیا تو میں نے ان کی زبانی یہ جواب کہلا بھیجا کہ آپ کے اعتراض کا جواب تو خود اسی آیت میں موجود ہے، اس لیے کہ قرآن نے ”بِلِسَانِ قَوْمِهٖ“ کی قید ذکر کی ہے، اور قوم آپ کی بے شک عرب ہی تھے اعتراض تو جب تھا کہ ”بلسان امته“ فرمایا جاتا۔

{۹} (ابوداؤد ۲، کتاب الفتن/۲۴۳)

{۱۰} ومارسلنا......من قبلك ومن قبل قومك رسولا إلا بلسان الآمة التى آرسلناه اليها ولغتهم (ابن جریر۸/۴۳۷–دارالفکر)

{۱۱} (سبا۳۴/۲۸)

{۱۲} (الاعراف۷/۱۵۸)

اس جواب سے انہیں بہت خوشی بھی ہوئی اور مکمل تشفی بھی!{۱۳}

بیان القرآن میں حضرت مجدّ د الملتہ رحمہ اللہ اس بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

یہود کا یہ کہنا تھا کہ آپ کی قوم کا خاص یعنی عرب ہونا اور بعثت کا عام ہونا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ''قوم'' خاص ہے اور ''امت'' عام ہے، قوم کے خاص ہونے سے امت کا خاص ہونا لازم نہیں آتا۔

یہود کے اس دعوے کے عقلی جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تم نے کم از کم آپ ﷺ کو عرب کی حد تک تو نبی تسلیم کر ہی لیا اور نبوت کے لیے صدق لازم ہے، آپ ﷺ مدّعی ہیں عمومِ بعثت کے لہٰذا اس دعوٰی میں بھی آپ کو سچا ماننا پڑے گا۔ وھو المطلوب۔{۱۴}

بہرکیف اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو قومی زبان میں بھیجا اور اس کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ احکامِ الٰہی کی افہام وتفہیم میں سہولت رہے اور کسی کے پاس عدمِ تبلیغ کا عذر باقی نہ رہے، سورۂ انفال میں ارشاد ہے:

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾{۱۵} ''تاکہ جو زندہ رہے تو واضح دلیل کے ساتھ اور جو ہلاک ہو تو واضح دلیل کے بعد۔''

﴿فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ پیغمبر کا کام صرف تبلیغِ ہدایت ہے، باقی رہا معاملہ ہدایت و گمراہی کا، تو اس کا تعلق اللہ کی مشیت اور مصلحتِ تکوینی کے ساتھ ہے، اسبابِ ہدایت کی دستیابی کے بعد جو شخص مقدماتِ ہدایت اختیار کرے اللہ اس کے لیے راستے کھول دیتا ہے اور حق کا یقین اس کے دل میں بٹھا دیتا ہے، لیکن نورِ ہدایت سے استفادہ کی طلب ہی نہ ہو تو ہدایت یابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر گمراہی مقدّر ہو جاتی ہے۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ وہ مالک الکل غالب ہے، چاہے تو سب کی دستگیری فرما کر انہیں راہِ ہدایت پر چلا دے لیکن بہت سی حکمتوں کی بناء پر وہ ایسا نہیں کرتا۔

حکمت وہدایت:

۱......لوگوں کو ضلالت وجہالت کے اندھیروں سے نکالنا نزولِ قرآن کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔(۱)

۲......طریقِ ہدایت ایک ہے جبکہ گمراہی کی لامحدود شاخیں ہیں، ''ظلمات'' کو جمع اور ''نور'' کو واحد لانے سے یہی سمجھ آتا ہے۔(۱)

{۱۳} (اشرف التفاسیر ۲/۴۲۸-۴۲۹...... ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ)

{۱۴} (بیان القرآن، حصہ دوم، جلد ۲/۶)

{۱۵} (الانفال ۸/۴۲)

۳......ایمان حقیقی نور اور کفر حقیقی ظلمت ہے۔(۱)

۴......کائنات کی ہر چیز کا مالکِ حقیقی اللہ ہے اسے چھوڑ کر غیروں سے لو لگانے والے اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔(۲)

۵......کفار کو عذاب دیے جانے کی تین بڑی وجوہات ہیں:

۱......فانی دنیا کو ابدی زندگی پر ترجیح دینا۔

۲......لوگوں کو راہِ حق سے روکنا۔

۳......احکامِ الٰہی میں کٹ حجتی سے کام لینا۔(۳)

۶......رسولوں کا قومی زبان میں مبعوث کیا جانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ بعثت کے مقصودِ اصلی یعنی بیانِ حق میں ابہام رہ جاتا۔(۴)

۷......شیخ کے خلفاء وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں ان کے ساتھ تمام مستفیدین سے زیادہ مناسبت ہو۔(۴){۱۶}

سرگزشتِ موسیٰ علیہ السلام

﴿۵......۸﴾

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو

بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا

دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر کرنے والا ہے شکر گزار ۝ اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ

اللہ کا احسان اپنے اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے، وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب اور ذبح کرتے

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی ۝

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

اور جب سنا دیا تمہارے رب نے، اگر احسان مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے ۝

{۱۶} (بیان القرآن، حصہ دوم، جلد ۶/۱)

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۸

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کرو گے تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے تو اللہ بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا O

ربط: رسالت کے عمومی ذکر کے بعد اب خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بعض دیگر انبیاء کا تذکرہ ہے اور مقصود اس سے یہ ثابت کرنا ہے کہ دنیا میں آنے والے ہر نبی کا اوّلین مقصد لوگوں کی ہدایت رہا ہے۔

تسہیل: اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات دے کر بھیجا اور حکم دیا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں اور انہیں تاریخی واقعات سے نصیحت کریں۔ یقیناً ان واقعات میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرتیں ہیں جو صبر وشکر کے خوگر ہیں O اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی ہیں جب کہ اس نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی وہ تمہیں بدترین سزائیں دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اس میں تمہارے رب کی طرف سے سخت آزمائش تھی O اور یہ بات بھی تمہیں یاد رکھنی چاہیے کہ تمہارا رب تم پر واضح کر چکا ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے O اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم اور زمین پر بسنے والے سارے کے سارے لوگ ناشکرے بن جاؤ تو اللہ کو اس کی قطعاً پرواہ نہیں کیونکہ وہ بے نیاز اور قابلِ تعریف ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۵﴾...... اپنی قوم کو عقائد واعمال کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان واعمالِ صالحہ کی روشنی کی طرف لانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، آپ کی بعثت بنی اسرائیل اور قبطی دونوں قوموں کی طرف تھی لیکن آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والے صرف بنی اسرائیل تھے۔

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ﴾ آپ نے اپنی قوم کو تاریخِ الٰہی کے اِن واقعات سے نصیحت کی جن میں سے کوئی واقعہ رحمت اور کوئی قہرِ الٰہی کا مظہر تھا۔ "ایام اللہ" کا اطلاق ہر قسم کے اہم تاریخی واقعات پر ہوتا ہے{۱۷} نیز "ایام" کی نسبت اللہ کی طرف کرنے میں ان واقعات کی عظمت واہمیت کی طرف اشارہ ہے۔{۱۸}

﴿اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ...... الخ﴾ نعمت اور عذاب کے واقعات میں{۱۹} چھپی حکمتوں اور نصیحتوں کا ادراک وہی شخص

{۱۷} المراد بايّام الله وقائعه سبحانه ونقماته في الأمم الخالية۔ (روح المعانى ۸، ۲۷۱/۱۳) وانذرهم بوقائعه التى وقعت على الامم قبلهم۔ (كشاف ۵۰۸/۲)

{۱۸} اضافة الايام الى الله تعالىٰ تشريف لأمرها (بحواله ماجدى ۲۹۶/۲)

{۱۹} اى فى التذكير بايّام الله (روح المعانى ۸، ۲۷۲/۱۳)

وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيَّامِ اللهِ
دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
فنِ تعمیر کا شاہکار، قومِ ثمود کی بستی
قومِ شعیب کی بستی کا ایک منظر
بشکریہ "نقوش التاریخ الاسلامی"

کرسکتا ہے جو صبر وشکر جیسی عظیم صفات سے متصف ہو، ایسے شخص پر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ مصائب وشدائد میں گھبرانا اور فرحت وانبساط میں اترانا نہیں چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآنی علوم پانچ قسم ہیں، ان میں سے ایک ''تذکیر بایام اللہ'' بھی ہے یعنی اطاعت شعاروں پر اللہ کے افضال وعنایات اور مجرمین کی دار وگیر پر مشتمل واقعات کا بیان......!{۲۰}

﴿۶﴾......اس آیت کی تشریح کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت ۴۹ اور سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۱ ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۷﴾......حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس عظیم حقیقت کو بیان فرمایا کہ شکرِ نعمت سے جسمانی، روحانی، دنیوی اور اخروی عطایا میں اضافہ ہوتا ہے اور کفرانِ نعمت سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

ہر سلیم الفطرت انسان احسان کا فطری صلہ شکر ہی کو سمجھتا ہے اور یہ صفت اس کے اعتدال اور ہدایت پر ہونے کی علامت ہے۔

شکر کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں صرف نہ کیا جائے۔''

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ حضرت جنید بغدادی کے شیخ تھے، ایک دن انہوں نے اپنے تلمیذِ رشید حضرت جنید سے سوال کیا کہ شکر کیا ہے؟

حضرت بغدادی رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اللہ کی نعمتوں کو بے محل خرچ نہ کرنا......!

شیخ سرّی بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ یہ جواب کہاں سے حاصل کیا؟

حضرت جنید نے جواب میں کہا کہ آپ کی صحبت سے حاصل کیا۔{۲۱}

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''نعمت کو منعمِ حقیقی کی طرف سے سمجھنے سے دو باتیں پیدا ہوتی ہیں......ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسرے اس کی خدمت گزاری اور امتثالِ اوامر میں سرگرمی دکھانا۔''{۲۲}

ایک اور مقام پر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

''اگر کوئی حالت طبیعت کے موافق ہو، چاہے اختیاری ہو یا غیر اختیاری، تو اس حالت کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر

{۲۰} (الفوز الکبیر/۱۸......قدیمی کتب خانہ)
{۲۱} سکونِ قلب/۱۸۴-۱۸۵، حضرت تھانوی رحمہ اللہ...... ادارہ تالیفات اشرفیہ)
{۲۲} (تعلیم الدین/۷۴)

خوش ہو اور اسے اپنی لیاقت سے بہت زیادہ سمجھے، پھر زبان سے اللہ کی تعریف کرے اور جوارح (اعضاء) کو گناہوں سے روک کر رکھے۔" {۲۳}

بہر حال شکر نعمتوں میں زیادتی کا سبب تو ہے، لیکن قرآن نے یہ حقیقت بھی کھلے الفاظ میں بیان فرمائی کہ:

﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ {۲۴} "میرے بندوں میں سے بہت تھوڑے ہیں جو شکر کرتے ہیں۔"

اسی سورت کی آیت (۳۴) میں ہے:

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ {۲۵} "بلاشبہ انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے۔"

﴿وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ حالات کی مناسبت سے اس جملے کی تشریح میں یہ عرض کردینے کو جی چاہتا ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان، جسے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی طویل اور صبر آزما جنگ کے بعد اللہ اور اس کے رسول کے مقدس نام پر اور لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ کا واسطہ دے کر حاصل کیا گیا، ہم نے اس نعمتِ عظمیٰ کی بالکل قدر نہیں کی، یہاں آج بھی سود اور رشوت کا بازار گرم ہے، ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہے، لاقانونیت کی فضا ہے، نہ خدا کا خوف ہے نہ قانون کا ڈر، نہ حاکم کو احساسِ فرض ہے نہ محکوم کو، نہ کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال، الحاد و دہریت کو کھلی چھوٹ ہے اور ایمانی عقائد پر حملے ہیں، یہاں بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں، فلک بوس عمارتیں بھی ہیں، خوشنما بلڈنگیں بھی ہیں، فراخ سڑکیں اور ان سڑکوں پر دوڑتی عمدہ گاڑیاں بھی ہیں لیکن افسوس! صد افسوس! نہیں ہے تو اسلام کی بالادستی نہیں ہے۔ {۲۶}

ہمارے حالات کی بدتری کی وجہ ناشکرا پن ہے اور صرف وطنِ عزیز پر کیا موقوف پورے عالمِ اسلام کی یہی حالت ہے، انہوں نے اپنی افرادی قوت کی قدر نہ کی، ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا لہٰذا آج سارا عالمِ اسلام کفریہ طاقتوں کے ہاتھوں ذہنی و جسمانی طور پر یرغمال بنا ہوا ہے۔

اس میں دورائے نہیں ہیں کہ ناشکر گزاری کا نتیجہ تجارت، سیاست، معیشت اور سلطنت کی تباہی ہے اور اس کے ثبوت پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ہم سر کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

{۲۳} (انفاسِ عیسیٰ/۲۱۸)

{۲۴} (سبا ۳۴/۱۳)

{۲۵} (ابراھیم ۱۴/۳۴)

{۲۶} (بصائر و عبر، از حضرت بنوری رحمہ اللہ/۴۰۵)

﴿۸﴾......حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے، قوم کو پند ونصیحت کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش فرمازہے ہیں کہ شکر میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے اور کفرانِ نعمت کا وبال بھی اسی پر پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی اطاعت سے نفع ہے نہ معصیت سے ضرر......!

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے دو عظیم صفات کا ذکر ہے۔

(۱) ''لَغَنِيٌّ''......یہ لفظ کائنات کی تمام چیزوں کی تحقیر اور اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

(۲) ''حَمِيدٌ''......وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، کفر وانقیاد سے اس کی ذات پر مطلق اثر نہیں پڑتا۔{۲۷}

حکمت وہدایت:

۱......تمام انبیاء کی بعثت کا مقصدِ اصلی انسانوں کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر نورِ ایمان کی طرف لانا تھا۔(۵)

۲......عبرت وانذار کے لیے امم سابقہ کے واقعات وحالات کا سہارا لینا جائز ہے۔(۵)

۳...... ''اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ''، مخرج حقیقی حق تعالیٰ ہے لیکن اس کے باوجود اخراج کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا اس بات کی قوی دلیل ہے کہ تکمیلِ مرید میں شیخ کو عظیم دخل ہے۔(۵){۲۸}

۴......مومن دو حال سے خالی نہیں، یا صبر کرتا ہے یا شکر کرتا ہے، حدیث میں ہے:

﴿الایمان نصفان فنصف فی الصبر ونصف فی الشکر﴾{۲۹}

''ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا ایمان صبر میں ہے اور آدھا شکر میں ہے۔''

۵......مومن پر آنے والی مصیبت میں بھی اس کے لیے نفع اور تربیت ہے۔(۶){۳۰}

۶......نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا انتہائی مبارک عمل ہے(۷)......حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب رحمہ اللہ اپنے مریدین کو بار بار یہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''میاں! تم لوگ مجاہدے اور ریاضتیں تو کرنے سے رہے، پہلے لوگوں کی طرح مشقتیں برداشت کرنا بھی تمہارے بس میں نہیں اور فرصت کا ملنا بھی تمہارے لیے بڑا مسئلہ ہے، لیکن ایک کام ضرور کر لیا کرو، اور وہ یہ کہ کثرت سے اللہ کا شکر ادا کرنے والے بن جاؤ۔ اس سے امراضِ باطنہ دور ہوں گے اور دل میں تواضع آجائے گی۔''{۳۱}

{۲۷}(قبس من نور القرآن الکریم ۱۴/۶)

{۲۸}(بیان القرآن، حصہ دوم، جلد ۳/۶)

{۲۹}(بیہقی بحوالہ منیر ۲۱۲/۱۴......وھو ضعیف)

{۳۰}(بیان القرآن، حصہ دوم، جلد ۳/۶)

{۳۱}(ارشاداتِ اکابر/۱۶۱)

۷......بنی اسرائیل مصیبت اور نعمت دونوں حالتوں میں ناکام رہے، مصیبت میں صبر نہ کر سکے اور نعمت کا شکر ادا نہ کر سکے۔

۸......"لَأَزِيدَنَّكُمْ" سے نعمتوں کی افزونی کے علاوہ لفظ کے عموم سے توفیقِ شکر اور ثوابِ شکر کا مطلب بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

۹......صبر و شکر کے فوائد بھی انسان خود سمیٹتا ہے اور ناشکری کی نحوست بھی اسی پر پڑتی ہے اللہ کی سلطنت و سطوت میں نہ انسان کے شکر سے اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی ناشکرے پن سے کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔(۸)

۸......مومن کی زندگی کا کوئی لمحہ صبر و شکر سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔

گزشتہ اقوام کا اپنے انبیاء سے ناروا سلوک

﴿۹......۱۲﴾

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَالَّذِينَ مِن

کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے، قوم نوح کی اور عاد اور ثمود اور جو ان سے پیچھے ہوئے، کسی کو

بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ

ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو، آئے ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر پھر لوٹائے انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں

فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ

اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو دے کر بھیجا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو

مُرِيبٍ ﴿٩﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ

بلاتے ہو خلجان میں ڈالنے والا O بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین؟ وہ تم کو بلاتا ہے

لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ

تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے کہنے لگے تم تو یہی آدمی ہو

مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ

ہم جیسے، تم چاہتے ہو کہ روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے، سو لاؤ کوئی سند

مُّبِينٍ ﴿١٠﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن

کھلی ہوئی O ان کو کہا ان کے رسولوں نے ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم، لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں

يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

جس پر چاہے اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ پر بھروسہ چاہیے

الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ

ایمان والوں کو O اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور وہ سمجھا چکا ہم کو ہماری راہیں اور ہم صبر کریں گے ایذاء پر

اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہیے بھروسے والوں کو O

تسہیل: اے حق کو جھٹلانے والو! کیا تمہارے علم میں ان لوگوں کے حالات نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں یعنی قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود، اور ان قوموں کے حالات جو ان کے بعد ہوئیں، جن کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، جب ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے ہاتھ مونہوں پر رکھتے ہوئے کہا ”جو پیغام تمہارے ذریعے بھیجا گیا ہے ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور جس دین کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کے بارے میں ہمارے دل میں ایسے اشکالات ہیں جو ہمیں تردّد میں ڈال رہے ہیں“ O ان کے رسولوں نے جواب میں کہا، ارے! کیا تم اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ وہ تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے تاکہ تمہارے گزشتہ گناہ معاف کر دے اور ایک معین وقت تک کے لیے تمہیں توبہ اور عمل کی مہلت دے دے، انہوں نے کہا تم محض ہمارے جیسے انسان ہو، تم یہ چاہتے ہو کہ جن چیزوں کی ہمارے آباء واجداد عبادت کیا کرتے تھے ان کی عبادت سے ہمیں روک دو، اگر تم واقعی سچے ہو تو اپنی نبوت پر کوئی واضح معجزہ دکھاؤ O ان سے ان کے رسولوں نے کہا، واقعی ہم بھی تمہارے جیسے انسان ہی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا خصوصی احسان فرما دیتا ہے، رہا معجزے کا معاملہ، تو اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بھی معجزہ دکھانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، ہمارا بھروسہ صرف اللہ پر ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے O یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ اس کے فضل کا حال یہ ہے کہ اس نے ہمیں دین و دنیا کے فوائد کے راستے بتا دیئے ہیں، تم ہمیں جو اذیتیں دیتے ہو تو ہم ان پر صبر کریں گے اور بھروسہ رکھنے والوں کو ہمیشہ اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے O

تفسیر

﴿۹﴾ ...... بحیثیت ناصح ومذکّر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی سرکش اقوام میں سے چند ایک کا ذکر فرمایا یعنی قومِ

نوح، قومِ ھود اور قومِ ثمود! ان کے متعلقہ انبیاء ان کے پاس واضح معجزات لے کر آئے {۳۲} لیکن نمائندگانِ حق کے ساتھ ان کی قوموں کا یہ رویہ رہا کہ:

﴿فَرَدُّوٓا اَيۡدِيَهُمۡ فِىۡۤ اَفۡوَاهِهِمۡ﴾ اس کے معنیٰ میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

بعض نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے بطور استہزاء ہنستے ہوئے اپنے مونہوں پر اپنے ہاتھ رکھ لیے، {۳۳} بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کے مونہوں پر ہاتھ رکھ دیے، {۳۴} اور ایک قول یہ بھی ہے کہ شدتِ غضب سے انہوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ {۳۵}

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے منہ پر انگلی رکھ کر انبیاء کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے تھے۔

مطلب کوئی سا بھی لیں، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی صورت دعوتِ حق سننے کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ آگے اس کی تصریح ہے کہ:

﴿وَقَالُوۡۤا اِنَّا كَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ ...... الخ﴾ ہمیں اس پیغام سے صاف انکار ہے جس کے تم مدعی ہو اور اللہ کی وحدانیت {۳۶} کا جو درس تم ہمیں دیتے پھرتے ہو اس کے بارے میں ہم شش و پنج میں مبتلا ہیں۔

﴿شَكٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَيۡهِ مُرِيۡبٍ﴾ میں لفظِ "مریب" تاکید کے لیے ہے۔ {۳۷} ورنہ جو معنیٰ شک کا ہے وہی معنیٰ "مریب" کا بھی ہے۔

﴿۱۰﴾ ...... پیغمبروں کی طرف سے جواب دیا گیا کہ پوری کائنات کو وجود میں لانے والے اللہ کے باب میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں، {۳۸} انسانی فطرت اور زمین و آسمان کا سارا نظام اس کے وجود پر شاہد ہے۔

رہا ہمارا تمہیں عقیدۂ توحید کی دعوت دینا، تو یہ بھی درحقیقت اللہ کی دعوت ہے، ہم تو فقط واسطہ ہیں، اور یہ اللہ کی شانِ کریمی ہے {۳۹} کہ شاہراہِ ہدایت کی طرف تمہاری رہبری فرما کر وہ تمہیں دنیا و آخرت کی ذلت اور ناکامی سے بچانا چاہتا ہے۔

{۳۲} جاء تهم رسلهم بالمعجزات الظاهرة۔ (تفسیر المراغی ۱۳/۱۳۲)
{۳۳} وضعوا أيديهم علىٰ أفواههم مبالغة فی السخرية والتكذيب (قبس من نور القرآن الكريم ۶/۱۵)
{۳۴} ان الكفار وضعوا أيديهم علىٰ افواه الانبياء عليهم السلام (كبير ۷، ۱۹/۶۹)
{۳۵} ای عضّو بنان الندم غيظا لما جاء هم به الرسل وضجر لنفرتهم من استماع كلامهم (المراغی ۱۳/۱۳۳)
{۳۶} من الايمان بالله والتوحيد۔ (مدارك ۲/۱۶۴ ...... مکتبہ رحمانیہ لاہور)
{۳۷} "مريب" صفة توكيدية (البحر المحيط ۵/۴۰۷)، هو صفة تاكيدية۔ (روح المعانی ۸، ۱۳/۲۸۱)
{۳۸} استفهام معناه الانكار ای لا شك فی الله۔ (قرطبی ۹/۲۹۵)
{۳۹} بعد أن أشير الى الدليل ...... نبّه علىٰ عظم كرمه۔ (روح المعانی ۸، ۱۳/۲۸۲)

﴿قَالُوٓا۟ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ توحیدِ باری کے باب میں شکوک وشبہات کے بعد مشرکین نے انبیاء علیہم السلام کو بشریت کا طعنہ دیا، کہنے لگے کہ تم ہمارے جیسے انسان ہو اور انسان کا مقامِ نبوت پر فائز ہونا ممکن ہی نہیں لہٰذا تمہاری نبوّت (معاذ اللہ!) ایک ڈھکوسلا ہے جس کا مقصد بجز ہمارے آبائی دین میں رخنہ ڈالنے کے اور کچھ نہیں اور اگر تم اللہ کے ساتھ کسی تعلقِ خصوصی (نبوت) کے دعویدار ہو ہی تو کوئی ایسا معجزہ دکھاؤ کہ خواہی نہ خواہی سب کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں، یہ مطالبہ صرف عناد کی وجہ سے تھا{۴۰} ورنہ دنیا میں آنے والے ہر پیغمبر کو حالات کے موافق معجزات ضرور عطا ہوئے۔

﴿۱۱﴾......رسولانِ کرام نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بشریت اور لوازمِ بشریت میں وہ ایک عام انسان کی طرح ہیں، ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ اللہ نے اپنی حکمت کے مطابق انہیں نبوت ورسالت کے لیے منتخب فرمالیا۔

باقی رہا معجزہ دکھانے کا مطالبہ تو اس کا دکھانا ہمارے بس میں نہیں اس کا ظہور مشیتِ باری تعالیٰ کے سوا ممکن ہی نہیں،{۴۱} اور نہ ہی عقلاً ہماری تصدیق اس پر موقوف ہے اگر تم اس حقیقت سے بے بہرہ رہو اور ہماری ایذاء رسانی کے درپے رہو تو ہمارا بھروسہ اللہ کی تائید ونصرت پر ہے اور اس کی ذات پر توکل ہی اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہے۔

﴿۱۲﴾......﴿وَمَا لَنَآ أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى ٱللَّهِ﴾ جماعتِ انبیاء نے ''توکل علی اللہ'' کی علت بیان فرمائی، وہ یہ کہ جب اللہ نے ہمیں معرفت ورضا کے طریق سے بہرہ مند فرمایا ہے{۴۲} اور زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اپنے فضل وکرم سے ہماری رہنمائی کر رہا ہے تو پھر اس کی ذاتِ عالی پر کامل اعتماد کر کے ہم کیوں نہ یہ یقین رکھیں کہ راہِ حق میں پیش آنے والی مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو بھی وہ دور فرمادے گا۔

﴿وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَآ ءَاذَيْتُمُونَا﴾ تمہارے اوچھے ہتھکنڈوں سے ہمارے پائے استقلال میں ذرّہ برابر بھی تزلزل نہیں آسکتا، ہم صبر اور توکل سے تمہاری سازشوں کا جواب دیں گے اور اہلِ ایمان کو توکل ہی کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار سمجھنا چاہیے۔

حکمت وہدایت:

۱......پہلی قوموں کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا انسان پر لازم ہے۔(۹)

{۴۰} ھذا الطّلب اقدمھم علیه العناد والمکابرة۔ (روح المعانی ۸،۱۳/۲۸۵)

{۴۱} والمعنی ان الاتیان بالآیة التی قداقترحتموھا لیس الینا ولا فی استطاعتنا وانما ھوامر یتعلّق بمشیئة اللہ تعالیٰ۔ (مدارک ۲/۱۶۵)

{۴۲} ای الطریق الذی یوصل الی رحمته وتنجی من سخطه۔ (قرطبی ۹/۲۹۶)

۲......سوءِادب کفر کے علاوہ ایک مستقل جرم ہے، اسی واسطے اہلِ طریقت اس سے سخت ممانعت کرتے ہیں۔(۹){۴۳}

۳......محض اَوہام وظنون کی بناء پر عقیدۂ توحید جیسے سادہ عقیدہ کو چیستاں بنانا فطرت کی آواز کو دبانا ہے، آخر اس قادرِ مطلق کی ذات وصفات میں کمی کیا ہے جس کی تلافی یہ احمق انسان ''خداؤں کی جمعیت'' سے کرنا چاہتا ہے؟(۱۰)

۴......بشریت منصبِ نبوت کے منافی نہیں اور کسی نبی نے بھی فوق البشر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن کافروں اور مشرکوں کو یہ مسئلہ کبھی سمجھ نہ آیا۔(۱۰)

۵......ایمان کی نعمت اللہ کی توفیق وعنایت سے حاصل ہوتی ہے دلیل ومعجزہ سے نہیں، البتہ ظاہری اسباب کے لحاظ سے ایمان ویقین حاصل کرنے کی طلب وجستجو انسان کا فریضہ ہے۔{۴۴}

۶......مصائب کا ہجوم دیکھ کر توکل واستقامت کی راہ سے ہٹ جانا اہلِ ایمان کا وطیرہ نہیں۔(۱۱)

۷......صبر وتوکل انتہائی فضیلت والے اعمال اور دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا موثر ترین ہتھیار ہیں۔(۱۲)

کفار کی دھمکیاں اور ان کا انجامِ بد

﴿۱۳......۱۸﴾

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۚ فَاَوْحٰٓى

اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے

اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ

ہم غارت کریں گے ان ظالموں کو O اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں ان کے پیچھے، یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرتا ہے کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہے

مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَاۗىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى

میرے عذاب کے وعدہ سے O اور فیصلہ لگے مانگنے پیغمبر اور نامراد ہوا ہر ایک سرکش ضدی O پیچھے اس کے دوزخ ہے اور

مِنْ مَّاۗءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ

پلائیں گے اس کو پانی پیپ کا O گھونٹ گھونٹ پیتا ہے اس کو اور گلے سے نہیں اتار سکتا اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر

بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ

طرف سے اور وہ نہیں مرتا اور اس کے پیچھے عذاب ہے سخت O حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے، ان کے عمل ہیں جیسے وہ

الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

راکھ کہ زور کی چلے اس پر ہوا آندھی کے دن، کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا O

{۴۳} (بیان القرآن حصہ دوم، جلد۲/۴)
{۴۴} (موضح القرآن/۳۳۲)

ربط: صاحبِ عزیمت مومنین کے مقابلے میں متعصب کافروں کی ہلاکت نوشتۂ تقدیر ہے۔

تسہیل: اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے یا تمہیں ہمارے دین میں واپس لوٹ آنا ہوگا، تو ان کے رب نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے O اور ان کی ہلاکت کے بعد تمہیں اس زمین میں بسائیں گے اور میرا یہ وعدہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے دن میرے سامنے پیش ہونے سے بھی ڈرتا ہے اور اس کے دل میں میری وعیدوں کا بھی خوف ہے O اور انہوں نے دوٹوک فیصلے کی دعا مانگی اور جب اللہ نے فیصلہ فرما دیا تو ہر سرکش اور ضدی نامراد ہوا O دنیوی عذاب کے علاوہ دوزخ کا عذاب بھی اس کے انتظار میں ہے، وہاں اسے پیپ اور لہو پلایا جائے گا O وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پینے کی کوشش کرے گا مگر حلق سے نیچے نہیں اتار سکے گا اور اسے ہر طرف موت نظر آ رہی ہوگی مگر وہ مرے گا نہیں، بلکہ اس کے بعد اسے مزید سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا O جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے راکھ کا ڈھیر، جس پر آندھی کے دن تیز ہوا چلے اور اسے اڑا لے جائے، یونہی اُن لوگوں کو بھی اپنے اعمال میں سے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا، یہی دور کی گمراہی ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۳﴾...... اپنے بے ہودہ اشکالات کے معقول اور متین جوابات سن کر اپنے سدھار کے بجائے کفار نے انبیاء کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔ کہنے لگے، تمہارے سامنے دو راستے ہیں، یا تو ہمارا دین قبول کر کے ہمارے ساتھ رَل مِل جاؤ {۴۵} یا پھر جلاوطنی کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہو۔

﴿فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ ...... الخ﴾ ادھر ظالموں نے یہ دھمکی دی ادھر اللہ نے بذریعہ وحی ان کی ہلاکت کی خبر سنا کر انبیاء کے قلوب کو مطمئن کر دیا۔

﴿۱۴﴾...... ﴿وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ﴾ یہ اللہ کی سنتِ جاریہ ہے کہ ظالم کا ظلم جب حد سے تجاوز کر جائے تو وہ اسے نیست و نابود کر کے اس کی جگہ عدل و انصاف کے علمبرداروں کو لا کھڑا کرتا ہے۔ مشرکینِ مکہ نے طاقت و نخوت کے نشے میں مجبور و مقہور مسلمانوں کو مکہ بدر کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب یہ مکہ میں کبھی داخل نہیں ہو سکیں گے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان کا مسلمانوں کو نکالنا ہی مسلمانوں کے غلبے کا سبب بنا اور کل کے محکوم حاکم بن کر رہے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ﴾ نصرتِ الٰہی کا یہ وعدہ صرف انبیاء و رسل کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ

{۴۵} (اس کی تشریح کے لیے دیکھیے تسہیل البیان ۱۱۴/۳)

اس کا دائرہ وسیع ہے اور یہ وعدہ ہر اس مومن کے لیے ہے جو اللہ کے روبرو کھڑا ہو کر جواب دہی سے اور آخرت کے عذاب سے خوفزدہ رہتا ہے۔

﴿۱۵﴾...... ﴿وَاسْتَفْتَحُوا﴾ ''انہوں نے فیصلہ چاہا'' کس نے فیصلہ چاہا؟ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حتمی اور آخری فیصلے کا مطالبہ انبیاء نے بھی کیا اور ان کی امتوں نے بھی......!

سورۂ اعراف میں حضرت شعیب علیہ السلام کی دعا یوں منقول ہے:

﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ﴾{۴۶} ''اے ہمارے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان دوٹوک فیصلہ فرما دے اور تو ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

شیخ الانبیاء سیدنا نوح علیہ السلام اپنی سرکش قوم کے بارے میں دست بدعا ہیں:

﴿رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾{۴۷} ''اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے، پس تو میرے اور ان کے درمیان کوئی قطعی فیصلہ فرما کر مجھے اور میرے مومن ساتھیوں کو نجات عطا فرما۔''

حضرت لوط علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا تھا:

﴿رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ۝﴾{۴۸} ''میرے اللہ! مجھے اور میرے گھر والوں کو ان حرکتوں سے بچا لے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

پیغمبروں کی ان عاجزانہ دعاؤں کے مقابلے میں باغی اور سرکش قوموں کی ہٹ دھرمی ملاحظہ فرمائیے، بولے:

﴿رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾{۴۹} ''اے ہمارے پروردگار! ہمارا حصہ ہمیں روزِ حساب سے پہلے جلدی دے دے۔''

سورۂ شعراء میں ان کی ہٹ دھرمی کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

﴿فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝﴾{۵۰} ''اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں۔''

{۴۶} (الاعراف ۷/۸۹)
{۴۷} (الشعراء ۲۶/۱۱۷-۱۱۸)
{۴۸} (الشعراء ۲۶/۱۶۹)
{۴۹} (ص ۳۸/۱۶)
{۵۰} (الشعراء ۲۶/۱۸۷)

سورۂ انفال میں ان کا مطالبہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

﴿اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ﴾ {۵۱}

''اے اللہ! اگر یہ قرآن واقعی تیرا کلام ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا، یا ہمیں المناک عذاب سے دوچار کردے۔''

قرآنی اندازِ بیان کے پیشِ نظر بعض مفسرینِ کرام نے ''وَاسْتَفْتَحُوْا'' سے جماعتِ انبیاء مراد لی ہے اور بعض نے گروہِ کفار! {۵۲}

انبیاء نے کفار کی تکذیب کی وجہ سے عذاب بھیجنے کی درخواست کی اور کفار نے انبیاء کی صداقت کو چیلنج کرتے ہوئے اپنی ہلاکت کو دعوت دی۔ {۵۳}

﴿وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ پیغمبروں کی پکار پر اللہ نے اپنا فیصلہ صادر فرمایا اور عذابِ الٰہی نے کافروں کو ان کی آرزوؤں سمیت صفحۂ دہر سے ہمیشہ کے لیے گم کردیا۔

﴿۱۶-۱۷﴾ ...... ﴿مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ﴾ ''ورآء'' کا صیغہ لغاتِ اضداد میں ہونے کی وجہ سے ''آگے'' اور ''پیچھے'' دونوں معنی میں مستعمل ہے۔ {۵۴}

قرآنی سیاق وسباق یہ بتاتا ہے کہ جہنم یا عذابِ جہنم وغیرہ کے مواقع پر یہ لفظ ''آگے'' [illegible] معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۂ الجاثیہ میں ہے:

﴿مِّنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَوْلِيَآءَ﴾ {۵۵}

''ان کے آگے جہنم ہے، اور جو کچھ انہوں نے کمایا نہ وہ انہیں کچھ کام آئے گا اور نہ وہ کام آئیں گے جن کو انہوں نے اللہ کے علاوہ کارساز بنا رکھا تھا۔''

یونہی سورۂ مومنون میں ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ {۵۶}

''ان کے سامنے عالمِ برزخ کی آڑ ہے جو دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانے تک برقرار رہے گی۔''

{۵۱} (الانفال ۸/۳۲)

{۵۲} استنصرت الرسل ربها على قومها (ابن کثیر ۲/۶۸۴)...... والضمير للانبياء عليهم السلام (بیضاوی ۳/۳۴۲)...... الضمير للكفار (روح المعانی ۸، ۱۳/۲۹۰)

{۵۳} قال الرسول: انّهم كذّبونى فافتح بيني وبينهم فتحا وقالت الامم ان كان هؤلاء صادقين فعذبنا (قرطبی ۹/۲۹۷)

{۵۴} يقال لمن خلفه نحو قوله "من ورآء اسحٰق يعقوب...... ارجعوا ورائكم...... ويقال لمن قدامه نحو: وكان ورآء هم ملك...... وقوله...... أومن ورآء جدر (مفردات/۵۲۰)

{۵۵} (الجاثیہ ۴۵/۱۰)

{۵۶} (المؤمنون ۲۳/۱۰۰)

دنیا کی ذلت ورسوائی کے بعد کفار کے لیے اخروی سزاؤں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگا، انہیں انتہائی متعفن وغلیظ پانی پینے کو دیا جائے گا جس میں دوزخیوں کا پیپ وخون ملا ہوگا، غلاظتوں کا یہ مرکب ان کے حلق کا پھندا بن جائے گا، وہ اسے پینا نہیں چاہیں گے لیکن ان کی تشنہ لبی انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرے گی لہٰذا بڑے تکلف کے ساتھ گھونٹ گھونٹ کر کے تھوڑا تھوڑا اسے پئیں گے'اسبابِ ہلاکت میں{۵۷} سے کونسا سبب ہوگا جو موجود نہ ہوگا لیکن موت انہیں مانگے نہیں ملے گی۔ جہنمیوں کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے زقوم دیا جائے گا، جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لو أن قطرة من الزقوم قطرت في دار الدنيا لأفسدت على أهل الدنيا معائشهم.{۵۸}

''اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی زمین پر ٹپک پڑے تو اہلِ دنیا کا زمین پر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے۔''

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيظٌ﴾ اور یہ تو ان کو دیے جانے والے عذابوں میں سے عذاب کی ایک جھلک ہے، ورنہ اس کے علاوہ بھی متنوع دردناک عذاب ان کے لیے تیار ہوں گے، قرآن نے دیگر مختلف مقامات پر ان ہولناک عذابوں کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً:

﴿إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ۝ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ۝﴾{۵۹}

''زقوم کا درخت گنہگار کا کھانا ہوگا تیل کی تلچھٹ جیسا وہ پیٹوں میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح جوش مارے گا، (فرشتوں سے کہا جائے گا) اس کو پکڑو اور گھسیٹ کر دوزخ کے بیچوں بیچ لے جاؤ، پھر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب اس کے سر پر انڈیل دو۔''

سورۂ واقعہ میں فرمایا:

﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ۝ لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّومٍ ۝ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ۝ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ۝ فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِيمِ ۝ هَٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ۝﴾{۶۰}

''پھر اے جھٹلانے والے گمراہو! تمہیں ایک ایسے درخت سے کھانا پڑے گا جس کا نام زقوم ہے، اسی سے پیٹ بھرتے ہوں گے اور اس کے اوپر کھولتا ہوا پانی پینا پڑے گا جیسے پیاس کی بیماری والے اونٹ پیتے ہیں، یہ ان کی مہمانی ہوگی جزا کے دن۔''

{۵۷} "یاتیه الموت"...... ای اسباب الموت (مدارک ۲/۱۶۷)
{۵۸} (ترمذی ۲، ابواب صفة جهنم/۸۶)
{۵۹} (الدخان ۴۴/۴۳-۴۸)
{۶۰} (الواقعه ۵۶/۵۱-۵۶)

اسی سورت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ؕ﴿۴۱﴾ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾﴾{۶۱}

"اور بائیں ہاتھ والوں کے بارے میں کیا بتانا؟ وہ تو تپتی ہوئی لُو اور کھولتے ہوئے پانی میں ہوں گے، اور ان کے لیے سیاہ دھویں کا سایہ ہوگا جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ فائدہ مند!۔"

یہ محض چند نمونے ہیں ورنہ قرآنِ کریم میں ایسے مناظر جا بجا بیان ہوئے ہیں تاکہ کسی لمحے بھی انسان آخرت سے غافل نہ ہو۔

﴿۱۸﴾...... جو اعمال ایمان کی مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہوں اور جن کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا نہ ہو، ان کی حقیقت اس راکھ سے زیادہ اور کچھ نہیں جسے تیز و تند طوفان اڑا لے جائے، کفار کی خوش اعمالیاں بھی بس آندھی کی اس خاک جیسی ہیں جن کا وہ قیامت کے دن کوئی ثواب نہیں پائیں گے، اس وقت یہ لوگ آتشِ حسرت میں جلیں گے اور کفِ افسوس ملیں گے۔

قرآن نے کفار کے حبطِ اعمال کا ذکر ایک سے زائد مقامات پر کیا ہے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا﴾{۶۲}

"ہم ان کے کیے ہوئے اعمال کا فیصلہ یوں کریں گے کہ انہیں فضا میں بکھری گرد کی طرح بے وقعت بنا دیں گے۔"

اور فرمایا کہ:

﴿مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا کَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَکَتۡهُ﴾{۶۳}

"دنیا کی زندگی میں یہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں کڑاکے کی سردی ہو، وہ ہوا جب اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کی کھیتی سے گزر جاتی ہے تو اسے تباہ کر دیتی ہے۔"

سورۂ بقرہ میں ریاکاری، ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے انکار کو ضیاعِ اعمال کا سبب قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفۡوَانٍ عَلَیۡهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلۡدًا﴾{۶۴}

"اس (ریاکار اور منکرِ آخرت) کی خیرات کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک چکنا پتھر ہے، جس پر کچھ مٹی آ گئی ہو اور اس میں کچھ گھاس پھونس بھی اُگ آئی ہو، پھر جب اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ مٹی بہہ گئی اور محض چکنا پتھر باقی رہ گیا۔"

{۶۱} (الواقعہ ۵۶/۴۱-۴۴)
{۶۲} (الفرقان ۲۵/۲۳)
{۶۳} (آلِ عمران ۳/۱۱۷)
{۶۴} (البقرۃ ۲/۲۶۴)

﴿ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ﴾ ایک ایسے دن جبکہ انسان ایک ایک نیکی کو ترسے گا، اس دن توحید کی اساس پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے اعمالِ خیر کا برباد ہو جانا، واقعی پرلے درجے کا نقصان اور گمراہی ہوگی۔

حکمت و ہدایت:

۱......مسلمانوں کو اللہ کی وعیدوں کے مقابلے میں کفار کی دھمکیوں سے ذرا بھی متأثر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کے وعدے اور وعیدیں پورے ہو کر رہیں گے جبکہ کفار کی دھمکیاں خاک میں مل جائیں گی۔(۱۳)

۲......مسلمانوں کے غلبہ کے لیے اللہ کی مدد تبھی نازل ہوگی جبکہ مسلمان اللہ کے عذاب اور پکڑ سے ڈرنے والے ہوں۔(۱۳)

۳......زمینی خلافت کے زیادہ لائق مومن ہیں، اللہ کے باغی اقتدار میں آ کر کفر کی تقویت کا سبب اور اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، اس لیے حصولِ خلافت کے حق کی طرف بھی مومنوں کو خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

۴......ظلم اور ظالم کو مہلت ملنا تو ممکن ہے لیکن ان کے لیے ہلاکت و بربادی سے بچنا ممکن نہیں۔(۱۵)

۵......کافر کتنا قابلِ رحم ہے کہ اس کے لیے کہیں بھی راحت و سکون نہیں، مخالفتِ حق کی وجہ سے دنیا کی تباہی الگ اور آخرت کی رسوائی الگ۔(۱۶)

۶......آخرت کے عذاب بڑے ہولناک ہیں، ان سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔(۱۷)

دلیلِ وحدانیتِ باریٔ تعالیٰ

﴿۱۹......۲۰﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۹

تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور زمین جیسی چاہیے؟ اگر چاہے تم کو لے جائے اور لائے کوئی پیدائش نئی ○

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۲۰

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں ○

ربط: قیامت کے دن کفار کے اعمال تو باطل جائیں گے مگر ایمان والوں کے اعمال ضائع نہ ہوں گے، ان کے اعمال کیسے ضائع ہو سکتے ہیں جبکہ اللہ کا ہر فعل کسی حکمت پر مبنی ہے، ارض و سما کو بھی اس نے حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔

تسہیل: کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے زمین و آسمان کو حکمت اور مصلحت سے پیدا کیا ہے؟ اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کردے اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لا بسائے ○ اور یہ کام اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۹-۲۰﴾...... اللہ رب العزّت نے اس کائنات کو یوں پیدا فرمایا ہے کہ اس کی ہر ہر چیز نہ صرف اللہ کی قدرت پر دلالت کرتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق میں کوئی نہ کوئی حکمت اور فائدہ ہے۔

﴿اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ﴾ اس قادرِ مطلق کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمہیں دنیا سے غائب کردے اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے جو تمہارے برعکس مطیع و فرمانبردار ہوں، اپنے سے پہلی نافرمان قوموں کے حال سے عبرت نہیں پکڑتے جو طاقت و حشمت کے ہوتے ہوئے چشمِ زدن میں صفحۂ ہستی سے ناپید ہو کر رہ گئیں؟ قومِ عاد جیسی زور آور اور زبردست قد کاٹھ والی قوم کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ﴾{۲۵} ''کیا ان میں سے کوئی ایک فرد بھی باقی بچا ہے؟''

تو اے مشرکینِ مکہ! تم کیا ہر شعبۂ زندگی سے عدل و انصاف کو مٹا کر اور کفر و طغیان میں حد سے تجاوز کر کے اپنی بقاء کا خواب دیکھتے ہو؟{۲۶}

حکمت و ہدایت:

۱...... فطرتِ انسانی اور روحِ کائنات کے درمیان ایک خاص ربط ہے، سلیم الفطرت انسان کو اسی ربط کے ذریعے زمین و آسمان کی تخلیق میں قدرتِ باری تعالیٰ کے عظیم دلائل نظر آتے ہیں۔(۱۹)

۲...... وہ قادرِ مطلق جو زمین و آسمان کو پیدا کر سکتا ہے، اس کے لیے ایک قوم کو فنا کے گھاٹ اتار کر دوسری کو منظرِ عام پر لانا کچھ بھی مشکل نہیں۔(۲۰)

شیطان کا اپنے پیروکاروں کو جواب

﴿۲۱......۲۳﴾

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے پھر کہیں گے کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے

{۲۵} (الحاقۃ ۶۹/۸)

{۲۶} ترھیب المشرکین...... ای ان یشأ یھلککم اذا خالفتم أمرہ (تفسیر قاسمی ۱۰/۲۲)

أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ قَالُوا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۖ سَوَآءٌ

سو کیا بچاؤ گے ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ؟ وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے

عَلَيْنَآ أَجَزِعْنَآ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ ﴿٢١﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللّٰهَ

اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بے قراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں خلاصی O اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا

وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ إِلَّآ أَنْ

سب کام بے شک اللہ نے تم کو دیا تھا سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر جھوٹا کیا اور میری تم پر کچھ حکومت نہ تھی مگر یہ کہ

دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوٓا أَنْفُسَكُمْ ۖ مَّآ أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ أَنْتُمْ

میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا میری بات کو، سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو اپنے آپ کو نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں نہ تم میری

بِمُصْرِخِيَّ ۖ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَآ أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّ الظّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٢﴾

فریاد کو پہنچو میں منکر ہوں جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے البتہ جو ظالم ہیں ان کے لیے ہے عذاب دردناک O

وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ

اور داخل کیے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کیے تھے نیک باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں

فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ﴿٢٣﴾

اپنے رب کے حکم سے ان کی ملاقات ہے وہاں سلام O

ربط: ان دو گروہوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک نجات پا جائے گا اور دوسرا عذاب میں گرفتار ہوگا، اس دوسرے گروہ کا شیطان کے ساتھ جو مباحثہ ہوگا اسے خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تسہیل: قیامت کے دن سب لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو دنیا میں بڑے بنے ہوئے تھے کہ ہم تو تمہاری ہی اتباع کیا کرتے تھے تو کیا آج تم اللہ کا کچھ عذاب ہم سے ہٹا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ نے ہمیں دینِ حق پر چلنے کی ہدایت دی ہوتی تو ہم تمہیں ضرور ہدایت دیتے اور یوں دونوں عذاب سے بچ جاتے، مگر اب تو ہمارے لیے دونوں صورتیں یکساں ہیں، چیخیں چلائیں یا ضبط کریں ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں O اور حشر کے دن جب ہر معاملے کا فیصلہ ہو چکے گا، شیطان کہے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جھوٹے وعدے کیے تھے چنانچہ میں نے ان میں سے کوئی وعدہ بھی پورا نہیں کیا، میرا تم پر کچھ بھی زور نہیں چلتا تھا بجز اس کے کہ میں نے تمہیں فسق و فجور کی دعوت دی اور تم نے میری دعوت قبول کر لی لہٰذا مجھے ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو، اس سے

پہلے تم مجھے جو اللہ کا شریک ٹھہراتے رہے ہو تو میں اس سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں، بلاشبہ ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے O اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے انہیں ایسے باغات میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے، ان کی باہمی ملاقات کے وقت کی دعا سلام ہوگی O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۱﴾......عجب منظر ہے آخرت کی حضوری ہے، ڈکٹیٹرز بھی موجود ہیں اور وہ آبرو باختہ اور بودے کردار کے لوگ بھی حاضر ہیں جو روحانی اور عملی طور پر ان کے بندۂ بے دام بنے ہوئے تھے، عذاب کا فیصلہ دونوں کے لیے ہو چکا لیکن متبعین اپنے تئیں ایک ناکام کوشش کرتے ہوئے لیڈروں سے کہتے ہیں{۶۷} کہ دیکھو! دنیا میں تمہارے کس حکم کی تعمیل نہیں کی؟ تمہاری خوشنودی کے لیے ہم نے راہِ نجات کو ٹھکرا کر ہلاکت مول لی، اللہ سے بغاوت کی، اس کے نبیوں کو ستایا، ہماری اس غلامی کے بدلے کیا آج تم اتنا بھی نہ کرو گے کہ عذاب دور نہیں تو کم از کم ہلکا ہی کروا دو؟

سردارانِ قوم اپنی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے کورا جواب دیں گے کہ اگر ہم خود ہدایت یافتہ ہوتے تو ضرور اس ذلت سے بچاؤ کی طرف تمہاری رہنمائی کرتے لیکن ہم خود گمراہ تھے، سو تمہیں بھی گمراہی کی طرف لے چلے۔{۶۸} لہٰذا اب جزع فزع کرو یا صبر، عذاب سے چھٹکارا ہم دونوں کے لیے کسی طور بھی نہیں۔

محمد بن کعب القرظی سے منقول ہے کہ جہنمی لوگ آپس میں مشورہ کریں گے کہ دیکھو! اہلِ طاعت نے صبر کے بدلے ابدی مسرتیں حاصل کرلیں، کیوں نہ ہم بھی عذاب پر صبر کریں، شاید کہ کوئی نتیجہ برآمد ہو ہی جائے؟ چنانچہ وہ ایک لمبا عرصہ تک عذاب پر صبر کیے رہیں گے لیکن جب انہیں اپنی خام خیالی کا یقین ہو چلے گا تو دھاڑیں مار مار کر آہ وزاری کریں گے اور کہیں گے:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَجَزِعْنَآ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٍ﴾{۲۹}

قرآنِ کریم سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عوام اور خواص کے مابین ہونے والا یہ مکالمہ اس وقت ہوگا جب وہ دوزخ میں ڈالے جا چکے ہوں گے، سورۂ غافر میں ہے:

{۶۷} "للّذین استکبروا" وھم السادۃ والرؤساء (مدارک ۲/۱۶۹)

{۶۸} "لوھدانا اللہ" للایمان ووفقنالہ "لھدیناکم" ولکن ضللنا فاضللناکم (ابی سعود ۳/۴۸۰)

{۶۹} (قرطبی ۹/۳۰۶-۳۰۷)

﴿وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنتُم مُّغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ﴾ {۷۰}

''اور جب آپس میں جھگڑیں گے آگ کے اندر، پس کمزور لوگ اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع بنے رہے، تو کیا آج تم آگ کا کچھ حصّہ ہمارے بدلے خود لے لوگے؟۔''

﴿۲۲﴾......اب ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیے:

رہنمایانِ قوم کا صاف انکار دیکھ کر مجرمین ''شیطان'' پر جھنجھلائیں گے کہ تمہی ہمارے اس دائمی خسران کے ذمہ دار ہو، وہ مکار اور جھوٹا آج سچ بولے گا اور صاف جواب دے گا کہ ایک وعدہ اللہ کا تھا اور وہ یہ کہ دنیا کی عارضی زندگی کے بعد ایک دائمی زندگی بھی ہے جہاں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا ضرور ملے گی، اور ایک وعدہ میرا تھا کہ نہیں! زندگی تو بس دنیا کی زندگی ہے، {۷۱} جو مر گیا ختم ہو گیا، پھر نہ حساب کتاب کا مرحلہ نہ جزا و سزا کی کہانی، اللہ کا وعدہ سچا اور براہین پر مبنی تھا جبکہ میرا دعویٰ دلائل سے خالی تھا اور اس کے ماننے پر میں نے جبر و تشدّد کا کوئی حربہ بھی استعمال نہیں کیا، لیکن تم نے اللہ کے سچے وعدے سے انحراف کیا اور میری جھوٹی بات جھٹ سے مان لی، تو اب مجھ پر الزام دھرنے کے بجائے اپنی عقلوں پر ماتم کرو اور خود کو مجرم جانو۔

﴿مَّا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ......الخ﴾ آج نہ میں تمہارا معین و مددگار ثابت ہوسکتا ہوں نہ تم میرے کسی کام آسکتے ہو، اور میری کرتوتوں کے سبب تم مجھے جو اللہ کا شریک ٹھہرائے بیٹھے تھے، تو میں آج تمہارے اس شرک سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ {۷۲}

﴿إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ یا تو یہ شیطان کے کلام کا تتمہ ہے یا اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے۔ اس جیسے جملوں میں وہ رحیم و کریم رب اپنی مخلوق کو محاسبے کی دعوت دے کر انہیں اصلاح کی تلقین کرتا ہے۔ {۷۳}

﴿۲۳﴾......کفار کے مقابلے میں وہ اہلِ طاعت ہیں جنہوں نے پوری زندگی اللہ کی مرضی و منشاء کے مطابق گزاری، ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا، قرآن ان پر آخری تبصرہ یوں کرتا ہے کہ:

ایمان قبول کرنے اور اعمالِ خیر بجالانے والوں کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،

{۷۰} (المؤمن ۴۰/۴۷)

{۷۱} وعده تعالىٰ بالبقاء بعد خراب البدن والثواب والعقاب عندالبعث، حقّ قدو فى به، ووعدى بان ليس الّا الحياة الدنيا (تفسير قاسمى ۱۰/۲۵)

{۷۲} "انّى كفرت" معنى كفره باشرا كهم تبرؤه منه واستنكاره له (مدارك ۲/۱۷۱)

{۷۳} "انّ الظّٰلمين" تتمة كلامه أوابتداء كلام من جهة الله عزّوجلّ وفى حكاية امثاله لطف للسامعين وايقاظ لهم حتّى يحاسبوا أنفسهم ويتدبّروا عواقبهم (ابى سعود ۳/۴۸۲)

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نعمتوں کے زوال کا کوئی تصور نہ ہوگا اور انہیں فرشتوں کی طرف سے سلام کا تحفہ عطا ہوگا۔

فرشتوں کی طرف سے سلام کا ذکر سورۂ زمر میں بھی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ﴾ {۷۴}

"متقی لوگ جنت کی طرف گروہ درگروہ جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے تو وہاں کے داروغے ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہو۔"

سورۂ رعد میں جنّت اور جنتیوں کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۚ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ {۷۵}

"فرشتے ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے ان پر داخل ہوں گے کہ تمہارے صبر کی بدولت اب تم پر سلامتی ہی سلامتی نازل ہوگی اور آخرت کا بدلہ کیا ہی اچھا ہے؟"

حکمت و ہدایت:

۱......روحانی طور پر دیمک خوردہ اور عملی طور پر بودے کردار کے لوگ آج جن سرکش زعماء کی اتباع میں بے دینی کی ہر حد پھلانگ رہے ہیں، کل یہی وڈیرے ان سے دستکش ہو جائیں گے کاش! کوئی دنیا ہی میں عبرت پکڑ لے۔ (۲۱)

۲......اپنی گمراہی پر کسی کی تقلید کو بطور حجّت پیش کرنا کوئی عذر نہیں۔ (۲۱)

۳......شر کے راستوں پر چلنے والوں کا یہ کہنا کہ "لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ" (اگر اللہ ہم کو ہدایت دیتا تو ہم تم کو ہدایت دیتے) صریح جھوٹ ہے (۲۱) سورۂ مجادلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ {۷۶}

"جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا تو اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے تھے۔"

۴......دنیا میں جہاں کہیں بھی غیر اللہ کو پوجا جاتا ہے، تو درحقیقت وہ شیطان کی عبادت ہوتی ہے، اس لیے کہ وہی غیر اللہ کی عبادت کا داعیٔ اعظم ہے۔ (۲۲)

۵......قیامت کے دن شیطان اور اس کے پیروکاروں کے درمیان مناظرہ ہوگا جس کا موضوع ہوگا "متبوع اور پیشوا کی اپنے پیروکاروں سے برأت" اور اس میں شیطان بمقابلہ انسان زیادہ سچ بولے گا کہ اللہ نے سچے وعدے

{۷۴} (الزمر ۳۹/۷۳)
{۷۵} (الرعد ۱۳/۲۳-۲۴)
{۷۶} (المجادلة ۵۸/۱۸)

کیے تھے، تم نے سچے وعدوں کو چھوڑ کر میرے جھوٹے وعدوں پر اعتبار کیا۔

۶......قیامت کے دن شیطان جب اپنے وعدوں کو مکر قرار دے گا اور وعدۂ الٰہی کے سچا ہونے کا اقرار کرے گا تو اس کے پیروؤں کی حسرت و یاس کا کیا عالم ہوگا؟ کوئی اندازہ بھی کرسکتا ہے؟ (۲۲)

۷......علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیطان کا کام صرف وسوسہ اندازی ہے اور ان وساوس کی تکمیل نفس کی طرف سے ہے لہٰذا اصل شیطان ''نفس'' ہوا۔{۷۷}

۸......آخرت میں مجرمین کا رسواکن عذاب سے دوچار ہونا اور متقین کا کامیابی سے ہمکنار ہونا یقینی ہے۔(۲۲-۲۳)

۹......دنیا میں ''سلام'' کا مطلب ''سلامتی طلب کرنا'' ہے جبکہ آخرت میں یہ لفظ ''سلامتی'' کے حصول پر مبارکباد کے لیے استعمال ہوگا۔{۷۸}

کلمۂ توحید کی فضیلت اور کلمۂ کفر کی قباحت

﴿۲۴......۲۷﴾

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال بات ستھری جیسے ایک درخت ستھرا اس کی جڑ مضبوط ہے

فِي السَّمَاءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ

اور ٹہنے ہیں آسمان میں O لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ

کے واسطے تاکہ وہ فکر کریں O اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندا اکھاڑ لیا اس کو زمین کے

الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

اوپر سے کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ O مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں اور

وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿۲۷﴾

بچلا دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو اور کرتا ہے اللہ جو چاہے O

ربط: اس سے قبل مشرکین کے اعمال کی مثال بیان کی گئی تھی یہاں مشرکین اور مومنین دونوں کے عقائد و نظریات کی مثال بیان کی جارہی ہے، ایک فریق کے نظریات کی بنیاد شرک پر ہے اور دوسرے فریق کی بنیاد توحید پر ہے، شرک میں

{۷۷} (تفسیر الرّازی ۱۹/۱۱۱)
{۷۸} (موضح القرآن/۳۳۴)

کھوکھلا پن پایا جاتا ہے، نہ عقلِ سلیم اس کی تائید کرتی ہے اور نہ ہی شریعت میں اس کی کوئی دلیل ہے جبکہ عقیدۂ توحید کو عقل وفطرت اور وحی کی تائید حاصل ہے۔

تسہیل: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ کی کیسی عمدہ مثال بیان فرمائی ہے؟ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے، جس کی جڑ زمین کی گہرائی میں ہوتی ہے اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوتی ہیں O وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں O اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس خراب درخت کی مانند ہے جسے زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اور اسے زمین میں کچھ بھی جماؤ حاصل نہ ہو O اللہ ایمان والوں کو اس قولِ محکم یعنی کلمۂ طیبہ کی برکت سے دنیا اور آخرت دونوں میں ثابت قدمی عطا فرماتا ہے اور ظالموں کے اعمال کلمۂ خبیثہ کی نحوست سے ضائع کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہے کرتا ہے O

تفسیر

﴿۲۴-۲۵﴾...... سورت کے مضامین سے مناسبت اور مطالب و معانی کا وسیع آفاق رکھنے والی یہ ایک عمدہ مثال ہے جو حق کے ثبات اور کفر کے نابود ہونے پر دلالت کر رہی ہے، فرمایا جا رہا ہے:

کلمۂ توحید و ایمان اس خوش منظر درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں بھی مضبوط ہیں اور شاخیں بھی بہت بلند ہیں، اور جس درخت کی جڑیں پائیدار اور شاخیں بلند ہوں اس کا پھل زمین کی گندگی سے پاک ہوتا ہے پھر اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جو وقت اللہ نے اس کے پھل لانے کا متعین کر دیا ہے، {۷۹} یہ اس وقت میں پھل ضرور دیتا ہے، پھر پھل بھی ایسا جو سارا سال کام دیتا ہے، یہی حال کلمۂ توحید کا ہے، اس کی ایک جڑ ہے یعنی اللہ کی حاکمیت پر غیر مشروط اعتقاد؛ اعمالِ صالحہ اس کی شاخیں ہیں جو بارگاہِ قبولیت میں حاضر کیے جاتے ہیں اور پھر ان شاخوں پر دائمی رضائے الٰہی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔

کلمۂ توحید کو جس ''شجرِ طیبہ'' سے تشبیہ دی گئی ہے، اس سے مراد کھجور کا درخت ہے، بخاری میں روایت ہے، حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ مجھے ایسا درخت بتاؤ جو مسلمان کے مشابہ ہے (یا آپ نے فرمایا کہ مسلمان آدمی کی مانند ہے) نہ اس کے پتے گرتے ہیں اور نہ یہ ہوتا ہے نہ وہ ہوتا ہے (یعنی آپ ﷺ نے تین صفات مزید اس درخت کی بیان فرمائیں جنہیں راوی نے "لا و لا و لا" سے تعبیر کر دیا۔)

{۷۹} "کلّ حین" وقته الله تعالیٰ لاثمارها (بیضاوی ۳/۳۷۷)

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں خاموش ہیں تو میں نے بھی بولنا مناسب نہ سمجھا، جب کسی کی طرف سے جواب نہ آیا تو آنحضرت ﷺ نے خود ہی فرمادیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، مجلس برخاست ہوئی تو میں نے والدِ محترم سے کہا کہ اللہ کی قسم! میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کہہ دوں کہ وہ کھجور کا درخت ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تمہیں اس جواب سے کیا مانع تھا؟ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ آپ حضرات خاموش بیٹھے تھے تو میں نے بھی آپ سے آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم نے یہ جواب دے دیا ہوتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔" {۸۰}

اگر غور کیا جائے تو کھجور کے درخت کا ہر جزء کارآمد ہے، اس کا پھل نہایت لذیذ اور مفید ہوتا ہے، کچا اور پختہ دونوں طرح کھایا جاتا ہے، پختہ ہونے پر سکھا دیا جائے تو سال بھر استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کی گٹھلی چوپایوں کی غذا ہے، یہ ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے اور موسم خزاں میں بھی اس کے پتے نہیں گرتے، اس کا تنا مکانوں میں بطور ستون کام آتا ہے اور اس کے پتوں سے چٹائیاں اور ٹوکرے بناتے ہیں، الغرض اس درخت کے سارے اجزاء نفع بخش ہیں۔

﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ﴾ قرآنی مثالیں سامعتوں کی لذّت کے لیے نہیں بلکہ ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت ذکر کی گئی ہیں، اس لیے کہ تمثیلات معانی کی تصویر کشی اور غیر محسوس چیز کو حس کے قریب لانے میں ایک بہترین واسطہ کا کام دیتی ہیں جس سے مخاطب کے ذہن میں متکلّم کا مقصود نقش ہو جاتا ہے، اور اگر مخاطب ضدی نہ ہو تو تسلیم کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا۔

﴿۲۶﴾...... کلمۂ طیبہ کے مقابلے میں کلمۂ خبیثہ یعنی کفر وشرک کا کلمہ ہے، اس کی مثال اس خودرو اور بے ثمر جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہے جسے زمین میں کوئی ثبات حاصل نہیں، جڑ گہری نہ ہونے کی وجہ سے شاخوں کی بلندی اور پھیلاؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ رنگ، نہ بو، نہ ذائقہ، نہ پھل، نہ سایہ اور ہوا کے معمولی جھونکے یا پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر سے زمین سے اکھڑ کر اپنا وجود کھو بیٹھے۔

یہاں کلمۂ خبیثہ کو جس شجرِ خبیثہ کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، اس سے حنظل کا درخت مراد ہے۔ ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے شجرِ خبیثہ کی وضاحت حنظل کے درخت سے فرمائی۔ {۸۱}

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلمۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ کلمۂ طیبہ سے مراد توحید،

{۸۰} (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۱)

{۸۱} "ومثل كلمة خبيثة كشجرة خبيثة"...... قال: "هي الحنظل" (ترمذی ۲، ابواب التفسیر/۱۴۴)

اسلام، قرآن اور کلمۂ خبیثہ سے شرک، دعوتِ کفر اور تکذیبِ حق مراد لیے گئے ہیں، ان اقوال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کلمۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کو اپنے عموم پر رکھنا ہی مناسب لگتا ہے، یعنی کلمۂ طیبہ سے ہر وہ کلمہ مراد ہے جو صلاح وخیر خواہی پر مبنی ہو اور کلمۂ خبیثہ سے مراد ہر وہ کلمہ ہے جو رضائے حق کے منافی ہو۔{۸۲}

ناچیز نے ''کلمۂ طیبہ'' سے کلمۂ توحید اور کلمۂ خبیثہ سے ''کلمۂ کفر'' مراد لینے کو ترجیح دی ہے، اس لیے کہ ''کلمۂ توحید'' کے ضمن میں خیر کی ہر جنس داخل ہے اور کلمۂ کفر کے زمرے سے شر کا کوئی پہلو خارج نہیں، گویا اس تفسیر سے عموم کا حق ادا ہو جاتا ہے۔(واللہ اعلم بالصّواب)

قرآن کی اس تمثیل سے ملتی جلتی ایک تمثیل عہدِ عتیق میں اس پیرائے میں مذکور ہے:

''مبارک وہ آدمی ہے جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا سو وہ اس درخت کی مانند ہوگا جو پانی کی نہروں کے کنارے لگایا جائے اور اپنے وقت پر میوے لائے، جس کے پتے مرجھائیں نہیں، اور اپنے ہر کام میں پھلتا پھولتا رہے گا، شریر ایسے نہیں، وہ بھوسے کی مانند ہیں جسے ہوا اڑا لے جاتی ہے۔{۸۳}

﴿۲۷﴾......اسی عقیدۂ توحید کی بدولت اللہ ایمان والوں کو دنیا میں بھی استقامت نصیب فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو مضبوطی عطا فرمائے گا۔

دنیا میں ہر فردِ بشر مصائب کی یلغار میں گھرا رہتا ہے، ہر لحظہ کوئی نہ کوئی خطرہ سر پر منڈلاتا ہی رہتا ہے، ایسے میں ایمان اور عقیدۂ توحید ہی تو ہوتا ہے جو مومن کے دل کو اطمینان کی دولت بخشتا ہے۔

''تثبیت فی الآخرۃ'' سے مراد مرحلۂ قبر کی سرخروئی ہے، بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿المسلم اذا سئل فی القبر شھدأن لاالٰہ الاّاللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ، فذلک قولہ تعالیٰ: ''یثبّت اللّٰہ الّذین اٰمنوا فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الآخرۃ.﴾{۸۴}

''ایک مسلمان سے جب قبر میں (اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں) سوال کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ کے اس قول ''یثبّت اللّٰہ الذین امنوا فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الآخرۃ'' کا یہی مطلب ہے۔''

{۸۲} اختلف فی الکلمۃ...... ولعلّ المراد مایعمّ ذلک (بیضاوی ۳/۳۴۷)
{۸۳} (زبور ۱/۱-۴)
{۸۴} (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۲)

علاوہ ازیں ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ:

﴿کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیّت وقف علیه فقال: "استغفروا لأخیکم واسألوا له بالتثبیت فانّه الآن یسأل.﴾{۸۵}

''نبی اکرم ﷺ جب کسی میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے کہ: ''اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اللہ سے اس کی ثابت قدمی کا سوال کرو، اس لیے کہ اب اسے سوال و جواب کا مرحلہ درپیش ہے۔''

ایمان والوں کے مقابلے میں ظالم یعنی کافر لوگ{۸۶} اپنے مشرکانہ نظریات کے سبب دنیا میں بھی تذبذب کا شکار رہتے ہیں اور آخرت کی ہمیشہ کی حرماں نصیبی تو بہر حال ان کا مقدر ہوگی۔

﴿وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾ ایمان کی نعمت سے نوازنے اور توفیقِ ایمان سے محروم رکھنے میں اللہ خود مختار ہے، وہ جو چاہے فیصلہ کرے، کوئی اس کے ارادوں میں حائل نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ جو فیصلہ جس کے بارے میں کرتا ہے اپنی حکمت کے موافق کرتا ہے۔{۸۷}

حکمت و ہدایت:

۱......معانی کو ذہنوں کے قریب کرنے کے لیے مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے اور یہ طریقہ سمجھانے اور بیدار کرنے میں بڑا مؤثر ثابت ہوتا ہے۔(۲۴)

۲......کلمۂ ایمان پاکیزہ کلمہ ہے اور کلمۂ کفر خبیث کلمہ ہے۔

۳......اس آیت (۲۴) میں اور اس کے علاوہ بھی جہاں کہیں اللہ ایمان کی فضیلت اور کفر کی قباحت بیان کرتا ہے تو مقصود انسانیت کو ایمان کی دعوت دینا اور کفر و شرک سے بیزار کرنا ہوتا ہے۔

۴......جن خوش نصیب انسانوں کے دلوں میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تخم ریزی ہوتی ہے، وہ دنیا کی زندگی سے لے کر محشر تک حق اور ایمان پر ثابت قدم رہیں گے جبکہ کافر دنیا میں بھی بدی کی راہوں پر بھٹکتا پھرتا ہے اور قبر میں بھی حیرت زدہ ہو کر جواب دے گا:

﴿هاه هاه لا أدری.﴾{۸۸}

''ہائے، ہائے میں تو (اللہ، رسول کے بارے میں) کچھ نہیں جانتا۔''

{۸۵} (ابوداؤد ۲، کتاب الجنائز/۱۰۳......ایچ ایم سعید کمپنی)

{۸۶} "ویضل الله الظّالمین" المراد بهم الکفرة (روح المعانی ۸،۱۳/۲۱۴)

{۸۷} "ویفعل الله مایشاء" من تثبیت بعض واضلال بعض آخرین حسبما توجبه مشیئته التابعة للحکم البالغه المقتضیة لذلك (ابوالسعود ۳/۴۸۴)

{۸۸} (بحواله بیان القرآن حصّه دوم، جلد ۱۱/۶)

مشرکین کی مذمت اور مؤمنین کی مدح

﴿۲۸......۳۱﴾

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ

تو نے نہ دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں؟ ○ جو دوزخ ہے

يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوا

داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے ○ اور ٹھہرائے اللہ کے لیے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے

فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾ قُل لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنفِقُوا

تو کہہ! مزا اڑا لو پھر تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کی ○ کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں نماز اور خرچ

مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ﴿٣١﴾

کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر پہلے اس سے کہ آئے وہ دن جس میں نہ سودا ہے نہ دوستی ○

ربط: جیسے پچھلی آیات میں مومن اور کافر دونوں قسم کے لوگوں کا ذکر تھا یونہی اگلی آیات میں بھی ہے، کچھ وہ تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی مادی اور معنوی نعمتوں کے جواب میں کفر کا راستہ اختیار کیا اور کچھ وہ تھے جنہیں قبولِ ایمان اور شکر کی توفیق ملی۔

تسہیل: کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کے جواب میں کفر کیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں اتارا؟ ○ یعنی اس دوزخ میں جس میں انہیں داخل ہونا ہی پڑے گا اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ○ اور انہوں نے اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں، آپ ان سے فرما دیجیے کہ چند دن مزے اڑا لو بالآخر تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے ○ اے میرے پیغمبر! میرے ان بندوں سے جو ایمان لائے، فرما دیجیے کہ نماز کا اہتمام کریں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کیا کریں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہو سکے گی اور نہ ہی دوستی کام آئے گی ○

﴿تفسیر﴾

﴿۲۸-۲۹﴾...... یہ آیت کفارِ قریش کے بارے میں نازل ہوئی، {۸۹} جنہیں اللہ نے دیگر بے شمار مادی نعمتوں

{۸۹} عن ابن عباس "ألم ترالی الذین بدلو" قال: هم كفار أهل مكة (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۲)

کے علاوہ حرم کی سکونت، اس کی مجاورت اور حضور خاتمی مرتبت ﷺ جیسی عظیم اور بے بدل نعمتوں سے نوازا، {۹۰} چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان نعمتوں سے مستفید ہوتے اور ان کا شکر بجالاتے، لیکن وہ احسان فراموش ناشکری پر کمربستہ ہوگئے، الٰہی اختیارات عاجز ولاچار مخلوق میں بانٹنے لگے اور اپنی قوم کو بدراہ کر کے انہیں بھی اپنے دامِ سیادت میں جکڑ لیا۔

ان نامور رئیسوں اور ان کی قوم نے اپنے کفر کی وجہ سے اپنے لیے جہنم جیسے بُرے ٹھکانے کا انتخاب کرلیا ہے۔

﴿۳۰﴾......مشرکین بھی عجیب تھے، وہ مخلوق میں سے اشجار واحجار کو تو خدائی رتبہ دینے کے لیے تیار تھے مگر اس خالق کے سامنے جھکنے کے لیے آمادہ نہ تھے جس نے انہیں اور ان کے خودساختہ معبودوں کو پیدا فرمایا۔

معبودانِ باطلہ کی پرستش کا نتیجہ خود گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی صورت میں نکلا۔

توحید جیسے صاف ستھرے عقیدے سے انحراف اور شرک اور مادیت میں حددرجہ انہماک ان کی گمراہی اور ہلاکت کا سبب بنا۔{۹۱}

﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا﴾ یہ کفار کے لیے وعید ہے {۹۲} کہ بہت اچھا! چندے عیش کرلو، اپنی نفسانی خواہشات سے بہرہ اندوز ہولو، تم بھی اور تمہارے پیروکار بھی، مگر تا کے؟ آخر یہ زندگی ختم ہوگی اور اس معمولی عیش کے بدلے دوزخ کے دائمی ٹھکانے کو تم اپنا منتظر پاؤ گے۔

شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اس موقع پر بڑی عمدہ مثال بیان فرمائی، فرماتے ہیں:

﴿تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾

یہ جملہ ایسے ہے جیسے کوئی طبیب کسی بدپرہیز آدمی سے اس کی بدپرہیزی پر خفا ہوکر کہے:

﴿کل ماترید فانّ مصیرک الی الموت.﴾{۹۳} ''جو جی چاہے کھاؤ، تمہارا انجام بس موت ہی ہے۔''

﴿۳۱﴾......روئے سخن اب مشرکین سے مؤمنین کی طرف ہے اور انہیں وظائفِ عبودیت میں سے اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کا خاص طور سے حکم دیا جارہا ہے، ان دو عبادات کو ذکر کر کے تمام مالی وبدنی عبادات کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے۔

فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کی رعایت رکھتے ہوئے نماز کی ادائیگی اور اللہ کے حکم کے مطابق اپنا حلال مال

{۹۰} ''وھم أھل مکۃ'' اسکنھم اللہ حرمہ وجعلھم قوام بیتہ وأکرمھم بمحمد ﷺ (البحر المحیط ۴۲۴/۵)
{۹۱} ''اللّام فی ''لیضلّو'' لام العاقبۃ لان عبادۃ الاوثان سبب یودّی الی الضلال (کبیر ۹۵/۱۹،۷)
{۹۲} ''قل تمتّعوا'' وعیدلھم (قرطبی ۳۱۲/۹)
{۹۳} (تفسیرِ عثمانی/۳۳۵......دارالتصنیف کراچی)

خفیہ اور علانیہ امورِ خیر پر خرچ کرنا ایسی عبادات ہیں جن سے انفرادی زندگی بھی خوشگوار رہتی ہے اور اجتماعی زندگی پر بھی اس کے عمدہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

﴿مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ ......الخ﴾ اس جملے سے ان جاہلی عقائد کی تردید ہے کہ اعمال میں ہونے والی کمی بیشی کو فدیہ وغیرہ دے دلا کر پورا کیا جا سکے گا نیز یہود کے اس نظریے کی تردید ہے کہ فاسد اعمال کے ہوتے ہوئے بھی پیغمبروں کی عزیز داری کی وجہ سے خلاصی کی صورت نکل آئے گی...... فرمایا نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہوگا، اس دن تو انصاف کا دور دورہ ہوگا، نہ تجارت ہوگی نہ دوستیاں اور تعلقات کام آئیں گے، بجز ان دوستیوں کے جن کی بنیاد تقوٰی پر ہوگی:

﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ {۹۴} "سب دوست اس دن باہم دشمن ہو جائیں گے سوائے تقوٰی والوں کے۔"

حکمت وہدایت:

۱...... کفار کے طرزِ عمل کا یہ پہلو بڑا تعجب انگیز ہے کہ وہ نعمتوں کا بدلہ "کفرانِ نعمت" سے دیتے ہیں، ہلاکت کے اس راستے سے مسلمانوں کو بچ کر رہنا چاہیے۔ (۲۸)

۲...... "بِئْسَ الْقَرَارُ" میں لفظ "قرار" سے اشارہ اس طرف ہے کہ کفار کا داخلہ جہنم میں بطور گزرگاہ کے نہیں ہوگا بلکہ دائمی قیام ہوگا۔ (۲۸)

۳...... کواکب پرستی، آفتاب پرستی، اوتار پرستی، ماہتاب پرستی، قبر پرستی اور ان کے علاوہ بھی غیر اللہ کی پرستش کی جتنی صورتیں ہیں سب حرام اور شرک ہیں۔ (۲۹)

۴...... گمراہ پیشوا اپنے پیروکاروں کے دلوں سے اللہ کی حاکمیت کا تصور کھرچ کر اپنی اور دیگر معبودانِ باطلہ کی خدائی کا تصور نقش کر دیتے ہیں یعنی ضال بھی ہوتے ہیں اور مضل بھی، تابع اور متبوع دونوں ہی اپنا انجام جلد دیکھ لیں گے۔ (۳۰)

۵...... ایمان باللہ کے بعد نماز اور انفاق فی سبیل اللہ اسلام کی اساسی عبادات ہیں، مومن کو ان میں خاص طور سے مستعدی دکھلانا چاہیے۔ (۳۱)

۶...... مال علانیہ بھی خرچ کیا جا سکتا ہے اور خفیہ بھی، دونوں طریقوں میں سے کسی طریقے کا انتخاب حالات کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ (۳۱)

۷...... نیکی کے ہر کام کے لیے ایک مہلت ہے، اس مہلت کے ختم ہونے کے بعد اعمال کا باب بند ہو جاتا ہے، بجز "صدقۃ

{۹۴} (الزخرف ۴۳/۶۷)

جاریہ'' کے، کتنے صاحبِ عقل اور خوش نصیب ہیں جو مہلت (زندگی) سے فائدہ اٹھالیتے ہیں۔(۳۱)

۸......آیت (۳۱) میں ''عبادی'' فرما کر حق تعالیٰ کا اہلِ ایمان کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرنا ان کے شرف و اکرام کی دلیل ہے۔{۹۵}

آفاق و انفس میں دلائلِ قدرت

﴿۳۲......۳۴﴾

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

اللہ وہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی تمہاری

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ

میوے اور کہنے میں کیا تمہارے کشتی کو کہ چلے دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں لگایا تمہارے

الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾

ندیوں کو O اور کام میں لگا دیا تمہارے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو O

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۗ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۗ اِنَّ الْاِنْسَانَ

اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو بے شک آدمی بڑا بے

لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

انصاف ہے ناشکرا O

ربط: اللہ کے وجود کے دلائل دے کر اس کے لیے وجوبِ شکر ثابت کیا جا رہا ہے، اور ساتھ ہی کفار کے لیے تنبیہ اور ڈراوا ہے، جو دلائلِ قدرت میں غور نہ کرنے کی وجہ سے نعمتِ شکر سے محروم ہیں۔

تسہیل: اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے بارش برسائی، پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے مختلف پھل پیدا کیے اور اس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جہازوں کو مسخر کر دیا تا کہ وہ اللہ کے حکم سے سمندر میں چلیں اور اسی نے نہروں کو بھی تمہارے لیے مسخر کر دیا O اور سورج اور چاند کو بھی اسی نے تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے جو اپنے مدار پر مسلسل گردش میں ہیں اور روز و شب کو بھی تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے O اور تم جس جس چیز کے طالب اور ضرورتمند تھے وہ اس نے تمہیں عطا کر دی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے، بلاشبہ انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے O

{۹۵} خصهم بالاضافة تنويها لهم (بيضاوى ۳/۳۴۸)

﴿تفسیر﴾

﴿۳۲-۳۳﴾......دلائلِ توحید سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے اور ہر جگہ ایک منفرد اسلوب سے اللہ کی وحدانیت انسانی قلوب میں جاگزین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں ایک تنقیدی حملہ کر کے انسانی شعور پر دستک دی جارہی ہے کہ: آسمان سے ''آبِ حیات'' برسنا، تمہاری رزق رسانی کے لیے مختلف خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل پیدا کرنا، پھر سمندروں کی بپھری موجوں پر ذراسی ڈونگی کا صحیح سلامت تیرنا، ندی نالوں میں پانی کی روانی اور طغیانی، سورج اور چاند کا ایک معین نظام اور ضابطہ کے تحت مسلسل چلنا، رات کی تاریکی سے دن کے نور کا برآمد ہونا اور پھر اس نور پر رات کی سیاہ چادر کا تن جانا......اے اشجار واحجار کے پرستارو! ذرا ضد سے ہٹ کر، ٹھنڈے دل ودماغ سے اپنے ضمیر سے تو فیصلہ لو، یہ سب کچھ کس کے الٰہ ہونے کی شہادت دیتا ہے؟

﴿۳۴﴾......تمہیں ہر وہ نعمت عطا فرمائی جس کی تمہیں ضرورت پڑسکتی تھی اور جس کا سوال تمہیں کرنا چاہیے تھا، خواہ تم نے زبانِ قال سے سوال کیا یا زبانِ حال سے، ہم نے ضرورت اور فائدے کی ہر چیز تمہیں عطا کی اور آج تک دے رہے ہیں، آج کا انسان بحری اور ہوائی جہازوں، گاڑیوں اور ٹرینوں، کمپیوٹر اور سیٹلائٹ کی جن نعمتوں سے مستفید ہو رہا ہے ان کے لیے لوہے، پیٹرول، ڈیزل، پانی، گیس اور ہوا کی صورت میں بنیادی مواد کس نے فراہم کیا ہے اور ان سے مستفید ہونے کے لیے عقل کس نے عطا فرمائی ہے؟

﴿وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ مذکورہ بالا خارجی انعامات کے علاوہ انسان اگر اپنے وجود میں غور کرے تو کتنی ہی ایسی نعمتیں ہیں جو عالمِ وجود میں آنے کے بعد اللہ نے اسے بن مانگے عطا فرمادیں، آنکھیں اور ان کا رنگین پردہ، کان اور ان کی زبردست قوتِ سماعت، ناک اور اس کی قوتِ شامہ، ہاتھ پاؤں اور ان کا پکڑنا اور چلنا، یہ سب وہ نعمتیں ہیں جن کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا اور اگر سوچ کا دائرہ وسیع کر کے انسان دل، دماغ، معدہ، جگر، خون، رگوں کے جال، ہڈیوں کے ڈھانچے اور دیگر نعمتوں میں غور شروع کر دے تو ناممکن ہے کہ اس منعمِ حقیقی کی ناسپاسی کرے۔ ہزار حقیقتوں کی ایک حقیقت بہرحال یہی ہے کہ انسان نہ تو اللہ کی نعمتوں کو شمار کرسکتا ہے اور نہ ہی ان کا شکر ادا کرسکتا ہے، طلق بن حبیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ان حق اللہ أثقل من أن یقوم به العباد وان نعم اللہ اکثر من أن یحصیها العباد﴾{۹۶}	''اللہ کا حق اس سے کہیں زیادہ بھاری ہے کہ بندے ادا کرسکیں اور اللہ کی نعمتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ بندے انہیں شمار کرسکیں۔''

{۹۶} (ابن کثیر ۲/۷۰۳)

صحیح بخاری میں ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی یہ دعا مذکور ہے:

﴿الحمدللہ لک الحمد ربّنا غیر مکفی ولامودّع ولامستغنی ربّنا﴾{۹۷}

"تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اے ہمارے رب! حمد وثنا کا مستحق تُو ہی ہے، ہماری ثنائیں تو بہرصورت ناکافی اور نامکمل ہیں۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے بارگاہِ حق میں عرض کیا:

"اے اللہ میں آپ کا شکر کیسے ادا کروں، توفیقِ شکر بھی تو تیری ایک نعمت ہی ہے؟"

اللہ نے فرمایا: "اے داؤد! جب آپ نے شکر کی ادائیگی سے اپنی عاجزی ظاہر کردی تو آپ نے شکر کا حق ادا کردیا۔"{۹۸}

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان پر اپنی نعمتوں کی حد فرمادی اور اپنی مشیت وحکمت کے مطابق اسے اس کی طلب کے مطابق ہر چیز عطا فرمائی، {۹۹} اگر ان انعامات کی سرسری گنتی ہی شروع کردی جائے تو زبانیں تھک جائیں اور وہ شمار میں نہ آسکیں چہ جائیکہ ان کے شکر کا حق ادا ہو سکے، اگر ہمارے رونگٹے رونگٹے کو گویائی عطا کردی جائے تب بھی ہم اس کے شکر سے عاجز رہیں گے۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ "بے شک انسان بڑا ہی ناانصاف اور بڑا ہی ناشکرا ہے۔"

انسان کے ظلوم اور کفار ہونے کے مقابلے میں اللہ نے سورۂ نحل میں اپنے غفور رحیم ہونے کا ذکر فرمایا ہے، دونوں مقامات میں فرق یہ ہے کہ یہاں چونکہ ان انسانوں کا ذکر تھا جنہوں نے نعمتوں کے جواب میں کفر اور ظلم کا راستہ اختیار کیا، اس لیے انسان کے ظلوم اور کفار ہونے پر آیت ختم کی اور سورۂ نحل میں انسان پر اللہ کے انعامات کا ذکر تھا اور مغفرت اور رحمت بھی انعاماتِ الٰہیہ میں سے ہیں، اس لیے آیت کے اختتام پر غفور اور رحیم جیسی صفات لائی گئیں، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان اگر "ظلوم" ہے تو اس کا رب "غفور" ہے، اور انسان اگر کفار (ناشکرا ہے) تو اس کے کفران کے مقابلے میں اللہ کی "رحمت" ہے۔{۱۰۰}

{۹۷} (بخاری ۲، کتاب الاطعمۃ/۸۲۰)

{۹۸} (ابن کثیر ۲/۴۰۳)

{۹۹} "وآتاکم من کلّ ماسألتموہ" ای اعطاکم جمیع ماسألتموہ حسبما تقتضیہ مشیئۃ التابعۃ للحکمۃ والمصلحۃ (روح المعانی ۸،۱۳/۳۲۶)

{۱۰۰} والمقصود کأنہ یقول: ان کنت ظلوما فأنا غفور وان کنت کفّارًا فانا رحیم أعلم عجزک وقصورک (کبیر ۷،۱۹/۱۰۰)

حکمت و ہدایت:

۱......مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وجود کے دس دلائل بیان فرمائے ہیں:

☆ آسمان کی چھت ☆ زمین کا فرش ☆ بارش کا برسنا اور اس سے مختلف قسم کی نباتات اور پھلوں کا پیدا ہونا ☆ کشتیوں اور جہازوں کا حمل ونقل کے لیے استعمال ہونا ☆ دریاؤں اور نہروں کی روانی ☆ سورج کی روشنی ☆ چاند کی چاندنی ☆ شب کی تاریکی ☆ دن کی روشنی ☆ انسان کی بے شمار ضروریات کی فراہمی۔

۲......عجائباتِ قدرت کی کثرت اور خود انسان کی ذات، اللہ کے وجود، اس کی وحدانیت وقدرت اور اس کے علم پر شاہد ہیں سمجھنے کے لیے بس انسانی فطرت کا صحیح سالم ہونا شرط ہے۔(۳۲-۳۴)

۳......انسان قوانینِ قدرت کو اپنے تابع نہیں کرسکتا، البتہ اللہ کی مخلوق میں مختلف تصرفات کر کے ان کے اثرات سے بے شمار فوائد ضرور حاصل کرسکتا ہے، اگر تصرف نہ بھی کرے تو بھی یہ چیزیں انسان کی نفع رسانی ہی میں لگی ہوئی ہیں مظاہرِ فطرت کی تسخیر اسی معنی میں ہے۔

۴......قرآن، کائنات کے مناظر اور نفسِ انسانی کی اُلجھنوں کو عقیدۂ توحید سے مربوط کر دیتا ہے، اہلِ ایمان کے لیے اس کتاب کا یہ پہلو بھی ایک معجزہ ہے۔

۵......وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے قرآن کا انداز فلسفیانہ نہیں بلکہ یہ اس مسئلہ کو دستِ قدرت کی کارگری کے ذریعے بڑے خوبصورت، مؤثر اور اشاراتی انداز میں بیان کرتا ہے، سلیم الفطرت انسان کے لیے ماننے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا جبکہ عنادی شخص مبہوت کھڑا رہ جاتا ہے۔

۶......کائنات میں حرکت کرنے والے بڑے بڑے اجرامِ فلکی اللہ کے حکم سے زندگی کے قیام کے لیے سرگرداں ہیں۔

۷......اللہ کے انعامات واحسانات کا کوئی شمار نہیں، زمان ومکان کی حد بندیوں میں جکڑا ہوا اور محدود علم کا مالک تودۂ خاک اپنے خالق کی نعمتوں کا احاطہ کیا کرے گا؟ وہ تو انسانی دائرۂ علم و ادراک سے ماوراء ہیں۔(۳۴)

۸......حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ اہلِ نار پر بھی اللہ کا انعام ہے، اگر وہ چاہتا تو اس سے بھی شدید عذاب ان کو دے سکتا تھا۔{۱۰۱}

{۱۰۱}(بیان القرآن ۱۳/۶/۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

﴿۳۵......۴۱﴾

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ

اور جس وقت کہا ابراہیم نے اے رب! کر دے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے کہ

ٱلْأَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِى

ہم پوجیں مورتوں کو O اے رب! انہوں نے گمراہ کیا بہت لوگوں کو سو جس نے پیروی کی

فَإِنَّهُۥ مِنِّى ۖ وَمَنْ عَصَانِى فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۶﴾ رَّبَّنَآ إِنِّىٓ أَسْكَنتُ

میری سو وہ تو میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے O اے رب! میں نے بسایا ہے

مِن ذُرِّيَّتِى بِوَادٍ غَيْرِ ذِى زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ ٱلْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا۟

اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے پاس، اے رب! ہمارے تاکہ قائم رکھیں

ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجْعَلْ أَفْـِٔدَةً مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَٱرْزُقْهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ

نماز کو سو رکھ بعضے لوگوں کے دل کہ مائل ہوں ان کی طرف اور روزی دے ان کو میووں سے

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۳۷﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِى وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى

شاید وہ شکر کریں O اے رب ہمارے! تو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں

ٱللَّهِ مِن شَىْءٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا فِى ٱلسَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى وَهَبَ لِى عَلَى

دکھا کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی چیز زمین میں نہ آسمان میں O شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا مجھ کو اتنی بڑی

ٱلْكِبَرِ إِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ ۚ إِنَّ رَبِّى لَسَمِيعُ ٱلدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ ٱجْعَلْنِى مُقِيمَ

عمر میں اسماعیل اور اسحاق بے شک میرا رب سنتا ہے دعا کو O اے رب میرے! کر مجھ کو کہ قائم رکھوں

ٱلصَّلَوٰةِ وَمِن ذُرِّيَّتِى ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا ٱغْفِرْ لِى وَلِوَٰلِدَىَّ

نماز اور میری اولاد میں سے بھی، اے رب میرے! اور قبول کر میری دعا O اے ہمارے رب! بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو

وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ ٱلْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع

اور سب ایمان والوں کو جس دن قائم ہو حساب O

ربط: سر سے پاؤں تک شرک کی نجاست میں آلودہ ہونے کے باوجود قریش نہ صرف ابراہیمی ہونے کا دعوٰی کرتے تھے بلکہ اپنے مشرکانہ نظریات کی حمایت میں ان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہی تھی کہ یہ نظریات ہمیں اپنے جدِّ امجد

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وراثت میں ملے ہیں، ان آیات میں ان کے دعوے کی تردید کی جا رہی ہے۔

تسہیل: اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنادے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھنا O اے میرے رب! ان بتوں نے بہت سارے انسانوں کو گمراہ کردیا ہے، جو کوئی ان بتوں سے کنارہ کشی میں میری بات مانے گا وہ تو یقیناً میرا ہے اور جو کوئی میری نافرمانی کرے گا میں اس کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرتا ہوں کیونکہ آپ غفور رحیم ہیں O اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس ایسی وادی میں ٹھہرایا ہے جو زراعت کے بھی قابل نہیں، اے ہمارے رب! میرا مقصد بس یہ ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کریں، پس آپ سے درخواست یہ ہے کہ انسانوں کے دل ان کی طرف مائل کردیجیے اور انہیں پھلوں کی روزی عطا فرمایئے تاکہ وہ آپ کا شکر کریں O اے ہمارے رب! بلاشبہ آپ کو تو وہ سب کچھ معلوم ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور یہ علم صرف ہم تک محدود نہیں بلکہ اللہ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز بھی مخفی نہیں O تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق جیسے بیٹے عطا فرمائے، بے شک میرا رب سب کی دعا سنتا ہے O اے میرے رب! مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنادے اور میری اولاد کو بھی، اے ہمارے رب! میری دعا قبول فرمالے O اے ہمارے رب! حساب کے دن میری، میرے والدین کی اور سارے ایمان والوں کی مغفرت فرمادینا O

تفسیر

﴿۳۵﴾......اس آیت میں مردِ حق آگاہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دو دعائیں مذکور ہیں، یعنی مکہ کو حرمِ امن بنانے کی دعا اور اپنے اور اپنی اولاد کے شرک سے محفوظ رہنے کی التجاء......!

حق تعالیٰ کے انوار کی تجلّی گاہ کو پرامن دیکھنے کی خواہش کے اظہار سے نعمتِ امن کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، انسانی احساسات پر امن کا گہرا اثر ہوتا ہے اور حیاتِ انسانی کے رواں دواں رہنے میں بھی یہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

بعض علماء سے سوال کیا گیا کہ ''امن'' اور ''صحت'' میں سے کس نعمت کی اہمیت زیادہ ہے؟

انہوں نے فرمایا کہ ''امن'' زیادہ اہمیت کا حامل ہے بہ نسبت صحت کے! اور اپنے اس دعوٰی پر بڑی دلچسپ مثال پیش فرمائی، فرمایا کہ:

''ایک بکری جس کی ٹانگ وغیرہ ٹوٹ گئی ہو، لیکن اسے امن حاصل ہو تو وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ روبہ صحت ہوتی جائے گی حتّٰی کہ مکمل صحت یاب ہو کر دوبارہ سے چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگے گی، اس کے مقابلے میں ایک صحت مند بکری ہے لیکن وہ ایسی جگہ باندھی گئی ہے جہاں قریب ہی بھیڑیا بھی بندھا ہوا ہے، یعنی وہ ماٗمون نہیں، تو یہ بکری نہ

کھائے گی نہ پئے گی حتی کہ شدتِ خوف سے اپنی جان گنوا بیٹھے گی۔{۱۰۲}
بہر حال اللہ نے اپنے خلیل علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور مکہ مکرمہ کو امن کا ''رول ماڈل'' بنا دیا، جہاں انسان تو انسان، حیوانات اور نباتات کو بھی امن حاصل ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ جانداروں اور ماحولیات کے تحفظ کو جو اہمیت مکہ میں حاصل ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے، اگر کسی شہر کا اس میں سے استثناء کر سکتے ہیں تو وہ دوسرے ''حرم'' یعنی مدینہ منورہ کا!

﴿وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ انبیاء علیہم السلام جیسی برگزیدہ ہستیوں سے شرک کا صدور محال ہے، لہٰذا اس عبارت کا مطلب اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے ملتِ اسلام اور توحید پر استقامت کی دعا ہے۔{۱۰۳}

﴿وَبَنِيَّ﴾ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صلبی اولاد ہے{۱۰۴} اور اگر عام ذریت مراد ہو تو یہی کہا جائے گا کہ بعض کے حق میں شرک سے حفاظت کی اس دعا کو شرفِ قبولیت عطا ہوا اور بعض کے حق میں یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔{۱۰۵}

﴿۳۶﴾...... ﴿رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ﴾ بت بذاتہٖ کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے البتہ گمراہی کا سبب بنتے ہیں، یہاں یہی مطلب ہے کہ یہ مورتیاں خلقِ کثیر کی گمراہی کا سبب بنی ہیں، اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت اصنام کی طرف مجازی ہے۔{۱۰۶}

﴿فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ﴾ تحمل و بردباری اور رأفت و شفقت کے پیکر سیدنا ابراہیم علیہ السلام بڑے باادب اور دھیمے انداز میں دعا کے بعد بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کرتے ہیں کہ میری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جو غیر اللہ کی عبادت سے باز آ جائے،{۱۰۷} وہ میری جماعت میں سے ہے، اور جو طریقِ ہدایت سے اعراض کریں تو ان کا معاملہ تیری رحمت و غفران کے سپرد ہے، چاہے تو انہیں بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔

سورۂ مائدہ میں سیّدنا مسیح علیہ السلام کی اس سے ملتی جلتی التجاء کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾{۱۰۸}

''اگر آپ انہیں سزا دیں تو یہ آپ ہی کے بندے ہیں اور اگر آپ انہیں معاف کر دیں تو آپ غالب اور حکمت والے ہیں۔''

{۱۰۲} (قبس من نور القرآن الكريم ۳۸/۶)
{۱۰۳} ای ثبتنا علی مانحن علیه من التوحید وملّة الاسلام (المراغی ۱۵۹/۱۳)
{۱۰۴} ''وبنیّ'' ای الصلبی (نظم الدرر ۱۹۰/۴)
{۱۰۵} وان کان عمم فی الدعاء الا ان الله تعالیٰ أجاب دعاءه فی حق البعض دون البعض (کبیر۷، ۱۰۲/۱۹)
{۱۰۶} لما کانت سببا للاضلال اضاف الفعل الیهن مجازًا (قرطبی ۳۱۴/۹)...... ای تسبّبن له کقوله تعالیٰ ''وغرّتهم الحیوٰة الدنیا'' (ابو السعود ۴۹۲/۳)
{۱۰۷} ای فمن تبعنی من الناس فتجنب عبادة الاصنام فهو منّی (التحریر والتنویر۷، ۲۳۹/۱۳)
{۱۰۸} (المائدة ۱۱۸/۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس استدعاء اور سیدنا ابراہیم کے اس ارشاد ”فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَاِنَّکَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ“ میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے، البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار شفاعت ورحمت سے یکسر محروم رہیں گے، اس لیے آپ نے ”الۡعَزِیۡزُ“ اور ”الۡحَکِیۡمُ“ یہ دو صفتیں ذکر فرمائیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا دنیا میں کی تھی، اور دنیا میں توبہ کا دروازہ بہر حال کھلا ہے، اس لیے فرمایا کہ اگر آپ انہیں توبہ کی توفیق عطا فرما کر ان کے سابقہ گناہ معاف فرمادیں تو آپ ”غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ“ ہیں۔{۱۰۹}

﴿وَمَنۡ عَصَانِیۡ﴾ میں مشرکینِ عرب پر تعریض ہے کہ تم نے ابراہیمی ہونے کا دعویٰ تو کیا لیکن عملاً ”ابراہیمی“ بن کر نہیں دکھایا۔{۱۱۰}

﴿۳۷﴾......مناجات کا سلسلہ جاری ہے، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام بڑے تضرّع سے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں نے اپنی اولاد (حضرت اسماعیل علیہ السلام ورنہ حضرت اسحاق علیہ السلام تو شام میں تھے) کو ایک ایسی بے آب وگیاہ وادی میں لا چھوڑا ہے جو نہ مادی کشش رکھتی ہے اور نہ اس میں رزق کی کشائش ہے، میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا، اب تو اپنی قدرت سے اس چٹیل میدان کے لیے مشتاقانِ دید کا بھی انتظام فرما تاکہ اس کی رونق میں اضافہ ہو اور غیب سے وسعتِ رزق کے اسباب بھی مہیا فرما تاکہ یہ یکسوئی کے ساتھ تیری عبادت اور تیری شکرگزاری میں مصروف رہیں، آج خانۂ کعبہ اگر مرجعِ عالم اور عالمی تجارتی منڈی ہے تو کیوں؟ یہ اسی مناجات کا حیرت انگیز عملی ظہور ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے گڑگڑا کر اللہ کے حضور پیش فرمائی۔

﴿۳۸﴾......اے اللہ! ہماری دعائیں تو عبودیت وعاجزی کا ایک مظہر ہیں ورنہ نہ آپ کا علم ناقص ومحدود ہے اور نہ صرف کلیات پر مشتمل بلکہ آپ تو ہر چیز کا کامل اور محیط علم رکھتے ہیں، کائنات کی کوئی چیز{۱۱۱} بھی آپ کے دائرۂ علم وخبر سے ماوراء نہیں۔

﴿۳۹﴾......اولاد کی خواہش ہمیشہ سے ہر انسان کو رہی ہے، اولاد ہی نسلِ انسانی کے تسلسل کا ایک ذریعہ ہے، اور اگر کسی کو عمر کے آخری حصے میں یہ نعمت اللہ تعالیٰ عطا فرمادیں تو اس کے اطمینان ومسرّت کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

{۱۰۹} (تفسیر عثمانی/۱۲۵ ......دار التصنیف، کراچی)
{۱۱۰} وسوق هذه الدعوة للتعريض بالمشركين من العرب بانّهم لم يبرّوا بأبيهم ابراهيم عليه السلام (التحرير والتنوير،۱۳/۷، ۲۴۰)
{۱۱۱} ”من شئ“ من للاستغراق (کشاف ۵۲۶/۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ایسی ہی عمر میں اولاد جیسے عطیۂ الٰہی کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، آپ کی عمر ننانوے (۹۹) برس تھی جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور ۱۱۲ برس کی عمر میں آپ کو حضرت اسحاق جیسا فرزندِ ارجمند عطا ہوا جو حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔{۱۱۲}

اس بارے میں بائبل کی روایات بھی ملاحظہ فرمایئے، لکھا ہے:

''اور ابرام کے لیے ہاجرہ سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اسماعیل رکھا گیا، اور ابرام چھیاسی برس کا تھا جب ہاجرہ سے اسماعیل پیدا ہوا۔''{۱۱۳}

''اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کا نام جو سارہ سے اس کے لیے پیدا ہوا، اسحاق رکھا، اور خدا کے حکم کے مطابق آٹھویں دن اس کا ختنہ کیا اور ابراہیم اس وقت سو برس کا تھا۔''{۱۱۴}

﴿اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ﴾ یہاں ''سمیع'' بمعنیٰ ''مجیب'' ہے{۱۱۵} یعنی میرا رب دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔

﴿۴۰﴾......اے پروردگار! مجھے بھی اقامتِ صلوٰۃ کی توفیق عطا فرما اور میری اولاد میں سے بھی ایسے لوگ پیدا فرما جو اس اہم فریضے کو مکمل شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اخلاص کے ساتھ ادا کریں۔

﴿مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ میں ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے، یعنی اپنی نسل کے اہلِ ایمان کے لیے دعا ہے، اس لیے کہ بذریعۂ وحی آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کی آئندہ نسل میں کچھ لوگ کافر بھی ہوں گے۔{۱۱۶}

﴿رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ﴾ اے اللہ! تُو میری ساری دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخش دے{۱۱۷} تو تیرے خزانوں میں کمی ہی کیا ہے؟

﴿۴۱﴾...... ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دعاؤں کا سلسلہ اختتام پذیر ہو رہا ہے، آخر میں اپنے لیے، مؤمنین مخلصین اور اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت فرماتے ہیں۔

{۱۱۲} روی انّه ولد له اسماعیل لتسع وتسعین سنة واسحاق لمائة واثنتی عشرة سنة (بیضاوی ۳/۳۵۳)

{۱۱۳} (عہدِعتیق، تکوین باب ۱۶:۱۵-۱۶/ص ۱۷)

{۱۱۴} (عہدِعتیق، تکوین، باب ۲۱:۴-۵/ص ۲۲)

{۱۱۵} ای انّه یستجیب لمن دعاہ (ابن کثیر ۲/۷۰۵)...... فالسمع بمعنی القبول والاجابة (روح المعانی ۸،۱۳/۳۵۰)

{۱۱۶} "مـن ذرّیّتی"...... ای بعضهم (ابوالسعود ۳/۴۹۳)...... ای بعض ذرّیّتی......لانّه علم باعلام الله انّه یکون فی ذرّیّته کفار (مدارک ۲/۱۷۷)

{۱۱۷} "وتقبّل دعاء" کلّه بذلك وغیره (نظم الدّرر ۴/۱۹۳)

اپنے کافر والد کی مغفرت کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دستِ سوال کیوں دراز فرمایا؟ اس کا جواب ہم سورۂ توبہ کی آیت (۱۱۴) کی تشریح میں عرض کر چکے، وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

حکمت وہدایت:

۱...... امن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے بہت بڑی نعمت ہے، امن کے بغیر نہ دنیا کی مصلحتیں حاصل ہو سکتی ہیں نہ دین کی، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا اپنی دعا میں ''امن'' کو مقدم کرنا اس کی اہمیت کو خوب واضح کرتا ہے، نیز اس اندازِ بیان سے دعائے امن کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ (۳۵)

۲...... اس کرۂ ارض پر مکہ مکرمہ سے زیادہ شرف وفضیلت کسی اور جگہ کو حاصل نہیں جبکہ امن کی گراں بہا نعمت بھی اسی شہرِ مقدس کا خاصہ ہے، امن بھی آج سے نہیں ہزاروں سال سے اسے حاصل ہے، اس وقت بھی یہاں امن تھا جب نہ کوئی حکومت تھی نہ قانون تھے۔ (۳۵)

۳...... دعا میں اپنی ذات اور ذرّیت کا تقدم مشروع ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے ظاہر ہے۔ (۳۵)

۴...... ﴿وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ﴾ میں اس بات پر دلالت ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جیسی جلیل القدر شخصیات بھی شرک میں مبتلا ہونے سے ڈرتی تھیں اور وہ اپنی عصمت کے لیے اللہ سے التجاء کرتی ہیں تو ان لوگوں کو اپنے حال وکمال پر ناز کہاں زیب دیتا ہے جو ہر وقت نفس وشیطان کے پھندوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ {۱۱۸} (۳۵)

۵...... ﴿فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي﴾ میں مشرکین پر تعریض ہے کہ ابراہیمی وہ ہے جو مشنِ ابراہیمی پر کاربند ہو، تم سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے عقائد ونظریات کے اختلاف کے باوجود کیونکر ملّتِ ابراہیمی کے دعویدار بنے پھرتے ہو؟ (۳۶)

۶...... بڑے بڑے گناہگار مسلمان کے لیے بھی دعائے مغفرت شرعاً ممنوع نہیں ہے سوائے مشرک وکافر کے۔ (۳۶)

۷...... ایمانی رشتہ نسبی وخونی رشتے پر ترجیح رکھتا ہے، اسی لیے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا ''فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي''

۸...... سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عیال کی وادیٔ غیر ذی زرع (مکہ) میں سکونت کی علّت اقامتِ صلوٰۃ بیان فرمائی...... اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہاں ادا کی جانے والی نمازِ کی فضیلت دیگر مقامات کی بہ نسبت زیادہ ہے، مزید برآں نماز کی اہمیت اور دین کا اہم رکن ہونا بھی واضح ہوتا ہے۔ (۳۷)

{۱۱۸} (بیان القرآن، حصہ اوّل، جلد ۶/۱۴)

۹......نماز کا پڑھنا کافی نہیں، نماز قائم کرنا ضروری ہے اور یہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر ہم کسی باعمل عالم اور صاحبِ نسبت بزرگ کی صحبت میں رہ کر نماز قائم کرنا سیکھ لیں۔
محدث العصر علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ ایک دفعہ دیوبند سے بارہ چودہ کوس کا سفر پیدل طے کر کے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت گنگوہی نے مقصدِ آمد پوچھا تو فرمایا کہ میرے یہاں آنے کا مقصد اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ آپ سے دعا کرواؤں کہ میں ٹھیک طریقے سے نماز ادا کرنے والا بن جاؤں، حضرت گنگوہی نے ارشاد فرمایا کہ آپ نے درست فرمایا، نماز ہی وہ عبادت ہے جو درست ہو جائے تو سارے معاملات درست ہو جاتے ہیں۔{۱۱۹}
۱۰......ایمان والوں کے دلوں میں کعبۃ اللہ کے لیے بے پایاں محبت وعقیدت دعائے ابراہیمی کی برکت سے ہے۔(۳۷)
۱۱......دینی کاموں میں مدد کے لیے اللہ تعالیٰ سے بقدرِ ضرورت مال وجاہ کا طلب کرنا مذموم نہیں۔{۱۲۰}(۳۷)
۱۲......دعا میں مصالحِ دینیہ ودنیویہ دونوں کا جمع کرنا تقوی کے منافی نہیں۔{۱۲۱}(۳۷)
۱۳......کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے اہل وعیال کو ویرانے میں چھوڑ دے، اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ اللہ کے حکم سے کیا تھا۔
۱۴......عالم الغیب صرف اللہ عزّ وجل کی ذات ہے(۳۸) نبیوں، ولیوں اور پیروں کے لیے یہ خدائی صفت ثابت کرنا نبوی تعلیمات سے کھلا اعراض ہے۔
۱۵......اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا کرنا واجب ہے۔(۳۹)
۱۶......قبولیت کے یقین کے ساتھ کی جانے والی دعائیں ضرور شرفِ قبولیت پاتی ہیں۔
۱۷......اللہ سے طلبِ مغفرت کا سوال ہر شخص پر لازم ہے، اپنے لیے بھی، اپنے اہل وعیال اور تمام اہلِ ایمان کے لیے بھی۔(۴۱)
۱۸......بعث وجزاء کا عقیدہ برحق ہے، منکرین، آخرت میں کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ کر لیں گے۔(۴۱)
۱۹......﴿يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ میں ”حساب“ کی طرف ”قیام“ کی نسبت معاملے کی صعوبت اور شدّت پر دلالت کرتی ہے، جیسے ایک عربی محاورہ ہے: ”قامت الحرب علی ساق“{۱۲۲} ”جنگ اپنی پنڈلی پر قائم ہو گئی۔“

{۱۱۹}(بحوالہ معالم العرفان ۳۰۹/۱۰......حضرت سواتی رحمہ اللہ)
{۱۲۰}(بیان القرآن حصہ اوّل، جلد ۱۵/۶)
{۱۲۱}(تیسیر اللطیف المنّان فی خلاصۃ تفسیر القرآن/۱۶۶......المکتبۃ العصریہ، بیروت)
{۱۲۲}(ایسر التفاسیر ۶۳/۳......دیکھیے حاشیہ۴)

یومِ آخرت کے چند مناظر

﴿۴۲......۵۲﴾

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۗ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے ان کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف، ان کو تو ڈھیل دے رکھی ہے اس دن کے

تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ

لیے کہ پتھرا جائیں گی آنکھیں ○ دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر، پھر کر نہیں آئیں گی ان کی طرف ان کی آنکھیں اور

طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ

دل ان کے اڑ گئے ہوں گے ○ اور ڈرا دے لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب تب کہیں گے ظالم اے رب

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ اَوَلَمْ

ہمارے! مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت تک کہ ہم قبول کر لیں تیرے بلانے کو اور پیروی کر لیں رسولوں کی

تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

کیا تم پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ٹلنا؟؟ ○ اور آباد تھے تم بستیوں میں انہی لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ

اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا ہم نے ان سے اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے ○ اور یہ بنا چکے ہیں اپنا داؤ اور اللہ

مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ

کے آگے ہے ان کا داؤ اور نہ ہوگا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ ○ سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کرے گا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ

بے شک اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا ○ جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے

الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ

اللہ اکیلے زبردست کے ○ اور دیکھے تو گناہ گاروں کو اس دن باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں ○ کرتے ان کے ہیں گندھک کے

قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۙ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اور ڈھانکے لیتی ہے ان کے منہ کو آگ ○ تا کہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا بے شک اللہ

سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ

جلد کرنے والا ہے حساب O یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تا کہ چونک جائیں اس سے اور تا کہ جان لیں کہ معبود وہی ہے ایک

اُولُوا الْاَلْبَابِ۝

ہے اور تا کہ سوچ لیں عقل والے O

ربط: مربوط سلسلہ کلام کے تناظر میں جنابِ نبی کریم ﷺ کو تسلی اور آپ کے مخالفین کو دھمکی اور وعید ہے۔

تسہیل: اے میرے حبیب! آپ دل میں یہ خیال بھی نہ لانا کہ اللہ ظالموں کی کرتوتوں سے بے خبر ہے، وہ تو بس انہیں اس دن تک مہلت دے رہا ہے جس دن آنکھیں کھلی رہ جائیں گی O مجرم سر اٹھائے بھاگ رہے ہوں گے، ایسی ٹکٹکی بندھی ہوگی کہ آنکھ جھپکنا بھول جائیں گے اور خوف کی وجہ سے ان کے دل اڑ رہے ہوں گے O اے میرے پیغمبر! آپ ان لوگوں کو اس دن سے خبردار کیجیے جب ان پر عذاب آپڑے گا تو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے فریاد کریں گے اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مہلت مزید دے دے، ہم تیری دعوت قبول کرلیں گے اور رسولوں کی اتباع کریں گے، اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا کہ کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھایا کرتے تھے کہ تمہیں دنیا چھوڑ کر کہیں نہیں جانا؟ O حالانکہ تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہتے تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ستم ڈھائے تھے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا تھا، اور عبرت کے لیے ہم نے تمہارے سامنے مثالیں بھی بیان کردی تھیں O انہوں نے حق کا راستہ روکنے کے لیے بڑی بڑی تدبیریں کیں اور اللہ کو ان کی ساری تدبیروں کا علم ہے، ان کی تدبیریں تو واقعی ایسی تھیں کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جاتے مگر وہ حق کا راستہ نہ روک سکے O اے لوگو! تم اللہ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا مت سمجھو، بے شک اللہ سب پر غالب ہے اور انتقام بھی لے سکتا ہے O اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی یہ نہیں رہے گا اور سب لوگ اللہ کے روبرو پیش ہوں گے جو یکتا اور قہار ہے O اور تم اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے O ان کے کرتے تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ لپٹ رہی ہوگی O یہ سب کچھ اس لیے ہوگا تا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دے دے، یقیناً اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے O یہ قرآن لوگوں تک پیغام رسانی کا ذریعہ ہے تا کہ اس کے ذریعے لوگوں کو خبردار کیا جائے اور تا کہ وہ جان لیں کہ وہی اکیلا معبود ہے اور تا کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں O

تفسیر

﴿۴۲-۴۳﴾...... کفار و مشرکین کی دو روزہ چاندنی دیکھ کر یہ گمان مت کیجیے گا کہ یہ ہمیشہ اس عیشِ فراواں کے مزے

لوٹتے رہیں گے نہیں! ہم ان کی بدمستیوں اور سرکشیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں، البتہ اپنے مصالح تکوینی سے انہیں ڈھیل دیے جارہے ہیں۔

﴿وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾{۱۲۳} ''اور میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں، یقیناً میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔''

مہلت کی یہ ڈوری ان کی حیاتِ دنیوی تک ہی طویل ہوگی، پھر نہ پوچھیے کہ روزِ محشر کس رسوائی کا شکار ہوں گے؟ حالت یہ ہوگی کہ دہشت اور ہول کی وجہ سے آنکھیں پتھرا جائیں گی، سر اٹھیں گے تو فرطِ ہیبت سے اٹھے کے اٹھے رہ جائیں گے، نگاہیں یوں منجمد ہوں گی کہ پلکیں جھپکانے سے قاصر ہوں گے،{۱۲۴} بس ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہوں گے، خود اپنی طرف بھی ان کا التفات نہ ہوگا، اور دل حواس باختہ اور فہم و دانش سے یوں خالی ہوں گے گویا ان کے سینے میں دل موجود ہی نہیں بلکہ اپنی جگہ سے زائل ہو چکے ہیں۔{۱۲۵}

الغرض اس ہولناک دن نہایت جزع فزع کے عالم میں ہر چیز سے غافل بس موقفِ حساب کی طرف دوڑے چلے جارہے ہوں گے۔

﴿۴۴﴾......اے حبیب ﷺ! آپ ان کفار کو اس دن سے آگاہ فرما دیجیے جب سب حقائق کھل جائیں گے، اپنی ہزیمت اور ذلت کے ہر منظر کا مشاہدہ یہ دیکھتی آنکھوں کرلیں گے، ان کے دلوں میں دنیا میں واپسی کی خواہش پیدا ہوگی اور وہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں گے کہ اے پروردگار! بس ایک تھوڑی سی مہلت اور چاہیے، پھر نہ دعوتِ حق ٹھکرائیں گے اور نہ تیرے رسولوں کی مخالفت کا سوچیں گے بلکہ سمع و طاعت کو شعار بنالیں گے اللہ! اللہ! کس حسرت آمیز لہجے میں مہلت مانگیں گے مگر جواب آئے گا، ارے اپنی اصلاح کے وعدے اور دعوے کرنے والو! دنیا کی زندگی تمہارے لیے مہلت نہ تھی تو اور کیا تھا؟ مگر تم نے کوئی عبرت نہ پکڑی بلکہ ہمیشہ اپنی شان و شوکت اور جاہ و منزلت کے لازوال ہونے پر قسمیں کھاتے رہے۔

سورۂ نحل میں اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ ہے:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ﴾{۱۲۶} ''اور یہ بڑے زور شور سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جائے گا، اللہ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔''

عذاب سامنے دیکھ کر کفار کی دنیا میں واپسی کی تمنا کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے، سورۂ سجدہ میں ارشاد ہے:

{۱۲۳} (القلم ۶۸/۴۵)

{۱۲۴} عیونهم مفتوحة ممدودة من غیر تحریك للاجفان (تفسیر القاسمی ۱۰/۳۷)

{۱۲۵} والمعنی: ان القلوب یومئذ زائلة عن أماكنها (تفسیر القاسمی ۱۰/۳۷)

{۱۲۶} (النحل ۱۶/۳۸)

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا﴾{۱۲۷}

''اگر تُو دیکھے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سُن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے، ہم نیک اعمال بجالائیں گے۔''

سورۂ منافقون میں ہے:

﴿رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾{۱۲۸}

''اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے مہلت کیوں نہ دے دی کہ میں خوب صدقہ کرتا اور نیکو کاروں میں شامل ہو جاتا؟''

﴿۴۵﴾...... دنیا کی مہلت کے علاوہ امم سابقہ کی تاریخ و آثار بھی تمہارے سامنے تھے، تم اخبار و قصص کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے مشاہدہ سے یہ حقیقت جان چکے تھے کہ ارتکابِ جرائم کی حدود عبور کرنے والی قومیں اللہ کے عذاب کی زد میں آ کر نابود ہو جاتی ہیں مگر یہ عظیم حقیقت بھی تمہارے شعور و وجدان میں ارتعاش پیدا نہ کر سکی۔

﴿۴۶﴾...... پیغامِ حق کو مٹانے اور شریعتِ سماویہ کی بیخ کنی کے لیے ان بدبختوں نے کون کون سا حربہ استعمال نہیں کیا؟ دولت، حکومت، عورت، میڈیا، اسکولز، کالجز، علاج معالجہ اور بہت کچھ...... سوا چودہ سو سال ہونے کو آئے ہیں کہ انداز و عنوان بدل بدل کر یہ حربے دینِ اسلام کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔

لیکن ان کے یہ داؤ پیچ ہمیشہ ہی ناکام رہے ہیں، اس لیے کہ چراغِ ہدایت کو گل کرنے کی سعیٔ لاحاصل کرنے والے ان نامرادوں کے مقابلے میں اللہ نے اس کا نور چار دانگ عالم پھیلانے کا وعدہ کر رکھا ہے، اور جب ایسا ہے تو پھر ان کی مکاریوں سے پیغامِ حق کیسے غبار آلود ہو سکتا ہے؟ سو وہ اپنی اس ناپاک جسارت سے اپنے ہاتھوں اسبابِ ہلاکت مہیا کر رہے ہیں،{۱۲۹} سچے دین پر ان کے اوچھے ہتھکنڈوں کا نہ پہلے کوئی اثر ہوا تھا نہ آئندہ ہو گا۔

ہماری مذکورہ تفسیر کے مطابق ''وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ'' میں ''ان'' نافیہ ہو گا،{۱۳۰} اس صورت میں مقصود ان کے مکر کے ضعف کو بیان کرنا ہے۔ یعنی ان کا مکر اور تدبیریں پہاڑ جیسی مضبوطی رکھنے والے قرآن اور مذہبِ اسلام کو نہ اپنی جگہ سے ہٹا سکتی ہیں نہ شکست دے سکتی ہیں۔

{۱۲۷} (السجدۃ ۳۲/۱۲)

{۱۲۸} (المنافقون ۶۳/۱۰)

{۱۲۹} "وعنداللہ مکرھم" والمعنى مكتوب عنده تعالىٰ مكرهم...... كناية عن مجازاته تعالىٰ لهم عليه۔ (روح المعانی ۸، ۱۳/۳۶۲)

{۱۳۰} "ان" بمعنى "ما" اى ما كان مكرهم لتنزول منه الجبال (قرطبی ۹/۳۴۴)

اور اگر "ان" کو مخففہ میں المثقلہ مانیں تو عبارت یوں ہوگی:

"انّـه کان مکرهم لتزول منه الجبال" یعنی کفار کا خیال یہ تھا کہ ہماری تدبیریں اس قدر محکم ہیں کہ پہاڑوں کو ہلا کر رکھ دیں۔{۱۳۱}

﴿۴۷﴾......اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کا جو وعدہ اللہ نے کر رکھا ہے، وہ بہر صورت پورا ہوگا، وہ جزا و سزا پر قادر ہے اس لیے مجرموں کو ضرور کیفرِ کردار تک پہنچائے گا، بھلا جو ذات زبردست قدرت کی مالک ہے اس کے ہاں وعدہ خلافی کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے؟

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ﴾ اللہ کی طرف جب انتقام کی نسبت کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ظلم و تعدّی کے مناسب عادلانہ جزا و سزا، اور ایسا کب ہوگا؟

﴿۴۸﴾......جب زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے' زمین و آسمان کی یہ تبدیلی کیسے ہوگی؟ اس میں ذات و صفات ہر ایک کی تبدیلی مراد ہو سکتی ہے، البتہ یہاں قرآن نے کسی وجہ کی تصریح نہیں کی،{۱۳۲} اتنی بات یقینی ہے کہ یہ زمین و آسمان اس دن اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ باقی نہیں رہیں گے۔{۱۳۳}

بخاری و مسلم کی ایک روایت جو سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں آپ ﷺ نے اُس زمین کا یہ حال بیان فرمایا:

"قیامت کے دن لوگوں کو ایسی سفید زمین پر جمع کیا جائے گا جو میدے کی سفید ٹکیا کی طرح ہوگی، نہ اس پر کوئی اونچ نیچ ہوگی نہ کوئی نشان ہوگا۔"{۱۳۴}

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ "اور لوگ نکل کھڑے ہوں گے اس اللہ کے سامنے جو اکیلا ہے، زبردست ہے۔"

وہی جابر و سرکش، جن کی سماعتوں پر اللہ کی وحدانیت کی بازگشت بڑی گراں گزرتی تھی، جو پیغامِ حق پر کان دھرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے اور داعیانِ حق کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، مومنین مخلصین ان کے نزدیک سوسائٹی کے سب سے

{۱۳۱} أی هو مکر عظیم لتزول منه الجبال لو کان لها أن تزول، أی جدیرة (التحریر والتنویر ۷، ۱۳/ ۲۵۱)

{۱۳۲} والتبدیل قد یکون فی الذات...... وقد یکون فی الصفات...... والآیة لیست بنص فی احدا لوجهین (روح المعانی ۸، ۲۳/ ۳۶۷) "تبدّل الأرض غیر الأرض" علی حال سوی هذه الحال (تنویر المقباس/ ۲۷۴)

{۱۳۳} وهی هذا علیٰ غیر الصفة المألوفة المعروفة (ابن کثیر ۲/ ۷۰۴)

{۱۳۴} (بخاری ۲، کتاب الرقاق/ ۹۶۵، مسلم ۲، کتاب صفة المنافقین/ ۳۷۱...... (حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں تبدیلیٔ ارض و سماوات پر متعدد روایات نقل کی ہیں...... دیکھیے مظہری ۶/ ۳۲۳-۳۲۷)

کمتر افراد تھے، قیامت کے دن بڑی بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں شہنشاہِ کل کے دربار میں سر جھکائے حاضر ہوں گے، کہاں وہ نخوت وتکبر اور کہاں یہ ذلّت ونکبت؟

﴿بَرَزُوْا﴾ کی ضمیر یا تو تمام مخلوق کی طرف راجع ہے یا اس سے مراد صرف کفار ہیں{۱۳۵}

کفار کی رسوائی اور اللہ کے حضور حاضری کا یہ منظر انجیل میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

''جب ابنِ انسان اپنے جلال میں آئے گا اور تمام فرشتے اس کے ہمراہ ہوں گے تب وہ اپنے تختِ جلال پر بیٹھے گا۔ اور تمام قومیں اس کے حضور جمع کی جائیں گی اور وہ ایک کو دوسرے سے جدا کرے گا۔{۱۳۶}

﴿۴۹﴾...... مجرمین کو محاسبے اور انتقام کا مرحلہ درپیش ہے، جرم کی نوعیت کے اعتبار سے انہیں تقسیم کر دیا جائے گا،{۱۳۷} گلے میں طوق ہوں گے اور پاؤں میں بیڑیاں، قرآن نے دوسرے مقامات پر ان بیڑیوں اور طوقوں کا بیان مزید وضاحت سے کیا ہے:

سورۃ الحاقّۃ میں ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾{۱۳۸}

''پھر اسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستر ہاتھ کے برابر ہو۔''

سورۂ یٰسٓ میں فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ﴾{۱۳۹}

''ہم ان کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہوں گے اور اس کی وجہ سے ان کے سر اوپر کو اٹھے رہ جائیں گے۔''

اور صرف اسی سزا پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ:

﴿۵۰﴾......ان کے تن پر ایسا لباس ہوگا جو آتش گیر مادے سے تیار کیا جائے گا اور وہ آتشی شعلوں کو خود دعوت دے گا، چنانچہ یہ لباس پہنا کر جب انہیں جہنّم میں ڈالا جائے گا{۱۴۰} تو جہنم کی آگ انہیں چہار سمت سے ڈھانک لے

{۱۳۵} "وبرزوا" ای الخلائق اوالظالمون أجداثهم (تفسیر قاسمی ۱۰/۴۰)

{۱۳۶} (عہدِ جدید، مقدس متّی، باب ۲۵: ۳۱-۳۲/ص ۳۹)

{۱۳۷} "مقرّنین" المراد قرن بعضهم من بعض وضمّ كل لمشاركه فی كفره وعمله (روح المعانی ۸، ۱۳/ ۳۷۰)...... "مقرّنین" قرن بعضهم مع بعض حسب اقترانهم فی الجرائم والجرائر (ابو السعود ۳/ ۵۰۴)

{۱۳۸} (الحاقة ۶۹/ ۳۲)

{۱۳۹} (یٰس ۳۶/ ۸)

{۱۴۰} فهو لباسهم قبل دخول النار ابتداء بالعذاب حتّٰی یقعوا فی النّار (التحریر والتنویر ۷، ۱۳/ ۲۵۳)

گی اوران کے چہرے جھلس کررہ جائیں گے۔

دوزخ کی آگ تو ان کے سارے جسم کو متاثر کرے گی لیکن صرف چہرے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ اشرف الاعضاء ہے{۱۴۱} جیسا کہ سورۂ زمر میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾{۱۴۲} ''کیا بھلا وہ شخص جو روکتا ہے اپنے چہرے پر بُرا عذاب؟۔''

اس آیت میں جو لفظ ''قطران'' آیا ہے، قدیم تفاسیر وتراجم میں اس کا معنیٰ ''گندھک'' کیا گیا ہے، البتہ صاحب منجد نے اسے ''تارکول'' کے معنیٰ میں لیا ہے{۱۴۳} اور بعض دیگر لغات بھی اس معنیٰ میں ان کی مؤید ہیں، معنیٰ کوئی سا بھی ہو مقصود بہر حال یہی ہے کہ اہلِ دوزخ کا لباس کسی ایسے مادہ سے تیار ہوگا جو بڑی سرعت کے ساتھ آگ کو قبول کرے گا، اس مادے میں حدت ہوگی جو بدن میں جلن پیدا کرے گی اور اس پر مستزاد یہ کہ بدبودار ہونے کی وجہ سے عذاب کی شدت دوچند کر دے گا۔

﴿۵۱﴾...... ﴿لِیَجْزِیَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ ''تاکہ اللہ بدلہ دے ہر متنفس کو اس کے کیے کا۔''

یہ وجودِ قیامت پر ایک مستحکم دلیل ہے، بتایا جارہا ہے کہ دنیا چونکہ دارالعمل ہے، اس لیے یہاں کامل جزاوسزا انہیں ملتی، لہٰذا لازم ہے کہ کوئی ایسا مقام ہو جہاں ظلم کو اپنا شعار بنانے والے اپنے انجام کو پہنچیں اور عدل اور اعتدال پر قائم رہنے والوں پر انعام وعطا کی بارش ہو اور اس کے لیے روزِ قیامت مقرر ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ اس غلط فہمی میں کوئی نہ رہے کہ اتنی لاتعداد مخلوق کا حساب کیسے ہوگا اور جزاوسزا میں مساوات کس طرح ممکن رہے گی؟ اللہ تو قادرِ مطلق ہے، اس کے لیے ابتدائے آفرینش سے لے کر کائنات کے آخری انسان تک سے حساب لینا ایسے ہی ہے جیسے کسی ایک انسان سے حساب لینا۔ اللہ نے اپنی قدرت کا اظہار دوسرے مقام پر یوں فرمایا:

﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ﴾{۱۴۴} ''تم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ زندہ کیے جانا ایسا ہی ہے جیسے ایک جان کا، یقیناً اللہ ہر بات سنتا ہر چیز دیکھتا ہے۔''

{۱۴۱} وتخصیص الوجوه بالحکم المذکور مع عمومه لسائر اعضائهم لکونها اعز الاعضاء (ابوالسعود ۵۰۴/۳)

{۱۴۲} (الزمر ۲۴/۳۹)

{۱۴۳} (المنجد/۸۱۶...... دارالاشاعت کراچی)

{۱۴۴} (لقمان ۲۸/۳۱)

بتایئے! جس اللہ کے لیے تمام انسانوں کا پیدا کرنا اور انہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اس کے لیے اوّلین و آخرین سے حساب لینا کیا مشکل ہوگا؟

﴿۵۲﴾...... ﴿ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ ......الخ﴾ "یہ لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے۔"

﴿ھٰذَا﴾ کا مشارٌ الیہ پورا قرآن بھی ہوسکتا ہے {۱۴۵} اور مذکورہ آیات (۴۲-۵۱) بھی! {۱۴۶}

مشارٌ الیہ کی تعیین سے قطع نظر مقصود یہ بتانا ہے کہ قرآنی پیغام انسانی ہدایت کے لیے کافی اور وافی ہے۔ {۱۴۷}

اس حقیقت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے کہ پورے نظامِ کائنات کی صلاح و فلاح کا عظیم منشور پاس ہوتے ہوئے بھی دنیا اس کے عملی نفاذ سے محروم ہے۔

اسلام کا پروگرام:

شکیب ارسلان نے اپنے دورۂ روس کے بعد لکھا تھا کہ میں نے روس میں اسٹالن اور اس کے حواریوں کے سامنے اسلام کی حقانیت پر لیکچر دیا تو وہ سن کر بے حد متاثر ہوئے اور فوراً کہنے لگے کہ کیا دنیا میں کہیں اس پروگرام پر عمل بھی ہو رہا ہے؟

شکیب لکھتے ہیں کہ میرے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا، اس لیے کہ دنیا کے پچاس سے زائد ممالک میں نہ تو اجتماعی طور پر یہ فریضہ انجام دیا جارہا ہے اور نہ ہی دنیا اس کے عمدہ ثمرات سے بہرہ ور ہو رہی ہے۔ {۱۴۸}

کاش! اے کاش! ہمیں یہ نکتہ سمجھ میں آجائے کہ اسلام کے علاوہ کسی ازم اور مذہب میں ہماری اور پوری دنیا کی کامیابی اور عالمی مسائل کا حل نہیں۔

مسلمانوں کو اپنے اس فریضہ کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ اسلام کے عملی نفاذ کے لیے وہ کس حد تک اور کتنی مؤثر و مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں؟

صدیوں کی رسوائی و پسپائی بھی ہماری سوچ کا قبلہ درست نہ کرسکی، اللہ ہماری حالت پر رحم فرمائے۔

آج بھی اگر ہم اسلام کا مکمل پروگرام دنیا کے کسی بھی خطے میں پوری طرح نافذ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یقین جانیے یہ ہماری تاریخ کا "ٹرننگ پوائنٹ" ہوگا، اللہ تعالیٰ سے بصد عجز و نیاز توفیق کا سوال ہے۔

{۱۴۵} "ھذا" ای الکتاب (نظم الدرر ۴/۱۹۷)

{۱۴۶} "ھذا" ای ما ذکر من قوله سبحانه "ولا تحسبنّ الله غافلا" الی قوله "سریع الحساب" (ابوالسعود ۳/۵۰۵)

{۱۴۷} "بلاغ للناس" کفایة لهم فی الموعظة (بیضاوی ۳/۳۵۸)...... ای کفایة لهم لما فیه من العظة والتذکیر (تفسیر قاسمی ۱۰/۴۴)

{۱۴۸} (بحواله معالم العرفان ۱۰/۳۳۱...... حضرت سواتی رحمه الله)

﴿وَلِيُنذَرُوا بِهِ...... الخ﴾ نزولِ قرآن کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ پہلی امتوں کے جرائم اور اسباب ہلاکت واضح ہو جائیں اور انسانیت ان جرائم کے اعادہ سے باز رہ کر اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے، نیز یہ کہ اس کی فکری وعملی قوت کو کمال حاصل ہو{۱۴۹} اور وہ اللہ کی ذات وصفات کے صحیح ادراک کے قابل ہو سکے۔

﴿وَلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عقل اور اس کا صحیح استعمال ہی انسان کی وجہِ فضیلت ہے،{۱۵۰} ورنہ اس میں اور حیوان میں کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہتی۔

حکمت وہدایت:

۱......کفار کو مہلت دیے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی کرتوتوں سے غافل ہے، بلکہ یہ تأخیر وقتِ موعود کی آمد تک ہے، جلد یا بدیر یہ ضرور عذاب کے نرغے میں ہوں گے۔(۴۳)

۲......قیامت کی ہولنا کی بالآخر کفار وفساق کو اپنی اصلاح کی تمنا پر مجبور کر ہی دے گی، کاش! یہ لوگ زندگی کے قیمتی لمحات کو غنیمت جان کر دنیا ہی میں اللہ کو راضی کر لیں......!(۴۴)

۳......ظلم اور ظالم کی تاریخ ازل سے ہلاکت وبربادی کا ''جلی عنوان'' رہی ہے(۴۵) جابر وسرکش افراد واقوام پہلی ظالم امم کی تاریخ سے سبق حاصل کریں، ورنہ جان لیں کہ یہی ان کی تاریخ ہے۔

۴......اللہ نے اپنے حبیب ﷺ سے فتح ونصرت کے تمام وعدے ایفاء کیے(۴۷)......ایفائے عہود کی وہی جھلک آج بھی دیکھی جا رہی ہے اور قیامت تک اللہ مؤمنین کاملین کی دستگیری فرماتا رہے گا۔

۵......قیامت کے دن زمین وآسمان کو بدل دیا جائے گا، تبدیلی کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔(۴۸)

۶......مجرمین اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں قیامت کے دن مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا ہوں گے۔(اللّٰھم لاتجعلنا منھم)(۴۹-۵۰)

۷......وقوعِ قیامت کا مقصد دنیا میں کیے جانے والے اعمال کی جزا وسزا ہے۔(۵۱)

۸......انسانیت کو خسرانِ عظیم سے بچانے اور اس کے دل ودماغ میں وحدانیتِ باری تعالیٰ کو راسخ کرنے کے لیے قرآن نے انذار وتخویف، وعد ووعید اور دلائل وبراہین سمیت ہر انداز اختیار کیا ہے، مگر اس صحیفۂ ہدایت سے صرف وہی افراد مستفید ہوتے ہیں جن کی عقل کا قبلہ درست ہوتا ہے۔(۵۲)

{۱۴۹} (کبیر۷،۱۹/۱۱۴)

{۱۵۰} ھذہ الآیۃ دالۃ علی انّہ لافضیلۃ للانسان ولامنقبۃ لہ الّا بسبب عقلہ (کبیر۷،۱۹/۱۱۵)

سُورَةُ الْحِجْرِ
مَكِّيَّةٌ

سورۂ حجر کے اہم مضامین

سورۂ حجر مکی ہے، اس میں ۹۹ آیات اور چھ رکوع ہیں، اس میں چونکہ وادیِ حجر کے رہنے والوں یعنی قومِ ثمود کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام سورۃ الحجر ہے، وادیِ حجر، مدینہ منورہ اور شام کے درمیان واقع ہے، اس سورت کی صرف پہلی آیت تیرھویں پارہ میں ہے، باقی پوری سورت چودھویں پارہ میں ہے۔ اس سورت کا آغاز بھی حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے اور اس کی پہلی آیت میں قرآن کی تعریف اور توصیف ہے، اس سورت میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد کا اثبات ہے۔ اس سورت کے اہم مضامین درجِ ذیل ہیں:

﴿۱﴾...... قیامت کے دن کفار جب عذاب کی شدت اور ہولناکی کا مشاہدہ کریں گے تو وہ آرزو کریں گے کہ اے کاش! ہم مسلمان ہوتے، لیکن ظاہر ہے کہ اس دن کا ایمان اور ایمان کی تمنا کسی کام نہیں آئے گی جبکہ آج ان کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول انہیں ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ اسے مجنون اور دیوانہ کہتے ہیں اور وہ ایمانی دعوت کے مقابلے میں انکار اور استہزاء کا وہی رویہ اختیار رکھے ہوئے ہیں جو گزشتہ نافرمان قوموں نے اختیار کیا تھا۔

﴿۲﴾...... قرآنِ کریم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ خود باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے جبکہ دوسری آسمانی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے حاملین کو سونپی گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ دوسری آسمانی کتابیں انسانی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکیں جبکہ قرآن کئی صدیاں گزرنے کے باوجود ہر طرح کے تغیر وتبدل اور کمی بیشی سے پاک اور محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم کے معجزہ ہونے کے پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو اس کا محفوظ ہونا بھی ہے اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو حفظ کرنا آسان فرما دیا ہے، دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں قرآن کے حافظ نہ پائے جاتے ہوں، چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جو اپنی مادری زبان کے چند صفحے کا رسالہ یاد نہیں کر سکتے، وہ اتنی بڑی کتاب اپنے سینے میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

﴿۳﴾...... اس سورت کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں جو چیخ چیخ کر اپنے خالق کے وجود اور اس کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہ دلائل آسمانوں، زمینوں، چاند ستاروں، پہاڑوں اور میدانوں، سمندروں اور نہروں، درختوں اور پرندوں کی صورت میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، کہیں فرمایا گیا: ''ہم ہی نے آسمان میں بُرج بنائے اور دیکھنے والوں کے لیے اس کو سجا دیا۔'' (۱۵:۱۶)

دو آیتوں کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''اور زمین کو بھی ہم ہی نے پھیلا دیا اور اس پر پہاڑ بنا کر رکھ دیئے اور اس میں ہر مناسب چیز اُگائی۔'' (۱۵:۱۹)

کہیں فرمایا گیا: ''ہم ہی پانی سے بھری ہوئی ہوائیں چلاتے ہیں اور ہم ہی آسمان سے بارش برساتے ہیں اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔'' (۱۵:۲۲)

یہ ہوائیں ہزاروں ٹن پانی اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہیں، پھر جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے اسے برسا دیتی ہیں یہ ہوائیں ہی ہیں جو درختوں کو بارآور کرتی ہیں، یہ وہی کام سرانجام دیتی ہیں جو نر حیوان، مادہ کے لیے سرانجام دیتا ہے، ان ہواؤں میں نر اور مادہ کے اعضاء اور اثرات ہوتے ہیں جو کہ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف منتقل کرتی چلی جاتی ہیں۔

﴿۴﴾......توحید اور قدرت کے تکوینی دلائل ذکر کرنے کے بعد انسان کی تخلیق کی ابتداء کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کہ اس دنیا کے پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کی صورت میں سامنے آیا، آپ کی پیدائش یقیناً ربانی قدرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر تھی، کیونکہ بے جان مٹی سے ایک ایسی شخصیت پیدا کر دینا جسے حرکت کرنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سوچنے سمجھنے، عناصر کو مسخر کرنے اور امکانات کی دنیا میں آگے بڑھنے کی قدرت حاصل ہے، یقیناً اللہ کے قادر اور حکیم ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا قصہ ہے، جس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس میں اپنی رُوح پھونکی، فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اپنی قدرت کے اسرار اور حکمت کے عجائبات ان پر کھولے تو ان تمام امور میں جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی تکریم تھی اسی طرح ان کی اولاد کی بھی تکریم تھی۔ فرشتوں کو جب سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر دیا۔ اہلِ علم کے نزدیک راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ ابلیس فرشتہ نہیں بلکہ جن تھا البتہ فرشتوں کے درمیان رہتا تھا، سجدہ سے انکار کی وجہ سے اسے آسمانوں سے نکال دیا گیا اور وہ ابدی لعنت کا مستحق ٹھہرا، اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے انتقام لینے کے لیے قیامت کے دن تک زندگی کی مہلت مانگی تھی اور اپنے اس مقصد کا اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر اظہار کر دیا تھا، اس نے کہا تھا، پروردگار! جیسے تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں لوگوں کے لیے گمراہی کو آراستہ کر دوں گا اور سب کو بہکا دوں گا۔'' (۱۵:۳۹)

اسے کہہ دیا گیا تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لو، جو میرے بندے ہیں ان پر تو تمہارا کوئی داؤ نہیں چلے گا البتہ جو ابدی شقی اور فطرت کے خبیث ہیں وہ تمہاری اتباع کریں گے اور ان کے لیے میں نے جہنم تیار کر رکھی ہے جس کے سات دروازے ہیں اور ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے جماعتیں تقسیم کر دی گئی ہیں۔'' (۱۵:۴۴)

چونکہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ترہیب کے ساتھ ترغیب اور دوزخ کے ساتھ جنت کا بھی تذکرہ کرتا ہے، اس لیے شیطان کی اتباع کرنے والوں کے تذکرہ کے بعد ان سعادت مندوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو امن اور سلامتی کی جگہ یعنی جنت میں ہوں گے، وہاں انہیں نہ تھکاوٹ ہوگی نہ کوئی تکلیف اور پریشانی، ان کے سینے ایک دوسرے کے بارے میں صاف ہوں گے۔

﴿۵﴾...... جنت جیسی امن وسلامتی اور راحت واطمینان کی جگہ کا ذکر کرنے کے بعد سورۂ حجر، بندوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان اور رحمت کا ذکر کرتی ہے، بندہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو، اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف کرسکتا ہے اور اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اے پیغمبر! میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ میں بڑا بخشنے والا اور مہربان ہوں اور یہ کہ میرا عذاب دردناک ہے۔ (۱۵:۴۹۔۵۰)

یہ آیات خوف اور امید دونوں مقامات کی جامع ہیں، مومن کے دل میں اللہ کا خوف بھی ہونا چاہیے اور اس کی رحمت کی امید بھی ہونی چاہیے۔

﴿۶﴾...... اللہ کی رحمت اور فضل واحسان کے بعد حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے مہمانوں کا تذکرہ ہے جو انسانی شکل میں نورانی فرشتے تھے اور آپ کو بیٹے کی خوشخبری سنانے کے لیے آئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر کم و بیش ۱۲۰ سال تھی، اہلیہ بھی بہت بوڑھی تھیں، بظاہر یہ ولادت کی عمر نہ تھی اس لیے آپ کو بیٹے کی خوشخبری سن کر خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی ہوا۔ آپ نے فرشتوں کے سامنے تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا: ''ہم آپ کو سچی خوشخبری سنا رہے ہیں پس آپ مایوس نہ ہوں۔'' (۱۵:۵۵)

آپ نے جواب میں فرمایا (میں اللہ کی رحمت سے کیوں مایوس ہونے لگا) ''اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا تو صرف گمراہوں کا کام ہے۔'' (۱۵:۵۶)

میرے سوال کرنے کا مقصد تو یہ معلوم کرنا ہے کہ یونہی بڑھاپے میں ہمیں بیٹا دیا جائے گا یا جوانی لوٹا کر اور کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کے بعد؟

﴿۷﴾...... فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری سنا کر حضرت لوط علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر رات ہی کو اس بستی سے نکل جایئے کیونکہ آپ کی بستی والے گناہوں کی سرکشی میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ناپاک وجود سے زمین کو پاک کرنے کا فیصلہ

کرلیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''سوان کو سورج نکلتے نکلتے چنگھاڑ نے آ پکڑا اور ہم نے اس شہر کو اُلٹ کر نیچے کا اوپر کر دیا اور ان پر کنکر کی پتھریاں برسائیں۔'' (۱۵:۷۴)

﴿۸﴾...... وادیِ حجر کے رہنے والوں یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی قوم بھی ظلم اور زیادتی کی راہ پر چل نکلی تھی اور بار بار سمجھانے کے باوجود بت پرستی کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھی، انہیں مختلف معجزات بھی دکھائے گئے بالخصوص پہاڑی چٹان سے اونٹنی کی ولادت کا معجزہ، جو کہ حقیقت میں کئی معجزوں کا مجموعہ تھا، اونٹنی کا چٹان سے برآمد ہونا، نکلتے ہی اس کی ولادت کا قریب ہونا، اس کی جسامت کا غیر معمولی بڑا ہونا، اس سے بہت زیادہ دودھ کا حاصل ہونا...... لیکن ان بدبختوں نے اس معجزہ کی کوئی قدر نہ کی، بجائے اس کے کہ وہ اسے دیکھ کر ایمان قبول کر لیتے انہوں نے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا، چنانچہ وادیِ حجر والے بھی عذاب کی لپیٹ میں آ کر رہے۔

سورۂ حجر کے آخری رکوع میں نعمتِ قرآن کا ذکر ہے کہ جسے یہ نعمت حاصل ہو جائے اسے مال داروں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے اور حضورِ اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کی طرف جو حق نازل کیا گیا ہے، اسے کھول کر بیان فرما دیجیے، گویا گزشتہ سورت کی طرح اس سورت کی ابتداء اور اختتام بھی قرآن پر ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

کفّار کی تمنّا

﴿۱......۵﴾

﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱ رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور واضح قرآن کی ۝ کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا

لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ۝۲ ذَرْهُمْ یَاْكُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ

اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان ۝ چھوڑ دے ان کو کھالیں اور برت لیں (فائدہ اٹھالیں) اور امید میں (پر بھولے) لگے رہیں

یَعْلَمُوْنَ ۝۳ وَمَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴ مَا تَسْبِقُ مِنْ

سو آئندہ معلوم کرلیں گے ۝ اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر ۝ نہ سبقت کرتا ہے کوئی فرقہ

اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۵

اپنے وقتِ مقرر سے اور نہ پیچھے رہتا ہے ۝

ربط: سورۂ ابراہیم کے اختتام پر قیامت کے دن کفار کے احوال بیان کیے گئے تھے، یہاں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

تسہیل: الف، لام، را، یہ کامل کتاب اور ایسے قرآن کی آیات ہیں جو حق اور باطل کو واضح کرنے والا ہے ۝ کفار بار بار تمنّا کریں گے اے کاش! ہم مسلمان ہوتے ۝ آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے کہ یہ کھانے پینے میں، عیش وعشرت میں اور لمبے لمبے منصوبے بنانے میں مگن رہیں، بہت جلد انہیں اپنی جہد وسعی کا انجام معلوم ہو جائے گا ۝ اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے، اس کی ہلاکت کا وقت لوحِ محفوظ میں متعین تھا ۝ کوئی بھی قوم اپنے وقتِ متعیّن سے نہ تو آگے نکل سکتی ہے اور نہ ہی پیچھے ہو سکتی ہے ۝

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾...... دوسری سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی جو آیات ہیں، وہ ایسی کتاب کی آیات ہیں جو فصاحت و بلاغت، تاثیر اور جامعیت، حفاظت اور وضاحت کے اعتبار سے کامل ہے۔ {۱}

﴿۲﴾...... قیامت کے دن جب کفار کے سامنے اپنے کفر و عناد اور تکبر اور سرکشی کے نتائج ظاہر ہوں گے اور انہیں مختلف عذابوں سے دوچار ہونا پڑے گا تو وہ بار بار تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم مسلمان ہوتے، سورۂ انعام میں بھی یہ

{۱} "قرآنٍ"...... تنکیرہ للتفخیم ای آیات الجامع لکونہ کتابا کاملا (بیضاوی ۳/۳۶۰)

مضمون بیان ہوا ہے:

﴿وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ {۲}

''اور اگر تم وہ وقت دیکھو جب انہیں دوزخ پر کھڑا کیا جائے گا تو یہ کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں گے اور ایمان والوں میں سے ہوں گے۔''

حدیث سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب دوزخی، دوزخ میں جمع ہوجائیں گے اور ان کے ساتھ گناہ گار مسلمان بھی ہوں گے تو کفار طعنہ کے طور پر مسلمانوں سے سوال کریں گے ''ارے! تم تو مسلمان نہیں تھے؟'' وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں! ہم مسلمان تھے، کفار کہیں گے ''تو تمہارے اسلام نے تمہیں کیا فائدہ دیا جبکہ تم بھی دوزخ میں ہمارے ساتھ ہو؟'' مسلمان وضاحت کریں گے کہ ہم سے کچھ گناہ سرزد ہوگئے تھے ان کے بدلے ہم پکڑے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہونے والی یہ بات چیت سننے کے بعد حکم دیں گے کہ دوزخ میں جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں انہیں آزاد کردیا جائے، جب کفار یہ سارا معاملہ دیکھیں گے تو آرزو کریں گے اے کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے اور ہمیں بھی دوزخ سے نکال دیا جاتا جیسے ان مسلمانوں کو نکال لیا گیا ہے۔

یہ ارشاد فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝﴾ {۳}

﴿۳﴾......ضدی لوگوں کے کفر وعناد سے انسانیت کے غمخوار ﷺ کی طبیعت پر بڑا اثر ہوتا تھا اور آپ شدید حزن و الم کی کیفیت سے دوچار ہوجاتے تھے، اس پر فرمایا گیا کہ آپ انہیں کھانے پینے، سونے جاگنے، اوڑھنے پہننے اور دنیا کمانے لٹانے کی لذتوں میں پڑا رہنے دیں اور انہیں ایسے خیالی منصوبے بنانے دیں جو انہیں حقیقی زندگی کے تقاضوں اور آخرت کی تیاری سے غافل کردیں، سورۂ ابراہیم میں گزر چکا:

﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾ {۴}

''فرما دیجیے! چندے عیش کرلو، آخری انجام تمہارا دوزخ ہی ہے۔''

{۲} (الانعام ۶/۲۷)
{۳} (طبرانی بحوالہ ابن کثیر ۲/۱۱۷)
{۴} (ابراھیم ۱۴/۳۰)

سورۂ مرسلات میں ہے:

﴿كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُّجْرِمُونَ﴾{۵} ''تھوڑا بہت کھا، برت لو، بے شک تم مجرم لوگ ہو۔''

﴿۴-۵﴾......سوال ہوتا ہے کہ حق کو جھٹلانے اور زمین میں فتنہ وفساد پھیلانے والے ان چلتے پھرتے شیطانوں کو اللہ تعالیٰ ہلاک کیوں نہیں کر دیتا جبکہ وہ اس کی پوری پوری قدرت بھی رکھتا ہے؟ جواب دیا جارہا ہے کہ افراد کی طرح جماعتوں، قوموں، شہروں اور بستیوں کی بھی لوحِ محفوظ میں ایک متعین عمر ہے، اس طے شدہ عمر کے گزارنے کا ہر قوم کو حق دیا جاتا ہے:

﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾{۶} ''ہر امت کے لیے متعین وقت ہے، جب وہ وقت آ پہنچے گا تو نہ اس سے آگے نکل سکیں گے نہ پیچھے سرک سکیں گے۔''

نافرمان قوموں کو مہلت دیا جانا اللہ کی اس قدیمی سنت کا بھی تقاضا ہے جس کے مطابق وہ کسی قوم کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ اس پر حجت قائم نہ ہو جائے تاکہ کل کو وہ یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہمیں توبہ اور قبولِ ہدایت کا موقع کیوں نہ دیا گیا؟

حکمت وہدایت:

۱......قرآنِ کریم کمال اور بیان دونوں صفات کا جامع ہے، اس میں نہ نقص ہے نہ خلل، نہ اخفاء ہے نہ اشتباہ، یہ حق اور باطل میں دو اور دو چار کی طرح حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔(۱)

۲......ہر قسم کے کافر قیامت کے دن اپنے عقائد واعمال پر بار بار نادم اور شرمندہ ہوں گے، جب بھی انہیں کسی نئے عذاب اور نئی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ اظہارِ ندامت پر مجبور ہو جائیں گے ''ربما'' کا لفظ اصل میں قلیل کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر اسے کثیر میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے{۷} عربوں کی عادت ہے کہ جب وہ کثرت کو بیان کرتے ہیں تو وہ اس کے لیے ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جسے قلت کے لیے وضع کیا گیا ہو۔{۸}

۳......کافر تمنا کریں گے ''مسلمین'' ہونے کی، نہ متقین نہ معلّمین نہ مجاہدین نہ خاشعین ہونے کی، جس سے ظاہر ہوتا

{۵}(المرسلات۷۷/۴۶)

{۶}(یونس ۱۰/۴۹)

{۷} انها للتقليل غالبًا وللتكثير نادرًا (روح المعانی ۸،۱۴/۳)

{۸} لاشك أنّ العرب تعبر عن المعنى بمايؤدى عكس مقصوده كثيرا (كشاف ۲/۵۳۳......دیکھیے حاشیہ نمبر۱)

ہے کہ صرف شہادت کا اقرار اور اسلام کا اظہار بھی بہت بڑی نعمت ہے اور دائمی عذاب سے بچانے میں اس کا دخل ہے، مفسرین کی اکثریت کا یہی قول ہے۔(۲){۹}

۴......جاہلی اور مشرک قوموں نے ہمیشہ خورد ونوش کی لذّتوں، مادی منفعتوں، معیارِ زندگی کی بلندی، خیالی منصوبوں اور آرزوؤں ہی کو اپنا سب سے بڑا مقصد سمجھا اور اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتیں اور وسائل انہی کے حصول کے لیے مخصوص کیے رکھے، مغربی تہذیب جو کہ درحقیقت دجالی تہذیب ہے اور چند خوش نصیبوں کے سوا ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے، اس لعنتی تہذیب میں بھی ہر اعتبار سے ترجیح دنیوی زندگی ہی کو حاصل ہے، آخرت کا ذکر اور تصور اوّل تو ہے ہی نہیں، اگر ہے بھی تو بہت دھندلا سا۔

۵......اسلام مادی نعمتوں اور دنیاوی لذّتوں کے حصول سے منع نہیں کرتا کیونکہ زمین میں جو کچھ ہے اللہ نے انسانوں ہی کے لیے پیدا کیا ہے لیکن انہی چیزوں کو مقصدِ زندگی سمجھ لینا اور شریعت کی حدود وقیود کو بھول جانا کافروں کی خصوصیت ہے مسلمانوں کی نہیں۔

۶......حرص اور طولِ امل یعنی دنیا بنانے اور کمانے کے لمبے لمبے پروگرام اہلِ ایمان کو زیبا نہیں (۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿یھرم ابن آدم ویشبّ منه اثنتان الحرص علی العمر والحرص علی المال﴾{۱۰}

”آدم کا بیٹا بوڑھا ہو جاتا ہے مگر دو چیزیں اس کے ساتھ جوان ہوتی رہتی ہیں، درازیٔ عمر اور مال کی حرص۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری روایت رسول اللہ ﷺ سے یوں منقول ہے:

﴿أربعة من الشقاء: جمود العین وقساوة القلب، وطول الأمل والحرص علی الدّنیا﴾{۱۱}

”چار چیزیں بدبختی کی علامت ہیں، آنکھوں کا خشک ہو جانا، دل کی سختی، لمبی امیدیں اور دنیا کی حرص۔“

طبرانی اور بیہقی میں حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے:

{۹} ان حضرات کا استدلال انہی روایات سے ہے، جن میں ”کلمۂ شہادت“ پڑھنے والے ہر مؤمن کی نجات کا ذکر ہے، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت ہم نے بھی شروع میں ذکر کر دی ہے۔(م۔ا۔ش)

{۱۰} (ترمذی ۲، ابواب الزھد/۵۷)

{۱۱} (رواہ البزار بحوالہ منیر ۱۴/۱۲)

﴿صلاح اوّل هذه الأمة بالزّهد واليقين ويهلك آخرها بالبخل والامل﴾ {۱۲}

''اس امت کے پہلے لوگوں کی صلاح کی وجہ زہد و یقین تھا اور اس امت کے آخر میں آنے والوں کی ہلاکت بخل اور طولِ امل سے ہوگی۔''

مشرکین کی یاوہ گوئی

﴿۶......۱۵﴾

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿٦﴾ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن (نصیحت) تو بیشک دیوانہ ہے○ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو

إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٧﴾ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ﴿٨﴾

اگر تو سچا ہے؟○ ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر کام پورا (ٹھیک) کر کے اور اس وقت نہ ملے گی ان کو مہلت (ڈھیل)○

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٩﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي

ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں○ اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے

شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٠﴾ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١١﴾ كَذَٰلِكَ

اگلے فرقوں میں○ اور نہیں آتا ان کے پاس کوئی رسول مگر کرتے رہے ہیں اس سے ہنسی○ اسی طرح

نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٢﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَلَوْ

بٹھا دیتے ہیں ہم اس کو دل میں گنہگاروں کے○ یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آئی ہے رسم پہلوں کی○ اور اگر

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿١٤﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ

ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سارے دن اس میں چڑھتے رہیں○ تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہے ہماری نگاہ کو، نہیں!

نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ﴿١٥﴾

بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے○

ربط: مشرکین اور کفار کی مذمت کے بعد نبوت و رسالت پر ان کے اعتراضات، یاوہ گوئیوں اور بے ادبیوں کا ذکر ہے، ساتھ ہی سرورِ دو عالم ﷺ کی تسلّی اور تسکین کے لیے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر زمانے کے جاہلوں کا اپنے انبیاء کے ساتھ یہی رویہ رہا ہے۔

{۱۲} بحوالہ منیر ۱۴/۱۲

تسہیل: مشرکین کہتے ہیں کہ اے وہ شخص! جو اپنے اوپر قرآن کے نزول کا دعوٰی کرتا ہے، تو مجنون ہےO اگر تم اپنے دعوٰی میں واقعی سچے ہوتو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتے؟O ہم کسی حکمت اور مخصوص حالات کے علاوہ فرشتے نہیں اتارتے اور جب انہیں اتار دیا جائے تو پھر کسی کو مہلت نہیں دی جاتیO یہ قرآن ہم ہی نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیںO اور اے حبیب! آپ سے قبل بھی ہم پہلے گروہوں میں انبیاء بھیج چکے ہیںO اور ان کے پاس کوئی ایسا رسول نہیں آیا جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہوO جیسے تکذیب کا خیال مجرموں کے دل میں بٹھا دیا جاتا ہے یونہی ہم استہزاء بھی ان کے دلوں میں بٹھا دیتے ہیںO یہ مشرکین قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ کا یہ دستور پہلوں سے چلا آتا ہےO اگر بالفرض ہم ان کے لیے آسمان میں دروازہ کھول دیں اور وہ روزِ روشن میں اس سے چڑھ کر اوپر چلے جائیںO تب بھی یہ کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی تھی بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ ہم پر مکمل جادو کر دیا گیا تھاO

﴿تفسیر﴾

﴿۶﴾......مشرکین کہتے ہیں کہ اے وہ شخص! جو یہ دعوٰی کرتا ہے کہ میرے اوپر قرآن نازل ہوا ہے، تو مجنون اور دیوانہ ہے، معاذ اللہ! تیرے دیوانہ ہونے کے لیے یہ دعوٰی ہی کافی ہے کہ تیرے اوپر قرآن نازل ہوا ہے جبکہ کسی عام انسان پر آسمانی وحی کا نزول قطعاً محال ہے۔{۱۳}

﴿۷﴾......نہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کی افادیت پر غور، نہ اس کے مضامین کی صداقت کا لحاظ اور نہ اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا اقرار، انتہائی لغو قسم کا مطالبہ ہے تو یہ کہ اگر تم واقعی سچے نبی ہو تو اپنے ساتھ فرشتے کیوں نہیں لاتے جو تمہارے دعوے کی سچائی کی گواہی دیں؟ ان کا یہ مطالبہ قرآن نے بار بار نقل کیا ہے، سورۂ فرقان میں ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا﴾{۱۴}

''وہ لوگ جو ہمارے سامنے پیشی کی توقع ہی نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے یا ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہم اپنے پروردگار کو دیکھ لیں؟ درحقیقت وہ تکبر اور سرکشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

یہ مطالبہ صرف مشرکینِ مکہ ہی کا نہ تھا ان سے پہلے بھی جو جاہل قومیں گزری ہیں، وہ بھی اپنے انبیاء سے اسی قسم کے

{۱۳} يعنون يا من يدّعي مثل هذا الأمر العظيم الخارق للعادة إنك بسبب تلك الدعوى متحقق جنونك على أتم وجه (روح المعانی ۸،۱۴/۱۸)

{۱۴} (الفرقان ۲۵/۲۱)

مطالبات کیا کرتی تھیں، مقصد یہ تھا کہ بیہودہ مطالبات کے شور شرابے میں حق کی آواز دب کر رہ جائے، فرعون نے اپنی قوم کو لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا:

﴿فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ﴾{۱۵}

''اس پیغمبر کو سونے کے کنگن کیوں نہ ڈالے گئے اور فرشتے اس کے ساتھ پرا باندھے کیوں نہیں آتے؟''

﴿۸﴾......مشرکین کے اس لغو مطالبہ کا جواب یہ دیا گیا کہ ہم فرشتوں کو کسی حکمت یا مخصوص حالات کے علاوہ نازل نہیں کرتے، ظاہر ہے حکیم مطلق کا کوئی فیصلہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا اور انسانوں کے لیے فرشتے نازل کرنے میں کوئی حکمت نہیں اس لیے کہ اپنی اصل صورت میں تو وہ انسانوں کے درمیان رہ ہی نہیں سکتے، بالفرض اگر انہیں اتارا بھی جائے تو وہ انسانی صورت میں آئیں گے جس سے اشتباہ پیدا ہوگا، وہ دعویٰ کریں گے فرشتہ ہونے کا جبکہ انسان کہیں گے کہ اگر تم فرشتے ہو تو ہمارے جیسے کیوں ہو؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ﴾{۱۶}

''اگر ہم کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے تو وہ بھی ایک انسان کی صورت میں آتا اور پھر ان کو وہی شبہ ہوتا جس میں یہ اب مبتلا ہیں۔''

اس صورت مین ضدی لوگ یہ اعتراض بھی ضرور کرتے کہ عجب معاملہ ہے، نبی فرشتہ ہے جبکہ امتی انسان ہے، فرشتہ دعوت دے رہا ہے انسانوں کو کہ تم میری اتباع کرو، وہ مخصوص حالات جن میں فرشتے بھیجے جاتے ہیں، عام طور پر اس وقت ہوتے ہیں جب کسی قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہو اور جب کسی نافرمان قوم کی ہلاکت کے لیے فرشتوں کو بھیج دیا جائے تو پھر ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان سے عذاب نہیں ٹلتا، یہی مفہوم ہے ''وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ'' کا......!

﴿۹﴾......تمہاری غوغا آرائی اور اللہ کے نبی پر طعنہ زنی سے کچھ نہ ہوگا، تم نزولِ قرآن کے دعوٰی کی وجہ سے ہمارے نبی کو مجنون کہتے ہو جبکہ صورت یہ ہے کہ قرآن کو نازل بھی ہم ہی نے کیا ہے اور اس کی حفاظت بھی ہم ہی کریں گے، کتابیں تو قرآن سے پہلے بھی نازل ہوئیں اور وہ بلا شبہ اپنے اپنے دور میں نور اور ہدایت کا منبع تھیں مگر ان کتابوں کے حاملین نے اپنی خواہشات کے مطابق ان میں تحریف کردی، چونکہ قرآن کتابِ ہدایت کا آخری ایڈیشن ہے اس لیے اس کی حفاظت کا ذمہ ہم نے اپنے اوپر لے لیا ہے چنانچہ اس میں نہ کوئی تحریف کرسکتا ہے نہ ترمیم اور تبدیلی۔

آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں قرآن وہ واحد کتاب ہے جو لفظ بہ لفظ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح آسمان سے نازل

{۱۵} (الزخرف ۴۳/۵۳)
{۱۶} (الأنعام ۶/۹)

ہوئی تھی، یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کے علاوہ لفظ بہ لفظ محفوظ ہونے کا دعوٰی کسی دوسری کتاب نے کیا ہی نہیں، ان کتابوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ دعوٰی یہ کیا گیا ہے کہ ان کے اندر آسمانی تعلیم کی روح آ گئی ہے، باقی وہ لکھی ہوئی ہیں غیر معصوم انسانوں کی، ان میں ایسی بھی ہیں جنھیں انبیائے کرام علیہم السلام کے دنیا سے کوچ کر جانے کے سالہا سال بعد مرتب کیا گیا جبکہ قرآن اپنے پیش کرنے والے عظیم پیغمبر کی مبارک زندگی میں نہ صرف "الکتاب" کی شکل میں وجود میں آ چکا تھا بلکہ سینکڑوں سینوں میں محفوظ بھی ہو چکا تھا، اسے صرف ہفتہ واری سروس میں نہیں پڑھا جاتا بلکہ ابتداء سے آج تک فجر سے عشاء تک کی فرض نمازوں کے علاوہ نفلی نمازوں میں بکثرت پڑھا جاتا ہے۔

قرآن واحد آسمانی کتاب ہے جو اپنی حفاظت کے لیے کاغذ، قلم اور پریس کی محتاج نہیں، اگر بالفرض پوری دنیا میں مصحف کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہے تو بھی اس کے وجود کو کوئی خطرہ نہیں اس لیے کہ مشرق سے مغرب اور عرب سے عجم تک لاکھوں سینوں میں اس کا ہر حرف اور حرکت رقم ہے۔

قرآن واحد آسمانی کتاب ہے جسے اپنے وقتِ نزول سے آج تک تواتر کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے یعنی ہر دور میں اسے نقل کرنے والی اتنی بڑی جماعت رہی ہے جس کے بارے میں شریعت تو شریعت عام انسانی عقل بھی گواہی دیتی ہے کہ یہ جماعت جھوٹ نہیں بول سکتی۔

قرآنِ کریم کی آیات، الفاظ، حروف اور نقوش کی حفاظت ایسی مسلّمہ حقیقت ہے کہ ان گنت غیر مسلم مشاہیر اور نقادانِ قرآن بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، بنا بریں یہ دعوٰی بے جا نہ ہوگا کہ اگر مستقبل میں کبھی بھی مختلف ازموں کے ہاتھوں ستائی ہوئی انسانیت نے آسمانی پیغام کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا (یہ فیصلہ جلد یا بدیر ضرور ہو کر رہے گا) تو اسے ہر قطع و برید سے محفوظ آسمانی تعلیمات قرآن کے سوا کہیں نہیں ملیں گی۔

﴿۱۰-۱۱﴾...... اللہ کا ہر پیغمبر اپنی قوم کا مخلص خیر خواہ ہوتا ہے جبکہ ہمارے آقا ﷺ مخلصوں، خیر خواہوں اور شفقت کرنے والوں کے سردار تھے، کسی باپ اور ماں کو اپنی اولاد سے کیا محبت ہوگی جو آپ کو اپنی امت سے تھی، امتِ اجابت سے بھی اور امتِ دعوت سے بھی، جب خود کشی پر آمادہ امت کو آپ نجات اور فلاح کی طرف پوری دلسوزی اور محبت کے ساتھ بلاتے اور وہی امت جواب میں عناد، انکار، تکبر اور استہزاء کا رویّہ اختیار کرتی، گالم گلوچ اور ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہ آتی تو آپ کا صاف شفاف دل حزن والم سے بھر جاتا، آپ اپنے اللہ ہی سے سوال کرتے، یا رب! میں ان سے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں مانگتا، انہی کا بھلا چاہتا ہوں، پھر یہ کیوں نہیں سمجھتے؟ جواب دیا جاتا، اور بار بار دیا جاتا اے میرے حبیب! نہ آپ پہلے پیغمبر ہیں اور نہ ہی یہ پہلی قوم ہے جس نے کفر اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا

آپ سے پہلے کئی انبیاء آ چکے ان سب کا مذاق اڑایا گیا، ان میں سے ایک ایک کی دل آزاری کی گئی۔

﴿۱۲﴾...... ہوتا یہ ہے کہ گناہوں اور جرائم سے اپنے قلوب سیاہ کر دینے والی قوموں اور افراد کے دلوں میں کفر و استہزاء داخل کر دیا جاتا ہے {۱۷} پھر انہیں اپنا ہر عمل اور ہر حرکت بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے حتّٰی کہ اپنی ہلاکت اور بربادی بھی!

﴿۱۳﴾......اللہ کی جو سنّت گزشتہ اقوام کے سرکشوں بارے رہی وہ ان کے بارے بھی ہے، نہ اُنہیں ایمان لانے کی توفیق ملی نہ انہیں ملے گی، اُن کا مقدّر بھی ہلاکت تھا اِن کا مقدّر بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں، پہلے انبیاء اور اہلِ ایمان کو بھی اللہ نے بچالیا تھا اور غیبی نصرت ان کے ہمسفر رہی تھی، خاتم الانبیاء ﷺ اور ان کے ماننے والوں کو بھی بچالیا جائے گا اور فتح ان کا مقدّر ٹھہرے گی۔

﴿۱۴-۱۵﴾...... اگر بالفرض ان معاندین کے لیے آسمان میں دروازہ کھول دیا جائے اور یہ دن کی روشنی میں آسمانوں پر چڑھ جائیں {۱۸} اور عالمِ بالا کے عجائب اور اسرار اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں یا فرشتوں کو اترتے چڑھتے دیکھ لیں {۱۹} تو بھی یہ ایمان لانے کے نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی اعتراض اور اشکال پیدا کر ہی لیں گے، مثلاً کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی، جو کچھ ہمیں دکھایا گیا وہ سحر اور تخیل کے سوا کچھ نہ تھا، سورۂ انعام میں ہے:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ {۲۰}

"اگر ہم ان پر کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب نازل کرتے اور یہ اسے ہاتھوں سے چھو لیتے تو کافر لوگ پھر بھی یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو کے علاوہ کچھ نہیں۔"

حکمت و ہدایت:

۱......قرآنِ کریم کے بہت سارے ناموں میں سے ایک "الذکر" {۲۱} بھی ہے جس کا لفظی معنیٰ نصیحت بھی ہے اور یاد کرنا بھی، اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو کثرت سے اپنے ذکر کا حکم دیا ہے، ذکر دل سے بھی ہوتا ہے اور زبان

{۱۷} "كذلك نسلكه" اى الضلال والكفر والاستهزاء والشرك (قرطبی ۱۰/۱۰)

{۱۸} لاتقول العرب ظل يظل الالكل عمل عمل بالنهار (كبير۷، ۱۹/۱۲۸) "فظلّوا" لأن الظلول انّمايكون نهارًا (تفسير قاسمی ۱۰/۵۱)

{۱۹} أو تصعد الملائكة وهم يشاهدونهم (بيضاوی ۳/۳۶۴) "يعرجون" والمعنى انه تعالىٰ لوجعل هؤلاء الكفار بحيث يروا أبوابًا من السماء مفتوحة وتصعد منها الملائكة وتنزل (كبير۷، ۱۹/۱۲۸)

{۲۰} (الانعام ۶/۷)

{۲۱} (الذكر: هوالقرآن (تفسير المراغی ۱۴/۷)

سے بھی، لسانی ذکر کی مختلف صورتیں ہیں، ان میں سے بہترین ذکر قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس میں تدبر ہے،
ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿من شغله القرآن عن ذكري و مسئلتي اعطيته افضل مااعطي السائلين و فضل كلام الله على سائر الكلام كفضل الله على خلقه﴾{۲۲}

''جسے قرآن کی مشغولیت میرے ذکر اور دعا کی فرصت نہ دے میں اسے سارے مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ کے کلام کو باقی کلاموں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو اللہ کو اپنی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔''

۲......پیامِ نبوت کی تبلیغ میں ہمارے آقا ﷺ کو بے پناہ ستایا گیا حتّٰی کہ مجنون اور دیوانہ بھی کہا گیا۔(۶)

۳......معجزات کا دکھانا کوئی کھیل نہیں کہ ہر کس وناکس کی فرمائش پر دکھا دیئے جائیں۔(۷)

۴......قرآنِ کریم میں ان لوگوں کی بار بار تردید کی گئی ہے جو اس سچے انسان سے خوارق اور معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں جس کی حقانیت پر واضح دلائل قائم ہو چکے ہیں۔(۷)

۵......صداقت کے دلائل واضح ہو جانے کے بعد معجزات کا مطالبہ کٹ حجتی کے سوا کچھ نہیں، اسی لیے ایسے لوگ اکثر ایمان سے محروم ہی رہے ہیں، ایمان انہی کو نصیب ہوا جن کے دل میں سچی طلب تھی۔

۶......انسانوں کے لیے انسانوں ہی کو نبی بنا کر بھیجا جاتا ہے، انبیاء کے حق میں گواہی دینے کے لیے فرشتوں کو بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

۷......اللہ کے نبیوں اور سچے بندوں کو جھٹلانا اور ان کا مذاق اڑانا اوباش انسانوں کی قدیم عادت ہے۔(۱۱)

۸......بعض بدنصیبوں کے دل میں کفر وضلال پیوست ہو کر رہ جاتا ہے پھر انہیں قبولِ ایمان کی توفیق نہیں ہوتی۔(۱۲)

۹......جن لوگوں کے دل سخت ہو جائیں، وہ اگر عالمِ بالا، جنّت، دوزخ فرشتوں حتّٰی کہ باری تعالیٰ کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو بھی وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔(۱۴-۱۵)

اللہ کی قدرت کے چند مظاہر

﴿۱۶......۲۵﴾

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ

اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں O اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان

{۲۲}(الدارمی، فضائل القرآن/۶)

رَجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا

مردود سے O مگر جو چوری سے سن بھاگا سو اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا O اور زمین کو ہم نے پھیلایا

وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا

اور رکھ دیے اس پر بوجھ (پہاڑ) اور اگائی اس میں ہر چیز اندازے سے O اور بنا دیے تمہارے واسطے

مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ

اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں جن کو تم روزی نہیں دیتے O اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور اتارتے ہیں ہم اندازہ

اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ

معین پر (ٹھہرے ہوئے اندازہ پر) O اور چلائیں ہم نے ہوائیں رس بھری (بوجھل کرنے والی ابر کی) پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو

وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا

وہ پلایا، اور تمہارے پاس نہیں اس کا خزانہ O اور ہم ہی ہیں جلانے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے O اور ہم نے جان رکھا ہے

الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ

آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو O اور تیرا رب وہی اکٹھا کر لائے گا ان کو

اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار O

ربط: معاندین کے کفر و عناد کے بعد ارض و سما، جمادات اور نباتات، ہواؤں اور حیوانات میں بکھرے ہوئے قدرتِ باری تعالیٰ کے چند مظاہر بیان کیے گئے ہیں۔

تسہیل: اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور اسے دیکھنے والوں کے لیے ستاروں سے مزیّن کیا ہے O اور ہم نے اسے ہر شیطان مردود سے محفوظ کر دیا ہے O لیکن اگر کوئی چوری چھپے کوئی بات سن کر بھاگے تو دہکتا ہوا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے O اور زمین کو بھی ہم ہی نے پھیلایا اور اس پر بھاری پہاڑ رکھ دیئے اور ہم نے اس میں ہر چیز خاص اندازے سے اگائی O اور ہم نے اس میں معاش کے اسباب تمہارے لیے پیدا کیے اور ان کے لیے بھی جنہیں تم روزی نہیں دے سکتے ہو O اس کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں ہمارے پاس ان کے بے شمار خزانے ہیں لیکن ہم ان میں سے معین مقدار ہی عطا کرتے ہیں O اور ہم ہی وہ ہوائیں بھیجتے ہیں جو بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتی ہیں، پھر ہم ان بادلوں سے پانی برساتے ہیں جس سے تمہیں سیراب کرتے ہیں اور ہمیشہ کی ضروریات کے لیے اس پانی کو جمع کرنا تمہارے بس میں نہ تھا O اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور صرف ہم ہی سب کے وارث بنیں گے O

اور یقیناً ہم اگلوں کو بھی خوب جانتے ہیں اور بعد میں آنے والوں کو بھی خوب جانتے ہیںO اور بے شک تیرا رب ہی ہے جو اگلوں اور پچھلوں کو قیامت کے دن جمع کر دے گا یقیناً وہ علم اور حکمت والا ہےO

تفسیر

﴿۱۶﴾...... ''اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں'' بروج کا اطلاق محلات اور منازل پر ہوتا ہے لغت میں ''بروج'' ظہور کے معنی میں آتا ہے، سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ میں ازواجِ مطہرات کے لیے حکم ہے:

﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ {۲۳} ''اور جاہلیت کے دور کی طرح زیبائش و آرائش کا مظاہرہ نہ کرو۔''

یہاں ''بروج'' سے مراد بڑے ستارے ہیں یعنی شمس وقمر اور دوسرے ستاروں کی منزلیں جو کہ بارہ ہیں، ماہرینِ فلکیات کا خیال ہے کہ ان میں سے ہر برج کی ہیئت اور خصوصیت جدا جدا ہے، ان بارہ برجوں کے نام درجِ ذیل ہیں: حمل، ثور، جوزاء، سرطان، اسد، سنبلة، میزان، عقرب، قوس، جدّی، دلو اور حوت۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب ستاروں کے مواقع کی معرفت کو علومِ عظیمہ میں سے شمار کرتے تھے اور ان کے طلوع و غروب، مقامات اور رفتار سے راستوں، اوقات اور خوشحالی اور قحط سالی پر استدلال کرتے تھے۔

حمل اور عقرب کو مریخ کا، ثور اور میزان کو زھرہ کا، جوزاء اور سنبلة کو عطارد کا، سرطان اور اسد کو سورج کا، قوس اور حوت کو مشتری کا اور جدی اور دلو کو زحل کا برج قرار دیا جاتا تھا، آج کے ستارہ شناسوں کا بھی یہی خیال ہے، ستاروں کی چال سے شناسائی کا دعوٰی کرنے والے مستقبل کے بارے پیشگوئیاں بھی کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی قسمت کا حال بھی بتاتے ہیں، ظاہر ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا نہ صرف شریعت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بسا اوقات یہ دعوے کتاب وسنت کے نصوص سے ٹکراتے اور عقائد میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

قرآن، ستاروں اور سیاروں اور دوسری مخلوقات کا ذکر عظمتِ باری تعالیٰ کے بیان کے لیے کرتا ہے۔ سائنسی تحقیقات اس کا اصل موضوع ہرگز نہیں البتہ اگر ضمناً کوئی چیز ثابت ہوجائے تو اس سے خواہ مخواہ انکار بھی مناسب نہیں، ان لوگوں کا نقطۂ نظر صحیح نہیں جو تحقیق اور دریافت کے نام پر اٹھنے والی ہر آواز کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں اور بظاہر ایمانی جذبے سے لیکن حقیقت میں سادگی سے ہر چیز کے بارے فوراً یہ دعوٰی کر دیتے ہیں کہ یہ تحقیق تو قرآن میں صدیوں سے مذکور ہے، اس طرح ان دوستوں کی سوچ بھی حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے جو تفسیر

{۲۳}(الاحزاب ۳۳/۳۳)

کے ضمن میں کسی بھی سائنسی تحقیق اور ایجاد کے ذکر کو جھٹ سے تفسیر بالرائے قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، اگر سائنس خود آگے بڑھ کر قرآنی حقائق کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے تو ہمیں انکار کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار انسانوں کا ایمان اس تصدیق سے مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

﴿وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ﴾ اللہ نے صرف آسمان نہیں بنایا بلکہ اسے دیکھنے والوں کے لیے ستاروں سے ایسا مزین فرمایا ہے کہ وہ جب شب کی تاریکی میں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں حسن و جمال کی جگمگ کرتی بیکراں کہکشاں اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے، یہی حال ساری کائنات کا ہے، جدھر نگاہ ڈالیں تخلیق اور حسن و جمال لازم و ملزوم دکھائی دیتے ہیں، سورۂ صافات میں بھی آسمانوں کی تزئین کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا گیا:

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨ الْكَوَاكِبِ﴾ {۲۴} ”ہم نے آسمانِ دنیا کو تاروں سے رونق بخشی۔“

﴿۱۷﴾...... سرکش شیطانوں سے آسمانوں کی حفاظت کا خاص انتظام کیا گیا ہے، باقی رہیں اس انتظام کی تفصیلات تو ان کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں اور نہ ہی ہم اس کے جاننے کے مکلف ہیں، کچھ چیزیں غیب میں بھی تو رہنی چاہئیں اور جسے اللہ ہی غیب رکھنا چاہے کس کی طاقت ہے کہ اس کی حقیقت کھول سکے؟

﴿۱۸﴾...... اگر بالفرض کوئی شیطان چوری چھپے کوئی خبر سن کر بھاگے تو دہکتا ہوا شعلہ اس کا تعاقب کر کے اسے جلا کر راکھ کر دیتا ہے، سورۂ ملک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ {۲۵} ”ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور انہیں شیطان کی مار کا ذریعہ بنایا۔“

سورۂ جن میں ہے:

﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۚ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا﴾ {۲۶} ”اور پہلے ہم بہت سے مقامات پر خبریں سننے کے لیے بیٹھتے تھے لیکن اب کوئی سننے کی کوشش کرے تو اپنے لیے شعلہ تیار پاتا ہے۔“

آسمان، شیطانوں کی رسائی اور جاسوسی سے اپنی تخلیق کی ابتداء ہی سے محفوظ رہے ہیں یا بعد میں انہیں محفوظ کیا گیا؟ شہابِ ثاقب کیا ہے؟ شیطان کے تعاقب کی صورت کیا ہوتی ہے؟ پھر وہ شہاب کے لگنے سے صرف زخمی ہوتا

{۲۴}(الصافات ۳۷/۶)
{۲۵}(الملک ۶۷/۵)
{۲۶} (الجن ۷۲/۹)

ہے یا ہلاک ہوجاتا ہے؟ آسمانی خبروں کی جاسوسی کرنے والے شیطانوں کو مار بھگانے کا سلسلہ سرورِ دو عالم ﷺ کی ولادت و بعثت سے پہلے بھی تھا یا آپ کی ولادت سے اس کا آغاز ہوا؟ یہ سب اقوال تفسیروں میں مذکور ہیں اور وجہِ اختلاف وہ روایات ہیں جو ان آیات کی تشریح کے طور پر منقول ہیں۔

ہماری ناقص رائے اس بارے میں وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں یعنی شیاطین کا وجود، آسمانوں سے خبریں چرانے کی ان کی ناروا کوشش، شہابِ ثاقب اور اس کی ضرب، یہ سب چیزیں عالمِ غیب سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی حقیقت جاننے کے ہم قطعاً مکلّف نہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی چیز کے جاننے یا نہ جاننے سے ایمان کی کمی بیشی کا تعلق ہے، اور اس قسم کے جو بھی امور ہیں ان کی تحقیق میں پڑنے سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے اور انسان اس زندگی کے عملی معاملات سے دور ہو کر محض عقلی گھوڑے دوڑانے لگتا ہے اور وہ کوئی نئی حقیقت اور کوئی نیا علم بھی نہیں پا سکتا۔

ہم نے جس قدر جانا ہے وہ یہی ہے کہ شیطان کا عمل دخل آسمانوں میں نہیں ہے، اس وسیع کائنات کا یہ حسن و جمال اور حرکت و فعالیت شیطان کی دسترس سے محفوظ ہے، اس کائنات کے امور میں شیطانی قوتوں کی طرف سے جو دخل اندازی ہوتی ہے یا دخل اندازی کی جو کوشش ہوتی ہے، اس موقع پر شیطانی قوتوں کو مار بھگایا جاتا ہے اور شہابِ ثاقب کی وجہ سے ان کے عزائم رک جاتے ہیں۔'' {۲۷}

﴿۱۹﴾......زمین کو پیدا کرنا، اسے پھیلانا، اس کے سینے میں نہ ختم ہونے والے خزانوں کا رکھنا، اس سے استفادہ آسان کرنا، اسے ڈانواں ڈول ہونے سے بچانے کے لیے میخوں کا گاڑھ دینا، پھر انسانوں اور حیوانوں کی ضروریات کے لیے اس سے ہر قسم کی نباتات کا اُگا دینا، یہ سب کام قدیر و حکیم رب کے ہیں، نہ تو یہ سب کچھ خود بخود وجود میں آ گیا ہے اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی خود ساختہ معبود کا عمل ہے۔

﴿۲۰﴾......زندگی گزارنے کے لیے جن غذاؤں، دواؤں، ملبوسات اور اسبابِ کی ضرورت ہے وہ سب ہم نے فراہم کیے ہیں، نہ صرف تمہارے لیے بلکہ ان درندوں، پرندوں، حشرات اور برّی بحری فضائی حیوانات کے لیے بھی جن کی ضروریات کے مطابق روزی پہنچانا تمہارے بس میں نہیں، تمہارے گھر میں چند روز کے لیے آٹھ دس مہمان آ جائیں تو پریشان ہو جاتے ہو اگر کروڑوں کی تعداد میں سمندروں، جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والی مخلوق کو غذائی ضروریات فراہم کرنا تمہارے ذمہ لگا دیا جاتا تو کیا بنتا؟

{۲۷}(فی ظلال القرآن ۴/۲۲۷)

﴿۲۱﴾......کائنات کی تخلیق کی ابتداء سے تمہارے شمار میں نہ آنے والی مخلوق کو اپنے قانونِ ربوبیت کے تحت ہم پال رہے ہیں مگر اسبابِ حیات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، کمی کیسے واقع ہو سکتی ہے جبکہ ہمارے پاس معدنیات، نباتات اور مخلوقات کے غیر محدود خزانے ہیں اور ہم مزید خزانے پیدا کرنے پر بھی قادر ہیں لیکن یہ خزانے ہم بیک وقت ظاہر نہیں کرتے کیونکہ اگر صدیوں کی ضروریات ہم یکایک ظاہر کر دیں تو انہیں سنبھالنا انسان کے بس میں نہیں ہوگا، دوسرا غذائی مواد تو الگ رہا اگر وہ سارا پانی ہی ایک سال میں برسا دیا جائے جس کی حیوانوں اور انسانوں کی سیرابی اور زمین کی کاشت کے لیے دو چار سو سال میں ضرورت پڑ سکتی ہے تو دنیا کے سارے شہر اور ویرانے زیرِ آب آ جائیں اور کوئی ذی روح چیز زندہ نہ بچے۔

﴿وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ ہم جو کچھ اتارتے ہیں وہ حکمت اور مصلحت کے تحت معین مقدار ہی سے اتارتے ہیں۔

﴿۲۲﴾......چونکہ تم نہ تو بارش برسا سکتے ہو نہ خشک چشمے جاری کر سکتے ہو نہ ہمیشہ کی ضروریات کے لیے پانی ذخیرہ کر سکتے ہو اس لیے یہ پورا انظام ہم نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، وہ ہوائیں جو اپنے دوش پر ہزاروں لاکھوں ٹن پانی لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف چلتی ہیں، ان ہواؤں کو ہم چلاتے ہیں۔

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾{۲۸}

''اور وہی ہے جو اپنی رحمت سے پہلے خوشخبری کے لیے ہوائیں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو ایک مردہ بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر اس پانی سے ہر طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں۔''

ان ہواؤں سے درختوں کو بار آور کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نر پودوں کا دانہ مادہ پودوں کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے جبکہ اس انتقال کے بغیر مادہ پودے پھل نہیں دیتے، یونہی ہوا کے ذریعے ان پودوں کو گرد و غبار سے صاف کر دیا جاتا ہے تاکہ غذا ان کے مسام تک پہنچ جائے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿الریاح لواقح للشجر والسحاب﴾{۲۹}

پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو اٹھانے کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے ان سے بارش برسانے کا، یہ مرحلہ بھی ہمارے

{۲۸}(الاعراف ۷/۵۷)

{۲۹}(التفسیر المنیر ۱۴/۲۵)

حکم کے بغیر طے نہیں ہوسکتا، سورۂ واقعہ میں ہے:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ۞ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۞ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۞﴾ {۳۰}

''جو پانی تم پیتے ہو، بتاؤ تو سہی! وہ پانی بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ ہم چاہیں تو اس کو کھارا کردیں، تو تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟۔''

ہم جہاں چاہتے ہیں جتنی چاہتے ہیں بارش برسا دیتے ہیں، جس سے تم بھی سیراب ہوتے ہو، جانور اور پودے بھی سیراب ہوتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ﴾ {۳۱}

''وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارا جسے تم پیتے ہو، اور اسی پانی سے وہ درخت بھی اگتے ہیں جس میں تم جانور چراتے ہو۔''

﴿وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ﴾ اگر تم کوشش بھی کر دیکھو تو سالہا سال بلکہ سال بھر کی انسانی، حیوانی اور نباتاتی ضروریات کے لیے پانی اسٹور کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں، نہ اتنے بڑے ڈیم بنا سکتے ہو نہ ٹینک۔

آسمان سے جو پانی برستا ہے اس میں سے کچھ ہم زمین کے سوتوں میں داخل کردیتے ہیں تاکہ تم حسب ضرورت نکال کر استعمال کرتے رہو اور کچھ بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں جما دیتے ہیں، موسم بدلنے سے یہ برف پگھلتی ہے اور چشمے رواں ہوجاتے ہیں، چشموں سے نہروں اور نہروں سے دریاؤں میں پانی آجاتا ہے، بلند و بالا چوٹیوں پر برف گرانے اور جمانے کا اہتمام اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ طویل مدت گزرنے کے باوجود پانی کا معیار متاثر نہ ہو اور یہ برف گرد و غبار اور زمینی آلودگی سے محفوظ رہے...... انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی اور کارکنانِ قضا و قدر اس کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت مصروفِ عمل ہوتے ہیں۔

﴿۲۳﴾...... ''ہوا بارش وغیرہ کے انتظامات کے علاوہ زندگی اور موت بھی تمام تر ہمارے ہاتھ ہی میں ہے، نہ کوئی وشنو جی ہیں زندگی بخشنے والے اور قائم رکھنے والے اور نہ کوئی شیو جی ہیں ہلاک کرنے والے اور عمل فناطاری کرنے والے۔'' {۳۲}

﴿وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ سب فنا ہوجائیں گے مگر ہم باقی رہیں گے۔

{۳۰} (الواقعۃ ۶۸/۵۶-۷۰)
{۳۱} (النحل ۱۰/۱۶)
{۳۲} (تفسیر ماجدی ۵۳۵/۲)

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ {۳۳} ''ہر چیز فنا ہو جائے گی مگر اس کی ذات باقی رہے گی۔''

سارے انسانوں، سارے خزانوں اور سارے جانداروں کے وارث صرف ہم ہی ہوں گے۔

﴿۲۴﴾......کمالِ قدرت کے علاوہ کمالِ علم بھی صرف ہمارے لیے ہی ثابت ہے، ان لوگوں کو بھی ہم ہی جانتے ہیں جو آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک پیدا ہو کر مر گئے یا زندہ ہیں {۳۴} اور ان لوگوں کو بھی ہم ہی جانتے ہیں جو قیامت تک پیدا ہوں گے، نہ صرف ان کی ذات کو بلکہ ان کی صفات اور حالات و جذبات کو بھی ہم ہی جانتے ہیں۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ ''الْمُسْتَقْدِمِينَ'' (اگلوں) سے مراد نیکیوں میں سبقت لے جانے والے اور ''الْمُسْتَأْخِرِينَ'' (پچھلوں) سے مراد نیکیوں میں پیچھے رہ جانے والے ہیں۔ {۳۵}

﴿۲۵﴾......وہی اللہ جس نے انسانوں کے لیے آسمان کی محفوظ اور مزین چھت بنائی، جس نے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں اسبابِ معیشت رکھے، جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی کا نظام ہے اور جو اگلوں اور پچھلوں کو جانتا ہے وہی قیامت کے دن حساب کتاب کے لیے سب کو جمع کر دے گا تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے۔

حکمت و ہدایت:

۱......ستاروں اور برجوں کی تخلیق، زمین کے پھیلاؤ، پہاڑوں کے جماؤ، نباتات کی روئیدگی، اسبابِ رزق کی فراوانی، ہواؤں کے چلنے، بارش کے برسنے اور موت و حیات کے نظام میں اربابِ فکر و نظر کے لیے توحیدِ باری تعالیٰ کے دلائل ہیں۔ (۱۶)

۲......ساری کائنات کا خالق اور مالک اللہ ہے اور اس کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں لیکن وہ ان خزانوں میں سے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت معین مقدار میں نازل فرماتا ہے اس لیے کہ اگر وہ بہت زیادہ نازل فرمادے تو انسان سنبھال نہیں سکتا (۲۱) یوں بھی انسان ظلوم اور جھول ہے، رزق کی فراوانی کی صورت میں اس کے سرکشی پر اتر آنے کا امکان ہے، سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ﴾ {۳۶}

''اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق میں وسعت فرمادیتا تو وہ زمین میں فساد کرنے لگتے، وہ جس قدر چاہتا ہے اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے۔''

{۳۳} (القصص ۲۸/۸۸)
{۳۴} ای من استقدم ولادۃً وموتاً (کشاف ۲/۵۳۸)
{۳۵} ''المستقدمین'' یرید أھل طاعة اللہ تعالیٰ ''والمستاخرین'' یرید المتخلفین عن طاعة اللہ تعالیٰ (کبیر ۷، ۱۹/۱۳۶)
{۳۶} (الشوریٰ ۴۲/۲۷)

۳......اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے، بارش برستی ہے تو سبزہ پیدا ہوتا ہے، ہوائیں چلتی ہیں تو نر پودے مادہ پودوں کو بار آور کرتے ہیں، وہ بار آور ہوتے ہیں تو انسانوں کو نوع بنوع پھل میسر آتے ہیں۔ (۲۳)

۴......نیکی کے کام میں پیش پیش رہنے والوں کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے (۲۴) فقہاء نے نماز اور قتال کی پہلی صف کا اہتمام کرنے والوں کی فضیلت اس آیتِ کریمہ سے ثابت کی ہے اور احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اگر لوگوں کو اذان اور صفِ اوّل کی فضیلت معلوم ہو جائے تو پھر پہلی صف کے لیے ان کے درمیان ایسی کشمکش ہوگی کہ وہ قرعہ اندازی کیا کریں گے۔'' {۳۷}

میدانِ جنگ میں پہلی صف کی فضیلت کی وجہ سے ہمارے آقا ﷺ سب سے آگے ہوتے تھے، صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ آپ انسانوں میں سب سے زیادہ بہادر تھے اور جب جنگ شدّت اختیار کر جاتی تو ہم آپ کے قرب کو اپنے بچاؤ کا سبب سمجھتے اور جو شخص آپ کے ساتھ ہوتا تھا اسے بہادر سمجھا جاتا تھا۔ {۳۸}

انکارِ سجدہ کا انجام

﴿۲۶......۴۴﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھناتے (بجنے والی مٹی سے) سنے (جو بنی ہے سڑے ہوئے گارے سے) ہوئے گارے سے O اور جان (جنوں کو)

مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ

بنایا ہم نے اس سے پہلے لو کی آگ سے O اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو، میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھناتے

صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۸﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

سنے ہوئے گارے سے O پھر جب ٹھیک کروں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے O

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ إِلَّآ إِبْلِيْسَ ۭ أَبٰٓى أَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓإِبْلِيْسُ

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے مل کر O مگر ابلیس نے نہ مانا کہ ساتھ ہو سجدہ کرنے والوں کے O فرمایا، اے ابلیس!

مَا لَكَ أَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ أَكُنْ لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ

کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا سجدہ کرنے والوں کے؟ O بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کروں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا کھنکھناتے

{۳۷} (بخاری ۱، کتاب الاذان/۸۶، مسلم ۱، کتاب الصلاۃ/۱۸۲)

{۳۸} (التفسیر المنیر ۱۴/۲۷-۲۸)

حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى

سنے ہوئے گارے سے O فرمایا تو تو نکل یہاں سے، تجھ پر مار ہے O اور تجھ پر پھٹکار ہے اس دن تک

يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾

کہ انصاف ہو O بولا، اے رب! تو مجھ کو ڈھیل دے اس دن تک کہ مردے زندہ ہوں O فرمایا تو تجھ کو ڈھیل دی O

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

اسی مقرر وقت کے دن تک O بولا، اے رب! جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھو دیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین میں

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ

اور راہ سے کھو دوں گا ان سب کو O مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں O فرمایا یہ راہ ہے

عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ

مجھ تک سیدھی O جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا

مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ

بہکے ہوؤں میں O اور دوزخ پر وعدہ ہے ان سب کا O اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازہ کے

بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

واسطے ان میں سے ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا O

ربط: اللہ تعالیٰ کے وجود، قدرت اور توحید کے سابقہ مذکورہ دلائل کی طرح انسان کی تخلیق بھی ایک واضح دلیل ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ بات قطعی دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ اس دنیا میں ہر حادثے، واقعے اور مخلوق کی کوئی نہ کوئی ابتداء ضرور ہے، یہی اصولِ تخلیق انسان پر بھی صادق آتا ہے، آج ہمیں جو کاروانِ انسانی نظر آتا ہے یقیناً اس کاروان کا کوئی نہ کوئی پہلا فرد بھی ضرور ہوگا، اس پہلے فرد کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ ماں باپ کے بغیر پیدا ہوا تھا تو لامحالہ اسے اللہ نے براہِ راست اپنے حکم سے پیدا کیا ہوگا۔

تسہیل: یقیناً ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا تھا O اور اس سے پہلے جنات کو ہم شدید تپش والی آگ سے پیدا کر چکے تھے O اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں O سو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ میں گر جانا O چنانچہ سارے فرشتے انسان کے سامنے یکبار سجدے میں

گر پڑے O سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا O اللہ نے فرمایا، اے ابلیس! کیا وجہ تھی کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ O ابلیس نے جواب دیا کہ میرے لیے مناسب نہ تھا کہ میں ایسے بشر کے سامنے سجدہ کرتا جسے تو نے بدبودار گارے کی بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے O اللہ نے فرمایا، تو یہاں سے نکل جا کیونکہ تو مردود ہو گیا ہے O اور تجھ پر جزا کے دن تک لعنت برستی رہے گی O ابلیس نے کہا، اے میرے رب! مجھے حشر کے دن تک مہلت دے دے O اللہ نے فرمایا ٹھیک ہے میں نے تجھے مہلت دے دی ہے O وقتِ معلوم کے دن تک O ابلیس نے کہا، اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں دنیا میں انسانوں کے سامنے گناہوں کو مزیّن کر کے پیش کروں گا اور ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا O سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو اپنی اطاعت کے لیے منتخب کرلے گا O اللہ نے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والا ہے O بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تمہارا کوئی داؤ بھی نہیں چلے گا البتہ بہکے ہوئے لوگ، جو تیری اتباع کریں گے، صرف وہی گمراہ ہوں گے O بے شک جہنّم ان سب کے وعدہ کی جگہ ہے O اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لیے ان اتباع کرنے والوں کا ایک متعین حصہ ہے O

تفسیر

﴿۲۶﴾ ...... اس آیت کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے تحقیق اور تطبیق ضروری ہے، تحقیق لغت کے اعتبار سے ان الفاظ کی جو یہاں مذکور ہیں اور تطبیق ان مختلف آیات کے درمیان جن میں سے کسی میں "مِنْ طِيْنٍ" آیا ہے، کسی میں "مِنْ تُرَابٍ" اور کسی میں "مِنْ صَلْصَالٍ"...... تو جان لیجیے کہ "طِيْن" ایسی مٹی کو کہا جاتا ہے جس میں پانی ملا کر اسے گارا نما بنا دیا جائے، اگرچہ پانی کا اثر اس سے زائل ہی کیوں نہ ہو جائے، ایسی مٹی دیواروں وغیرہ کے لیپنے میں کام آتی ہے۔ "تُرَاب" کا اطلاق خالص مٹی پر ہوتا ہے، جس میں کسی بھی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ "صَلْصَال" کے اصل معنی ہیں "کسی خشک چیز سے آواز کا آنا" اور جب اس کی نسبت "مٹی" کی طرف کی جاتی ہے تو اس سے کھنکنے والی خشک مٹی مراد ہوتی ہے۔

انسان کی تخلیق کے نقطۂ آغاز کے لیے "تُرَاب" کا مادہ منتخب ہوا۔ پھر پانی کی آمیزش سے اسے "طِيْن" میں تبدیل کیا گیا اور آخر میں "صَلْصَال" کی صورت میں اس مادہ کو ٹھوس کر کے اس کا مجسمہ تیار کیا گیا، پھر اس میں روح پھونکی گئی اور اسے زمینی ماحول کی مناسبت سے مختلف صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا گیا۔ قرآن مختلف مقامات پر یہ مختلف

الفاظ استعمال فرما کر انسان کو اس کی اصل حقیقت باور کرانا چاہتا ہے تاکہ یہ ''تودۂ خاک'' اپنی اصلیت کو سامنے رکھے اور غرور وتکبر سے باز رہے۔

آسمانی کتابوں میں سے طرزِ ادا کا یہ کمال صرف قرآن کو حاصل ہے کہ اس کی تعبیر بھی نہایت لطیف ودقیق ہوتی ہے اور الفاظ کا حسن بھی اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے، پھر دلچسپ امر یہ کہ الفاظ کی خوبصورتی مفہوم کو متاثر نہیں کرتی اور مفہوم کی عمدہ ادائیگی سے اس کا فنی کمال نہیں دھندلاتا...... اللہ فرماتے ہیں: ''انسان کا مادۂ تخلیق بدبودار سیاہ مادہ ہے۔''

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ {۳۹} ''اللہ نے انسان کو خشک مٹی سے پیدا کیا جو ٹھیکری کی طرح کھنکھنانے والی ہے۔''

انسانی فطرت میں پائی جانے والی مختلف صفات مثلاً سختی، نرمی، نیز مزاجوں کا اختلاف وغیرہ، یہ سب کچھ اس کے خمیر سے اسے ودیعت ہوا ہے۔

شاہکارِ قدرت:

انتہائی کمزور مادہ سے جنم لینے والا مگر خوبصورت نقش ونگار کا مالک انسان اللہ کی قدرت کے کتنے دلائل اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے؟ تھوڑی سی جھلک اس کی بھی ملاحظہ فرمائیے:

انسانی جسم چھوٹے چھوٹے خلیات سے مرکب ہے اور ایک اوسط قد وقامت کے انسانی جسم میں یہ خلیات ایک کروڑ ارب کے قریب ہوتے ہیں، یہ اربوں کھربوں خلیے ایک ہی خلیے سے بنتے ہیں، روزانہ کروڑوں خلیے ختم ہوتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے بنتے ہیں، ایک اندازہ کے مطابق صرف ایک سیکنڈ میں خون کے ایک لاکھ خلیے ختم بھی ہوتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے جنم بھی لیتے ہیں، بعض خلیے اس قدر نازک ہوتے ہیں کہ ان کی جسامت ''ملی میٹر'' کے دس لاکھ ویں حصے کے برابر ہوتی ہے، انسانی جسامت اور اس کے چہرے کے نقش ونگار...... ایک بچے تک یہ اثرات اس کے کئی پشتوں کے ''جینز'' لاتے ہیں۔

مرد کے مادۂ تولید کے ایک مکعب سینٹی میٹر میں ڈھائی کروڑ حیوانات منویہ ہوتے ہیں اور عام حالات میں ایک اخراج میں کئی مکعب سینٹی میٹر کے بقدر مادہ خارج ہوتا ہے، جس میں ماہرین کے اندازہ کے مطابق پچاس کروڑ حیواناتِ منویہ موجود ہوتے ہیں، ان نصف ارب جرثوموں میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک انسان بن جانے کی

{۳۹} (الرحمٰن ۵۵/۱۴)

صلاحیت رکھتا ہے لیکن صرف ایک جرثومہ عورت کے بیضہ میں نفوذ پا کر انسان کی تخلیق کا سبب بنتا ہے، اسی طرح ہر بالغ عورت کے مخصوص حصّے میں چار لاکھ ناپختہ انڈے ہوتے ہیں مگر ان میں سے صرف ایک انڈا پختہ ہو کر اپنے مقررہ وقت پر نمودار ہوتا ہے۔

انسانی دماغ میں 25 ارب سے زیادہ نیوٹرون پائے جاتے ہیں جو مسلسل اپنا کام کرتے رہتے ہیں، حتّٰی کہ نیند کے دوران بھی ان کا عمل جاری رہتا ہے، ان نیوٹرون کا تقابل اگر ساری دنیا کے ٹیلی فون نظام سے کیا جائے تو پوری دنیا کا ٹیلی فونک سسٹم ان کے برابر کام نہیں کر سکتا۔

انسانی دل نصف پونڈ کے برابر ہوتا ہے لیکن اس میں دو پمپ نصب ہوتے ہیں، ایک پمپ کے ذریعے پھیپھڑوں کو خون کی ترسیل ہوتی ہے اور دوسرا پمپ صاف شدہ خون کو سارے جسم میں رواں دواں رکھنے کا عمل انجام دیتا ہے۔

ایک آدمی کی اوسط زندگی میں اس کا دل تین لاکھ ٹن خون پمپ کرتا ہے، اگر کوئی انسان ستر سال تک زندہ رہے تو اس کا دل چار کھرب دفعہ دھڑکتا ہے ایک آدمی کی اوسط زندگی میں پھیپھڑے پچاس کروڑ مرتبہ پھولتے اور سکڑتے ہیں، دنیا کی کوئی مشینری نہ اس قدر مشقت کا تحمل کر سکتی ہے اور نہ ہی گاہے بگاہے مرمت کے بغیر اتنا طویل عرصہ کام کر سکتی ہے، انسانی بدن میں بچھی خون کی شریانوں کو اگر ناپا جائے تو ان کی لمبائی ساٹھ ہزار سے ایک لاکھ میل لمبی ریلوے لائن کے بقدر ہوگی، انسانی آنکھ میں روشنی قبول کرنے والے ریشوں کی تعداد ایک کھرب ہے، یہ بات بھی کس قدر دلچسپ اور قابلِ حیرت ہے کہ یہ ریشے ''ملکی وے'' نامی کہکشاں میں پائے جانے والے ستاروں کے برابر ہیں، اسی طرح انسانی جسم تیس کروڑ کیمیاوی اجزاء پر مشتمل ہے، اگر ان اجزاء کو الفاظ کا روپ دیا جائے تو دس ہزار ضخیم کتابوں کی ایک لائبریری تیار ہو جائے گی۔ {۴۰}

انصاف کی نظر سے ان حقائق کا مطالعہ کرنے اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے بعد بتایئے! کیا دیگر دلائل و حجج سے قطع نظر صرف انسان کا اپنا وجود ہی حق تعالیٰ تک رسائی اور اس کی وحدانیت کے اقرار کے لیے کافی نہیں ہے؟

﴿۲۷﴾...... انسان کے مادۂ تخلیق کے بعد جنات کا مادہ تخلیق بیان کیا جا رہا ہے، اوّل روز سے ہی اللہ نے انسی و جنی فطرت میں ایک خلیج حائل رکھی ہے، جنات کو ایسے لطیف ناری عنصر سے پیدا کیا گیا جو کثافتوں سے پاک تھا، البتہ انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خاکی عنصر کے غلبہ کے باوجود اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک کر اسے اپنا عرفان بھی نصیب فرمایا جبکہ جنات کو عشق و عرفان کا وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو انسان کے لیے مقدّر رہے۔

{۴۰}(سائنسی انکشافات...... قرآن و حدیث کی روشنی میں/ ۵۹-۶۱...... دار الاشاعت کراچی)

﴿الْجَآنَّ﴾ سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے اس بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے ''ابلیس'' مراد ہے اور دوسرا قول جسے اکثر مفسرین نے اختیار کیا، وہ یہ کہ اس کا مصداق جنّات کا ''جدِّ امجد'' ہے۔{۴۱}

﴿۲۸﴾......ایک مرتبہ پھر فرشتوں کے سامنے انسانی ساخت کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ انہیں حکم دے رہا ہے کہ:

﴿۲۹﴾......جب یہ مادۂ خاکی بن کر تیار ہو جائے اور اس میں روحِ انسانی فائض ہو جائے تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔

﴿رُّوْحِیْ﴾ انسان میں پھونکے جانے والی روح کو اللہ کا اپنی طرف منسوب کرنا انسانی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔{۴۲}

﴿۳۰-۳۱﴾......تعمیلِ حکم میں سب فرشتے تعظیمِ آدم میں جھک گئے، سوائے ابلیس کے کہ اس نے انسان کو کمتر اور خود کو اعلیٰ سمجھتے ہوئے حکمِ الٰہی بجالانے سے انکار کر دیا۔{۴۳}

یہاں ایک شبہ کے ازالہ کے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا......شبہ یہ ہے کہ اگر علمی برتری کے سبب حضرت آدم علیہ السلام مسجودِ ملائک بنے تو فخر الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تو مسجودِ ملائک ہونے کے علاوہ مسجودِ خلائق بھی ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ آپ تو منبع العلوم تھے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت پر ملائکہ اور جنّات کو کلام تھا اس لیے سجدہ کی ضرورت پیش آئی جبکہ حضور ﷺ کے علم و فضل اور کمال میں کسی کو کوئی اشکال نہیں، اس لیے سجدہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔{۴۴}

﴿۳۲-۳۳﴾......اللہ نے (باوجود عالم الغیب ہونے کے) سجدہ نہ کرنے کا سبب پوچھا تو متکبرانہ بولا، میرے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ آتشی ہو کر خاکی کے سامنے جھکوں۔

﴿۳۴-۳۵﴾......ابلیس کے متکبرانہ مزاج کا نتیجہ مردودیت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

اب تو راندۂ درگاہ ہو چکا، جنّت{۴۵} جیسے مقامِ رفیع سے نکل جا، قیامت تک ہر لحظہ و ہر آن{۴۶} تجھ پر میری

{۴۱}(عن ابن عباس: یرید ابلیس...... وفی روایۃ اخریٰ: "الجانّ" ھو أب الجن وھو قول الأکثرین (کبیر۷، ۱۳۸/۱۹)

{۴۲} قال المفسرون: وانما أضاف الروح الیہ تعالیٰ علی سبیل التشریف والتکریم (صفوۃ التفاسیر/۱۰۹)

{۴۳} فرشتوں کو انسان کے سامنے سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا، اس کی نوعیت کیا تھی؟ اس پر سورۂ بقرہ، آیت ۳۴ کی تفسیر میں بحث ہو چکی۔(م۔ا۔ش)

{۴۴} (معالم القرآن ۳۵۸/۸...... مولانا محمد علی الصدیقی رحمہ اللہ)

{۴۵} "فاخرج منھا"...... الجنۃ (بیضاوی ۳۶۹/۳)...... قیل من الجنّۃ (نظم الدرر ۲۲۲/۴)

{۴۶} "إلیٰ یوم الدین" المراد منہ التأبید (کبیر۷، ۱۴۱/۱۹)

طرف سے لعنت برستی رہے گی اور تو میری رحمت سے محروم و مہجور رہے گا۔

﴿۳۶-۳۷-۳۸﴾...... چاہیے تو یہ تھا کہ اتنی بڑی محرومی پر ندامت کا اظہار ہوتا، مگر غرور و استکبار کے نشے میں چور ابلیس نے اکڑ دکھا کر مہلت مانگی، سوا سے ایک وقتِ معین تک ڈھیل مل گئی۔

﴿۳۹-۴۰﴾...... ابلیس ملعون بولا کہ اے رب! تو نے مجھے گمراہ کیا اس لیے {۴۷} میں بھی اس مسجودِ ملائک کو بہکانے اور مرغوباتِ دنیا میں لگا کر اسے آخرت سے غافل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کروں گا، البتہ تیرے منتخب و برگزیدہ بندے میری ان فتنہ سامانیوں سے مامون رہیں گے۔

شیطان نے اللہ کی طرف اپنی گمراہی کی جو نسبت کی ہے، اس کو صرف تکوینی حد تک ماننا ہی صحیح ہے، اس سے زیادہ تجاوز اس انتساب میں کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

﴿۴۱-۴۴﴾...... ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ میری توحید اور اعمالِ صالحہ کا راستہ میرا راستہ ہے، جو دارین کی فلاح کا ضامن بھی ہے اور شفاف بھی!

اخلاص و عبودیت کی دولت سے مالا مال میرے بندوں پر تیری کوئی دسترس نہ ہوگی، وہ تیرے دامِ فریب میں کبھی نہ آئیں گے، سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مذکور ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ {۴۸}

”نہیں زور چلتا اس (شیطان) کا ان لوگوں پر جو اپنے رب پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر توکل کرتے ہیں۔“

﴿إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾ نیک روی اختیار کرنے والوں کے برعکس جو لوگ گمراہی پسند اور اللہ تعالیٰ کی معرفت سے جاہل ہیں، ایسے بہکے بھٹکے ہی تیری عیاریوں کا شکار ہوں گے۔

ایسے گمراہوں کے انجام کے متعلق آغازِ کائنات سے اللہ کی سنت چلی آ رہی ہے اور وہ یہ کہ انہیں ان کی بداعمالیوں کے سبب نارِ جہنم میں ڈال کر کسی بھولی بسری داستان کی طرح فراموش کر دیا جائے گا:

﴿وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنسَاكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا﴾ {۴۹}

”آج کے دن ہم بھی تمہیں اسی طرح بھلا دیں گے جیسے تم نے اس (قیامت کے) دن کو بھلا رکھا تھا۔“

اس جہنم کے سات دروازے ہوں گے جن سے یہ مجمعِ فساق داخل ہوگا، ایک مخصوص نوعیت کی گروہ بندی کرکے

{۴۷} "بما" ای بسبب اغوائك ایای (روح المعانی ۷۲/۱۴،۸)

{۴۸} (النحل ۱۶/۹۹)

{۴۹} (الجاثیہ ۴۵/۳۴)

جہنمیوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا، اس گروہ بندی کے تحت اہلِ دوزخ کے سات طبقے ہوں گے، جن کے لیے دوزخ کی سات کھائیاں تیار ہوں گی، جو گمراہی کا جتنا بڑا علمبردار ہوگا اتنا ہی شدید اور رسوا کن عذاب اس کا منتظر ہوگا۔{۵۰}

یہ بھی ممکن ہے کہ ''سات'' دروازوں کا ذکر دوزخ میں داخل ہونے والوں کی کثرت کے اظہار کے لیے ہو،{۵۱} کیونکہ لغتِ عرب میں اس قسم کے عدد محض کثرت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱......اللہ تعالیٰ نے انسانِ اوّل کو خشک مٹی سے اور جنات کو آگ سے پیدا فرمایا جس سے اس کی بے پناہ قدرت ثابت ہوتی ہے(۲۶) صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''جب اللہ نے جنت میں آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنا کر اسے مخصوص وقت تک چھوڑ دیا تو ابلیس اس کے اِردگرد چکر لگا کر اس کا جائزہ لینے لگا، جب اس نے ڈھانچے کو اندر سے کھوکھلا دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان ایسی مخلوق ہے جسے اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو نہیں ہوگا۔{۵۲}

۲......کائنات کے تمام جانداروں کی زندگی پانی سے وابستہ ہے انسان کی زندگی کا آغاز بھی پانی اور کیچڑ سے ہوا۔

۳......خاک سے نشو ونما پانے والے انسان کو عرش کی بلندیاں عطا کر دینا دستِ قدرت کا اعجاز وکمال ہے۔

۴......ایک ہی مضمون اور واقعہ کے بیان میں مختلف الفاظ اور تعبیرات کے استعمال میں کئی حکمتیں اور راز پوشیدہ ہوتے ہیں جن تک رسائی کے لیے گہرے تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

۵......انسان اور جنات کے مادۂ تخلیق اور مخلوق ہونے کا ذکر فرما کر ان کے معبود ہونے کی نفی فرما دی گئی ہے۔

۶......پہلے خلیے کو زندگی کس طرح ملی؟ کیچڑ میں پائے جانے والے عناصرِ طبعیہ نے ایک زندہ انسان کی شکل کیسے اختیار کی؟ ان عوامل میں غور وفکر سے ہدایت کے دروازے کھلتے ہیں۔

۷......انسان کے اندر رحمانی تجلیات وانوار قبول کرنے کی استعداد رکھی گئی ہے اسی لیے انسانی روح کو اللہ نے ''روحی''یعنی اپنی روح قرار دیا ہے، اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ خدا رسیدگی کی اس صلاحیت کو کس حد تک کام میں لاتا ہے۔(۲۹)

۸......انسانی روح عالمِ بالا سے مربوط ہے، جیسے آفتاب وماہتاب آسمان پر ہونے کے باوجود اہلِ زمین کو اپنی حرارت

{۵۰} "لها سبعة أبواب" ای سبع طبقات ینزلونها بحسب مراتبهم فی الغوایة (روح المعانی ۱۴،۸/۷۷)

{۵۱} "لها سبعة أبواب" یدخلون منها لکثرتهم (بیضاوی ۳/۳۷۲)

{۵۲} (مسلم ۲، کتاب البر والصلة/۳۲۷)

وبرودت اور روشنی سے مستفید کرتے ہیں یونہی انسان کی روحِ سفلی میں بھی ارواحِ علویہ کے آثار ہوتے ہیں۔

۹......چونکہ شیاطین کو"شدید تپش والی آگ" سے پیدا کیا گیا ہے اس لیے ان کی صفات میں اذیت اور شدت کا عنصر غالب ہے۔

۱۰......اصلِ انسانی کی عزت وتکریم ظاہر کرنے کے لیے اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدے کا حکم دیا، یہ عبادت کا نہیں تعظیم کا سجدہ تھا جو کہ پہلی شریعتوں میں جائز تھا، اسلامی شریعت میں غیر اللہ کے سامنے نہ تعبدی سجدہ جائز ہے نہ تعظیمی۔(۲۹)

۱۱......خالقِ کائنات کو حق حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے دوسری چیز پر فضیلت دے چنانچہ اس نے انبیاء کو ملائکہ پر فضیلت عطا فرما کر عملی طور پر اس کا اعلان بھی کروا دیا، اس اعلان میں ملائکہ کا امتحان بھی تھا اور اس امتحان میں ابلیس کے علاوہ سب ہی کامیاب ثابت ہوئے، اگر مان لیا جائے کہ ابلیس فرشتوں کے ساتھ رہتا تو تھا مگر فرشتہ نہ تھا تو کہنا پڑے گا کہ سارے ہی فرشتے اس امتحان میں پاس ہوئے، ان میں سے ہر ایک نے تواضع کا اظہار فرمایا، تکبر کا راستہ کسی نے بھی اختیار نہ کیا۔

۱۲......تکبّر سے عقل وخرد پر پردے پڑ جاتے ہیں، اسی لیے شیطان کو انسان کا حقیر وکثیف مادۂ تخلیق تو نظر آیا مگر اس کی روحانی، علمی اور عملی ترقی کے امکانات نظر نہ آئے۔(۳۳)

۱۳......علامہ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے "بدائع الفوائد" میں پندرہ وجوہ سے مٹی کا آگ سے افضل ہونا ثابت کیا ہے۔{۵۳}

۱۴......کسی قوم یا فرد کے سر پر احساسِ برتری کا بھوت سوار ہو جائے تو اوّلاً فتنہ وفساد اور بالآخر ہلاکت یقینی ہے۔

۱۵......روحانی معالج یعنی اہلِ اصلاح وارشاد جب اپنے متعلقین کو برے اخلاق سے پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انسان کی طبیعت سے جو خُلق سب سے آخر میں خارج ہوتا ہے وہ تکبّر ہوتا ہے۔

۱۶......کسی ایک آدھ دعا یا درخواست کا قبول ہو جانا مقبول اور محبوب ہونے کی دلیل نہیں......ابلیس کی مہلت کی درخواست بھی قبول کر لی گئی تھی۔(۳۷)

۱۷......انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کے پاس سب سے مؤثر ہتھیار "تزیین" ہے یعنی بدی کو خوشنما بنا کر پیش کرنا، اس کے مقابلے میں اہلِ حق بدی کو خوفناک بنا کر پیش کرتے ہیں۔(۳۹)

۱۸......مزین اور پرکشش چیزوں اور اعمال کو دیکھ کر چوکنا ہو جانا چاہیے کیونکہ بسا اوقات ان کے پردے میں سامانِ

{۵۳}(بحوالہ تفسیر عثمانی/۱۹۶......دار التصنیف)

ہلاکت پوشیدہ ہوتا ہے۔

۱۹......اگر شیطانِ کا عزم یہ ہے کہ میں سارے انسانوں کو گمراہ کر کے رہوں گا تو حق پرستوں کا عزم بھی یہ ہونا چاہیے کہ ہم سارے انسانوں کو ہدایت پر لا کر رہیں گے، ہدایت تو اسی کو ملے گی جسے اللہ چاہے گا مگر ہمیں ثواب تو مل جائے گا۔

۲۰......اللہ کے مخلص اور منتخب بندوں کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، نہ جن نہ شیطان نہ دجال نہ بگڑا ہوا انسان!

۲۱......ڈارون نے انسان کو حیوان زادہ اور شیطان نے خاک زادہ کہہ کر اس کا شرف کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲۲......ایک ہی لفظ اور جملے میں کہنے والے کی نیت کے اعتبار سے مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں، اللہ نے فرمایا میں انسان کو مٹی سے بناؤں گا، ابلیس نے بھی یہی کہا کہ تو نے انسان کو مٹی سے بنایا ہے پھر ایک نے اسے مکرم اور مسجود بنا دیا جبکہ دوسرے نے ذلیل اور مردود ٹھہرا دیا!

۲۳......قرآن حاکمِ مطلق کا کلام ہے اس لیے اس پر حاکمانہ انداز غالب ہے، اگر کہیں حکیمانہ انداز ہے بھی تو حاکمانہ شان کے ساتھ، قصۂ آدم وابلیس میں بھی اس انداز کی جھلکیاں بار بار ملتی ہیں۔

۲۴......شریعت کے کسی حکم کو عقل اور نفس کی چاہت کے خلاف پا کر رد کر دینا صراحتہً کفر ہے۔

۲۵......مومن پر لازم ہے کہ ہر حال میں شخصی مفادات اور طبعی رجحانات پر اللہ کے حکم کو غالب رکھے۔

۲۶......احکامِ باری تعالیٰ میں کٹ حجتی کرنا عبودیت کے خلاف ہے۔

۲۷......حسب نسب کو تعظیم وتکریم کا معیار قرار دینا ابلیس کا شیوہ ہے، اسی نے اخلاق واوصاف دیکھے بغیر ''ناری'' کو ''خاکی'' سے افضل ٹھہرایا تھا۔

۲۸......ابلیس، انسان کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے جبکہ ارحم الراحمین نے اسے عزت دینے کا فیصلہ کیا ہے، اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ ذلت کا راستہ اختیار کرتا ہے یا عزت کا!

احکام الٰہی پر محض خلافِ طبع ہونے کی وجہ سے اعتراض کرنا صریح کفر ہے۔

۲۹......احکامِ شریعت کے مقابلے میں کبر کی چار قسمیں ہیں:

☆ اللہ کے احکام کا مقابلہ عقل سے کیا جائے۔

☆ قیاسِ فاسد کو حجت بنانے کی کوشش کی جائے۔

☆ اپنے وجدان وذوق کو ترجیح دی جائے۔

☆ سیاسی اور ملکی مصالح کو ڈھال بنایا جائے۔ {۵۴}

{۵۴}(معالم القرآن ۸/۳۶۵...... مولانا محمد علی الصدیقی رحمہ اللہ)

مغفرت اور عذاب

﴿۴۵......۵۰﴾

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۴۵﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ﴿۴۶﴾ وَنَزَعْنَا مَا

پرہیزگار ہیں باغوں میں اور چشموں میں O کہیں گے ان کو جاؤ ان میں سلامتی سے خاطر جمع سے (بے کھٹکے) O اور نکال ڈالی ہم نے

فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿۴۷﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ

جو ان کے جیوں میں تھی خفگی، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے O نہ پہنچے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف

وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۴۸﴾ نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّ عَذَابِي

اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے O خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں اصل بخشنے والا مہربان O اور یہ بھی کہ میرا عذاب

هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

وہی عذاب دردناک ہے O

ربط: ابلیس نے مردود ہونے کے بعد کہا تھا میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا، جواب میں باری تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میرے منتخب بندوں پر تیرا کوئی داؤ نہیں چلے گا اور یہ کہ گمراہوں کا ٹھکانہ جہنم ہے، یہاں اسی مضمون کو آگے بڑھایا گیا ہے اور اللہ کے منتخب بندوں کی جزا بتانے کے بعد مغفرت اور عذاب کا ذکر کیا گیا ہے

تسہیل: جو تقوے والے ہیں وہ باغات اور چشموں میں خوش عیشی کریں گے O ان سے کہا جائے گا کہ یہاں امن اور سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ O اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جو بھی کدورت ہوگی ہم اسے نکال دیں گے، پھر وہ ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر یوں بیٹھے ہوں گے گویا وہ بھائی بھائی ہیں O وہاں نہ تو انہیں کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا اور نہ ہی انہیں وہاں سے نکالا جائے گا O میرے حبیب! میرے بندوں کو بتا دیجیے کہ میں ایک طرف بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہوں O دوسری طرف میرا عذاب بھی دردناک ہے O

تفسیر

﴿۴۵﴾...... ذکر ہے ان اہلِ تقویٰ کا جو کفر و شرک سے بچتے ہیں اور حتی المقدور گناہوں سے بچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں{۵۵} اللہ کے حکموں کی اطاعت کرتے ہیں، ابلیس کے وساوس اور حربوں سے متاثر نہیں ہوتے، زندگی

{۵۵}وهو قول جمهور الصحابة والتابعين وهو المنقول عن ابن عباس أن المراد الذين اتقوا الشرك بالله تعالىٰ والكفر به وأقول هذا القول هو الحق الصحيح (كبير، ۱۹، ۷/۱۴۷)

کی شاہراہ پر یوں دامن بچا بچا کر چلتے ہیں گویا وہ ایسی پگڈنڈی ہے جس کے دونوں جانب خاردار باڑھ لگی ہوئی ہے
انہیں ایسے باغات میں جگہ دی جائے گی جہاں پانی، دودھ، شراب اور شہد کے چشمے بہہ رہے ہوں گے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ﴾ {۵۶}

''اس جنت کی مثال جس کا اہلِ تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس میں پانی کی نہریں ہوں گی جو بُو سے پاک ہوگا۔ اور ایسے دودھ کی نہریں ہوں گی جن کا مزہ نہیں بدلے گا اور ایسے شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لیے باعثِ لذت ہوگا اور صاف شہد کی نہریں بھی ہوں گی، اس کے علاوہ ان کے لیے ہر قسم کے میوے ہوں گے اور ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہوگی۔''

﴿۴۶﴾...... ان باغات میں ہر قسم کی پریشانی، بیماری اور حوادث سے امن اور تحفظ ہوگا، نہ نکالے جانے کا خوف نہ نعمتوں کے ختم ہونے اور فنا کا ڈر! {۵۷}

﴿۴۷﴾...... انسان بہرحال انسان ہے فرشتہ نہیں، بسا اوقات بڑے بڑے صوفیوں، متقیوں اور نیک لوگوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے رنجش، بدگمانی اور غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، قصد و ارادہ سے دل میں بغض و حسد پالنا بے شک بہت بڑا گناہ ہے مگر غیر اختیاری طور پر کسی کے لیے اگر دل میں میل آجائے تو کمزوریوں اور لاچاریوں میں گھرا ہوا انسان کیا کر سکتا ہے؟ دل میں از خود پیدا ہو جانے والی ناگواریاں تدین و تقویٰ کے منافی ہرگز نہیں، ایسی ناگواریاں صحابہ تک کے دلوں میں بھی پیدا ہوتی رہیں حالانکہ وہ معصوم پیغمبر اور عظیم ترین مصلح اور مرشد کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے یہی ناگواریاں اور دشمنوں کی لگائی بجھائی تھی جس کے نتیجے میں جنگِ جمل اور صفین میں صحابہ کا خون بہا، ان جنگوں میں شریک ہونے والوں کو اُمید تھی کہ قیامت کے دن ہم بھی اس آیت کا مصداق بنیں گے اور ہم جنّت میں اس حال میں داخل ہوں گے کہ ہمارے دلوں کو ہر قسم کے بغض، کینہ اور بدگمانی سے پاک کر کے ان میں ایک دوسرے کے لیے محبت ڈال دی جائے گی۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو حبیبہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جنگِ جمل سے فارغ ہونے کے بعد ایک دن حضرت عمران بن طلحہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں بڑے پُر تپاک طریقہ

{۵۶} (محمد ۴۷/۱۵)
{۵۷} "آمنين" أي من كل خوف و فزع ولاتخشوا من اخراج ولا انقطاع ولافناء (ابن كثير ۲/۷۱۹)

سے خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں ان لوگوں میں سے بنائے گا جن کے بارے میں وہ فرماتا ہے ”اوران کے دلوں میں جو بھی کدورت ہوگی ہم اسے نکال دیں گے پھر وہ ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر یوں بیٹھے ہوں گے گویا وہ بھائی بھائی ہیں۔“

جہاں یہ گفتگو ہورہی تھی اس بچھونے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے دو آدمی کہنے لگے، اللہ بہت عدل کرنے والا ہے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کل تک تم ایک دوسرے کو قتل کرتے رہو اور قیامت کے دن بھائی بھائی بن جاؤ؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تم یہاں سے کسی دور دراز اور لعنت کی زمین پر چلے جاؤ، اگر میں اور طلحہ اس آیت کے مصداق نہیں تو پھر کون اس کا مصداق ہوگا؟ {۵۸}

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ایمان والے دوزخ سے چھوٹ جائیں گے تو انہیں جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا، وہاں وہ ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا بدلہ لیں گے جو انہوں نے دنیا میں ایک دوسرے پر کی ہوں گی، یہاں تک کہ جب وہ پوری طرح پاک صاف ہوجائیں گے تو انہیں جنّت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔“ {۵۹}

﴿۴۸﴾......جنّتیوں کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوگی وہ انہیں دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت کے بغیر مل جائے گی اس لیے انہیں کسی قسم کی تھکاوٹ بھی نہیں ہوگی، آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے:

﴿بشروا خديجة ببيت في الجنة من قصب، لاصخب فيه، ولانصب﴾ {۶۰}

”حضرت خدیجہ کو جنّت میں اس محل کی خوشخبری سنادو جو موتیوں سے بنا ہوگا، جس میں نہ تو شور و شغب ہوگا اور نہ ہی مشقت اور تھکاوٹ۔“

﴿وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ﴾ جنّت کی نعمتیں صرف کامل نہ ہوں گی بلکہ دائمی بھی ہوں گی، جو جنّت میں داخل ہوگیا اسے نہ جنّت سے نکالا جائے گا نہ کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا، حدیث میں آتا ہے، اہلِ جنّت سے کہا جائے گا:

”اے جنت والو! یہاں تمہیں دائمی صحت حاصل رہے گی کبھی بیمار نہیں پڑو گے، زندہ رہو گے کبھی موت نہیں آئے گی، تمہاری جوانی سدا بہار ہوگی، بڑھاپا چھو کر بھی نہ گزرے گا۔“ {۶۱}

{۵۸} (ابن جریر، ابن المنذر......بحوالہ منیر ۱۴/۳۹)
{۵۹} (بخاری ۲، کتاب الرقاق/۹۶۷)
{۶۰} (بخاری ۱، ابواب العمرۃ/۲۴۱......اس مضمون کی مزید احادیث کے لیے دیکھیے، بخاری ۱، کتاب المناقب/۵۳۹...... بخاری ۲، کتاب التوحید/۱۱۱۶، مسلم ۲، کتاب الفضائل/۲۸۴، ترمذی ۲، ابواب المناقب/۲۲۸)
{۶۱} مسلم ۲، کتاب صفة الجنة ونعيمها وأهلها/۳۸۰، ترمذی ۲، کتاب التفسیر/۱۵۶)

﴿۴۹-۵۰﴾......کیا پیارا انداز ہے اللہ فرما رہے ہیں اے میرے پیغمبر! ''میرے بندوں کو بتا دیجیے'' کونسے بندے؟ وہی بندے جن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی، نمازی بھی ہیں اور بے نمازی بھی، عفیف اور پاکدامن بھی ہیں، زانی اور بدکار بھی، مگر ہیں تو میرے! گناہوں کے باوجود ''بندوں'' کی فہرست سے خارج نہیں ہوتے۔{۶۲} لازم ہے کہ بندوں کے دل میں عذاب کا خوف بھی ہو اور رحمت کی امید بھی، اپنے گناہوں اور لغزشوں پر نظر پڑے تو دل خوف سے کانپ اٹھے اور جب رحمت کے ٹھاٹھیں مارتے اس سمندر پر نظر پڑے جس کا کوئی کنارا نہیں تو دل میں گلشن سا مہک اٹھے، ایمان کامل ہوتا ہے ان دونوں صفات کے اجتماع سے، البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ رحمت تو ہر کسی کے لیے عام ہے خواہ مستحق ہو یا نہ ہو مگر عذاب صرف ان کے لیے ہے جو واقعی عذاب کے مستحق ہیں، یہ نہیں ہوگا کہ کسی بے گناہ کو دوزخ میں ڈال دیا جائے مگر یہ ضرور ہوگا کہ بے شمار خطا کاروں اور بدعملوں کو مغفرت کا پروانہ دے کر جنت میں جگہ دے دی جائے گی، دنیا میں بھی جو گناہوں میں لت پت بندوں پر کوئی عذاب نہیں آتا اور رزق کے دروازے ان پر بند نہیں کیے جاتے تو یہ رحمٰن و رحیم کی رحمت کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے، ''بسم اللہ'' سے قرآنِ کریم کی اختتامی آیات میں مذکور صفات تک ہمیں الرحمن، الرحیم، الغفار، الغفور، التواب اور الرءوف جیسے الفاظ تو بار بار ملتے ہیں مگر المعذّب، المؤلّم وغیرہ کہیں بھی نہیں ملتے۔

قرآنِ کریم کی طرح متعدد احادیث میں بھی امید اور خوف، رحمت اور عذاب، بشارت اور انذار دونوں کا ذکر اکٹھے آیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ سبحانہ نے جس دن رحمت کو پیدا کیا اسے سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر اس کے ننانوے حصے تو اپنے پاس روک لیے اور اس کا ایک حصہ اپنی ساری مخلوق میں تقسیم فرما دیا، اگر کافر کو اللہ کی رحمت کا علم ہو جائے تو وہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو اور اگر مومن کو اللہ کے عذاب کا یقین آ جائے تو وہ کبھی دوزخ سے بے خوف نہ ہو۔'' {۶۳}

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ:

''اگر مومنوں کو اس سزا کا علم ہو جائے جو اللہ کے پاس ہے تو اس کی جنت کی کوئی اُمید نہ رکھے اور اگر کافروں کو اللہ کی رحمت کا علم ہو جائے تو اس کی رحمت سے کوئی نا اُمید نہ ہو۔'' {۶۴}

{۶۲} اضاف العباد الی نفسه بقوله "عبادی" وهذا تشریف عظیم (کبیر۷، ۱۹/۱۴۹)

{۶۳} (بخاری ۲، کتاب الرقاق/۹۵۸)

{۶۴} (مسلم ۲، کتاب التوبة/۳۵۶)

اس مضمون کی روایت حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے زیرِ تفسیر آیات کے بارے میں منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اگر بندے کو علم ہو جائے کہ اللہ کس قدر معاف کرنے والا ہے تو پھر وہ حرام سے بچنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا اور اگر اسے پتہ چل جائے کہ اللہ کس قدر عذاب دینے والا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لے گا۔''

حکمت وہدایت:

۱......متقیوں کی جزا جنّت ہے، اہلِ سنّت کا اجماع ہے کہ اس سے مراد وہ متقی ہیں جو کفر اور شرک سے بچتے ہیں کیونکہ گناہ گار مسلمان کا ٹھکانہ بھی بالآخر جنّت ہی ہوگا، جبکہ معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سارے گناہوں سے بچتے ہیں۔(۴۵)

۲......جنّت کی تین نمایاں خصوصیات مذکورہ آیات سے ثابت ہوتی ہیں: (۱) امن اور تحفظ (۲) ہر قسم کی جسمانی اور روحانی آلائشوں اور پریشانیوں سے بچاؤ اور صفائی (۳) زوال اور فنا کے اندیشوں کا خاتمہ۔(۴۶-۴۸)

۳......قرآنِ کریم میں چار قسم کی جنّتوں اور چشموں کا ذکر ملتا ہے، چشموں کی نشاندہی تو ہم کر چکے، جنّتوں کی تعداد سورۂ رحمٰن میں مذکور ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾{۶۵} ''اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرنے والوں کے لیے دو جنّتیں ہوں گی۔''

اس کے بعد فرمایا:

﴿وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ﴾{۶۶} ''ان دو کے علاوہ دو جنّتیں اور بھی ہیں۔''

۴......دوسرے بہت سارے دلائل اور آیات واحادیث کے علاوہ مذکورہ آیات بھی اسلام کے معتدل مذہب ہونے پر دلالت کرتی ہیں، انسان کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ خوف اور امید کے درمیان زندگی گزارے، خوف ہی خوف ہو تو ناامیدی پیدا ہوتی ہے اور امید ہی امید ہو تو انسان بے عمل بلکہ بدعمل ہو جاتا ہے، بہتر ہے کہ صحت اور جوانی میں خوف کا غلبہ ہو اور بیماری اور بڑھاپے میں اُمید کا غلبہ ہو۔

واعظوں کو بھی چاہیے کہ نہ تو وہ گناہگاروں کو اتنا ڈرائیں کہ وہ مایوس ہو جائیں اور نہ ہی عمل کرنے والوں کو اتنا

{۶۵}(الرّحمٰن ۵۵/۴۶)
{۶۶}(الرّحمٰن ۵۵/۶۲)

اٹھائیں کہ وہ گھمنڈ میں مبتلا ہو جائیں، ہر حال میں اعتدال ہی بہتر ہے۔

۵......امام رازی رحمہ اللہ نے آیات (۴۹-۵۰) کے حوالے سے درج ذیل نکات ذکر فرمائے ہیں:

الف......بندوں کی تعظیم و تکریم کے لیے ''عبادی'' میں ''عباد'' کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔

ب......جب اپنی رحمت اور مغفرت کا ذکر کیا تو اسے تین تاکیدوں سے مؤکد فرمایا ''اَنِّیْٓ'' ''اَنَا'' اور ''الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ'' پر الف اور لام کا داخل کرنا تاکید ہی کے لیے ہے، لیکن جب عذاب کا ذکر کیا تو یہ نہیں فرمایا ''انی انا المعذّب''

ج......اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ لوگوں کو یہ پیغام پہنچا دیں گویا اپنے رسول کو اس پر گواہ بنایا کہ میں نے مغفرت اور رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔

د......جب اللہ نے فرمایا ''نبیٔ عبادی'' (میرے بندوں کو بتادیجیے) تو اس کا معنی یہ بنا کہ ہر اس شخص کو بتا دیجیے جو میری عبودیت اور بندگی کا اقرار کرتا ہے خواہ وہ فرمانبردار ہو یا نافرمان۔{۶۷}

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ

۵۱......۷۷

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾

اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا O جب چلے آئے اسکے گھر میں اور بولے (کیا انہوں نے) سلام، وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے O

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ

بولے، ڈر مت! ہم تجھ کو خوشخبری سناتے ہیں ایک ہوشیار لڑکے کی O بولا کیا خوشخبری سناتے ہو مجھ کو جب پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا، اب کاہے پر

فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ

خوشخبری سناتے ہو؟O بولے ہم نے تجھ کو خوشخبری سنائی سچی (پکی) سو مت ہو تو ناامیدوں میں O بولا اور کون آس توڑے

مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿٥٦﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٧﴾ قَالُوا

اپنے رب کی رحمت سے مگر (وہی) جو گمراہ ہیں O بولا پھر کیا مہم ہے تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوؤ؟O بولے

إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ ﴿٥٨﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٩﴾ إِلَّا امْرَأَتَهُ

ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم گنہگار پر O مگر لوط کے گھر والے ہم ان کو بچالیں گے سب کو O مگر ایک اس کی عورت،

{۶۷}(کبیر ۷، ۱۹/۱۴۹)

قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾

ہم نے ٹھہرالیا وہ ہے رہ جانے والوں میں O پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے O بولا تم لوگ ہو اوپرے (جن سے کھٹکا ہوتا ہے) O

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

بولے نہیں! پر ہم لے کر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں وہ جھگڑتے تھے O اور ہم لائے ہیں تیرے پاس پکی بات اور ہم سچ کہتے ہیں O

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا

سو لے نکل اپنے گھر کو کچھ رات رہے سے اور تو چل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی، اور چلے جاؤ

حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

جہاں تم کو حکم ہے O اور مقرر کر دی ہم نے اس کو یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے O

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

اور آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے O لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھ کو رسوا مت کرو O

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ

اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ O بولے کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا جہان کی حمایت سے؟ O بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر

كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ

تم کو کرنا ہے O قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش (نشے) ہیں O پھر آ پکڑا ان کو

مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ

چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت (ہی) O پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے ان پر پتھر کھنگر (کنکر) کے O بیشک اس میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کو O اور وہ بستی واقع ہے سیدھی راہ پر O البتہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کو (یقین کرنے والوں کو) O

ربط: پہلے اللہ کی مغفرت و رحمت اور عذاب کا ذکر تھا اور یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی لیکن غور کرنے سے سمجھ آتا ہے کہ یہ قصہ ماقبل کے مضمون کی تائید کے لیے لایا گیا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں آنے والے فرشتوں نے دو کام کیے تھے، ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں حضرت اسحٰق علیہ السلام جیسے نیک بیٹے کی خوشخبری سنائی اور یہ خوشخبری اللہ کے "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" ہونے کا مظاہرہ تھی، دوسرا کام یہ کیا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کیا اور یہ مظاہرہ تھا اللہ کے "عذابِ الیم" کا۔

تسہیل: اے میرے پیغمبر! انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ سنا دیجیے O جب وہ ابراہیم کے پاس آئے اور کہا تم پر سلام ہو تو انہوں نے کہا مجھے تم سے خوف محسوس ہو رہا ہے O فرشتوں نے کہا، آپ ڈریئے نہیں ہم آپ کو ایک صاحب علم بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں O ابراہیم علیہ السلام نے کہا، کیا تم مجھے اس حال میں یہ خوشخبری دے رہے ہو جبکہ مجھ پر بڑھاپا چھا چکا ہے؟ O انہوں نے کہا ہم آپ کو سچی خوشخبری سنا رہے ہیں لہٰذا آپ مایوس نہ ہوں O ابراہیم نے کہا، میں اللہ کی رحمت سے مایوس کیوں ہوں گا، مایوس ہونا تو گمراہوں کا شیوہ ہے O پھر ابراہیم نے پوچھا، اے فرشتو! تم کس مہم پر نکلے ہو؟ O انہوں نے جواب میں بتایا کہ ہمیں ایک مجرم قوم کو سزا دینے کے لیے بھیجا گیا ہے O البتہ لوط کے خاندان کو ہم بچا لیں گے O سوائے ان کی بیوی کے جس کے بارے میں ہم طے کر چکے ہیں کہ وہ لعنتی لوگوں کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی O پھر جب وہ فرشتے لوط کے گھرانے میں آئے O تو لوط نے کہا، تم اجنبی لوگ معلوم ہوتے ہو O وہ بولے، ہم ایسے ویسے نہیں بلکہ ہم آپ کے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے O اور ہم آپ کے پاس یقینی بات لے کر آئے ہیں اور ہم سچ بولنے والے ہیں O تو اب آپ رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر چلے جائیے اور خود آپ ان کے پیچھے چلیں اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور جہاں جانے کا تمہیں حکم ملا ہے وہاں سب چلے جاؤ O اور ہم نے لوط کو اپنا یہ فیصلہ بتا دیا تھا کہ صبح ہوتے ہوتے ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی O اور شہر کے لوگ خوش خوش لوط کے پاس دوڑے آئے O ان کے تیور دیکھ کر لوط نے کہا، یہ میرے مہمان ہیں ان کے حوالے سے مجھے رسوا نہ کرو O اور اللہ سے ڈرو اور میری عزّت سے نہ کھیلو O وہ بولے، کیا ہم نے تمہیں منع نہ کیا تھا کہ دنیا بھر کے انسانوں کے حمایتی نہ بنتے پھرو؟ O لوط نے کہا، اگر تم شہوت پوری کرنا چاہتے ہو تو میری قوم کی یہ بیٹیاں حاضر ہیں O اے میرے نبی! آپ کی جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں دیوانے ہو رہے تھے O پس سورج نکلتے نکلتے ایک چنگھاڑ نے انہیں آ پکڑا O اور ہم نے اس بستی کو الٹ کر اوپر کا تختہ نیچے کر دیا اور ہم نے ان پر کنکر کے پتّھر برسائے O اس قصّے میں اہلِ بصیرت کے لیے بڑی عبرتیں ہیں O اور وہ بستی ایک آباد راستے پر موجود ہے O بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے نشانی ہے O

تفسیر

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس فرشتوں کی آمد کا یہ قصہ سورۂ ہود میں بھی گزر چکا ہے اس لیے یہاں ہم تفسیر کے بجائے ان حکمتوں اور ہدایات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں جو ان آیات میں غور وفکر کرنے سے سمجھ آتی ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱......مہمان کو جو آداب سکھائے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ میزبان کو سلام کرے۔ (۵۲)

حضورِ اکرم ﷺ نے سلام کو عام کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ آپس میں محبت پیدا ہو، چنانچہ جب دو مسلمانوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور جب گھر میں داخل ہوتے ہیں تو بھی سلام کرتے ہیں۔

۲......طبعی خوف نہ ولایت کے منافی ہے نہ نبوت کے۔(۵۲) فرشتے جو کہ انسانی شکل میں آئے تھے، ان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لیے خوف محسوس ہوا کیونکہ جب انہوں نے اپنی عادت کے موافق ان کے سامنے کھانا پیش کیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کردیا، ان کے معاشرے میں اس قسم کا انکار عداوت کی بناء پر ہوتا تھا۔

۳......اولیاء تو کیا انبیاء بھی غیب کا علم نہیں رکھتے، اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام عالم الغیب ہوتے تو نہ تو آنے والوں سے خوف کھاتے اور نہ ہی آنے والوں کے لیے کھانا تیار کرتے۔

۴......حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعجب کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں کی یہ خوشخبری خلافِ عادت تھی، یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اسے اللہ کی قدرت سے بعید سمجھتے تھے، ولادت کی خوشخبری خلافِ عادت اس لیے تھی کیونکہ توریت کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال تھی۔

۵......آیت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ عادی اسباب پر نظر رکھنا اگر اللہ کے نبیوں کے لیے جائز ہے تو امت کے عام افراد کے لیے ناجائز کیسے ہوسکتا ہے۔(۵۴)

۶......فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ کہنا کہ ''فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ'' (آپ مایوس نہ ہوں) اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مایوس ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا، اگر بالفرض وہ مایوس ہوتے تو یہ ہرگز نہ فرماتے:

''مایوس ہونا تو گمراہوں کا شیوہ ہے۔'' (۵۵)

بعض اوقات انسان کو ایسی چیز سے بھی منع کردیا جاتا ہے جس سے وہ پہلے ہی بچا ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ﴾{۶۸} ''اور آپ کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کریں۔''

حالانکہ آپ تو پہلے ہی ان کی اطاعت سے بچے ہوئے تھے، یہاں بھی نہی کو اسی معنی میں لینا چاہیے۔

۷......اللہ کے نیک بندوں سے رشتہ اور قرابت جبکہ ایمان اور عملِ صالح سے خالی ہو، اللہ کے عذاب سے نہیں بچاسکتی جیسے حضرت لوط علیہ السلام کی اہلیہ کو پیغمبر کی اہلیہ ہونا نہ بچاسکا۔

۸......جس قوم پر اور جس جگہ اللہ کا عذاب نازل ہو اس طرف دیکھنا اور زیادہ دیر ٹھہرنا بھی مناسب نہیں، اسی لیے

{۶۸} (الأحزاب ۳۳/۴۸)

حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ ”تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے“ (۶۵) منع کرنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ کہیں اپنی قوم کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر آپ کے دل میں رحم اور شفقت غالب نہ آ جائے، نا قابلِ اصلاح ظالموں اور مجرموں پر شفقت بھی جائز نہیں مگر کسی کے نا قابلِ اصلاح ہونے کا یقینی علم انبیاء کو تو ہوسکتا ہے عام لوگوں کو نہیں۔

۹......معصوم مہمانوں تک کے بارے میں فحش کاری کا عزم اور کوشش سدوم کے رہنے والوں کی ضلالت، شہوت پرستی اور حیوانیت کی انتہا پر دلالت کرتی ہے۔

۱۰......امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں پہلے اس فیصلے کو مبہم رکھنا اور پھر خود ہی اس کی تفصیل کر دینا اس فیصلہ کی اہمیت وعظمت کے اظہار کے لیے ہے۔{۶۹}

۱۱......نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اس قوم کے مرد اور عورتیں نبی کے بیٹے اور بیٹیاں ہوتی ہیں مگر بعض فرمانبردار اور بعض نافرمان! حضرت لوط علیہ السلام نے ”هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْۤ“ (یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں) فرما کر شہوت میں اندھا ہو جانے والوں کو اپنی قوم کی بیٹیوں کے ساتھ جائز طریقے سے قضائے شہوت کا مشورہ دیا تھا البتہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے آپ کی صلبی بیٹیاں مراد ہیں۔ آپ کا منشاء یہ تھا کہ اگر چاہو تو میری بیٹیاں بھی نکاح کے لیے حاضر ہیں۔{۷۰}

۱۲......آیت ۷۵ میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ”اس قصے میں اہلِ بصیرت کے لیے بڑی عبرتیں ہیں“ اس سے بصیرت اور فراست کی فضیلت سمجھ آتی ہے جو کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔“ پھر آپ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

”اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ“ {۷۱}

۱۳......نبی مکرم ﷺ کی عمر اور زندگی کی قسم کھانا اللہ کے ہاں آپ کی غیر معمولی محبوبیت اور عظمت پر دلالت کرتا ہے۔(۷۲){۷۲}

{۶۹} وفی ابهامه أولا وتفسیره ثانیا تفخیم للأمر وتعظیم له (کبیر۷، ۱۹/۱۵۴)

{۷۰} (اس پر حاشیہ سورۂ ہود کی آیت ۷۸ کے ضمن میں گزر چکا۔)

{۷۱} (ترمذی ۲، کتاب التفسیر/۱۴۰)

{۷۲} وأنه تعالیٰ أقسم بحیاته وما أقسم بحیاة أحد، وذلك یدل علیٰ أنه أکرم الخلق علی الله تعالیٰ (کبیر۷، ۱۹/۱۵۶)

قرآنی قسمیں:

قرآنِ کریم میں دسیوں بار قسمیں کھائی گئی ہیں، ان قسموں کے حوالے سے چند سوالات بعض ذہنوں میں اٹھتے ہیں، مثلاً یہ کہ:

☆......قرآنِ کریم کے مخاطب مومن ہیں یا کافر اور منکر، مومنوں کو یقین دلانے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت نہیں جبکہ منکروں کو قسم کے باوجود یقین نہیں آتا تو پھر قسموں کا فائدہ کیا ہے؟

☆......کسی چیز کی قسم اس کی عظمت کی وجہ سے کھائی جاتی ہے جبکہ قرآن میں جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ تعظیم وتکریم کی مستحق نہیں۔

☆......عام طور پر زیادہ قسمیں کھانے والے کو معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تو پھر رب العالمین کا قسمیں کھانا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

ان سوالات کے جوابات انشاء اللہ ہماری درج ذیل گزارشات کے ضمن میں آجائیں گے، ان گزارشات کا زیادہ مواد امام رازی اور علامہ زرکشی رحمہما اللہ کے افادات پر مشتمل ہے۔

جہاں تک ان قسموں کی حکمتوں اور اسباب کا تعلق ہے تو ہم سرِدست اسباب کے بیان پر اکتفاء کریں گے۔

۱......بعض اوقات کفار، نبی مکرم ﷺ کے پیش کردہ دلائل کے سامنے مغلوب اور خاموش تو ہوجاتے تھے مگر صداقت تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے اور اپنے حواریوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرتے تھے کہ ویسے تو ہم حق پر ہیں مگر ہمیں اپنا موقف پیش کرنے کا ویسا سلیقہ نہیں آتا جیسا سلیقہ محمد (ﷺ) کو آتا ہے، ایسی صورت میں انہیں یقین دلانے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

۲......عرب جھوٹی قسم کھانے سے بچتے تھے اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جھوٹی قسموں سے بے برکتی ہوتی ہے اور گھر اور بستیاں تباہ ہوجاتی ہیں، جب ان میں سے قدرے سمجھدار لوگ دیکھتے کہ اپنے موقف کی سچائی پر قسمیں اٹھانے کے باوجود محمد ﷺ کسی آفت اور مصیبت کا شکار نہیں ہوئے تو ان کا ضمیر گواہی دیتا تھا کہ آپ سچے ہیں۔

۳......قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا، اس کے اوّلین مخاطب چھٹی صدی عیسوی کے عرب تھے اس لیے قرآن میں وہی اسلوبِ بیان، وہی تشبیہات واستعارات اور وہی ادبی نزاکتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے اس دور کے عرب آشنا تھے، جب ہم اس زمانے کے مسلّم اساتذۂ فن کا کلام دیکھتے ہیں تو ہمیں امراء القیس، طرفہ، قیس بن

زہیر، زہیر بن ابی سلمہ، نابغہ اور عروہ سے لیکر حاتم اور علقمہ تک سب کے کلام میں قسموں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے، اور قسمیں بھی خالق سے لیکر مخلوق تک سب کی، بیت اللہ کی، اپنی عمر کی، مخاطب کی زندگی اور خون کی، رشتوں اور تعلقات کی، اونٹوں اور گھوڑوں کی اور دوسری مخلوقات کی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں قسموں کے استعمال پر عرب کے کسی ثقہ شاعر، ادیب، خطیب بلکہ عوام نے بھی اعتراض نہیں کیا، اگر یہ عیب ہوتا تو قرآن کی فتوحات کا مشاہدہ کر کے جلنے بھننے والے زبانِ طعن ضرور دراز کرتے، ان کی خاموشی، چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ یہ عیب نہیں حسن تھا اور عرب اس حسنِ بیان کے پہلے سے عادی تھے۔

۴......اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں حقیقت میں وہ دلائل اور شواہد ہیں جو قسموں کی صورت میں لائے گئے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے مخاطب سے کہے ''تیرے احسانات کے حق کی قسم! میں تیرا شکر گزار رہوں گا'' یہاں احسانات کا ذکر کرنا دوامِ شکر کا سبب ہے۔

قرآنِ کریم سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، یہاں ہم صرف دو مثالیں ذکر کر رہے ہیں:

سورۂ عادیات میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کی پانچ حالتوں کی قسمیں کھائی ہیں ان میں سے ہر حالت گھوڑے کی وفا، احسان شناسی اور ایثار پر دلالت کرتی ہے، یہ پانچ قسمیں کھانے کے بعد فرمایا گیا ''بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور اس پر وہ خود گواہ ہے'' گھوڑا بے زبان جانور ہے اور انسان اشرف المخلوقات! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ جانور سے کہیں زیادہ وفادار ہوتا مگر زیادہ تر انسانوں کا رویّہ اپنے مالک کے ساتھ اس رویّے سے فروتر ہے جو ایک حیوان کا اپنے مالک کے ساتھ ہے، سیاقِ کلام بتاتا ہے کہ یہ قسمیں استشہاد کے طور پر لائی گئی ہیں۔

دوسری مثال کے طور پر ہم سورۂ عصر کو پیش کرنا چاہتے ہیں، اس سورت میں زمانے کی قسم کھا کر کہا گیا ہے کہ انسان خسارے میں ہے یعنی زمانے کے انقلابات اور انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ سارے انسان خسارے میں ہیں سوائے ان کے جن کے اندر چار صفات پائی جاتی ہوں۔

متعدد حضرات کی رائے یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی اکثر قسمیں استشہاد اور استدلال کے لیے ہی ہیں۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ:

قسم میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں، مقسم بہ اور مقسم علیہ، مقسم بہ سے مراد وہ چیز ہے جس کی قسم کھائی گئی ہو اور مقسم علیہ سے مراد وہ دعویٰ ہے جس پر قسم کھائی گئی ہو، قرآن مجید میں مقسم بہ تین چیزیں ہیں:

۱......اللہ تعالیٰ کی ذات، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ {۷۳} ''آسمان اور زمین کے رب کی قسم۔''

۲......فعلِ باری تعالیٰ! جیسے سورۂ شمس میں ہے:

﴿وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا﴾ {۷۴} ''اور آسمان کی قسم اور اس کے بنانے کی قسم۔''

۳......مخلوقِ باری تعالیٰ! جیسے:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ {۷۵} ''انجیر کی قسم اور زیتون کی قسم۔''

مقسم علیہ بھی عام طور پر تین چیزیں ہیں:

توحید، نبوت اور بعث بعد الموت۔

توحید کے اثبات کے لیے صرف سورۂ صافات میں قسم کھائی گئی ہے، فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ﴾ {۷۶} ''بے شک تمہارا معبود ایک ہی ہے۔''

اس لیے کہ مشرکینِ مکّہ شرک کے باوجود توحید کا اقرار کرتے تھے اور بت پرستی کا جواب یہ دیتے تھے کہ:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ {۷۷} ''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کے بہت قریب کر دیں۔''

اسی طرح جب ان سے سوال کیا جاتا کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ جواب میں نہ لات کا نام لیتے تھے نہ منات کا، نہ ہبل کا اور نہ عزیٰ کا بلکہ نام لیتے تھے تو صرف اللہ کا، اسی لیے اثباتِ توحید اور ردِ شرک کے دلائل تو دیئے گئے ہیں مگر اس کے لیے زیادہ قسمیں نہیں کھائی گئیں، چند مقامات پر نبوت و رسالت کے اثبات اور زیادہ تر آیات میں بعث بعد الموت کے حق ہونے پر قسمیں کھائی گئی ہیں کیونکہ یہ وہ مسئلہ تھا جو مشرکینِ مکّہ کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا اور آج کے بے شمار ''روشن خیالوں'' کی سمجھ میں بھی نہیں آتا، مرنے کے بعد کی زندگی کا ادھورا اقرار کرنے والے تو بہت ہیں مگر اسے اس طرح ماننے والے بہت کم ہیں جس طرح قرآن اسے ساری دنیا سے منوانا چاہتا ہے۔

مخلوق کی قسم:

سورۂ نساء آیت ۶۵، سورۂ یونس آیت ۵۳، سورۂ حجر آیت ۹۲، سورۂ مریم آیت ۶۸، سورۂ تغابن آیت ۷ اور سورۂ

{۷۳}(الذّاریات ۵۱/۲۳)
{۷۴}(الشمس ۹۱/۵)
{۷۵}(التین ۹۵/۱)
{۷۶}(الصّافات ۳۷/۴)
{۷۷}(الزمر ۳۹/۳)

معارج آیت ۴۰، یہ وہ سات مقامات ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے، ان کے علاوہ جتنی بھی قسمیں ہیں وہ مخلوقات کی ہیں، کہیں سورج اور چاند کی، کہیں ارض وسما کی، کہیں انجیر اور زیتون کی۔

سوال یہ ہے کہ جب بندوں کو مخلوق کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے تو خود باری تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا ہے؟

اس سوال کا پہلا جواب یہ ہے کہ جہاں جہاں ایسی قسمیں ہیں وہاں مضاف محذوف ہے، مثلاً ''ورب الشمس'' ''ورب القمر'' ''ورب التین'' تو ان مواقع پر سورج، چاند اور انجیر کی قسم نہیں بلکہ ان کے رب کی قسم ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ عرب ان چیزوں کو بڑا سمجھتے تھے اور ان کی قسمیں کھاتے تھے، قرآن نے بھی ان کے عرف اور اسلوب کو ملحوظ رکھا ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ عام طور پر انسان ایسی چیزوں کی قسم کھاتا ہے جن کی تعظیم کرتا یا جنہیں اپنے سے بڑا سمجھتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے برتر کوئی چیز ہے ہی نہیں اس لیے اس نے یا تو اپنی قسم کھائی ہے یا اپنی مصنوعات اور مخلوقات کی کیونکہ یہ مخلوقات اس کے خالق اور صانع ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔{۷۸}

حضرت مولانا دریا آبادی مرحوم نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں انہی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے، فرماتے ہیں:

''پھر جو معیار بندوں کے عمل و کردار کا ہے، اس کا پابند حق تعالیٰ کو بنانا بجائے خود ایک غیر معقول ترین مطالبہ کا پیش کرنا، مطلق کو مقید کے حکم میں لانا اور لامحدود وغیر متناہی کو محدود اور متناہی کے صفات کا اجراء کرنا ہے، بندے اگر معاشرہ کے بندھے ہوئے ضابطہ کو توڑیں گے تو قطعاً مجرم کہلائیں گے لیکن جو ''**فعّال لمایرید**''ہو، کیا اس کے کسی بھی فعل عمل کو کسی بھی حال اور کسی صورت میں ''جرم'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟

جرم کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ عمل فلاں ضابطہ اور فلاں قانون کے خلاف ہے، لیکن جس کی ہستی خود ہر قانون سے بالاتر ہو اور جس کی مشیت اور قوت ارادی سے مافوق کوئی شے تصور میں نہیں آسکتی، اسے آخر کس ضابطہ کی زنجیروں میں جکڑنا ممکن ہے؟

اور اگر ممکن ہے تو ایسا مقیّد اور پابند خدا، خدا ہی کیوں ٹھہرا؟

قتل و ہلاک، ایذاء رسانی وضرر رسانی سے بڑھ کر کوئی شدید جرم بندوں کے تصور میں بھی آسکتا ہے؟ لیکن آخر مشیتِ ایزدی روز ہی بے شمار انسانوں کی جان لیا کرتی ہے اور بے شمار معصوم بچوں کو یتیم اور بے شمار سہاگنوں کو بیوہ کرتی

{۷۸}(البرهان فی علوم القرآن ۳/۴۶...... علامہ زرکشی)

ہے، آج یہ غریب فاقہ سے تڑپ تڑپ کر گزر گیا، کل وہ مزدور انجن سے کچل گیا، ابھی اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، ابھی اس کا سر پھٹ گیا، یہ روزانہ ہر گھنٹے اور ہر منٹ گزرنے والے واقعات ہیں یا نہیں؟

پھر کیا (نعوذ باللہ) ان جرائم کی پاداش میں حق تعالیٰ کو کسی عدالت میں گھسیٹ لانے کا ارادہ ہے کیا؟

معاذ اللہ! اللہ میاں پر بھی فردِ جرم لگے گی؟ وہ بھی اپنی صفائی پیش کریں گے؟ اپنا بیان دیں گے؟ اللہ تعالیٰ جو یقیناً ہر قانون اور ہر حد بندی سے ماوراء ہستی ہے، کو اختیار اور پورا اختیار حاصل تھا کہ وہ ایسا کلام بندوں پر نازل کرتا جو اوّل سے آخر تک بندوں کے لیے بالکل ہی بے معنی، غیر مفہوم ہوتا، بندوں کو جواب طلب کا حق، شائبۂ حق جب بھی ذرہ برابر نہ ہوتا۔

سوال کرنے والے برابر یہ بھول جاتے ہیں کہ ابتداء میں ذکر تو خدا کا ہے لیکن خبر نکالتے وقت تمام صفات بندوں والی تصور میں رہتی ہیں، یہ مغالطہ عام ہے، بہت عام ہے، لیکن غلطی کا عموم غلطی کو صحت میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

جھوٹی قسم کھانا جو بندوں کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے اور بلا ضرورت قسمیں کھانا ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے، اس سے تو شخصی اور جماعتی کردار کی خرابیاں لازم آتی ہیں، اخلاقی زندگی پر دھبہ پڑتا ہے اور روح داغدار ہو جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے سے، قسم کھاتے رہنے سے کون سی روحانی و اخلاقی قباحت کس قسم کی اور کس درجہ میں پیدا ہوتی ہے کہ ان خدائی قسموں کی حکمت اور مصلحت تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

قرآن مجید کے موجودہ ذخیرۂ الفاظ 78 ہزار ہیں، وہ تو کہیے کہ قسم والے لفظ اکائیوں سے کچھ ہی گزر کر دہائی تک پہنچے ہیں، لیکن اگر اس سے کئی گنا زائد ہوتے، سب کے سب یہی ہوتے تو اس سے کائنات، نظمِ کائنات میں کون سی خرابی لازم آئی جاتی تھی؟

تو مدّعا یہ ہے کہ خدا کو بندوں کے پیمانے سے ناپنے کا مطالبہ لامحدود کو محدود ٹھہرانا ہے، اور آفتاب کو ذرہ کے معیار سے جانچنے سے بھی کہیں زیادہ بے دلیل بلکہ خلافِ دلیل اور غیر معقول ہے۔{۷۹}

جو سوالات ہم نے ابتداء میں اٹھائے تھے اگرچہ ان کے جوابات مندرجہ بالا تحریر میں آ گئے ہیں، پھر بھی ہم اختصار کے ساتھ دوبارہ عرض کیے دیتے ہیں۔

پہلا سوال یہ تھا کہ قسموں کا فائدہ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ:

☆...... کسی بھی معاملے کا فیصلہ یا تو شہادت اور دلیل سے ہوتا ہے یا قسم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دلائل اور

{۷۹}(تفسیر ماجدی ۲/۷۴۹-۷۵۰)

شواہد بھی ذکر فرمائے ہیں اور قسمیں بھی کھائی ہیں تا کہ منکرین کے پاس کوئی حجت اور عذر باقی نہ رہے۔

☆......حضورِ اکرم ﷺ کا قسمیں کھانے کے باوجود نحوست اور وبال سے بچا رہنا خود مشرکین کے عقیدہ اور قول کے مطابق آپ کی سچائی کی واضح دلیل تھی۔

☆......ان قسموں کی حقیقت استدلال اور استشہاد کی تھی۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ تعظیم و تکریم کی مستحق نہیں تو ہم نے عرض کر دیا کہ:

☆......اہلِ عرب ان چیزوں کو قابلِ احترام جان کر قسمیں کھاتے تھے۔

☆......مخلوقات اللہ کے خالق اور صانع ہونے پر دلالت کی وجہ سے قابلِ احترام ہیں۔

☆......یہ قسمیں محض ایک ادبی اور انشائی تقاضا پورا کرنے کے لیے ہیں مخلوق کے واجب التعظیم ہونے کی وجہ سے نہیں۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ زیادہ قسمیں کھانے والے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ:

☆......اللہ پر وہ اصول اور قاعدے جاری نہیں ہوتے جو اس کے بندوں پر نافذ اور جاری ہوتے ہیں۔

☆......عرب کے فصحاء، خطباء اور شعراء کے ہاں یہ کوئی معیوب چیز نہیں۔

☆......یہ شواھد ہیں جو قسموں کے انداز میں ذکر کیے گئے ہیں۔

☆......اللہ تعالیٰ کا بار بار قسمیں کھانا بندوں کی خیر خواہی کے لیے ہے تا کہ بندوں کو قرآنِ کریم کی ابدی صداقتوں اور ایمانی حقیقتوں پر یقین آ جائے۔

بعض کتابوں میں امام اصمعی رحمہ اللہ کے حوالے سے ایک بدّو کا واقعہ لکھا ہے کہ جب اس نے سورۂ ذاریات کی یہ آیات سنیں:

﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝٢٢ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ﴾ {۸۰}

"تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ آسمانوں میں ہے، آسمان اور زمین کے رب کی قسم! یہ حق ہے۔"

تو اس نے چیخ ماری اور کہا:

من الذی أغضب الجلیل حتّٰی الجاہ إلی الیمین؟

"کون ہے جس نے ربِ جلیل کو غضبناک کر دیا اور قسم کھانے پر مجبور کر دیا؟"

یہ جملہ اس نے تین بار دہرایا اور پھر انتقال کر گیا۔ {۸۱}

{۸۰}(الذاریات ۵۱/۲۲-۲۳)

{۸۱}(البرھان ۳/۴۶......الزرکشی)

آخر میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھا جائے کہ مکی سورتوں میں تو قسمیں ملتی ہیں مگر مدنی سورتوں میں نہیں، اس لیے کہ مدنی سورتوں میں مسائل و احکام اور قوانین زیرِ بحث آئے ہیں اور قانون کی کتابوں میں قسموں کا رواج نہ پہلے تھا نہ اب ہے جبکہ مکی سورتوں کا موضوع عقائد و نظریات تھے جنہیں پوری طرح ماننے کے لیے بت پرستی کے عادی انسان بالکل آمادہ نہ تھے، طبیعتیں سرد تھیں اور دل نجاست میں لت پت، مادیت کے سحر نے روحانیت کا نام بھی بھلا دیا تھا، یہ وہ ماحول تھا جس میں بقول مولانا دریا آبادی رحمہ اللہ ''قرآن خطیبِ بے بدل بن کر آیا، واعظِ شیوہ بیاں بن کر گرجا اور برسا، دلوں کے اندر وہ آگ لگا دی کہ سننے والے مبہوت و ششدر، خود اس کو بہترین شعر، شعر کا نمونہ سحر ٹھہرانے لگے، طرح طرح کے واسطے دلانے کا سامنے کی چیزوں کو قدرتِ باری پر گواہ لانے کا، جن جن چیزوں کی عظمت کی قسمیں خود مخاطبین کھایا کرتے تھے، جن کی افادیت کا کلمہ پڑھتے تھے، ان ہی کو ان پر الٹ الٹ کر ان سے اثباتِ توحید اور ردِ شرک پر استدلال کا موقع اب نہ ہوتا تو کب ہوتا۔''

جب خوابیدہ، بیدار ہو گئے، نجاست سے آلودہ دل پاک ہو گئے، شرک سے نفرت ہو گئی، آخرت کا یقین دلوں میں راسخ ہو گیا، اللہ سے ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا تو اب قسموں کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اسی لیے ہمیں مدنی سورتوں میں قسمیں نہیں ملتیں۔

آخر میں بحث کی مناسبت سے ہم بندوں کے لیے قسم کے بعض احکام ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

۱...... ہر چھوٹی بڑی بات پر قسم کھانے کی عادت بہر حال صحیح نہیں کیونکہ اس میں اللہ کے نام کی بے حرمتی لازم آتی ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ۸۹ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ''وَاحْفَظُوْٓا اَیْمَانَکُمْ'' (اپنی قسموں کی حفاظت کرو) اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''قسم کھانے میں جلد بازی سے کام نہ لو، اپنی قسم کو محفوظ رکھو جب تک شدید مجبوری نہ ہو قسم نہ کھاؤ۔'' {۸۲}

اگر کسی نے جائز بات پر قسم کھالی تو اسے پورا کرنا ضروری ہے، مذکورہ بالا جملے کا دوسرا مطلب یہی بیان کیا گیا ہے، قسم توڑنے کی صورت میں آخرت میں مواخذہ ہوگا اور دنیا میں کفارہ لازم آئے گا جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے۔ {۸۳}

بعض صورتوں میں قسم توڑنا واجب اور بعض میں مستحب ہوتا ہے، یہ صورتیں بھی پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

۲...... اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی دوسری چیز کی قسم کھانا جائز نہیں۔

{۸۲} (معارف القرآن ۳/۲۲۴ ...... حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ)
{۸۳} (دیکھیے تسہیل البیان ۲/۳۵۵)

رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اپنے باپ کے نام کی قسم کھا رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

﴿ألا ان اللہ ینھاکم أن تحلفوا بآباء کم فمن کان حالفا فلیحلف باللہ أو لیصمت﴾ {۸۴}

''سن لو! اللہ تمہیں اپنے باپوں کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، جس نے قسم کھانی ہو وہ اللہ کے نام کی کھائے ورنہ خاموش رہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں جو حدیث منقول ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

''اپنے باپوں اور اپنی ماؤں کی قسم نہ کھاؤ، اور نہ ہی بتوں کی قسم کھاؤ، صرف اللہ کے نام کی قسم کھایا کرو اور اللہ کے نام کی قسم بھی صرف اس وقت کھایا کرو جب تم سچے ہو۔'' {۸۵}

خود ہمارے آقا ﷺ جب کبھی قسم کھاتے تو ان الفاظ میں قسم کھاتے تھے:

''لا ومقلّب القلوب'' ''لا ومصرّف القلوب'' {۸۶} (نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، دلوں کو پھیرنے والے کی قسم!)

۳......جھوٹی قسم کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے شرک اور والدین کی نافرمانی کے بعد قسم کو تیسرا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ {۸۷}

ایکہ اور حجر والوں کا قصہ

﴿۷۸......۸۶﴾

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ ﴿۷۹﴾

اور تحقیق تھے بن کے رہنے والے گنہگار ○ سو ہم نے بدلہ لیا ان سے اور یہ دونوں بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر ○

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۸۰﴾ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۸۱﴾

اور بیشک جھٹلایا حجر والوں نے (حجر کے رہنے والوں نے) رسولوں کو ○ اور دیں ہم نے انکو اپنی نشانیاں سو رہے ان سے منہ پھیرتے (ان کو ٹالتے) ○

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿۸۲﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ

اور تھے کہ تراشتے تھے پہاڑوں کے گھر اطمینان کے ساتھ ○ پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے

{۸۴} (مسلم ۲، کتاب الایمان/۴۶)
{۸۵} (سنن النسائی ۲، کتاب الایمان والنذور/۱۴۲)
{۸۶} (سنن النسائی ۲، کتاب الأیمان والنذور/۱۴۱)
{۸۷} (بخاری ۲، کتاب الأدب/۸۸۴)

مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ

صبح ہونے (ہوتے) کے وقت O پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کمایا تھا O اور ہم نے بنائے نہیں آسمان

وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ

اور زمین اور جو ان کے بیچ میں ہے بغیر حکمت (تدبیر) اور قیامت بیشک آنے والی ہے سو کنارہ کر

الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

اچھی طرح کنارہ O تیرا رب جو ہے وہی ہے پیدا کرنے والا خبردار O

ربط: سورۂ حجر میں جو قصّے اللہ نے بیان فرمائے ہیں یہ ان میں سے تیسرا اور چوتھا قصّہ ہے، ان قصوں کے لانے سے مقصد عبادت واطاعت کی ترغیب اور گناہوں سے بچنے کی تلقین ہے۔

تسہیل: اور ایکہ کے رہنے والے بھی ظالم تھے O تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کے شہروں کے کھنڈرات شارع عام پر موجود ہیں O اور وادئ حجر کے رہنے والوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تھا O ہم نے انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں مگر وہ ان سے منہ پھیرتے رہے O اور وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے تھے تاکہ وہ ہر آفت سے محفوظ رہیں O پھر ایسا ہوا کہ صبح ہوتے ہی وہ ایک زبردست دھماکے کی لپیٹ میں آ گئے O اور جو کچھ انہوں نے کمایا تھا وہ ان کے کسی کام نہ آیا O اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے، اسے حکمت کے تحت پیدا کیا ہے اور قیامت بہر حال آ کر رہے گی پس آپ ان کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کیجیے O یقیناً تمہارا رب سب کچھ پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے O

تفسیر

﴿۷۸﴾ ...... "ایکہ" جھاڑیوں کے ایسے جھنڈ اور جنگل کو کہا جاتا ہے جہاں بڑے گنجان درخت ہوں، مدین والوں کو "اصحابِ ایکہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ جہاں وہ رہتے تھے وہاں بڑے سرسبز اور گھنے درخت تھے، {۸۸} چونکہ قریش کو خبردار کرنا مقصد ہے اس لیے یہاں ان قوموں کا ذکر مقامات اور بستیوں کی صراحت کے ساتھ آیا ہے جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوا، یہ بستیاں ایسی تھیں کہ جب قریش کے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے تھے تو ان کا گزر یہاں سے لازماً ہوتا تھا۔

{۸۸} وهم أصحاب الأيكة أى الشجر الكثير الملتف (صفوة التفاسير ۲/۱۱۴ ...... علامه الصابوني) والأيكة والليكة الشجرة الملتفة المتكاثفة (ابو السعود ۴/۳۰)

﴿لَظٰلِمِیْنَ﴾ کفروشرک ہو یا معصیت اور بندوں پر زیادتی، سب پر ظلم کا اطلاق ہوتا ہے، اگرچہ سب سے بڑا ظلم تو شرک ہی ہے جسے قرآن نے بھی "ظلمِ عظیم" قرار دیا ہے {۸۹} مگر فسق وفجور کو بھی قرآن نے اپنے اوپر ظلم قرار دیا ہے۔

جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تینوں قسم کے ظلم میں مبتلا تھیں۔

﴿۷۹﴾...... "فَانْتَقَمْنَا" سے مراد وہ سزا ہے جو ان کی بدعملیوں کی وجہ سے انہیں دی گئی،{۹۰} اس انتقام اور سزا کا تفصیلی ذکر سورۂ ہود وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

﴿وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ﴾ یہ دونوں یعنی اصحابِ ایکہ اور قومِ لوط کی بستیاں {۹۱} کسی دور دراز اور خفیہ علاقے میں نہیں بلکہ شارعِ عام پر واقع تھیں اور ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں جو یاد دلاتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں بھی زندگی ہنستی مسکراتی تھی اور تمہاری طرح انسان چلتے پھرتے اور ترقی کے منصوبے بناتے تھے، آج وہاں عبرت آموز ویرانے کے سوا کچھ نہیں۔

﴿۸۰﴾......اصحابِ حجر سے مراد قومِ ثمود ہے{۹۲} اور حجر مدینہ اور شام کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے، کسی زمانے میں اسے "وادیٔ قریٰ" کہا جاتا تھا آج کل "مدائنِ صالح" کہا جاتا ہے اور خیبر سے تبوک کی طرف جو راستہ جاتا ہے وہ یہیں سے گزرتا ہے۔

بعض افرنگی مستشرقین پتھروں سے تراشے ہوئے گھروں کو قبرستان قرار دیتے ہیں مگر ان کی اس نام نہاد تحقیق کو اول تو خود نولدیکی وغیرہ اہلِ افرنگ ہی نے غلط قرار دیا ہے دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ یہ غار نما گھر ہر قسم کے انسانی ڈھانچوں سے خالی ہیں، اگر یہ قبریں ہیں تو ڈھانچے کہاں گئے اور زندوں کے مکانات کہاں واقع تھے؟

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت جب عذاب آیا تو وہ کام کاج کے سلسلے میں اِدھر اُدھر منتشر تھے{۹۳} جو جہاں تھا وہ "صیحۃ" (دھماکے) کی لپیٹ میں آ گیا۔

﴿الْمُرْسَلِیْنَ﴾ اصحابِ حجر کی طرف صرف حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا جبکہ قرآن نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید ان کے لیے کئی پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ چونکہ

{۸۹} "انّ الشرك لظلم عظيم (لقمٰن ۱۳/۳۱)

{۹۰} "فانتقمنامنهم" جزا مادنسوابه أنفسهم من الكفروالمعاصى (المراغى ۴۰/۱۴)

{۹۱} "وانّهما" أى قرى قوم لوط ومحال أصحاب الأيكة (نظم الدرر ۲۳۲/۴)

{۹۲} "أصحٰب الحجر" يعنى ثمود (روح المعانى ۱۱۲/۱۴،۸)

{۹۳} والظاهر أن ثمود لماأخذتهم الصيحة كانوا منتشرين فى خارج البيوت (التحريروالتنوير ۷۳/۱۴/۷)

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا مشن اور پیغام ایک تھا اس لیے کسی ایک نبی کو جھٹلانا گویا تمام انبیاء کو جھٹلانا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ”الْمُرْسَلِيْنَ“ پر جو الف لام داخل ہے، اگر اسے جنس کے لیے لیا جائے تو اس لفظ کا اطلاق ایک پیغمبر پر بھی ہوسکتا ہے۔{۹۴}

﴿۸۱﴾......”ہم نے انہیں نشانیاں عطا کیں“ مشہور نشانی اور معجزہ تو ایک تھا جو قومِ ثمود کو عطا کیا گیا یعنی اونٹنی، مگر چونکہ وہ ایک معجزہ کئی معجزات کا مجموعہ تھا اس لیے اسے ”آیۃ“ سے نہیں ”آیات“ سے تعبیر کیا گیا، اس اونٹنی کا چٹان سے برآمد ہونا، اس کی زندگی، اس کا کھانا اور پینا ان میں سے ہر عمل معجزہ تھا{۹۵} یہ بھی ممکن ہے کہ اس مادی معجزہ کے علاوہ کچھ روحانی معجزات بھی انہیں دکھائے گئے ہوں۔

﴿۸۲﴾......ان کی مادی ترقی کا یہ حال تھا کہ ان میں ہر قسم کے انجینئر اور ماہرینِ تعمیرات موجود تھے، ممکن ہے ساری قوم ہی اس فن میں مہارت رکھتی ہو چنانچہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے گھر تعمیر کرتے تھے، یہ گھر ان کے لیے قلعوں کے بمنزلہ تھے جہاں دشمن کا پہنچنا ممکن نہ تھا اور یہی ایک خطرہ تھا جو ان کی خوش عیشی میں خللِ انداز ہوسکتا تھا، اس خطرے سے حفاظت کا مطلب ان کے خیال میں ہر خطرے سے حفاظت تھی، اللہ کی پکڑ کا تو انہیں کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔

﴿۸۳﴾......جب ان کا ظلم وعدوان حد سے تجاوز کر گیا تو ایک زبردست دھماکے نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ دھما کہ ان دھاریوں والے بادل سے ہوا جوان کی بستی پر چھا گیا تھا۔

﴿۸۴﴾......اس اچانک آنے والے عذاب سے انہیں نہ تو حفاظتی اسباب اور مضبوط قلعے بچا سکے اور نہ ہی علوم و فنون میں مہارت اور ہندسہ دانی اور انجینئرنگ میں کمال ان کے کسی کام آسکا۔

﴿۸۵﴾......ممکن تھا کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوتا کہ اللہ تو رحمٰن ورحیم ہے، انسانوں کو عذاب دینا اور ہلاک کرنا اس کی شان سے بعید ہے، تو یہاں اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسے ہم نے حق اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، کوئی چیز بھی بے مقصد اور فضول پیدا نہیں کی گئی، جب اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی عبث نہیں تو انسان جو کہ ”خلیفۃ اللہ“ ہے، اس کا دنیا میں آنا عبث اور بلا مقصد کیوں ہوگا؟ جب ہر چیز حق اور حکمت پر قائم نظام کے مطابق عمل کر رہی ہے تو انسان ہی کو یہ آزادی کیوں دی جائے کہ وہ قوانینِ قدرت سے بغاوت کرتے ہوئے نفسانی خواہشات کے مطابق زندگی گزارے اور سارے عالم کی بقاء اور امن کے لیے خطرہ بن جائے؟

{۹۴} وتعريف المرسلين ”للجنس“ (التحرير والتنوير۷، ۱۴/ ۷۳)

{۹۵} ”آيتنا“ أي كلها، بايتاء الناقة وسقيها وردها وشربها (نظم الدرر ۴/ ۲۳۲)...... من الناقة وسقيها وشربها وردها (روح المعاني ۸، ۱۴/ ۱۱۲)

باغیوں اور ظالموں کو اللہ مہلت دیتا ہے جب تک چاہتا ہے، جب مہلت کی مدت ختم ہو جائے تو اس کا عذاب سب کچھ تہ وبالا کر کے رکھ دیتا ہے، پھر ہنر مندی اور صناعی، حفاظتی اسباب اور سائنسی ترقی کسی کام نہیں آتی۔

﴿وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ﴾ جیسے مہلت اور عذاب عدل اور حکمت پر مبنی ہیں یونہی قیامت کا آنا بھی حق اور انصاف پر مبنی ہے، وہاں ہر شخص اپنا انجام دیکھ لے گا، دنیا میں تو ممکن ہے کہ بدعمل انجامِ بد سے بچ جائے کیونکہ دنیا عمل اور توبہ کی جگہ ہے جزا اور سزا کا محل نہیں مگر آخرت میں کوئی نہ بچ سکے گا سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی کو معاف فرما دے۔

﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ اے میرے پیغمبر! جزا اور سزا کا معاملہ ہمارے حوالے ہے اور اس کے لیے قیامت کا دن متعین ہے لہٰذا آپ ان کی مخالفت اور حرکتوں سے مایوس اور پریشان نہ ہوں اور خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرتے رہیں۔{۹۶}

﴿۸۶﴾...... یقیناً تمہارا رب "خلاّق" ہے "خلاّق" مبالغے کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے "بہت پیدا کرنے والا" کوئی انسان متعین طور پر نہیں بتا سکتا کہ اللہ کب سے پیدا کر رہا ہے اور اس نے کیا کچھ پیدا کیا ہے مگر وہ خود جانتا ہے کہ اس نے کیا پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا کیونکہ وہ "علیم" بھی ہے، اس کی کوئی تخلیق اور کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں، کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں ان دعوؤں کی دلیل ہے جو پچھلی آیت میں ذکر ہوئے، پہلا دعویٰ یہ تھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے ہم نے حق اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، دوسرا دعویٰ یہ تھا کہ قیامت آ کر رہے گی۔

﴿الْخَلَّاقُ﴾ کے لیے اپنی مخلوق کو نئے سرے سے پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں اور "علیم" کے لیے اپنے بندوں کے اقوال واعمال کا محاسبہ کرنا ذرا بھی دشوار نہیں۔

حکمت و ہدایت:

۱...... اصحاب ایکہ اور اصحابِ حجر کے انجام پر مشتمل ان آیات کے ضمن میں بعض مفسرین نے وہ روایات بھی نقل کی ہیں جو سفرِ تبوک سے تعلّق رکھتی ہیں، جب رسول اللہ ﷺ رومیوں سے مقابلہ کے لیے "حجر" اور قومِ ثمود کی سرزمین میں اترے تو صحابہ کرام سے فرمایا:

"یہ ان کی سرزمین ہے جن پر عذاب نازل ہوا لہٰذا جب تم ان لوگوں کے مکانات میں، جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، داخل ہو تو روتے ہوئے داخل ہو، اس ڈر سے کہ کہیں تم پر بھی وہ مصیبت نہ آ جائے جو ان پر آئی تھی۔"{۹۷}

{۹۶}"الصفح الجميل" أى فاعرض عنهم اعراضا جميلا، واحتمل اذاهم وعاملهم معاملة الصفوح الحليم (المراغى ۱۴/۴۲)...... أى فاعرض عنهم واحتمل ماتلقى منهم اعراضا جميلا بحلم واغضاء (كبير۷، ۱۹/۱۵۸)
{۹۷}(بخارى ۲، كتاب المغازى/۶۳۷)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

''یہاں کا پانی نہ پینا، اور نہ نماز کے لیے اس پانی سے وضو کرنا، اگر تم نے اس پانی سے آٹا گوندھ لیا ہو تو اسے اونٹوں کو کھلا دو اور خود اس میں سے ذرا سا بھی نہ کھاؤ۔'' {۹۸}

یہ بھی آپ کا فرمان ہے:

﴿لاتدخلوا ارض بابل فانها ملعونة﴾ {۹۹} ''بابل کی سرزمین میں داخل نہ ہو کیونکہ وہاں اللہ کی لعنت نازل ہوئی تھی۔''

ان روایات سے درجِ ذیل ہدایات حاصل ہوتی ہیں:

☆...... جہاں اللہ کا عذاب نازل ہوا ہو وہاں بغیر کسی مجبوری کے داخل ہونا مکروہ ہے یونہی کفار کے قبرستان میں بھی داخل ہونا صحیح نہیں، اگر داخل ہونا پڑ جائے تو اللہ کے عذاب سے پناہ مانگتے ہوئے جلدی سے گزر جانا چاہیے۔

☆......عذاب والی جگہ کا پانی پینا اور دوسری ضروریات میں استعمال کرنا بھی جائز نہیں۔

☆......امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس چیز کا کھانا یا پینا انسانوں کے لیے جائز نہ ہو وہ جانوروں کو کھلائی پلائی جاسکتی ہے کیونکہ وہ مکلف نہیں ہیں۔

☆......وہ آٹا جو حجر کے چشموں سے گوندھا گیا تھا، آپ نے اسے پھینکنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اونٹوں کو کھلانے کی اجازت دے دی جبکہ خیبر کے موقع پر آپ نے اہلی گدھوں کا گوشت پھینکنے کا حکم دیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گدھوں کے گوشت کی حرمت اور نجاست زیادہ شدید ہے۔

☆......نجس گوشت اور دوسری ناپاک خوراک کتوں کو کھلانے کے لیے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۲......انبیائے کرام علیہم السلام اور صالحین کے آثار اگر چہ کتنے ہی قدیم کیوں نہ ہوں، ان سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔

۳......ایسی جگہ جہاں اللہ کا عذاب نازل ہوا ہو، بعض علماء وہاں نہ صرف نماز پڑھنے سے منع کرتے ہیں بلکہ وہاں کی مٹی اور پانی سے تیمم اور وضو کی بھی اجازت نہیں دیتے، البتہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ مشرکین کے قبرستان کی پاک مٹی سے تیمم جائز ہے اور غیر مسلموں کی عبادت گاہ میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، اس موقع پر وہ حدیث بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے جو حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، اس میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سات مواقع پر

{۹۸} (سیرت ابن ہشام ۴/۱۷۵ ...... دار أحیاء التراث العربی)

{۹۹} (بحوالہ منیر ۱۴/۶۴)

نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے:

''کوڑا خانہ، بوچڑ خانہ، قبرستان، راستہ کے درمیان، حمام، اونٹوں کا باڑہ اور بیت اللہ کے اوپر۔'' {۱۰۰}

۴......ایسی زیرِ کاشت زمین جس میں کھاد کے طور پر گوبر وغیرہ ڈالا جائے، اس میں نماز جائز نہ ہوگی جب تک کہ اسے تین بار سیراب نہ کر دیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات

﴿۸۷......۹۹﴾

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا ○ مت ڈال اپنی آنکھیں

اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ

ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو اور نہ غم کھا ان پر اور جھکا اپنے بازو ایمان

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى

والوں کے واسطے ○ اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانے والا کھول کر ○ جیسا ہم نے بھیجا ہے ان

الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ

بانٹنے والوں پر ○ جنھوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں ○ سو قسم ہے تیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہے

اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

ان سب سے ○ جو کچھ وہ کرتے تھے ○ سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پرواہ نہ کر مشرکوں کی ○

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ

ہم بس (کافی) ہیں تیری طرف سے ٹھٹھے کرنے والوں کو ○ جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی سو عنقریب

يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

معلوم کر لیں گے ○ اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رکتا ہے ان کی باتوں سے ○ سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی

وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور ہو سجدہ کرنے والوں سے ○ اور بندگی کیے جا اپنے رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات ○

ربط: سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو دشمنوں کی ایذاؤں پر صبر کرنے اور ان کی شرارتوں کے جواب میں

{۱۰۰} (ترمذی ۱، ابواب الصلوٰۃ/۴۶)

درگزر سے کام لینے کا حکم دیا، یہاں ان نعمتوں کو ذکر کیا جارہا ہے جو خاص طور پر آپ کو عطا کی گئیں، کیونکہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جب وہ اپنے محسن کی نعمتوں کو یاد کرے تو اس کی راہ میں پیش آنے والی اذیتوں سے درگزر کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

تسہیل: ہم نے آپ کو سات آیات عطا کی ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم بھی دیا ہےO اور ہم نے کافروں کے مختلف گروہوں کو دنیا کا جو سامان دے رکھا ہے، آپ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور نہ ہی ان کی حالت پر کڑھتے رہیں، اور ایمان والوں کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آئیںO اور کہہ دیجیے کہ میں تو بس دوٹوک انداز میں عذاب سے ڈرانے والا ہوںO جیسا کہ ہم نے کتابِ الٰہی کو تقسیم کردینے والوں پر عذاب نازل کیاO جنہوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کردیےO تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گےO ان اعمال کے بارے جو وہ کرتے رہےO پس آپ کو جو حکم دیا گیا ہے وہ انہیں صاف صاف سنا دیجیے اور مشرکوں کی ذرا بھی پرواہ نہ کیجیےO آپ کو ان مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لیے ہم ہی کافی ہیںO جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود ٹھہراتے ہیں سو وہ عنقریب اپنا انجام جان لیں گےO ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کو دلی اذیّت ہوتی ہےO تو آپ اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرتے رہیں اور سجدہ کرنے والوں میں داخل رہیںO اور یقینی معاملہ پیش آنے تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیںO

﴿تفسیر﴾

سبعِ مثانی کیا ہے؟

﴿۸۷﴾......ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے آپ کو ''سبعِ مثانی'' عطا کیا ہے، ''سبعِ مثانی'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں تین اقوال زیادہ مشہور ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ اس سے سورۂ فاتحہ مراد ہے، سورۂ فاتحہ کے متعدد ناموں میں سے ایک نام سبعِ مثانی بھی ہے، مثانی، مثنٰی کی جمع ہے جس کا معنی ہے وہ چیز جسے بار بار دہرایا جائے۔{۱۰۱}

سورۂ فاتحہ کی سات آیات قرآنِ کریم کی آیات میں سے سب سے زیادہ دہرائی جانے والی سات آیات ہیں جنہیں ہر مسلمان ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھتا ہے{۱۰۲} اِلّا یہ کہ وہ امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو۔

{۱۰۱} "المثانی"...... جمع مثنّٰی...... من ثنّی إذا کرّر تکریرۃ (التحریر والتنویر ۷، ۸۰/۱۴)

{۱۰۲} ھی الفاتحۃ التی تثنی وتکرر فی کل صلاۃ (المراغی ۴۵/۱۴)، انھا تثنیٰ فی کل صلاۃ (کبیر ۷، ۱۵۹/۱۹)

لغت کے علاوہ حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابوسعید بن معلّٰی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا، اسی دوران نبی کریم ﷺ میرے قریب سے گزرے، آپ نے مجھے بلایا، میں نے فوراً کوئی جواب نہ دیا بلکہ نماز سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے تاخیر کی وجہ دریافت فرمائی، میں نے عرض کیا میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا؟ ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کا رسول جب تمہیں پکارا کریں تو ان کی پکار کا جواب دو۔''

اس کے بعد آپ نے فرمایا، کیا میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کی سب سے بڑی سورت نہ سکھاؤں؟ پھر جب آپ مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے آپ کو وعدہ یاد دلایا تو آپ نے فرمایا ''الحمد للہ رب العلمین'' یہ سبعِ مثانی اور قرآنِ عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔'' {۱۰۳}

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿أم القرآن هي السبع المثاني والقرآن العظيم﴾{۱۰۴} ''سورۂ فاتحہ ہی سبعِ مثانی اور قرآنِ عظیم ہے۔''

اس روایت میں سبعِ مثانی اور قرآنِ عظیم دونوں کا مصداق سورۂ فاتحہ کو ٹھہرایا گیا ہے، فاتحہ پر قرآنِ عظیم کا اطلاق کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی سورت اسلام کے تمام اصولوں پر مشتمل ہے {۱۰۵} اس لیے جزء پر کل کا اطلاق کر دیا گیا ہے اور عربی زبان میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سبعِ مثانی سے مراد سارا قرآن ہے، اس قول کے قائلین درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾{۱۰۶} ''اللہ نے ایک متشابہ مثانی کی صورت میں بہترین کلام نازل کیا ہے۔''

قرآنِ کریم متشابہ بھی ہے اور مثانی بھی، متشابہ سے مراد یہ ہے کہ اس کی سورتیں اور آیات رنگ و آہنگ، مضامین اور تاثیر میں ملتی جلتی ہیں اور مثانی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو بار بار پڑھا جاتا ہے۔

{۱۰۳} (بخاری ۲، کتاب التفسیر ۶۸۳)

{۱۰۴} (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۳)

{۱۰۵} لاشتمالها علىٰ مايتعلّق بأصول الاسلام (قرطبی ۱۰/۵۲)

{۱۰۶} (الزمر ۳۹/۲۳)

پاک و ہند میں مکتب فراہی کے جو پیروکار ہیں وہ مثانی کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ:

''قرآنِ کریم کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں، ہر سورت اپنے ساتھ اپنا ایک مثنی بھی رکھتی ہے'' اپنے اس دعوٰی کی تفصیل وہ یوں کرتے ہیں کہ ''قرآن میں سورتوں کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان کے الگ الگ سات گروپ یا سات مجموعے بن گئے ہیں، ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے، اس طرح قرآن گویا سات ابواب پر مشتمل ہے جن کے اندر سورتوں کی حیثیت فصلوں کی ہے، ان ابواب اور ان فصلوں میں مضامین مشترک بھی ہیں اور ہر باب اور ہر فصل کا ایک خاص امتیازی پہلو بھی ہے جو ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے، سورۂ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے جس میں اجمال کے ساتھ وہ تمام مطالب آگئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔''{۱۰۷}

اکثر مفسرین نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔{۱۰۸}

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ صحیح احادیث میں سورۂ فاتحہ کو ''سبع مثانی'' کا مصداق قرار دیا گیا ہے لیکن اگر سات لمبی سورتوں یا قرآنِ کریم کو ''مثانی'' کی صفت پائے جانے کی وجہ سے یہ نام دے دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب رسولِ اقدس ﷺ سے اس مسجد کے بارے میں سوال کیا گیا جس کی بنیاد تقوٰی پر رکھی گئی ہے تو آپ نے اپنی مسجد کی طرف اشارہ فرمایا{۱۰۹} حالانکہ یہ آیت مسجدِ قباء کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اصولی بات یہ ہے کہ جب دو چیزیں کسی صفت میں مشترک ہوں تو ان میں سے ایک کے ذکر کرنے سے دوسرے کی نفی نہیں ہوتی۔{۱۱۰}

﴿۸۸﴾......اس آیتِ کریمہ میں ہمارے آقا ﷺ کو تین حکم دیئے گئے ہیں، ہم نے محض مفہوم کے اعتبار سے انہیں حکم کہا ہے ورنہ لفظی اعتبار سے یہ آیت ایک حکم اور دو نہی پر مشتمل ہے۔

اس سے قبل والی آیت میں نعمتِ قرآن کا ذکر تھا تو اب گویا کہا جا رہا ہے کہ اس عظیم ترین نعمت کے مقابلے میں دنیا کی ساری چمک دمک اور مال و دولت سے مستغنی ہو جایئے جو کفار کو دیا گیا ہے، قرآن جیسی بے مثال دولت کے مقابلے میں دنیا بھر کے خزانوں اور تاج و تخت کی حیثیت ہی کیا ہے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

{۱۰۷} (تدبر قرآن ۴/۳۷۸)
{۱۰۸} تفصیل کے لیے دیکھیے کبیر، روح المعانی، قرطبی، ابن کثیر وغیرہ
{۱۰۹} فقال رسول اللہ ﷺ: ھو مسجدی ھذا (ترمذی ۲، ابواب التفسیر/۱۳۶)
{۱۱۰} (ابنِ کثیر ۲/۲۶۷)

"جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی نعمت عطا کی ہو پھر بھی وہ دنیاداروں کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہے تو:

﴿فقد صغر عظيما وعظم صغيرا﴾ {۱۱۱} "اس نے بڑی چیز کو چھوٹا اور چھوٹی چیز کو بڑا سمجھا۔"

﴿أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ کا ترجمہ "کافروں کے مختلف گروہ" کیا گیا ہے، دنیا کی نعمتوں سے مسلمان اور کافر بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، کافروں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ آخرت پر ایمان نہ ہونے، دنیا ہی کی زندگی کو سب کچھ سمجھنے اور حلال حرام کا امتیاز اٹھا دینے کی وجہ سے وہ دنیا سے کمال درجہ کی لذّت حاصل کرتے ہیں مگر لذّت کے مواقع سارے کفار کو حاصل نہیں ہوتے، ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہائی ذلّت، خساست، غربت اور مظلومیت کی زندگی گزارتے ہیں اور کامل مصداق ہوتے ہیں "خسر الدنيا والآخرة" کا، دنیا میں بھی پریشان رہے اور آخرت بھی کفر کی وجہ سے تباہ کرلی۔

نبی اکرم ﷺ کی شان اور مقام سے یہ تو تصوّر بھی محال ہے کہ آپ معاذ اللہ! کافروں اور مشرکوں کی ثروت وغنا اور عیش وعشرت کو حرص اور حسرت کی نظر سے دیکھتے ہوں کہ اے کاش! یہ سب کچھ مجھے حاصل ہوتا، البتہ یہ ممکن ہے کہ بغض فی اللہ کے جذبہ سے آپ کو اللہ کے دشمنوں کے پاس نعمتوں کی فراوانی دیکھ کر غصہ آتا ہو، یہ بھی خیال آتا ہوگا کہ کہیں ضعیف الایمان لوگ کفار کے پاس مال و دولت کی بہتات دیکھ کر متاثر نہ ہو جائیں اور اسے ان کی صداقت کی دلیل نہ سمجھ لیں۔

"بغض فی اللہ" کا یہ جذبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا میں بھی نظر آتا ہے:

﴿رَبَّنَآ إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾ {۱۱۲}

"یہ اللہ ہی کی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ آپ ان کے لیے نرم دل واقع ہوئے ہیں اور اگر خدانخواستہ آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، تو آپ ان کو معاف کر دیجیے اور اللہ سے ان کے لیے مغفرت طلب کیجیے اور خاص خاص باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہیں۔"

یہ ساری تاویل اور تفسیر تو تب ہوگی جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ خطاب بھی حضور اکرم ﷺ سے ہے اور مراد بھی

{۱۱۱}(التفسير المنير ۱۴/۷۰)

{۱۱۲}(یونس ۱۰/۸۸)

آپ ہیں وگرنہ قرآنِ کریم میں بہت سارے مقامات ایسے ہیں جہاں خطاب تو یقیناً آپ سے ہے مگر اشارہ دوسروں کی طرف ہے، ممکن ہے یہاں بھی ایسے ہی ہو۔

﴿وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ﴾ دوسرا حکم اس آیتِ کریمہ میں آپ کو یہ دیا گیا ہے کہ ''آپ ان کی حالت پر کڑھتے نہ رہا کریں۔''

ایمان کی دعوت کے باوجود کفر پر اصرار کرنے والوں کی حالت پر آپ ﷺ کا کڑھنا متعدد آیات سے ثابت ہے، مثلاً سورۂ کہف کی یہ آیت:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِمۡ إِن لَّمۡ يُؤۡمِنُواْ بِهَٰذَا ٱلۡحَدِيثِ أَسَفًا﴾ {۱۱۳} ''اے پیغمبر! شاید ان کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنے آپ کو غم کی وجہ سے ہلاک کر دیں گے۔''

﴿وَٱخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ ''اور ایمان والوں کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آئیں۔''

یہ تیسرا حکم ہے جو آپ کو دیا گیا ہے یعنی مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور تواضع سے پیش آئیں اور ان پر سختی نہ کریں، ہمارے آقا ﷺ کی سیرت اس حکم کی عملی تفسیر تھی اور اس کی گواہی خود اللہ نے دی:

﴿فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ لِنتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلۡقَلۡبِ لَٱنفَضُّواْ مِنۡ حَوۡلِكَ فَٱعۡفُ عَنۡهُمۡ وَٱسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِ﴾ {۱۱۴} ''یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ ان کے حق میں نرم ہیں، اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ سے بھاگ کھڑے ہوتے، تو ان سے معافی والا معاملہ فرمائیں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب فرمائیں اور اپنے امور میں ان سے مشاورت رکھیں۔''

﴿۸۹﴾...... پہلے حکم دیا گیا کہ ''ان کی حالت پر کڑھتے نہ رہا کریں۔'' اب فرمایا جا رہا ہے کہ ہٹ دھرمی کرنے والوں سے کہہ دیجیے کہ ''میں تو بس دوٹوک انداز میں ڈرانے والا ہوں۔'' یہ گویا لاتعلقی کا اعلان ہے، اس پر قرینہ یہ ہے کہ یہاں صرف ''نذارۃ'' (ڈرانے) کا ذکر ہے بشارت کا نہیں۔

''نذارۃ'' ہی مکذّبین کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک ضد سے دوسری ضد خود بخود سمجھ آ جاتی ہے، حدیث میں بھی آپ ﷺ کے نذیر (خبردار کرنے والا) ہونے کا ذکر آیا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''میری مثال اور جو کچھ اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص اپنی قوم کے پاس آئے

{۱۱۳} (الکہف ۱۸/۶)
{۱۱۴} (آلِ عمران ۳/۱۵۹)

اور کہے، اے میری قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے لشکر کو دیکھا ہے جو تمہارے اوپر حملہ آور ہوا چاہتا ہے اور میں صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں لہٰذا اپنے بچاؤ کا سامان کرلو اور حفاظت کی تدبیر کرلو، اس کی قوم کے کچھ لوگوں نے اس کی اتباع کی اور رات ہوتے ہی کہیں نکل گئے اور نجات پاگئے مگر دوسرے گروہ نے اسے جھوٹا قرار دیا اور اپنی جگہ ٹھہرے رہے، صبح ہوتے ہی لشکر نے اس پر حملہ کردیا اور انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، تو یہ ہے مثال اس شخص کی جو میری اطاعت کرتا ہے اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس کی اتباع کرتا ہے اور اس شخص کی جو میری نافرمانی کرتا ہے اور اس حق اور سچ کو جھٹلاتا ہے جو میں لے کر آیا ہوں۔" {۱۱۵}

تقسیم کرنے والے:

﴿۹۰-۹۱﴾......﴿كَمَآ اَنْزَلْنَا﴾ "جیسا کہ ہم نے نازل کیا" اس آیتِ کریمہ میں تشبیہ دی گئی ہے اس چیز کے ساتھ جو تقسیم کرنے والوں یا قسمیں اٹھانے والوں پر اللہ نے نازل فرمائی ہے، سوال یہ ہے کہ اس آیت میں مشبہ بہ تو آ گیا (یعنی وہ چیز جس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے) مگر مشبّہ کیا ہے؟ (یعنی وہ جسے تشبیہ دی گئی ہے) تو اس بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں {۱۱۶} معنی یہ بنے گا کہ ہم نے آپ پر ویسے ہی قرآن نازل کیا جیسے ہم نے یہود و نصاریٰ پر تورات اور انجیل نازل کی اور وہ ایسے بدبخت لوگ تھے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو حصوں اور اجزاء میں تقسیم کردیا، جسے چاہتے ظاہر کردیتے اور جسے چاہتے چھپا دیتے، اس صورت میں "قرآن" اپنے لغوی معنی میں ہوگا یعنی وہ چیز جسے پڑھا جاتا ہے اور لغوی معنی کے اعتبار سے "قرآن" کا اطلاق تورات اور انجیل پر بھی ہوسکتا ہے {۱۱۷} مگر دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ قرآن اپنے اصطلاحی معنی میں ہے اور اس سے مراد وہ کتابِ ہدایت ہے جو سرورِ دو عالم ﷺ پر نازل ہوئی، یہود و نصاریٰ نے ایمان اور انکار کے اعتبار سے اس کتابِ ہدایت کو اجزاء میں تقسیم کر رکھا تھا، اس کے جو اجزاء اور آیات ان کی مرضی کے موافق ہوتے ان پر ایمان لے آتے اور جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتے ان کا انکار کردیتے۔ {۱۱۸}

اس معنیٰ کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ {۱۱۹}

{۱۱۵} (بخاری ۲، کتاب الاعتصام/۱۰۸۱، مسلم ۲، کتاب الفضائل/۲۴۸)

{۱۱۶} المقتسمین هم الیهود والنصاریٰ (کبیر۷، ۱۹/۱۶۲)، وتفسیر "المقتسمین" المذکورین بأهل الکتاب مماروی عن الحسن وغیره (روح المعانی ۸، ۱۴/۱۱۹)

{۱۱۷} فیکون القرآن مصدرا أطلق بمعناه اللغوی أی المقروء من کتبهم (التحریروالتنویر۷، ۱۴/۵۸)

{۱۱۸} قال ابن عباسؓ: هم أهل الکتاب آمنوا ببعضه و کفروا (قرطبی ۱۰/۵۴)

{۱۱۹} عن ابن عباس: "کماأنزلنا علی المقتسمین" قال: آمنوا ببعض و کفروا ببعض الیهود والنصاریٰ (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۳)

مشبّہ کے بارے میں دوسری رائے مفسرین کی یہ ہے کہ اس سے مراد انذار اور عذاب ہے جو کہ آیت نمبر ۸۹ سے سمجھ آ رہا ہے، معنی یہ ہوگا کہ قریش کو بھی اس جیسے عذاب سے ڈرائیے جیسا عذاب ہم نے تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا تھا۔ یہ عذاب بنو قریظہ اور بنو نضیر پر نازل ہوا تھا اور انہیں بصد ذلت و رسوائی اپنے گھروں اور قلعوں سے نکلنا پڑا تھا۔

یہ مفہوم اس صورت میں ہوگا جب ہم ان آیات کو مدنی تسلیم کریں اور اگر ان کے مکی ہونے کا دعوٰی کیا جائے تو کہا جائے گا کہ مستقبل میں ان کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اس کی طرف اشارہ ہے، قرآن میں یہ اسلوب عام ہے کہ جس چیز کا ہونا یقینی ہوتا ہے اس کے لیے ماضی کا صیغہ لایا جاتا ہے، قیامت کا واقعہ جو ظاہر ہے مرنے کے بعد پیش آئے گا، اسے قرآن نے متعدد مقامات پر ماضی کے صیغوں میں بیان کیا ہے، یہاں بھی عذاب کا وقوع یقینی ہونے کی وجہ سے ماضی کا صیغہ لایا گیا ہے اور اسے ہم قرآن کا اعجاز ہی کہیں گے کہ مستقبل کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا وہ ہو کر رہا۔ {۱۲۰}

﴿الْمُقْتَسِمِيْنَ﴾ سے مراد اہلِ کتاب ہیں مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ منقول ہے کہ اس سے مراد قریش ہیں جو مکّہ کے مختلف راستوں کو تقسیم کر کے ان پر بیٹھ جاتے تھے اور باہر سے آنے والوں کو آنحضور ﷺ کے بارے میں بدگمان کرتے اور انہیں قبولِ اسلام سے روکتے تھے۔

مقاتل اور فراء اسی قول کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سولہ افراد تھے جنہیں ولید بن مغیرہ حج کے دنوں میں مکّہ کی مختلف گھاٹیوں، وادیوں اور گزرگاہوں پر یہ تاکید کر کے بٹھا دیتا تھا کہ یہاں سے گزرنے والوں کو سمجھاؤ کہ مکّہ میں ایک ایسا شخص ہے جو نبوت کا دعوٰی کرتا ہے، اس کی باتوں سے دھوکہ نہ کھانا وہ پاگل ہے، پھر ان میں سے کوئی آپ کو ساحر، کوئی شاعر اور کوئی کاھن قرار دیتا، انہیں "الْمُقْتَسِمِيْنَ" اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ مخالفانہ اور معاندانہ پروپیگنڈا کے لیے مکّہ کے راستوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے تھے، ان سب فسادیوں کو اللہ تعالیٰ نے بدترین موت سے دوچار کیا۔ {۱۲۱}

چوتھا قول یہ ہے کہ "الْمُقْتَسِمِيْنَ" سے مراد قسمیں اٹھانے والے ہیں، عاص بن وائل عتبہ، شیبہ اور ابوجہل وغیرہ ایسے لوگ تھے جو دارالندوہ میں جمع ہو کر اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کے قلع قمع پر قسمیں اٹھا کر عہد کیا کرتے تھے مگر ان کی قسمیں اور ارادے ان کی بدبودار لاشوں کے ساتھ ہی سرزمینِ عرب میں دفن ہو کر رہ گئے۔

امام بخاری اور حضرت مجاہد تابعی رحمہما اللہ وغیرہ بھی اس آخری قول کی تائید کرتے ہیں۔ {۱۲۲}

{۱۲۰}(تفسیر ماجدی ۲/۷۵۹)
{۱۲۱}(کبیر ۷، ۱۹/۱۶۲)
{۱۲۲}"المقتسمین" أی الّذین حلفوا (بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۳) قال مجاهد تقاسموا تحالفوا
(بخاری ۲، کتاب التفسیر/۶۸۳)

مفسرین کے مختلف اقوال کے بارے میں یہ وضاحت ہم پہلے بھی کر چکے ہیں اور یہاں بھی اس کی یاد دہانی مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ اختلاف تنوع پر مبنی ہے تضاد پر نہیں، اگر ہم یہ کہیں کہ "الْمُقْتَسِمِيْنَ" کا مصداق اہلِ کتاب بھی بن سکتے ہیں اور قریش بھی اور اس کا معنی تقسیم کرنے والے بھی ہو سکتا ہے اور قسمیں اٹھانے والے بھی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قیامت کے دن سوال:

﴿۹۲-۹۳﴾......﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ......الخ﴾ "تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ان سے ضرور سوال کریں گے......" کیا مومن اور کیا کافر، قیامت کے دن ہر کسی کا محاسبہ ہوگا، سوائے ان خوش نصیبوں کے جنہیں بغیر حساب کے جنت میں داخل کر دیا جائے گا، سوال ہوتا ہے کہ کیا کفار اور مشرکین سے بھی سوال ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ قرآن سے تو یہی ثابت ہوتا ہے، سورۂ غاشیہ میں ہے:

﴿اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۙ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴾{۱۲۳} "بے شک ہماری طرف انہیں لوٹ کر آنا ہے اور ہمارے ذمہ ہی ان کا حساب ہے۔"

یونہی سورۂ صافات میں ہے:

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ﴾{۱۲۴} "انہیں روکیے! ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔"

بعض حضرات کو ان آیات کی وجہ سے اشکال پیش آتا ہے جن میں سوال کی نفی کی گئی ہے، سورۂ رحمٰن میں ہے:

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ﴾{۱۲۵} "قیامت کے دن نہ انسانوں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا نہ جنوں سے۔"

سورۂ آلِ عمران میں سرے سے تکلم اور خطاب کی نفی کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾{۱۲۶} "قیامت کے دن اللہ ان سے بات نہیں کرے گا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت میں مختلف مواقع ہوں گے، بعض مواقع پر سوال ہوگا اور بعض میں سوال نہیں ہوگا۔{۱۲۷}

دوسرا جواب وہ ہے جو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ معلومات کے حصول کے لیے تو کسی مجرم سے سوال نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے البتہ زجر و توبیخ کے لیے

{۱۲۳} (الغاشیۃ ۸۸/۲۵-۲۶)

{۱۲۴} (الصّافّات ۳۷/۲۴)

{۱۲۵} (الرّحمٰن ۵۵/۳۹)

{۱۲۶} (آلِ عمران ۳/۷۷)

{۱۲۷} قال عکرمۃ: القیامۃ مواطن، یسأل فی بعضھا ولا یسأل فی بعضھا (قرطبی ۱۰/۵۷)

سوال ضرور کیا جائے گا{۱۲۸} گویا قرآن میں نفی اور چیز کی ہے اور اثبات کسی اور چیز کا۔

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ اور دوسرے متعدد علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جس سوال کا ذکر ہے وہ سوال کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ اور اس کے حقوق وواجبات وغیرہ کے بارے میں ہوگا۔{۱۲۹}

حقوق وواجبات ادا کیے بغیر محض زبان سے ''لا الہ الا اللہ'' کہہ دینا آسان ہے مگر اس کا اخلاص اور کمال بڑے مجاہدے سے حاصل ہوتا ہے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

سوال کیا گیا یا رسول اللہ! کلمہ کا اخلاص کیا ہے؟

فرمایا: ''یہ کہ کلمہ طیبہ اسے اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔''{۱۳۰}

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس کے مفہوم کی تائید متعدد آیات اور احادیث سے ہوتی ہے، آپ صرف اس صحیح حدیث ہی کو لے لیجیے جو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی نفسانی خواہشات میری لائی ہوئی ہدایات کے تابع نہ ہوجائیں۔''{۱۳۱}

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا یہ قولِ زریں ہم غالباً پہلے بھی نقل کرچکے ہیں کہ:

﴿لیس الایمان بالتحلّی ولا بالتّمنّی ولٰکن ما وقر فی القلب وصدّقتہ الأعمال﴾{۱۳۲}

''ایمان زیب و زینت سے حاصل ہوتا ہے اور نہ تمناؤں سے بلکہ جو دل میں قرار پکڑ جائے اور اعمال جس کی تصدیق کریں وہی ایمان ہے۔''

﴿۹۴﴾...... جب محاسبہ اور جزا و سزا ہمارے ذمہ ہے اور دعوت و انذار آپ کے ذمہ ہے اور خفیہ دعوت وتبلیغ کا مرحلہ انتہا کو پہنچ چکا تو اب آپ پیامِ رسالت کھول کر اور تفصیل سے بیان کردیجیے۔{۱۳۳}

یہ آیتِ کریمہ نبوت کے چوتھے یا پانچویں سال اس وقت نازل ہوئی جب آپ اپنے اصحاب کے ساتھ دارارقم میں چھپ کر نماز ادا کیا کرتے تھے اور ایمان کی دعوت کا سلسلہ بھی یہیں جاری رہتا تھا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

{۱۲۸} ''لنسألنّھم'' ای فلنسألن الکفار جمیعا سوال تأنیب وتوبیخ لھم (المراغی ۱۴/۴۷) قال ابن عباس: انّما یسئلون سؤال التقریع (کبیر۷، ۱۹/۱۶۴)

{۱۲۹} (تفسیر القیم/۳۹۶)

{۱۳۰} (الدرالمنثور ۲/۲۳۷)

{۱۳۱} (رواہ البغوی بحوالہ معارف الحدیث ۱/۱۳۷)

{۱۳۲} اقتضاء العلم العمل/۴۳......للخطیب البغدادی)

نے بھی یہیں اسلام قبول کیا تھا، اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے علانیہ تبلیغ شروع فرمادی۔

﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ مشرکوں کی حرکتوں، استہزاء اور مخالفت سے آپ اعراض اور درگزر فرمایئے اور اپنے کام میں لگے رہیے۔

﴿۹۵-۹۶﴾......ان مذاق اڑانے والوں کے شر سے آپ کو بچانے کے لیے ہم ہی کافی ہیں، ان مذاق اڑانے والوں میں ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، حارث بن طلاطلہ، اسود بن مطلب اور اسود بن یغوث کے نام خاص طور پر مفسرین نے ذکر کیے ہیں{۱۳۴} لیکن اگر ان کے نام متعین نہ بھی ہوسکیں یا ان پانچ کے علاوہ بھی کچھ بدبخت اپنی آخرت تباہ کرنے والوں میں شامل ہوں تو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ نزولِ قرآن کے ابتدائی زمانے میں بااثر لوگوں کا ایک پورا گروہ ایسا تھا جو اللہ کے احکام اور رسولِ اکرم ﷺ کی ذات کا مذاق اڑایا کرتا تھا{۱۳۵} اس طبقے کے جو سرغنہ تھے وہ سب کے سب عبرت آموز انجام سے دوچار ہوئے جس کی تفصیل بعض تفسیروں میں دیکھی جاسکتی ہے{۱۳۶} ان سرغنوں کی ہلاکت اگر حضورِ اقدس ﷺ کی کفایت اور حفاظت کا غیبی انتظام تھا تو ظاہری طور پر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما جیسے دبنگ انسانوں کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوجانے اور نومسلموں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا، مسلمانوں کے حوصلوں کو تقویت ملی جبکہ مشرکین نفسیاتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے، اس ٹوٹ پھوٹ نے ان کی پے درپے شکستوں کی راہ ہموار کی۔

﴿۹۷﴾......کفایت وحفاظت کے وعدے سوفیصد برحق تھے، ان وعدوں پر یقین کے باوجود حضورِ اکرم ﷺ کو مشرکین کے کفروشرک، ضدوعناد اور تمسخر واستہزاء سے قلبی اذیت ہوتی تھی چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ آپ کے قلبی انقباض کا ہمیں پورا پورا علم ہے اور اس کا علاج بھی ہم بتائے دیتے ہیں، وہ یہ کہ:

﴿۹۸﴾......آپ اللہ کے ذکر، تسبیح وتقدیس اور نماز میں اپنے آپ کو مشغول کرلیجیے، اس مشغولیت سے آپ پر عالمِ قدس کے انوار کا فیضان ہوگا اور دل کی گھٹن اور انقباض ختم ہوجائے گا۔{۱۳۷}

{۱۳۳} "فاصدع" صدع الأمر أى فصله (المفردات/۲۷۶)......والصدع: الجهر والاعلان وأصله الانشقاق (التحرير والتنوير۷، ۱۴/۸۸)

{۱۳۴} (دیکھیے قرطبی ۱۰/۵۸...... روح المعانی ۸، ۱۴/۱۲۶، روح المعانی میں "حارث بن طلاطلہ" کے بجائے "حارث بن عطیل السہمی" کا نام مذکور ہے۔)

{۱۳۵} ولا حاجة إلى شيء منها والقدر المعلوم أنهم طبقة لهم قوة وشوكة ورياسة (كبير۷، ۱۹/۱۶۵)

{۱۳۶} (دیکھیے روح المعانی ۸، ۱۴/۱۲۷، تفسیر القاسمی ۱۰/۷۲، کبیر۷، ۱۹/۱۶۵)

{۱۳۷} (ابن کثیر ۲/۴۲۹)

﴿۹۹﴾......ذکر وعبادت کا حکم عارضی نہیں ہے دائمی ہے، زندگی کی آخری سانس تک اس میں مصروف رہیے۔
اس آیتِ کریمہ میں "اَلْیَقِیْنُ" کا جو لفظ آیا ہے تو جمہور مفسرین نے اسے موت کے معنی میں لیا ہے،{۱۳۸} قرآن اور حدیث کے نصوص سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے، سورۂ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کے بارے میں بتایا ہے کہ جب ان سے دوزخ میں ڈالے جانے کا سبب پوچھا جائے گا تو وہ کہیں گے:

﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝﴾{۱۳۹}

"وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر بے ہودہ گوئی کرتے تھے اور قیامت کو جھٹلاتے تھے؛ یہانتک کہ ہمیں موت آ گئی۔"

یہاں "اَلْیَقِیْنُ" سے مراد یقینی طور پر موت ہی ہے۔
حضرت ام علاء انصاریہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

﴿فو اللہ لقد جاءہ الیقین و اللہ انی لأرجو له الخیر﴾{۱۴۰}

"اللہ کی قسم! عثمان کو اس حالت میں موت آئی ہے کہ میں اس کے لیے خیر کی امید رکھتا ہوں۔"

بعض جاہل یقین کو معرفت کے معنی میں لے کر استدلال کرتے ہیں کہ عبادت اسی وقت تک ضروری ہے جب تک دل میں معرفت نہ پیدا ہو جائے، جب معرفت پیدا ہو جائے اور مرتبۂ یقین حاصل ہو جائے تو عبادت کی ضرورت نہیں رہتی، اس استدلال اور مفہوم کو اہلِ علم، کفر، جہالت اور گمراہی قرار دیتے ہیں۔{۱۴۱}

حکمت وہدایت:

۱......نبی کریم ﷺ اور تمام مسلمانوں کو جو سب سے بڑی نعمت عطا کی گئی وہ قرآن مجید ہے، اس کا موازنہ اور مقابلہ دنیا کی کسی بھی نعمت سے نہیں کیا جا سکتا۔(۸۷-۸۸)

{۱۳۸}"حتّٰی یأتیك الیقین" أی الموت (روح المعانی ۸، ۱۲۸/۱۴)، أن الیقین الموت (قرطبی ۵۹/۱۰)، قال ابن عباس رضی اللہ عنهما: یرید الموت (کبیر ۷، ۱۶۶/۱۹)
{۱۳۹}(المدثر ۷۴/۴۳-۴۷)
{۱۴۰}(بخاری ۲، کتاب التعبیر/۱۰۳۷ ...... الفاظ کے معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ یہ حدیث "بخاری ۱، کتاب الجنائز/۱۶۶" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔)
{۱۴۱} هذا کفر وضلال وجهل (ابن کثیر ۷۳۰/۲)

۲......فاتحہ، قرآنِ کریم کی سورتوں میں سے سب سے افضل سورت ہے اسی لیے اسے قرآن کا جزء ہونے کے باوجود مستقل طور پر ذکر کیا گیا ہے، اسے قرآن کا دیباچہ اور خلاصہ بھی کہا جاتا ہے، اس میں بیان کیے گئے مضامین کے مطالعہ کے بعد قرآن پڑھا جائے تو لگتا ہے کہ پورے قرآن میں فاتحہ کی تفسیر ہے، احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو بار نازل ہوئی، ایک بار مکہ میں اور دوسری بار مدینہ میں۔ (۸۷)

۳......جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور پھر قرآن جیسی نعمت عطا کی ہو، اسے مادی اسباب و وسائل کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ (۸۷-۸۸) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لیس منّا من لم یتغنّ بالقرآن﴾ {۱۴۲} ”جسے قرآن سے استغنا حاصل نہیں ہوتی وہ ہم میں سے نہیں۔“

اس حدیث کا اگرچہ مشہور مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص آواز کو بنا سنوار کر نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں مگر ابنِ عیینہ رحمہ اللہ نے اس کا مطلب وہ بیان کیا ہے جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے۔ {۱۴۳}

۴......بعض حضرات نے آیت ۸۸ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادی نعمتوں اور اسبابِ دنیا کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اور اللہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے مگر حق یہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، یہ ایسا معتدل دین ہے جس میں جسم اور روح، دنیا اور آخرت دونوں کے تقاضوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور فطرت کے جائز مطالبات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ حضورِ اکرم ﷺ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اخروی کامیابی چاہنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اس کے باوجود آپ بقدرِ ضرورت مادی نعمتوں سے مستفید ہوتے تھے، ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿حبّب الیّ من الدنیا النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلوٰة﴾ {۱۴۴} ”مجھے تمہاری دنیا میں سے عورتیں اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔“

نکاح کی صورت میں عورتوں کی طرف میلان اور خوشبو کی پسندیدگی فطرتِ سلیمہ کی وجہ سے تھی، البتہ اگر فتنوں کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے ایمان بچانا مشکل ہو جائے تو پھر راہِ فرار اختیار کی جا سکتی ہے، اس بارے میں ہمارے آقا ﷺ کا ارشاد ہے:

{۱۴۲} (مجمع الزوائد ۷/۱۷۱)

{۱۴۳} ومن ههنا ذهب ابن عيينة إلىٰ تفسير الحديث الصّحيح "ليس منّا......الخ" إلىٰ أنّه يستغنى به عماعداه (ابن كثير ۲/۷۲۶)

{۱۴۴} (نسائی ۲، کتاب عشرة النساء/۹۳)

﴿یوشک أن یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینه من الفتن﴾{۱۴۵}

''عنقریب ایسا زمانہ آئے گا جب مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جنھیں فتنوں سے اپنا دین بچانے کے لیے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش برسنے کے مقامات پر لے کر چلا جائے گا۔''

۵......داعی کو چاہیے کہ اگر اس کے مخاطب ایمان کی دعوت قبول نہ کریں تو اتنا پریشان نہ ہو کہ اس کی ہلاکت کا اندیشہ پیدا ہو جائے، داعی کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے، دلوں کا بدلنا اللہ کا کام ہے۔(۸۸)

۶......اہلِ ایمان کے ساتھ شفقت اور تواضع کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔(۸۸)

۷......جو لوگ اللہ کی کتاب کو تقسیم کرتے ہیں، اس کے بعض احکام پر ایمان لاتے اور بعض کا انکار کرتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔(۹۰-۹۱)

۸......نبی اکرم ﷺ کی طرح ہر صاحبِ علم مسلمان کے پیشِ نظر سارے انسانوں تک پیغامِ ہدایت پہنچانے کا مشن ہونا چاہیے۔(۹۴)

۹......اللہ کے جو بندے اخلاص کے ساتھ دین کی محنت میں لگے ہوں، ان کی حفاظت اللہ خود کرتا ہے اور ان کا مذاق اڑانے والوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کرتا ہے۔(۹۵)

۱۰......ذکر و نماز اور تسبیح و تحمید میں اللہ تعالیٰ نے غموں اور پریشانیوں کا علاج رکھا ہے اور کثرتِ سجود سے اللہ کا انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بندہ سب سے زیادہ اللہ کے قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے تو سجدے میں بہت دعا کیا کرو۔''{۱۴۶}

۱۱......زندگی کی آخری سانس تک اللہ کی عبادت فرض ہے اور یہ بندے سے کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی الا یہ کہ وہ لمبے وقت کے لیے بے ہوش یا دیوانہ ہو جائے۔(۹۹)

۱۲......خاتمہ بالایمان کی دعا بھی کرنی چاہیے اور کوشش بھی۔(۹۹)

۱۳......عبادت کسی سے بھی ساقط نہیں ہوتی خواہ مریض ہو یا صحت مند، ولی اور مجاہد ہو یا صحابی اور نبی۔

☆☆☆☆☆

{۱۴۵} (بخاری ۲، کتاب الفتن/۱۰۵۰)

{۱۴۶} (مسلم ۲/۴۹...... دارالمعرفة، بیروت)